MAHS213CCT

تاریخ ہندوستان

(1857 تا 1950)

History of India

(1857 – 1950 A.D.)

فاصلاتی اور روایتی نصاب پر مبنی خود اکتسابی مواد

ماسٹر آف آرٹس (ایم۔اے۔)

(دوسرا سمسٹر)

نظامت فاصلاتی تعلیم

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی

حیدرآباد-32، تلنگانہ-بھارت

©Maulana Azad National Urdu University, Hyderabad
Course: History of India (1857 – 1950 A.D.)
ISBN: 978-81-967513-3-3
First Edition: October 2023

Publisher	:	Registrar, Maulana Azad National Urdu University, Hyderabad
Publication	:	2023
Copies	:	500
Price	:	310/- (The price of the book is included in the admission fee of distance mode students)
Copy Editing	:	*Vidya Vachaspati* Shaik Mahaboob Basha, Programme Coordinator–History, DDE, MANUU, Hyderabad Dr. Syed Meer Abul Hussain, Asst. Professor of History (C), DDE, MANUU, Hyderabad Mr. Mohd Aasim, Asst. Professor of History (C), DDE, MANUU, Hyderabad
Cover Designing	:	Dr. Mohd Akmal Khan, Asst. Professor of Urdu (C), DDE, MANUU, Hyderabad
Printer	:	Print Time & Business Enterprises, Hyderabad

History of India (1857 – 1950 A.D.)

for

M.A. History 2nd Semester

On behalf of the Registrar, Published by:

Directorate of Distance Education

Maulana Azad National Urdu University

Gachibowli, Hyderabad – 500032 (TS), Bharat

Director: dir.dde@manuu.edu.in *Publication:* ddepublication@manuu.edu.in

Phone number: 040-23008314 Website: manuu.edu.in

© All rights reserved. No part of this publication may be reproduced or transmitted in any form or by any means, electronically or mechanically, including photocopying, recording or any information storage or retrieval system, without prior permission in writing from the publisher (registrar@manuu.edu.in).

مدیر اعلیٰ

Chief Editor

Prof. S.M. Azizuddin Husain

Former Head, Department of History & Culture
Jamia Millia Islamia, New Delhi
&
Honorary Professor, Centre for Urdu Culture Studies
Maulana Azad National Urdu University
Hyderabad

پروفیسر سید محمد عزیزالدین حسین

سابق صدر، شعبہ تاریخ و ثقافت
جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی
اعزازی پروفیسر، مرکز مطالعات اردو ثقافت
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی
حیدرآباد

مدیر

Editor

***Vidya Vachaspati* Shaik Mahaboob Basha**

Programme Coordinator – History
Directorate of Distance Education
Maulana Azad National Urdu University
Hyderabad

ودیا واچسپتی شیخ محبوب باشا

پروگرام کوآرڈی نیٹر، تاریخ
نظامت فاصلاتی تعلیم
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی
حیدرآباد

مدیر زبان

Language Editor

Prof. Najmus Saher

Professor (Education)
Directorate of Distance Education
Maulana Azad National Urdu University
Hyderabad

پروفیسر نجم السحر

پروفیسر (تعلیم)
نظامت فاصلاتی تعلیم
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی
حیدرآباد

مجلس ادارت

Editorial Board

Prof. Perwez Nazir
Department of History
Aligarh Muslim University, Aligarh

پروفیسر پرویز نظیر
شعبہ تاریخ
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

Prof. Mushtaq Ahmad Kaw
Former Head, Department of History
Maulana Azad National Urdu University
Hyderabad

پروفیسر مشتاق احمد کاؤ
سابقہ صدر شعبہ تاریخ
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

Prof. Alauddin Khan
Head, Department of History
Shibli National College
Azamgarh, U.P.

پروفیسر علاؤالدین خان
صدر، شعبہ تاریخ
شبلی نیشنل کالج، اعظم گڑھ

Prof. Danish Moin
Department of History
Maulana Azad National Urdu University
Hyderabad

پروفیسر دانش معین
صدر، شعبہ تاریخ
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

Vidya Vachaspati
Shaik Mahaboob Basha
Programme Coordinator – History
DDE, MANUU, Hyderabad

ودیا واچسپتی شیخ محبوب باشا
پروگرام کوآرڈی نیٹر، تاریخ
ڈی ڈی ای، مانو، حیدرآباد

Dr. Syed Meer Abul Hussain
Assistant Professor of History (C) / Guest
Faculty DDE, MANUU, Hyderabad

ڈاکٹر سید میر ابوالحسین
اسسٹنٹ پروفیسر تاریخ (عارضی)/ گیسٹ فیکلٹی
ڈی ڈی ای، مانو، حیدرآباد

Mr. Mohd Aasim
Assistant Professor of History (C) / Guest
Faculty DDE, MANUU, Hyderabad

محمد عاصم
اسسٹنٹ پروفیسر تاریخ (عارضی)/ گیسٹ فیکلٹی
ڈی ڈی ای، مانو، حیدرآباد

کورس کوآرڈی نیٹر

ودیا واچسپتی شیخ محبوب باشا

اسسٹنٹ پروفیسر (تاریخ)، نظامت فاصلاتی تعلیم

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

مصنفین	اکائی نمبر
• ڈاکٹر فردوس حمید پرے	اکائی 1,15
• ڈاکٹر دوسی سرینواس	اکائی 2
• ڈاکٹر داؤد ابراہیم	اکائی 3
• محمد عاصم	اکائی 4,5,8,12,14
• ڈاکٹر پوجا مشرا	اکائی 6
• ڈاکٹر خورشید احمد بھٹ	اکائی 7,10,11
• ڈاکٹر سید میر ابوالحسین	اکائی 9
• ودیا واچسپتی شیخ محبوب باشا	اکائی 13
• ڈاکٹر اے۔ سبھاش	اکائی 16
مترجمین	
• پروفیسر نجم السحر	اکائی 2,6
• محمد عاصم	اکائی 16
• ڈاکٹر سید میر ابوالحسین/محمد عاصم	اکائی 13

پروف ریڈرس:

اول	:	محمد عاصم
دوم	:	سید میر ابوالحسین
فائنل	:	شیخ محبوب باشا

فہرست

پیغام	وائس چانسلر	7
پیغام	ڈائرکٹر	8
کورس کا تعارف	کورس کوآرڈی نیٹر	9
بلاک I	**برطانوی ہندوستان کا سماجی ثقافتی خاکہ**	
اکائی 1	برطانوی راج کی سماجی۔ قانونی مداخلت	15
اکائی 2	برطانوی حکومت کے متعلق دانشوروں کا ردعمل: رام موہن رائے، ایشور چندر ودیا ساگر اور سرسید احمد خان	30
بلاک II	**ہندوستانی قوم پرستی کا عروج**	
اکائی 3	قوم پرستی: نظریات اور مباحث	47
اکائی 4	ابتدائی ہندوستانی سیاسی انجمنیں	59
اکائی 5	ہندوستانی قومی کانگریس کا قیام	76
اکائی 6	اعتدال پسند اور انتہا پسند	98
اکائی 7	انقلاب پسند	116

اکائی 8	قوم پرستی اور ہندوستانی سرمایہ دار طبقہ	138
بلاک III	**گاندھیائی قوم پرستی**	
اکائی 9	گاندھی کا عروج اور ہندوستانی قوم پرستی	155
اکائی 10	عدم تعاون اور خلافت تحریکیں	169
اکائی 11	عام نافرمانی اور ہندوستان چھوڑو تحریکیں	191
بلاک IV	**ہندوستانی قوم پرستی کے دیگر رجحانات**	
اکائی 12	امبیڈکر اور دلت تحریکیں	214
اکائی 13	مسلم لیگ اور ہندو مہاسبھا	242
اکائی 14	بائیں بازو کی تحریکیں	265
اکائی 15	ہندوستانی قومی فوج	283
اکائی 16	تقسیم ہند اور قومی تعمیر کا عمل	300
نمونہ امتحانی پرچہ		318

''اردو زبان جب ہی ترقی کر سکتی ہے اور عالمی زبان بن سکتی ہے جب کہ اس میں باضابطہ تراجم، علوم وفنون کا سلسلہ قائم کیا جائے۔ جدید علم کے ہر صیغے کی مبسوط اور جامع کتابیں ترجمہ کی جائیں۔ علوم وفنون کا کوئی پہلو یورپ کی زبانوں میں ایسا نہ ہو جس کا ترجمہ اردو میں موجود نہ ہو۔ جب تک اردو میں ایسا منظم سلسلہ قائم نہ ہوگا اس کی علمی ترقی محال ہے۔''

ابوالکلام آزاد

AZAD NATIONAL URDU UNIV

پیغام

مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی 1998 میں وطنِ عزیز کی پارلیمنٹ کے ایکٹ کے تحت قائم کی گئی۔اس کے چار نکاتی مینڈیٹس یہ ہیں۔(1)اردو زبان کی ترویج و ترقی (2)اردو میڈیم میں پیشہ ورانہ اور تکنیکی تعلیم کی فراہمی (3)روایتی اور فاصلاتی تدریس سے تعلیم کی فراہمی اور (4) تعلیم نسواں پر خصوصی توجہ۔ یہ وہ بنیادی نکات ہیں جو اِس مرکزی یونیورسٹی کو دیگر مرکزی جامعات سے منفرد اور ممتاز بناتے ہیں۔ قومی تعلیمی پالیسی 2020 میں بھی مادری اور علاقائی زبانوں میں تعلیم کی فراہمی پر کافی زور دیا گیا ہے۔

اُردو کے ذریعے علوم کو فروغ دینے کا واحد مقصد و منشا اُردو داں طبقے تک عصری علوم کو پہنچانا ہے۔ایک طویل عرصے سے اُردو کا دامن علمی مواد سے لگ بھگ خالی رہا ہے۔ کسی بھی کتب خانے یا کتب فروش کی الماریوں کا سرسری جائزہ اس بات کی تصدیق کر دیتا ہے کہ اُردو زبان سمٹ کر چند ادبی اصناف تک محدود رہ گئی ہے۔ یہی کیفیت اکثر رسائل و اخبارات میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ اردو میں دستیاب تحریریں قاری کو کبھی عشق و محبت کی پُر پیچ راہوں کی سیر کراتی ہیں تو کبھی جذباتیت سے پُر سیاسی مسائل میں اُلجھاتی ہیں، کبھی مسلکی اور فکری پس منظر میں مذاہب کی توضیح کرتی ہیں تو کبھی شکوہ و شکایت سے ذہن کو گراں بار کرتی ہیں۔ تاہم اُردو قاری اور اُردو سماج دورِ حاضر کے اہم ترین علمی موضوعات سے نابلد ہیں۔ چاہے یہ خود ان کی صحت و بقا سے متعلق ہوں یا معاشی اور تجارتی نظام سے، یا مشینی آلات ہوں یا ان کے گرد و پیش ماحول کے مسائل ہوں، عوامی سطح پر ان شعبہ جات سے متعلق اردو میں مواد کی عدم دستیابی نے عصری علوم کے تئیں ایک عدم دلچسپی کی فضا پیدا کر دی ہے۔ یہی وہ مبارزات (challenges) ہیں جن سے اُردو یونیورسٹی کو نبرد آزما ہونا ہے۔ نصابی مواد کی صورت حال بھی کچھ مختلف نہیں ہے۔ اس کولی سطح پر اُردو کتب کی عدم دستیابی کے چرچے ہر تعلیمی سال کے شروع میں زیرِ بحث آتے ہیں۔ چوں کہ اُردو یونیورسٹی کا ذریعہ تعلیم اُردو ہے اور اس میں عصری علوم کے تقریباً سبھی اہم شعبہ جات کے کورسز موجود ہیں لہٰذا اِن تمام علوم کے لیے نصابی کتابوں کی تیاری اِس یونیورسٹی کی اہم ترین ذمہ داری ہے۔ اُنہیں مقاصد کے حصول کے لیے اردو یونیورسٹی کا آغاز فاصلاتی تعلیم سے 1998 میں ہوا تھا۔

مجھے اِس بات کی بے حد خوشی ہے کہ اس کے ذمہ داران بشمول اساتذہ کرام کی انتھک محنت اور ماہرین علم کے بھرپور تعاون کی بنا پر کتب کی اشاعت کا سلسلہ بڑے پیمانے پر شروع ہو گیا ہے۔ فاصلاتی تعلیم کے طلباء کے لیے کم سے کم وقت میں خود اکتسابی مواد اور خود اکتسابی کتب کی اشاعت کا کام عمل میں آ گیا ہے۔ پہلے اور دوسرے سمسٹر کی کتب شائع ہو کر طلباء و طالبات تک پہنچ چکی ہیں۔ تیسرے سمسٹر کی کتابیں بھی جلد طلباء تک پہنچیں گی۔ مجھے یقین ہے کہ اس سے ہم ایک بڑی اردو آبادی کی ضروریات کو پورا کر سکیں گے اور اِس یونیورسٹی کے وجود اور اِس میں اپنی موجودگی کا حق ادا کر سکیں گے۔

پروفیسر سید عین الحسن

وائس چانسلر

پیغام

فاصلاتی طریقۂ تعلیم پوری دنیا میں ایک انتہائی کار گر اور مفید طریقۂ تعلیم کی حیثیت سے تسلیم کیا جاچکا ہے اور اس طریقۂ تعلیم سے بڑی تعداد میں لوگ مستفید ہورہے ہیں۔ مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی نے بھی اپنے قیام کے ابتدائی دنوں ہی سے اردو آبادی کی تعلیمی صورت حال کو محسوس کرتے ہوئے اِس طرزِ تعلیم کو اختیار کیا۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کا آغاز 1998 میں نظامتِ فاصلاتی تعلیم اور ٹرانسلیشن ڈویژن سے ہوا اور اس کے بعد 2004 میں باقاعدہ روایتی طرز تعلیم کا آغاز ہوا اور بعد ازاں متعدد روایتی تدریس کے شعبہ جات قائم کیے گئے۔ نو قائم کردہ شعبہ جات اور ٹرانسلیشن ڈویژن میں تقرریاں عمل میں آئیں۔ اس وقت کے اربابِ مجاز کے بھرپور تعاون سے مناسب تعداد میں خود مطالعاتی مواد تحریر و ترجمے کے ذریعے تیار کرائے گئے۔

گزشتہ کئی برسوں سے یو جی سی۔ ڈی ای بی UGC-DEB اس بات پر زور دیتا رہا ہے کہ فاصلاتی نظامِ تعلیم کے نصابات اور نظامات کو روایتی نظامِ تعلیم کے نصابات اور نظامات سے کماحقہ ہم آہنگ کرکے نظامتِ فاصلاتی تعلیم کے طلبا کے معیار کو بلند کیا جائے۔ چوں کہ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی فاصلاتی اور روایتی طرزِ تعلیم کی جامعہ ہے، لہٰذا اس مقصد کے حصول کے لیے یو جی سی۔ ڈی ای بی کے رہنمایانہ اصولوں کے مطابق نظامتِ فاصلاتی تعلیم اور روایتی نظامِ تعلیم کے نصابات کو ہم آہنگ اور معیار بلند کرکے خود اکتسابی مواد SLM از سرِ نو بالترتیب یو جی اور پی جی طلبا کے لیے چھ بلاک چوبیس اکائیوں اور چار بلاک سولہ اکائیوں پر مشتمل نئے طرز کی ساخت پر تیار کرائے جارہے ہیں۔

نظامتِ فاصلاتی تعلیم یو جی، پی جی، بی ایڈ، ڈپلوما اور سرٹیفکیٹ کورسز پر مشتمل جملہ پندرہ کورسز چلا رہا ہے۔ بہت جلد تکنیکی ہنر پر مبنی کورسز بھی شروع کیے جائیں گے۔ متعلمین کی سہولت کے لیے 9 علاقائی مراکز بنگلورو، بھوپال، دربھنگہ، دہلی، کولکاتا، ممبئی، پٹنہ، رانچی اور سری نگر اور 5 ذیلی علاقائی مراکز حیدرآباد، لکھنؤ، جموں، نوح اور امراوتی کا ایک بہت بڑا نیٹ ورک تیار کیا ہے۔ ان مراکز کے تحت سرِ دست 155 متعلم امدادی مراکز (Learner Support Centre) کام کررہے ہیں، جو طلبا کو تعلیمی اور انتظامی مدد فراہم کرتے ہیں۔ نظامت فاصلاتی تعلیم نے اپنی تعلیمی اور انتظامی سرگرمیوں میں آئی سی ٹی کا استعمال شروع کردیا ہے، نیز اپنے تمام پروگراموں میں داخلے صرف آن لائن طریقے ہی سے دے رہا ہے۔

نظامتِ فاصلاتی تعلیم کی ویب سائٹ پر متعلمین کو خود اکتسابی مواد کی سافٹ کاپیاں بھی فراہم کی جارہی ہیں، نیز جلد ہی آڈیو۔ ویڈیو ریکارڈنگ کا لنک بھی ویب سائٹ پر فراہم کیا جائے گا۔ اس کے علاوہ متعلمین کے درمیان رابطے کے لیے ایس ایم ایس کی سہولت فراہم کی جارہی ہے، جس کے ذریعے متعلمین کو پروگرام کے مختلف پہلوؤں جیسے کورس کے رجسٹریشن، مفوضات، کونسلنگ، امتحانات وغیرہ کے بارے میں مطلع کیا جاتا ہے۔ امید ہے کہ ملک کی تعلیمی اور معاشی حیثیت سے پچھڑی اردو آبادی کو مرکزی دھارے میں لانے میں نظامتِ فاصلاتی تعلیم کا بھی نمایاں رول ہوگا۔

پروفیسر محمد رضاء اللہ خان

ڈائرکٹر، نظامت فاصلاتی تعلیم

کورس کا تعارف

عزیز طلباء و طالبات، آداب۔ ''ہندوستان کی تاریخ (1857–1950ء)'' کورس میں خوش آمدید۔ یہ کورس آپ کو ہندوستانی تاریخ کی جدید دور میں ہونے والی مختلف تبدیلیوں سے متعارف کرائے گا۔ اس میں آپ کو اندازہ ہوگا کہ برطانوی نوآبادیاتی حکومت نے کس طرح کچھ اہم قوانین بنائے جن کا ہندوستانیوں پر خاص طور پر ہندوستانی سماج کے دبے کچلے طبقات پر خاصا اثر پڑا۔ برطانوی ثقافتی اثر و رسوخ اور خاص طور پر ہندوستانی ثقافت پر ان کی تنقید کی وجہ سے، جدید ہندوستان میں متعدد اصلاحی تحریکیں ابھریں اور آپ سمجھ پائیں گے کہ کیسے رام موہن رائے، ایشور چندر ودیا ساگر اور سر سید احمد خان جیسے مقامی دانشوروں نے اس صورت حال کا سامنا کیا۔ یہ کورس آپ کو قوم پرستی کے نظریات کا تجزیہ کرنے میں اور یہ جاننے میں مدد کرے گا کہ ہندوستان میں قوم پرستی کو کیسے عروج حاصل ہوا۔ خاص طور پر آپ مختلف نظریات سے تعلق رکھنے والی تنظیموں اور افراد کے ذریعے چلائی جانے والی ہندوستانی قوم پرست تحریک کو سمجھ سکیں گے۔ ہندوستانی قومی تحریک کوئی یک رخی تحریک نہیں تھی کیونکہ اس میں اختلاف کے بھی بہت سے پہلو تھے۔ مزید برآں آپ ہندوستانی قومی تحریک میں مہاتما گاندھی کے غیر معمولی کردار کو سراہ سکیں گے۔ آپ ذات پات اور کروڑوں ہندوستانیوں کے ساتھ اس سے منسلک امتیازی سلوک کے خلاف انتھک جدوجہد کے لیے ڈاکٹر بابا صاحب بھیم راؤ امبیڈکر کی کوششوں کی تعریف کریں گے۔ مزید، آپ سمجھ جائیں گے کہ ہندو مہاسبھا اور مسلم لیگ جیسی فرقہ وارانہ تنظیمیں کیسے اور کیوں ابھریں اور عروج کو پہنچیں اور کس طرح برطانوی ہندوستان کو تقسیم ہونا پڑا۔ اگرچہ تقسیم، ہندوستان کی نوزائیدہ قومی مملکت کے لیے ایک شدید جھٹکا تھا، لیکن اس نے ایک مضبوط قوم بننے کے لیے قابل ستائش کوششیں کیں جس کی آزادی کے لیے بہت سے دلیر عورتوں اور مردوں نے اپنی جان کی بازی لگائی۔

حالیہ دور تک، تاریخ کو بادشاہوں اور شہنشاہوں کے عظیم کارناموں/بداعمالیوں کے طور پر سمجھا جاتا تھا۔ ملکائیں بھی زیادہ تر اپنے عظیم مردوں کے تعلق کی وجہ سے ظاہر ہوئیں۔ دوسرے لفظوں میں، تاریخ کو بادشاہوں اور ریاستوں، شہنشاہوں اور سلطنتوں، کے ناموں کی ایک لمبی فہرست سمجھا جاتا تھا۔ اس میں ان کے ذریعے لڑی جانے والی جنگوں اور ان کی محبوباؤں وغیرہ کا تذکرہ بھی شامل تھا۔ مختصراً، تاریخ کا مطلب سیاسی تاریخ تھا اور بدقسمتی سے یہ سوچ عام لوگوں کے ذہنوں پر ابھی بھی حاوی ہے۔ عام لوگ، محنت کش عوام، جو اصل تاریخ ساز تھے، شاید ہی کبھی تاریخ کے ڈرامے میں نظر آئے۔ لیکن، اب تاریخ کے بارے میں نقطہ نظر بڑی حد تک تبدیل ہو چکا ہے اور اسی لیے تاریخ لکھنے کا طریقہ بھی بدل گیا ہے۔ عام لوگ بشمول مرد و خواتین، نے تاریخ میں اپنے حصے کا دعویٰ کرنا شروع کر دیا ہے۔ اب تاریخ کی توجہ حکمرانوں سے رعایا کی طرف منتقل ہو رہی ہے۔ جیسا کہ تیلگو شاعر سری سری (سری رنگم سری نواس راؤ) نے اپنی نظم میں مناسب طریقے سے بیان کیا ہے، اب مورخین اس کی کھوج کرنا چاہتے ہیں اور تاریخ کے اندھیرے میں دبی پڑی سب کہانیوں پر روشنی ڈالنا چاہتے ہیں۔ وہ پوچھنے لگے کہ دریائے نیل کی تہذیب میں عام زندگی کیسی تھی اور تاج محل کی تعمیر میں پتھر ڈھونے والے قلی کون تھے اور سلطنتوں کے باہمی جنگوں میں عام لوگوں کی بہادری کیسی تھی۔ 'ناوہ ڈولی گنتی کی تھی چڑھ بیٹھا جس پر راجا، اس کے واہک کلی کون تھے؟' یہ بے حد ضروری ہے کہ تاریخ کا مطالعہ عام لوگوں کے نقطۂ نظر سے کیا جائے۔ مشہور ادیب جارج اورویل نے تاریخ کو مختصر الفاظ میں بیان کرتے ہوئے کہا کہ: 'جو ماضی کو قابو کرتے ہیں وہی مستقبل کو قابو کرتے ہیں: جو حال کو قابو کرتے ہیں وہی ماضی کو قابو کرتے ہیں۔' ممتاز مورخ پروفیسر کے ایس ایس شیشن نے زور دیا کہ 'تاریخ کا معاشرے سے وہی رشتہ ہے جو یادداشت کا فرد سے ہے۔' ودیا واچسپتی ایس ایم باشا کے مطابق جو ماضی کو اچھے سے سمجھتے ہیں، وہ حال کو بہترین طریقے سے سمجھ سکتے ہیں؛ اور اسی طرح ماضی کو اچھے ڈھنگ سے سمجھنے کے لیے حال کا گہرا علم ضروری ہے۔

UGC-DEB کی ہدایات کے مطابق، نظامت فاصلاتی تعلیم، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے سیلف لرننگ مٹیریل لکھنے کے لیے بہترین مصنفین کو راغب کرنے کی پوری کوشش کی ہے۔ امید ہے کہ یہ نہ صرف آپ کی تعلیمی کارکردگی کے لیے کارآمد ثابت ہوگا بلکہ مختلف مسابقتی امتحانات کو اعتماد کے ساتھ دینے کے قابل بھی بنائے گا۔ ہم شعبہ تاریخ، نظامت فاصلاتی تعلیم میں، آپ کی خدمت کے لیے ہر وقت تیار ہیں۔ کورس میں ایک بار پھر خوش آمدید اور میں آپ کے لیے نیک خواہشات کا اظہار کرتا ہوں۔

ودیا واچسپتی شیخ محبوب باشا

کورس کوآرڈی نیٹر

مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی
मौलाना आज़ाद नेशनल उर्दू यूनिवर्सिटी
Estd. 1998
MAULANA AZAD NATIONAL URDU UNIVERSITY

تاریخ ہندوستان

(1857 تا 1950ء)

History of India

(1857 – 1950 A.D.)

مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی
मौलाना आज़ाद नेशनल उर्दू यूनिवर्सिटी
Estd. 1998
MAULANA AZAD NATIONAL URDU UNIVERSITY

اکائی 1۔ راج کی سماجی و قانونی مداخلت

(Socio-Legal Intervention by the Raj)

اکائی کے اجزا

1.0 تمہید

1.1 مقاصد

1.2 انگریزوں کی ابتدائی سماجی پالیسی

1.3 نوآبادیاتی سماجی مداخلت میں تبدیلیاں

1.3.1 نوزائیدہ قتل ایکٹ

1.3.2 ستی ایکٹ

1.3.3 ٹھگی اور ڈاکو کو دبانے کے ایکٹ

1.3.4 غلامی ایکٹ

1.3.5 مذہبی قانونی رکاوٹ ختم کرنے کا قانون

1.3.6 ہندو بیواؤں کے عقد ثانی کا قانون

1.3.7 ایج آف کنزنٹھ ایکٹ / عمر رضامندی کا ایکٹ

1.3.8 شاردا ایکٹ

1.4 برطانوی پالیسی اور ہندوستانی رد عمل: ایک تشخیص

1.5 اکتسابی نتائج

1.6 کلیدی الفاظ

1.7 نمونہ امتحانی سوالات

1.8 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1.0 تمہید (Introduction)

آٹھارویں صدی کے آخر میں انگلش ایسٹ انڈیا کمپنی پلاسی اور بکسر کی لڑائیوں میں اپنی فتوحات کے بعد بنگال میں ایک فاتح تجارتی اور فوجی طاقت کے طور پر ابھری۔اور انیسویں صدی کے اوائل میں برطانوی کمپنی نے تجارت سے حکمرانی تک کا سفر مکمل کر لیا۔اس تبدیلی کے لیے حکومتی اداروں، نئے انفراسٹرکچر کے قیام اور آبادی کو کنٹرول کرنے کے لیے ایک جامع پالیسی کی ضرورت تھی۔اس عمل کو نو آبادیاتی اداروں اور حکمرانی کے طریقہ کار پر ابتدائی انحصار کے ذریعے نشان زد کیا گیا تھا، جس کے بعد ان میں عارضی تبدیلیاں ہوئیں، آخر کار حکومتی اداروں کی ترتیب ہوئی اور کچھ مقامی لوگوں کے ساتھ مل کر برطانوی حکومت نے اپنے معاشی مقاصد پورے کیے۔ نو آبادیاتی حکومت نے ہندوستان کو چلانے کے لئے مختلف سیاسی و سماجی پالسیاں بنائیں۔ہندوستان میں برطانوی نو آبادیاتی حکومت نے مختلف سماجی و قانونی مداخلت کی جس نے ہندوستانی معاشرے کو نمایاں طور پر متاثر کیا۔اس مداخلت کا مقصد ہندوستان میں برطانوی کنٹرول کو مستحکم کرنا، روایتی ہندوستانی سماجی اور قانونی نظام کو تبدیل کرنا اور برطانوی اقدار اور مفادات کو فروغ دینا تھا۔اس باب میں، ہندوستان میں انگریزوں کی سماجی و قانونی مداخلت کو اجاگر کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

1.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- نو آبادیاتی دور میں سماجی رسم و رواج کے بارے میں جان سکیں گے۔
- وہ عوامل جنھوں نے نو آبادیاتی سماجی پالیسی تشکیل کی اس سے آگاہ ہو سکیں گے۔
- ہندوستان میں انگریزوں کی ابتدائی سماجی پالیسی کے بارے میں سمجھ سکیں گے۔
- ہندوستانی سماجی زندگی میں برطانوی مداخلت کے عوامل کے بارے میں جان سکیں گے۔
- برطانوی سماجی پالیسیوں کے اثرات اور ہندوستانی رد عمل کی معلومات ہو سکے گی۔

1.2 انگریزوں کی ابتدائی سماجی پالیسی (Early Social Policy of the British)

سماجی پالیسی کی اصطلاح میں قانون، تعلیم، خاندان، جرائم، حیثیت کی درجہ بندی، سماجی معلومات اکٹھا کرنے اور اس کو منظم کرنے کے مقصد کے ساتھ اجتماعی زندگی میں ریاستی مداخلت کا احاطہ کیا گیا ہے۔'سماجی پالیسی' کی اصطلاح کی انتہائی وسیع دائرہ کے پیش نظر ہم اس باب میں نو آبادیاتی دور میں ہندوستانی سماجی رسم و رواج کے بارے میں برطانوی رویوں کا مطالعہ کریں گے۔ شروع میں یہ ذکر کیا جاسکتا ہے کہ ہماری زیادہ تر توجہ بنگال پر مرکوز ہیں۔ چونکہ ہندوستان میں کمپنی کی حکومت کا ہیڈ کوارٹر تھا اور ابتدائی طور پر برطانوی حکومت کے زیر تسلط ہونے کی وجہ سے بنگال نے ایک تجربہ گاہ کی حیثیت حاصل کر لی۔ حکومت نے اپنی ابتدائی ریاستی پالیسیاں بنگال میں تیار کیں۔ بنگال وہ خطہ تھا جہاں تعلیم یافتہ متوسط طبقے کے لوگوں کی کافی تعداد موجود تھی جنھوں نے سماجی پالیسی کو تیار کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ کلکتہ میں انگریزوں کی

معاشی سرگرمیاں اور اس کے اعلیٰ طبقوں میں مغربی تعلیم کے پھیلاؤ نے شہر کی سماجی اور ثقافتی زندگی کی رونق بڑھا دی۔ اس لیے مغربی تعلیم یافتہ بنگالی اشرافیہ نے برطانوی پالیسیوں کو تشکیل دینے کی کوشش کرنے کے علاوہ فعال طور پر بحث کی اور عوامی ردعمل سے حکومت کو آگاہ کیا۔ وارن ہیسٹنگز (Warren Hastings)، ہندوستان کے پہلے گورنر جنرل تھے، جو کہ ایک انگریزی بیوروکریسی قائم کرنے کے حق میں تھے، جو ہندوستانی زبانوں پر عبور رکھتی ہو اور ہندوستانی روایات سے آشنا ہو۔ 1784 میں ہیسٹنگز نے نوٹ کیا کہ 'علم کا ہر ذخیرہ اور خاص طور پر ان لوگوں کے ساتھ سماجی رابطے کے ذریعے حاصل کیا جاتا ہے جن پر ہم فتح کے حق کی بنیاد پر غلبہ حاصل کرتے ہیں، مرحلے کے لیے مفید ہے: یہ انسانیت کا فائدہ ہے...'

ہیسٹنگز کی روایتی ہندوستانی زبانوں پر عبور نے ہندوستان کو سمجھنے اور مقامی باشندوں کے ساتھ بات چیت کا موقع فراہم کیا۔ اس کا مقصد آکسفورڈ میں فارسی شعبہ بنانا تھا۔ جہاں ہندوستان آنے سے پہلے سرکاری ملازمین کو فارسی اور ہندوستانی سیکھنے کی ترغیب دی جاتی تھی۔ چونکہ کمپنی نے 1790 کے اواخر میں زبان کی تربیت کے معاملے پر سرکاری کارروائی کی، ہیسٹنگز نے فوری حل کے طور پر اپنے ارد گرد سرکاری ملازمین کا ایک گروپ اکٹھا کیا جو قانون اور فقہ سے متعلق ہندوستانی متن کے مطالعہ اور ترجمے کے لیے خود کو وقف کر سکیں۔ اس طرح کی سرگرمی کی حوصلہ افزائی کے لیے، ہیسٹنگز نے ترجمے کی مشقوں کے لیے پرکشش مالی مدد کی پیشکش کی۔ ان کی سرپرستی میں بنگالی پہلی سنسکرت پر مبنی مقامی زبان بن گئی جس کا انگریزوں نے منظم طریقے سے مطالعہ کیا۔ ہیسٹنگز کے قریبی ساتھی ناتھینیل ہالہڈ (Nathaniel Halhed) نے ہندو رسم و رواج اور مذہبی قوانین کا ایک مجموعہ مرتب کر کے اس کا انگریزی میں ترجمہ بھی کیا۔ 1788 میں اس نے بنگالی زبان کی گرامر شائع کی، جس سے بنگالی زبان پڑھنے اور لکھنے میں آسانی ہوئی۔ کمپنی کے دستاویزات کو ہندوستانی زبانوں میں دوبارہ اشاعت کرنے کی ہیسٹنگز کی کوششوں نے کلکتہ میں طباعت اور اشاعت کے پیشہ کو فروغ دیا۔ وارن ہیسٹنگ نے ایشیاٹک سوسائٹی (1784) کو قائم کرنے میں بھی اہم کردار ادا کیا جو ہندوستانیوں کی ابتدائی روایات کو 'دوبارہ دریافت' کرنے میں مدد فراہم کرتا تھا۔ کلکتہ مدرسہ (1781) کا قیام اس سمت میں ایک اور اہم پیشرفت تھی۔

ہیسٹنگز کی گورنر جنرل شپ کے دوران ثقافتی اور سماجی پالیسی برطانوی مستشرقین (Orientalists) کے نظریے سے متاثر تھی۔ یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ یہ نظریہ ہندوستان میں برطانوی سلطنت کے تقاضوں اور حدود سے بھی مطابقت رکھتا تھا۔ مقامی باشندوں کے سماجی رسم و رواج، آداب اور ضابطوں کے بارے میں علم ترقی کے لیے ضروری شرط تھی۔ ہندوستان میں حکمرانی کے مستقل ادارے، ہیسٹنگز کی ہندوستانیوں پر اپنے طریقے سے حکمرانی کرنے اور انگلائزیشن کے خلاف مزاحمت کرنے کی پالیسی مستشرقین کے تصورات اور سیاسی عملیت پسندی کے عناصر کے امتزاج کی عکاسی کرتی ہے۔ مغربی ساحل پر مالابار کے حالات کے بارے میں ابتدائی برطانوی سرکاری رپورٹوں میں مقامی سماجی طریقوں کو ہمدردی کے ساتھ دیکھنے کے رجحان پر گفتگو کی گئی ہے یہاں تک کہ جب وہ مغربی اصولوں سے مختلف ہوں۔ مثال کے طور پر اٹھارویں صدی کے آخر میں آنے والی رپورٹوں میں بغیر کسی حقارت کے ازدواجی زندگی بالخصوص نائر رواج کو بیان کیا گیا ہے۔ کمپنی کے عہدیداروں نے نائر خواتین کی چند شوہری کے بارے میں اطلاع دی اور اسے نیئر مردوں کے ازدواجی پیشے کے نتیجے کے طور

پر بیان کیا۔ بعد ازاں انیسویں صدی میں ازدواجی وراثت کو 'غیر فطری' کے طور پر دیکھا جانے لگا اور نیئر خواتین کی چند شوہری کو 'ریاض' اور 'غیر اخلاقی' قرار دیا گیا۔

1.3 نو آبادیاتی سماجی مداخلت میں تبدیلیاں (Changes in Colonial Social Intervention)

گورنر جنرل ہیسٹنگز کے دور کے اختتام کے بعد سے برطانوی حکومت کا رویہ اور پالیسیاں محتاط طریقہ سے لیکن آہستہ آہستہ ہندوستانی سماجی اداروں میں مداخلت کی سمت بڑھیں۔ مستشرقیت (Orientalism) جو ہیسٹنگز کے دور کی خصوصیت تھی اب مختلف نظریاتی دھاروں کی طرف سے تنقید کا نشانہ بننا شروع ہو گئی جس میں یہ عقیدہ مشترک تھا کہ ہندوستانی معاشرے کو فوری جدیدیت اور مغربیت کی ضرورت ہے۔ ولیم ولبرفورس اور چارلس گرانٹ (جو بعد میں کمپنی کے بورڈ آف کنٹرول کے صدر بنے) کی قیادت میں ایوینجلیکل چیلنج (Evangelical challenge) نے زور دے کر کہا کہ ہندومت توہم پرستی، بت پرستی اور پنڈتوں کے ظلم پر مبنی ہے۔ ان کا واضح مقصد عیسائی مشنری مذہب کے ذریعے ہندوستانیوں کو جدید بنانا تھے۔ جیرمی بینتھم، جیمز مل اور جان سٹوارٹ مل کی سربراہی میں، بنیادپرستوں (Radicals) نے اپنے نظریات کی بنیاد عقل اور سائنس پر رکھی۔ ان متضاد نظریات نے ہندوستان میں سماجی پالیسی کی تشکیل میں بنیادی کردار ادا کیا۔ وسیع پیمانے پر ناراضگی اور بغاوت بھڑکنے کا خدشہ عملی طور پر ہندوستان میں مغربی نظریات کو تھوپنے میں اہم رکاوٹ تھی۔ اب ہم سماجی رسم و رواج میں حکومتی مداخلت کی کچھ مخصوص مثالوں کے تفصیلی مطالعہ کی طرف رجوع کریں گے۔

ہندوستان میں برطانوی راج کی کچھ اہم سماجی و قانونی مداخلتیں ہیں:

1.3.1 نومولود بچوں کے قتل کرنے کی روایت اور اس کے خاتمہ کا قانون (The Infanticide Act–1802)

پہلی سماجی برائی جسے برطانوی حکومت نے ختم کیا تھا وہ نومولود بچوں کے قتل کا رواج تھا۔ بھارت کے بہت سے حصوں میں شیر خوار بچوں کا قتل عام تھا۔ بنارس کے راجپوتوں، جاٹوں، میواتیوں اور راجپوت راجکماروں میں لڑکیوں کی شادی میں آنے والی مشکلات اور اخراجات نے نومولود بچیوں کو بھوک یا زہر دے کر مارنے کے رواج کو جنم دیا۔ بنارس کا رہائشی جوناتھن ڈنکن (Jonathan Duncan) پہلا فرد تھا جس نے اس سماجی برائی کو روکنے کی کوشش کی۔ قانون سازی کے ذریعے یکطرفہ طور پر بچوں کے قتل کو ختم کرنے کے بجائے ڈنکن نے مقامی راج کماروں سے ملاقات کی اور انہیں اس بات پر قائل کیا کہ نوزائیدہ بچوں کا قتل ہندو صحیفوں کے اصولوں کے خلاف ہے۔ ڈنکن جانتا تھا کہ مروجہ سماجی نظام میں لڑکیاں اپنے خاندانوں کی معاشی ذمہ داری ہیں اور ان کو خاندان پر ایک معاشی بوجھ سمجھا جاتا تھا۔ تعلیمی اخراجات اور شادی کے اخراجات سے بچنے کا ایک آسان طریقہ ان کا پیدائش کے وقت قتل تھا۔ دوسرے اگر ان کی کسی وجہ سے شادی نہ ہونے پر خاندان کے لئے باعث بے عزتی سمجھا جاتا تھا۔ اس وجہ سے سبھی اعلیٰ طبقے میں ان کا قتل کر دیا جاتا تھا۔ ڈنکن نے اس عمل کو ترک کرنے پر حکومت کی طرف سے مالی معاوضے کا وعدہ کیا۔ اس نے اعلیٰ ذات کے لوگوں یا پھر جن قبائیلوں میں یہ رسم عام تھی، ان کو اس غیر انسانی رویہ سے بعض آنے کی ترغیب دی۔

ریورنڈ وارڈ نے اپنی کتاب *A View of the History, Literature and Religion of the Hindus* میں بنگال میں بچوں کے قتل کے رواج کی تفصیلی وضاحت کی ہے۔ ولیم کیری، ''فورٹ ولیم کالج'' کے ایک مشنری نے ان رسوم کو ختم کرنے سختی سے دلیل دی۔ گورنر جنرل کی کونسل کے ایک رکن جو سیرام پور مشنریوں سے ہمدردی رکھتے تھے، ان سماجی برائیوں کی نشاندہی لارڈ ویلزلی کو کرائی۔ کیری نے ہندو پنڈتوں سے مشورہ کرنے کے بعد ان طریقوں کو فوری طور پر ختم کرنے کے لیے حکومت کو ایک عرضی پیش کی۔ اسی دوران کلکتہ کے مجسٹریٹ نے کونسل کے نائب صدر کو ایک خط بھیجا جس میں کہا گیا تھا کہ مغلوں یا برطانوی حکومتوں میں بچوں کے قتل کی کبھی اجازت نہیں تھی۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ جب پولیس نے شیر خوار بچوں کے قتل کو روکا تو عوامی مخالفت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ عیسائی مشنری کی انتھک کوششوں کے بعد برطانوی حکومت بالآخر اس رسم کو ختم کرنے کے لئے قانون سازی کے لئے تیار ہو گئی۔ بالآخر 1802 میں ریگولیشن V1 کے ذریعہ بچوں کے قتل پر پابندی کا ایک قانون نافذ کیا گیا۔ بچوں کی ہلاکت کے خاتمے کے لئے جو بظاہر بنگال میں کارآمد ثابت ہوا، عوام کی طرف سے مخالفت کا کوئی خاص نتیجہ نہیں نکلا۔ غالباً بنگال میں اس کا محدود رواج اور مذہبی منظوری کی عدم موجودگی نے انگریزوں کو آسانی سے اسے ختم کرنے میں تعاون دیا۔ ہندوستان کے دیگر حصوں میں بچوں کے قتل پر پابندی موثر دکھائی نہیں دیتی، کیونکہ یہ رسم اس کی ممانعت کے بعد بھی جاری رہی۔ نوزائیدہ بچوں کے قتل کو ختم کرنے کے معاملے میں تبدیلی کی پہل مقامی سطح کے عہدیداروں اور مشنریوں کے ذریعہ آئی۔ گورنر جنرل نے ہندو پنڈتوں کے خیالات جاننے کے بعد ہی اپنی رضامندی دی کیونکہ اس طرح کے اقدام سے عوامی دشمنی کا امکان نہ ہونے کے برابر تھا۔

1.3.2 ستی کے خاتمہ کا قانون (The Sati Prohibition Act–1829)

ہندوستانی سماجی زندگی میں اگلی اہم سرکاری مداخلت بیوہ کو جلانا یا ستی کو ختم کرنے سے متعلق تھا۔ یہ رواج انیسویں صدی کے آغاز میں تینوں پریسیڈنسیز (Presidenceis) میں وسیع پیمانے پر پھیل گیا تھا اور رپورٹ ہونے والے واقعات کی بڑی تعداد بنگال کے اضلاع میں تھی۔ ستی کے واقعات بنگال کے مختلف اضلاع میں سرکاری اعداد و شمار کے مطابق مندرجہ ذیل تھے:

سیریل نمبر	علاقہ	واقعات کی تعداد
01	کلکتہ	3379
02	ڈھاکہ	408
03	مرشدآباد	198
04	پٹنہ	425
05	بنارس	875
06	بریلی	140
07	کل نمبر	5425

بیوہ جلانے کا رواج نہ صرف برہمن بلکہ دوسری ذاتوں میں بھی عام تھا۔تاہم کل آبادی کے تناسب سے ستی کے واقعات بہت محدود تھے۔مثال کے طور پر 1825 میں ہیضے کی وبا کے دوران جب 25,000 سے زیادہ لوگ مارے گئے تھے، بنگال کے باقرگنج ضلع میں بیواؤں کو جلانے کی کل تعداد صرف 63 تھی۔چونکہ ستی کی رسم حکومت کی نظر میں انسانیت سوز تصور پر مبنی تھا اس لئے اس کے خاتمہ کے لئے انہوں نے قانون سازی کا سہارا لیا۔1795 کے اوائل میں کولبروک (H.T. Colebrook) نے یہ بتانے کی کوشش کی کہ یہ عمل مستند ویدک روایت سے مطابقت نہیں رکھتا۔اگرچہ ہندوستان میں بہت قدیم زمانے سے ستی کا رواج رائج تھا، لیکن کئی ہندوستانی حکمرانوں بشمول اکبر، جہانگیر، گروامرداس، مراٹھا سردار اہلیا بائی، پیشواؤں، تنجور کے بادشاہ اور گوا میں پرتگالیوں نے اس رواج کی حوصلہ شکنی کی کوشش کی اور اپنی حکومت میں اس پر پابندی عائد کردی تھی۔

انیسویں صدی تک اس غیر انسانی عمل کو ختم کرنے کے لیے کوئی مستقل اور منظم کوشش نہیں کی گئی۔جب کہ بنگال میں دیگر یورپی کمپنیوں نے اپنے علاقوں میں بیوہ کو زندہ جلانے پر پابندی عائد کی تھی، کلکتہ سپریم کورٹ نے شہر کے صرف ایک حصے میں اس کی اجازت نہیں دی۔اس رواج کے بارے میں حکومت کا ابتدائی رویہ اس وقت دیکھا جاسکتا ہے جب 1789 میں، شاہ آباد کے کلکٹر بروک نے ستی کے فعل کی اجازت نہیں دی۔گورنر جنرل کارن والس (Governor-General Cornwallis) کے معاملے کا حوالہ دیتے ہوئے، اس نے نوٹ کیا کہ "ہندو مذہب کی رسومات اور توہمات کو انتہائی غیر موزوں رواداری کے ساتھ اجازت دی جانی چاہیے، لیکن ایک ایسا عمل جس کی انسانی فطرت کو کسی خاص ہدایت کے بغیر اجازت نہیں دی جاسکتی" کارن والس نے اسے ملازمت نہ دینے کے لیے کہا۔ستی کی رسم کو زور زبردستی سے انجام دینے یا بیوہ کو مجبور کرنے پر لوگوں کو بیدار کرنے کی ضرورت تھی۔1797 میں مدنا پور ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے ایک بیوہ کو جلانے سے روکا تھا گورنر جنرل نے زبردستی سے بچنے اور قائل کرنے کے لیے کہا۔

ولیم کیری (William Carey) کی قیادت میں، سیرامپور مشنریوں نے کلکتہ کے آس پاس کے علاقوں میں بیواؤں کو جلانے پر ایک سروے کیا۔کیری نے فورٹ ولیم کالج سے پنڈتوں کو ملا کر ستی کے بارے میں معلومات پر مشتمل ہندو شاستروں کو اکٹھا کیا۔ان کا مطالعہ کرنے کے بعد اس نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ ہندو مذہب نے جہاں اسے منع نہیں کیا، وہیں اسے واجب بھی نہیں بنایا۔اس کے بعد کیری نے لارڈ ویلزلی کو ستی پر روک لگانے کے لیے ایک اپیل بھیجی۔1805 میں ویلزلی نے نظام عدالت کے ججوں سے کہا کہ وہ یہ معلوم کریں کہ ہندو مذہب میں ستی کا رواج کس حد تک ہے۔عدالت میں پنڈتوں نے اقرار کیا کہ شاستروں میں بیواؤں کو زبردستی جلانے کی اجازت نہیں ہے۔عدالت نے یہ بھی نوٹ کیا کہ ہندوؤں میں ستی کا رواج کافی مقبول ہے، اس کو ختم کرنے کا کوئی بھی قدم ان کے لئے باعث رنج و غم ہوگا اور غیر اطمینان بخش ہوگا۔

1813 میں حکومت نے بیوہ کے لیے کم از کم عمر مقرر کی۔اور اعلان کیا کہ تین سال سے کم بچے کی ماں اس وقت تک ستی نہیں ہو سکتی جب تک کہ کوئی دوسرا شخص بچے کی دیکھ بھال نہ کرے۔1819 اور 1821 میں سپریم کورٹ کے دو ججوں نے ستی کو فوری طور پر روکنے

کی استدعا کرتے ہوئے کہا کہ اس طرح کے اقدام سے عوام میں شدید ناراضگی پیدا نہیں ہوگی۔اس درخواست کو حکومت نے مسترد کر دیا تھا۔ 1821 میں لارڈ ہیسٹنگز (Lord Hastings) نے ستی کے مکمل خاتمے کی اجازت دینے سے اس خوف سے انکار کر دیا کہ اس سے مذہبی جنونیت کو ہوا ملے گی۔ہیسٹنگ کا جانشین لارڈ ایمہرسٹ (Lord Amherst) ستی کی ممانعت کے خلاف تھا کیونکہ اسے خدشہ تھا کہ اس طرح کے اقدام سے فوری طور پر فوج کے سپاہیوں پر منفی اثرات مرتب ہوں گے۔ بمبئی حکومت اور دہلی میں چارلس میٹکاف بھی اس رواج کو فوری طور پر ختم کرنے کے حق میں نہیں تھے۔

رام موہن رائے کی قیادت میں مغربی بنگالی دانشوروں نے ستی کے خاتمے کے لیے سرگرم احتجاج کیا۔ 1818 میں انہوں نے حکومت کو ایک درخواست بھیجی جس میں اس رواج کو ختم کرنے کی پُرزور اپیل تھی اور ستی کے خاتمے کے خلاف کٹر ہندو مطالبات کا مقابلہ کریں۔ ستی کے رواج پر عمر کی پابندی کو سختی سے لاگو کرنے کے لیے ایک ویجیلنس کمیٹی کا قیام عمل میں لایا گیا۔رام موہن نے ستی کے حامیوں جیسے کاسی ناتھ ترکاواگیش (1819) کے ساتھ ایک سیاسی بحث میں حصہ لیا،اس رواج کے خلاف رائے عامہ کو متحرک کرنے کے لیے رسالہ اور اخباری مضامین لکھے۔انہوں نے اپنی مہم کو آگے بڑھانے کے لیے اپنے جریدے سمبد کاموذی اور مراۃ الاخبار کا استعمال کیا۔اس میں انہوں نے ستی کو ختم کرنے اور لوگوں کو بیدار کرنے کے لئے مضامین لکھے۔ عورتوں کی جماعت نے بھی ستی مخالف خطوط لکھے۔اس طرح راجہ رام موہن رائے نے بنگال میں ستی کے خاتمہ کے لئے ایک مثبت فضا قائم کی، جس میں 'سماچار درپن' اور 'بنگدت' جیسے اخبارات نے ان کی حمایت کی۔ جبکہ دوسری طرف 'سماچار چندریکا' ان کے راسخ العقیدہ ہندو مخالفین کا آلہ کار بن گیا۔

اسی دوران عیسائی مشنریوں نے انگریزوں کی توجہ برطانیہ میں ستی کی برائیوں اور حکومت کی طرف سے اس کے خاتمہ کی فوری ضرورت کی طرف مبذول کرائی۔ پارلیمنٹ نے ہندوستانی حکومت کو ستی کے بارے میں تمام دستیاب معلومات شائع کرنے کی ہدایت کی۔ہندوستان اور برطانیہ میں اس کے خاتمے کے بڑھتے ہوئے مطالبے کے باوجود، اور انگلینڈ میں کمپنی کے حکام خود کوئی فیصلہ نہیں کرنا چاہتے تھے، کیونکہ وہ نہیں جانتے تھے کہ ہندوستان میں اس کا کیا ردعمل سامنے آئے گا۔آخر کار یہ گورنر جنرل ولیم بینٹنک (Sir William Bentinck) پر چھوڑ دیا گیا کہ وہ دسمبر 1829 میں بیوہ کو جلانے کے خلاف قانون سازی کرے۔

انگریزوں نے، راجہ رام موہن رائے جیسے سماجی مصلحین کی کوششوں سے، 1829 میں 'بنگال ستی ریگولیشن (ضابطہ XVII)' پاس کیا، جس کا مقصد ستی کے رواج پر پابندی لگانا تھا، جہاں بیواؤں سے اپنے شوہر کی چتا پر خود سوزی کرنے کی توقع کی جاتی تھی۔ حکومت کی طرف سے بیوہ جلانے کے خاتمے کے نتیجے میں ہندوستانیوں میں کوئی واضح عدم اطمینان یا ناراضگی نہیں ہوئی۔ بچوں کے قتل کے معاملے کی طرح، بیوہ کو جلانے پر پابندی کا اقدام بنیادی طور پر مغربی تعلیم یافتہ ہندوستانی دانشوروں، عیسائی مشنریوں اور انفرادی منتظمین کی طرف سے آیا۔ کمپنی کی حکومت کی طرف سے اسے ختم کرنے میں نمایاں تاخیر بنیادی طور پر ہندوستانی پر تشدد ردعمل کو بھڑکانے کے انتہائی خوف کی وجہ سے تھی۔

1.3.3 ٹھگی اور ڈاکہ زنی کو ختم کرنے کا قانون

(Thuggee, and Dacoity Suppression Acts, 1836–48)

1836 اور 1848 کے درمیانی عرصے میں، ایسٹ انڈیا کمپنی نے، برطانوی ہندوستان پر حکمرانی کرتے ہوئے، قانون سازی کے ایک سلسلے کو منظور کیا جسے ٹھگی اور ڈاکہ زنی روکنے کا قانون کہا جاتا ہے۔ ان کارروائیوں کا مقصد ٹھگی اور ڈکیتی کے بڑھتے واقعات کو ختم کرنا تھا جو شمالی اور وسطی ہندوستان میں پھیلے ہوئے تھے۔ ٹھگی ایک وحشیانہ عمل تھا جس میں رسمی قتل، مسخ اور لوٹ مار شامل تھی، جو انہی علاقوں میں پھیلی ہوئی تھی جو عوام کے لئے بہت بڑی مصیبت بنتی جارہی تھی۔

ولیم بینٹنک نے 1835ء میں ٹھگی اور ڈکیتی ڈپارٹمنٹ بنایا اور ولیم ہنری سیلمین کو اس کا سپرنٹنڈنٹ بنایا گیا۔ 1830 کی دہائی کے دوران ٹھگوں کو ہندوستان کے گورنر جنرل، ولیم بینٹنک اور ان کے چیف کپتان، ولیم ہنری سیلمین نے ختم کرنے کے لیے مصمم ارادہ کرلیا۔ ٹھگی اور ڈکیتی کو ختم کرنے کا قدم سرکاری ملازم ولیم ہنری سیلمین کی کوششوں کی وجہ سے تھا، جس نے ''فرنگیہ'' جسے سید امیر علی بھی کہا جاتا تھا' کو پکڑا۔ سیلمین کی قیادت میں سخت کارروائیوں کے نتیجے میں 1400 ٹھگ پکڑے گئے جنھیں حکومت نے پھانسی دی یا عمر قید کی سزا سنائی۔ ٹھگوں کے لیے جبل پور میں ایک خصوصی جیل تھی۔

اس قانون سازی کی منظوری کے ساتھ برطانوی حکام نے اپنے زیر کنٹرول علاقوں میں ٹھگیوں اور ڈاکوؤں کے خلاف منظم طریقے سے کریک ڈاؤن شروع کردیا۔ حکام کے ہاتھوں پکڑے جانے والے ارکان عدالتوں سے نرم سزا پانے کے لیے مخبر بن گئے۔ یہ مخبر ٹھگوں کی تلاش میں اہم آلہ کار ثابت ہوئے۔ خفیہ ٹھکانے اور ان کے اسلحہ جات ختم کردیئے گئے اور زندہ بچ جانے والوں پر مقدمہ چلایا گیا اور ان کے جرائم کی شدت کے لحاظ سے سزائے موت یا پھر عمر قید سے لے کر پھانسی تک کی سزا دی گئی۔ 1870 کی دہائی تک ٹھگ فرقہ بنیادی طور پر ختم ہوچکا تھا، لیکن ٹھگی کی تاریخ نے 1871 کے کریمنل ٹرائبس ایکٹ (Criminal Tribes Act) کو جنم دیا۔ ٹھگی اور ڈکیتی ڈپارٹمنٹ 1904 تک موجود رہا جب اس کی جگہ سینٹرل کریمنل انٹیلی جنس ڈیپارٹمنٹ (Central Criminal Intelligence Department) نے لے لی۔

1.3.4 غلامی کے خاتمہ کا قانون (The Slavery Act–1843)

غلامی ایک اور ادارہ تھا جس کے خلاف برطانوی حکومت نے جارحانہ قدم اٹھایا اور اس کو ختم کرنے کے لئے قانون بنایا۔ مزدوروں کے استحصال کے نظام کے طور پر غلامی ہندوستان میں 1843 تک رائج تھی۔ تاہم معاشی لحاظ سے غلام مزدور معاشی اہمیت خطے کے لحاظ سے بہت مختلف تھی۔ بمبئی اور کلکتہ میں غلاموں کے تجارت کا ایک مرکز تھا۔ عرب تاجر' عرب اور افریقہ سے غلاموں کو فروخت کرنے کے لیے لاتے تھے۔ غلاموں کے خرید و فروخت کو بڑھاوا دینے میں قحط بھی ذمہ دار تھا۔ قحط سے بچنے کے لئے اکثر غریبوں کی ایک بڑی تعداد نے خود کو غلاموں کی منڈی میں خرید و فروخت کے لئے پیش کیا۔ مدراس میں دیگر دو پریسیڈنسیز (Presidenceis) کے برعکس غلامی بہت زیادہ

رائج تھی۔ غلامی کی یہ شکل خطے کی زرعی پیداوار میں بہت اہم کردار ادا کررہی تھی۔ مالا بار، کورگ اور کینرا وہ اہم علاقے تھے جہاں بڑے پیمانے پر غلامی موجود تھی۔

غلامی کے خاتمے کے بارے میں حکومت ہند کا رویہ بہت مثبت نہیں تھا۔ ابتداء میں برطانوی حکومت نے غلامی کو ختم کرنے میں بہت دلچسپی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ 1774 کے اوائل میں حکومت نے اس کے بارے میں فکر مندی کا اظہار کیا۔ ولبرفورس (Wilberforce) کی قیادت میں غلامی کے خلاف ایونجلیکل پروپیگنڈے نے برطانیہ میں عوام کی توجہ ہندوستان میں غلامی کی برائیوں پر مرکوز کرنے میں مدد کی۔ اگرچہ برطانیہ نے 1820 میں اپنے تسلط میں غلاموں کی تجارت کو ختم کر دیا، بھارت میں کمپنی نے غلامی کی قانونی حیثیت کو اس بنیاد پر تسلیم کیا کہ یہ مذہبی منظوری کے ساتھ ایک روایتی عمل تھا۔ 1833 کے چارٹر ایکٹ نے ہندوستانی حکومت کو ہدایت کی کہ وہ غلاموں کی حالت کو بہتر بنائے۔ اس کے نتیجے میں 1835 کے ہندوستانی لاء کمیشن کی تقرری ہوئی۔ اگرچہ اس کا بنیادی کام تعزیرات کو وضع کرنا تھا، قانون کمیشن نے 1841 میں غلامی کے خلاف ایک رپورٹ بھی تیار کی۔

1839ء میں لاء کمیشن نے ایک مسودہ ایکٹ پیش کیا جس کے تحت غلاموں کو جسمانی سزا دینا ایک تعزیری جرم قرار دیا گیا۔ ڈرافٹ ایکٹ پر کوئی کارروائی کرنے سے پہلے کمشنروں نے اس طرح کے اقدام سے عوام میں عدم اطمینان پیدا کرنے کے امکان پر تبادلہ خیال کیا۔ 1811 ضابطہ X (زمینی راستے سے غلاموں کی درآمد پر پابندی)، 1833 ضابطہ IV (غلاموں کی بین الصوبائی نقل و حرکت پر پابندی) اور دہلی میں غلامی کے عملی خاتمے کا جائزہ لیا گیا اور دیکھا گیا کہ اس کا کوئی مخالف اثر نہیں ہوا۔ کمیشن کے کئی ارکان اس ایکٹ کی فوری منظوری کے خلاف تھے اور اس معاملے پر بمبئی اور مدراس حکومتوں کے خیالات جاننے کے لیے خطوط بھیجے گئے تھے۔ بمبئی حکومت نے کسی خاص قانون کی ضرورت محسوس نہیں کی اور مدراس انتظامیہ نے بھی ایسے قانون کی ضرورت پر شک کا اظہار کیا۔ پارلیمانی رائے کے دباؤ کے تحت، لاء کمیشن کو دوبارہ ایک نیا ایکٹ بنانے کے لیے کہا گیا جو ہندوستانی حکومت کی طرف سے کافی تاخیر کے بعد ہندوستان میں غلامی کے خاتمے کے لیے 1843 کے ایکٹ (ضابطہ V) کے طور پر منظور ہوا۔ تاہم غلامی کو ختم کرنے والے قانون کا اثر بہت محدود تھا۔ ایکٹ میں سب سے اہم شق صرف یہ بتاتی ہے کہ برطانوی عدالت میں غلام کی محنت کا کوئی دعویٰ تسلیم نہیں کیا جائے گا اور یہ کہ کوئی سرکاری اہلکار اب غلام کو اپنے آقا کے پاس واپس جانے پر مجبور نہیں کر سکتا۔ غلامی کے زوال کا سب سے اہم عنصر انیسویں صدی کے آخر میں شجر کاری اور عوامی کاموں میں متبادل روزگار کے ذرائع کا پیدا ہونا تھا۔

1.3.5 مذہبی رکاوٹ کے خاتمہ کا قانون (The Religious Disabilities Removal Act–1850)

ذات سے متعلق قانونی رکاوٹ ہٹانے کا قانون 1850 میں برطانوی حکومت نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے دور میں منظور کیا۔ یہ ایک امتیازی قانون تھا۔ اس قانون نے دوسرے مذہب یا ذات میں قبول کرنے والے لوگوں کے حقوق کو متاثر کرنے والے تمام قوانین کو ختم کر دیا۔ نئے قانون نے ہندو مذہب سے دوسرا مذہب قبول کرنے والے کو نئے قانون کے تحت مساوی حقوق کی اجازت دی، خاص طور پر وراثت

کے معاملے میں اس ایکٹ نے ہندو جائیداد قانون (Property Law) کو بدل دیا۔اس ایکٹ کی وجہ سے سیاسی صورتحال بہت زیادہ متاثر ہوئی کیونکہ اسے اپنے عقیدے کو ترک کرنے کی ترغیب کے طور پر دیکھا جاتا تھا۔

1.3.6 ہندو بیواؤں کے عقد ثانی کا قانون (The Hindu Widows' Remarriage Act–1856)

ہندوستان کے کچھ حصوں میں مروجہ رسم ورواج کے مطابق، بیواؤں، خاص طور پر اونچی ذات کی ہندو بیواؤں سے توقع کی جاتی تھی کہ وہ کفایت شعاری اور انتہا پسندی کی زندگی گزاریں، جیسے کہ میک اپ نہیں، نئے کپڑے نہیں، اچھا کھانا نہیں، جسے خاندانی عزت سمجھا جاتا تھا۔بیوہ کو پورے خاندان کے لیے بدقسمت شخص سمجھا جاتا تھا۔بیوہ کا دوبارہ نکاح جائز نہیں تھا خواہ وہ بچہ ہی کیوں نہ ہو اور نکاح بھی مکمل نہ ہوا ہو۔بیواؤں کو سفید ساڑھی پہننی پڑتی تھی۔ بہت سے معاملات میں اسے اپنے بال منڈوانے پڑتے اور کسی گھریلو تقریب میں شامل ہونے کی اجازت نہیں تھی۔ان کا تہواروں سے بائیکاٹ کیا جاتا تھا اور یہاں تک کہ خاندان اور معاشرے کے افراد ان سے دور رہتے تھے۔

ہندو بیواؤں کے عقد ثانی کا قانون (ضابطہ XV) 1856ء پاس کرکے ہندو بیوہ کی دوبارہ شادی کو قانونی قرار دیا گیا تھا۔ایشور چندر ودیاساگر نے ہندو صحیفوں کا حوالہ دے کر اسے قانونی شکل دینے میں نمایاں کردار ادا کیا۔یہ ایکٹ لارڈ ڈلہوزی نے تیار کیا تھا اور لارڈ کیننگ نے 26 جولائی 1856 کو اٹھارہ سو ستاون کی بغاوت سے پہلے منظور کیا تھا۔اسے لارڈ ولیم بینٹنک کے ذریعہ 1829 میں ستی کے خاتمے کے بعد سب سے بڑی سماجی اصلاح کے طور پر جانا جاتا ہے۔

ہندو بیواؤں کے عقد ثانی کا قانون 1856ء نے دوبارہ شادی کرنے کا انتخاب کرنے والی ہندو بیواؤں کے لیے کچھ قسم کی وراثت سے محروم ہونے کے خلاف قانونی تحفظات قائم کیے ہیں۔تاہم ایکٹ کے تحت بیوہ سے ضروری ہے کہ وہ اپنے مرحوم شوہر سے ملنے والی کسی بھی وراثت کو چھوڑ دے۔اس اقدام سے خاص طور پر ان بچوں کی بیواؤں کی مدد کی گئی جن کے شریک حیات شادی سے پہلے ہی انتقال کر گئے تھے۔ایکٹ کے مطابق بیوہ کوئی بھی وراثت رکھ سکتی تھی جو اس نے اپنے فوت شدہ شوہر سے حاصل کی ہو۔یہ ایکٹ انیسویں صدی کے دوران ہندوستانی معاشرے کی سماجی اصلاح میں ایک اہم باب تھا۔اس ایکٹ نے بیواؤں سے شادی کرنے والے مردوں کو قانونی تحفظات فراہم کیا۔اس ایکٹ نے ان تمام لڑکیوں کو حقوق اور وراثت فراہم کی جو ان کی پہلی شادی کے وقت انہیں حاصل تھیں۔

ہندو بیواؤں کے عقد ثانی کا قانون، 1856ء کے نفاذ کے بعد؛ پہلی شادی 7 دسمبر 1856 کو شمالی کلکتہ میں ہوئی۔دولہا ایشور چندر کے قریبی دوست کا بیٹا تھا۔ چنانچہ ہندو بیواؤں کی دوبارہ شادی ایکٹ 1856 کا نفاذ ہندوستان میں انیسویں صدی میں ہونے والی بڑی سماجی تبدیلیوں میں سے ایک تھا۔تب سے لے کر اب تک ملک میں خواتین کی سالمیت اور شائستگی کے تحفظ کے لیے ایسے بہت سے قوانین بنائے گئے ہیں۔بیواؤں کی دوبارہ شادی کے جس قدر حامی تھے اُسی قدر اس کے مخالفین تھے۔وہ لوگ اس کو ہندو مذہب میں مداخلت سے تعبیر کرتے تھے۔وشنو پنڈت نے ستری بیواؤں کے دوبارہ شادی کی حوصلہ افزائی کرنے کے لئے ایک سوسائٹی قائم کی۔ مخالفین نے بھی اس کی مخالفت کے لئے ایک سوسائٹی قائم کی۔مہاراشٹرا میں پنڈتا رامائی نے بیواؤں کی زندگی بہتر بنانے کے لئے کئی عملی اقدام اٹھائے جو قابل ستائش ہیں۔

1.3.7 عمر رضامندی کا قانون (The Age of Consent Act-1891)

عمر رضامندی کا ایکٹ ایک بل کے طور پر سر اینڈریو سکوبل نے 9 جنوری 1891 کو پیش کیا تھا۔اس کی حمایت گورنر جنرل لانس ڈاؤن نے کی۔بی۔ایم۔مالا باری کی کوششوں سے عمر رضامندی کا ایکٹ 1891ء منظور کیا گیا، جس میں 12 سال سے کم عمر کی لڑکیوں کی شادی پر پابندی تھی۔اصل میں 1891ء میں عصمت دری کے نتیجے میں دو نوجوان لڑکیوں رخما بائی اور پھولمونی داسی (Rukhmabai and, Phulmoni Dasi) کی دردناک موت ہو گئی تھی۔

عمر رضامندی کا ایکٹ برطانوی ہند میں 19 مارچ 1891 کو نافذ کیا گیا ایک قانون تھا جس نے شادی شدہ یا غیر شادی شدہ تمام لڑکیوں کے لیے جنسی تعلقات کے لیے رضامندی کی عمر کا دائرہ اختیار دس سے بارہ سال تک بڑھا دیا،اس کی خلاف ورزی مجرمانہ تھی۔اس کی خلاف ورزی عصمت دری کے طور پر مجرمانہ قانونی چارہ جوئی سے مشروط تھی۔

1.3.8 شاردا ایکٹ (The Sarda Act–1929)

عمر رضامندی سے متعلق سوالات کو حل کرنے والے مختلف بل ہندوستانی مقننہ میں پیش کیے گئے جو شکست سے دوچار ہوئی۔آل انڈیا ویمنز کانفرنس، ویمنز انڈین ایسوسی ایشن اور نیشنل کونسل آف ویمن ان انڈیا نے اپنے اراکین کے ذریعے جوشی کمیٹی کے سامنے شادی اور رضامندی کے لیے عمر بڑھانے کے حق میں دلیل پیش کی۔ مسلم خواتین نے شادی کی عمر کی حد بڑھانے کے حق میں جوشی کمیٹی کے سامنے اپنے خیالات پیش کیے حالانکہ انہیں معلوم تھا کہ انہیں مسلم علماء کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑے گا۔جوشی کمیٹی نے 20 جون 1929 کو اپنی رپورٹ پیش کی اور اسے 28 ستمبر 1929 کو امپیریل لیجسلیٹو کونسل (Imperial Legislative Council) نے منظور کیا اور لارڈ ارون (Lord Irwin) کی منظوری کے بعد 1 اپریل 1930 کو ایک قانون بن گیا جس کا دائرہ پورے برطانوی ہندوستان تک پھیلا ہوا تھا۔ہندوستان میں کم عمری کی شادی کے عام رواج کو غیر قانونی قرار دینے کے لیے، راؤ صاحب ہری بلاس شاردا نے 1928-1929 کے دوران حکومت ہند کی قانون ساز اسمبلی میں شاردا بل پیش کیا۔28 ستمبر 1929 کو لارڈ ارون کی نائب حکومت کے دوران، ہندوستان کی امپیریل لیجسلیٹو کونسل نے شاردا ایکٹ، 1929(Child Marriage Restraint Act–1929) منظور کیا۔اس ایکٹ کا نام آریہ سماج کے رکن ہربلاس شاردا کے نام پر رکھا گیا ہے۔

ہندوستانی سماجی مصلحین کے دباؤ کے جواب میں برطانوی حکومت نے چائلڈ میرج ریسٹرینٹ ایکٹ منظور کیا، جسے شاردا ایکٹ کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ یہ ایکٹ، جس نے لڑکیوں اور لڑکوں کی بالترتیب 14 اور 18 سال کی عمریں شادی کے لئے مقرر کی تھیں، ستمبر 1929 میں منظور کیا گیا اور یکم اپریل 1930 کو نافذ ہوا۔جب کہ اصلاح پسندوں نے اس کا خیر مقدم کیا اور تعلیمی لحاظ سے بہت زیادہ لڑکیوں کو مواقع اور ان کی صحت میں بہتری کی توقع کی۔ اس ایکٹ کے نافذ ہونے کی خبر نے قدامت پسند طبقوں کے دلوں میں گہری دہشت پیدا کردی۔ کیونکہ ان کا "مذہب خطرے میں تھا"، انہوں نے پریس میں اس کی شدید مخالفت کی۔ آندھرا میں، ابھینوا سرسوتی اور سودھرما

پرکاشینی جیسے جرائد نے سماجی مصلحین، شاردا ایکٹ کے ذمہ دار قانون ساز، انڈین نیشنل کانگریس اور اس کے لیڈروں، خاص طور پر مہاتما گاندھی، اور برطانوی حکومت پر دھرم یودھم کا اعلان کیا۔

ایکٹ کا بنیادی مقصد نابالغ بچوں کی شادیوں کو روکنا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ اس خاص برائی کو ختم کیا جائے جس میں ایک لڑکی کے بچے کی زندگی اور صحت کے لیے خطرات لاحق ہوتے ہیں، جو شادی شدہ زندگی کے تناؤ کو برداشت نہیں کر سکتے تھے اور ایسی نابالغ ماؤں کو قبل از وقت موت سے بچانا تھا۔ ایکٹ کا مقصد کم عمری میں ان کی شادی پر پابندی لگا کر بچوں کے حقوق اور بہبود کا تحفظ کرنا ہے۔ ایکٹ بچوں کی شادی کی حوصلہ شکنی کرکے بچوں کی تعلیم کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ یہ تسلیم کرتا ہے کہ کم عمری کی شادیاں اکثر بچوں خصوصاً لڑکیوں کے تعلیمی مواقع میں رکاوٹ بنتی ہیں۔ یہ ایکٹ ان لوگوں کے لیے قانونی نتائج مرتب کرتا ہے جو بچوں کی شادیوں کا اہتمام کرتے ہیں یا اس میں حصہ لیتے ہیں۔ اس کا مقصد جرمانے اور سزائیں لگا کر اس طرح کے طرز عمل کو روکنا ہے۔

بچپن کی شادی کرنے کی سزا، جو کوئی بھی بچپن کی شادی کرتا ہے، کرواتا ہے یا اس کی ہدایت کرتا ہے اسے سزا دی جاسکتی ہے۔ اگر کوئی نابالغ بچپن کی شادی میں داخل ہوتا ہے تو، نابالغ کے لیے ذمہ دار کوئی بھی فرد، چاہے والدین، سرپرست، یا کسی اور حیثیت میں، تین ماہ تک کی سادہ قید اور جرمانہ ادا کرنے کے لیے ذمہ دار ہو سکتا ہے۔ واضح رہے کہ کسی بھی خاتون کو قید کی سزا نہیں دی جاسکتی۔ چائلڈ میرج ریسٹرینٹ ایکٹ پہلا سماجی اصلاحی مسئلہ تھا جسے ہندوستان میں خواتین کے ایک منظم گروپ نے اٹھایا تھا۔ اس گروپ نے بہت سے سیاست دانوں پر دباؤ ڈالا کہ وہ اپنے وفود کو لے کر، پلے کارڈز اٹھا کر، اور نعرے لگا کر ایکٹ کی حمایت کریں۔ ان کا خیال تھا کہ اس ایکٹ کے پاس ہونے سے دنیا کو دکھایا جائے گا کہ ہندوستان سماجی اصلاحات کے لیے سنجیدہ ہے۔ اس ایکٹ کی حمایت کرتے ہوئے ہندوستان میں خواتین قدیم شاستروں کے دوہرے معیار کو چیلنج کر رہی تھیں۔ یہ اعلان کرتے ہوئے کہ وہ مردانہ اثر و رسوخ سے پاک اپنے قوانین بنانا شروع کر دیں گی۔

1.4 برطانوی پالیسی اور ہندوستانی رد عمل: ایک تشخیص

(British Policy and Indian Response: An Assessment)

مذکورہ بالا بحث ہندوستانی روایات اور ثقافت کے تئیں برطانوی رویہ میں نمایاں تبدیلیوں کی نشاندہی کرتی ہے۔ ہندوستانی کالونی کے بدلتے ہوئے خدمت گزار کردار اور ہندوستانی حکومت کے عملی سیاسی تحفظات نے ایسا سیاق و سباق پیدا کیا جس نے ہندوستان میں ریاستی پالیسیوں کی سمت کا تعین کیا۔ ہندوستان کے سماجی طریقوں اور رسوم و رواج میں ریاستی مداخلت کی شعوری کوششیں اپنے اثرات میں انتہائی محدود تھیں۔ تاہم، نوآبادیاتی حکومت نے قبل از نوآبادیاتی ہندوستان کی سیاسی ترتیب کو تبدیل کرکے اہم سماجی تبدیلیوں کو جنم دیا۔ انگریزوں نے شعوری طور پر قبل از نوآبادیاتی حکمران ہندوستانی گروہوں کو ان کی سماجی اور ذات پات کی حیثیت کو تسلیم کرتے ہوئے سیاسی طاقت اور مراعات سے انکار کیا۔

تعلیم بھی سماجی تبدیلیوں کا ایک اہم ذریعہ تھی، جو شاید قانون سازی سے زیادہ موثر ہے۔ مغربی تعلیم یافتہ بنگالی دانشوروں نے ریاست کے ساتھ پالیسی معاملات پر مباحثوں میں شامل ہوئے، پالیسی کی تبدیلیوں کا جواب دیا اور آزادانہ طور پر بنگال میں سماجی تبدیلیاں لانے کی کوشش کی۔ دانشوروں کے یہ گروہ جن میں رام موہن رائے اور کیشوب چندر سین جیسی شخصیات شامل تھیں، برطانیہ کی ترقی سے متاثر ہوئے اور اس بات پر قائل ہوئے کہ ہندوستانی معاشرے کو فوری سماجی تبدیلی کی ضرورت ہے۔ ایک ہی وقت میں مزاحمتی انگلائزیشن کے ساتھ ساتھ عیسائی مشنریوں نے ہندوستانیوں کو تبدیل کرنے کی کوشش کی۔

رام موہن رائے جیسے دانشوروں نے اپنے ہم وطنوں کو ایک اصلاح شدہ توہم پرستی سے پاک ہندوستانی مذہب دیا۔ برہمو سماج ان کی تنظیم تھی۔ انہوں نے ترقی پسند مغربی اقدار کو اپنانے کے ساتھ ہندو اصلاح کو جوڑا۔ بد قسمتی سے برہمو اور بنگال کے اصلاح پسند گروپ اپنی مہم کو محدود مغربی تعلیم یافتہ 'شہری بنگالی آبادی سے آگے نہیں بڑھا سکے۔ سماجی اصلاحات کا پیغام آہستہ آہستہ ہندوستان کے بہت سے حصوں میں پھیل گیا اور حکومتی حمایت سے آزاد ہندوستانی پہل کے تحت اصلاحات کی تحریک کو جنم دیا۔

اس لیے اس بات کا اعادہ کیا جا سکتا ہے کہ برطانوی ہندوستانی حکومت نے ہندوستان میں اصلاح پسندانہ خیالات کو فروغ دیا۔ سماجی اور مذہبی ادارہ ایک ایسا شعبہ تھا جس میں حکومت نے بڑی احتیاط کے ساتھ مداخلت کی۔ یہاں تک کہ سماجی معاملات میں ریاست کی محدود مداخلت کی پالیسی، جس کا اوپر سروے کیا گیا ہے، 1857 کی بغاوت کے بعد کے عرصے میں مکمل طور پر جمود کا شکار ہوئی۔ اس کے بعد سے سماجی اصلاح کو بنیادی طور پر مقامی پہل پر چھوڑ دیا گیا کیونکہ انگریزوں کا ماننا تھا کہ بغاوت کے اہم وجوہات میں مذہبی اور سماجی امور میں بے جا مداخلت اور قانون سازی تھی۔ اس لئے غدر کے بعد انہوں نے اس قسم کے اصلاحی اقدام سے گریز کیا۔

1.5 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

اس اکائی کو پڑھنے کے بعد قاری ان مختلف نظریاتی اور مادی عوامل کو سمجھ سکیں گے۔ جنہوں نے ہندوستان میں برطانوی سماجی پالیسی کی سمت فراہم کی۔ حکومت ہند نے انفرادی منتظمین، مشنریوں اور ہندوستانی سماجی مصلحین کے دباؤ میں ہندوستانی سماجی طریقوں میں محتاط مداخلت کی۔ تاہم، ان پالیسیوں کا اثر (ماسوائے تعلیم کے میدان میں) انتہائی محدود تھا اور اس نے کوئی قابل ذکر ہندوستانی رد عمل کو مشتعل نہیں کیا۔ 1857 کے بعد سماجی تبدیلیوں کی ان محدود کوششوں کو نو آبادیاتی حکومت نے شعوری طور پر ترک کر دیا تھا۔ یہ نوٹ کرنا ضروری ہے کہ ان میں سے بہت ساری مداخلت برطانوی نو آبادیاتی مفادات، سماجی استحکام کو برقرار رکھنے کی ضرورت، اور برطانوی انتظامیہ کے ساتھ کام کرنے والے ہندوستانی سماجی اصلاح کاروں کے اثر ورسوخ کے امتزاج سے چلائی گئیں۔ ان مداخلتوں نے ہندوستانی معاشرے پر پیچیدہ اور بعض اوقات متضاد اثرات مرتب کیے۔ مزید برآں ان میں سے بہت سی پالیسیوں اور قوانین کو ہندوستانی سماج کے مختلف طبقوں کی طرف سے مزاحمت اور تنقید کا سامنا کرنا پڑا، جس نے ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد کے وسیع تر تناظر میں اپنا اثر ڈالا۔

1.6 کلیدی الفاظ (Key words)

برصغیر پاک وہند : جنوبی ایشیا کا ایک خطہ ہے، جو جغرافیائی طور پر، بنگلہ دیش، بھوٹان، بھارت، مالدیپ، نیپال، پاکستان، اور سری لنکا کے ممالک کے بڑے زمینی علاقوں پر پھیلا ہوا ہے۔

نو آبادیاتی : طاقتور ملک کا کمزور ملک پر تسلط۔

ایشیاٹک سوسائٹی : اسکی بنیاد ایشیا کی تاریخ، نوادرات، قوانین، فنون، علوم اور ادب کی تحقیق کے لیے رکھی گئی تھی۔

کلکتہ مدرسہ : اس کا قیام عربی، فارسی اور اسلامی قانون کے مطالعہ کو فروغ دینے کے لیے رکھی گئی تھی۔

مستشرقین : جو مشرقی ایشیا کے ممالک کی زبان، ثقافت، تاریخ یا رسم ورواج کا مطالعہ کریں۔

بنیاد پرستی : وہ عقیدہ ہے جس کا مقصد زبردست یا انتہائی سماجی یا سیاسی تبدیلی۔

فورٹ ولیم کالج : لارڈ رچرڈ ویلزلی نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے سول اور فوجی حکام کو ہندوستان کی مقامی زبانوں میں تعلیم فراہم کرنے کے لیے قائم کیا تھا۔

ایوینجلیکل : بشارت انجیل/بائبل کو سنجیدگی سے لیتے ہیں اور مسیح کو نجات دہندہ مانتے ہیں۔

1.7 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

1.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Very Short Answer Type Questions)

1. شاردا ایکٹ کس نے متعارف کرایا؟
2. شاردا ایکٹ کب نافذ ہوا؟
3. ناعمری کی شادی کی سزا کیا ہے؟
4. چائلڈ میرج ریسٹرینٹ ایکٹ اور کس نام سے جانا جاتا ہے؟
5. ٹھگی اور ڈکیتی کا محکمہ کس گورنر جنرل کے دور میں بنایا گیا تھا؟
6. ٹھگیوں اور ڈاکوؤں سے نمٹنے کی ذمہ داری کس کو دی گئی؟
7. ہندو بیواؤں کی دوبارہ شادی کا قانون کس کے دور میں پاس ہوا؟
8. اس سماجی مصلح کا نام بتائیں جس نے ستی مخالف قانون کی منظوری میں انگریزوں کی حمایت کی؟

1.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. سماجی اصلاحی تحریک میں راجا رام موہن رائے کا کیا کردار ہے، واضح کریں؟
2. وارن ہیسٹنگ کے بعد کے دور میں نو آبادیاتی سماجی پالیسی میں جو تبدیلیاں آئیں ان کی وجوہات کیا تھیں؟

मौलाना आज़ाद नेशनल उर्दू यूनिवर्सिटी
Estd. 1998
MAULANA AZAD NATIONAL URDU UNIVERSITY

3. ولیم بینٹک کے دور میں کون سے سماجی قوانین منظور ہوئے؟
4. شاردا ایکٹ، 1929 پر ایک مختصر نوٹ لکھیں۔
5. ہندو بیواؤں کے عقد ثانی کا ایکٹ 1856 کیوں پاس کیا گیا؟

1.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. ستی، نوزائیدہ بچوں کا قتل اور غلامی کے حوالے سے برطانوی پالیسیوں کی ترقی اور اثرات پر لکھیں۔
2. عمر رضامندی ایکٹ 1891 اور شاردا ایکٹ 1929 پر تفصیلی نوٹ لکھیں؟
3. سماجی اعمال کو قانونی شکل دینے میں سماجی اور مذہبی مصلحین کے کردار پر بحث کریں۔

1.8 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Learning Resources)

---

1. Bandyopadhyay, Sekhar, *From Plassey to Partition and After: A History of Modern India*, Orient Longman, New Delhi, 2006.
2. Banerjee-Dube, Ishita, *A History of Modern India*, Cambridge University Press, 2014.
3. Chandra, Bipan et al., *India's Struggle for Independence*, Penguin, New Delhi, 1988.
4. Mahaboob Basha, Shaik, 'Declaring Dharma Yudhdham: Conservative Reaction Against the Child Marriage Restraint Act Colonial Andhra, 1928–1938', *Indian Historical Review*, Vol. 50, No. 1, January–June 2023, pp. 90–108.
5. Mahaboob Basha, Shaik, '*Punarvivaham* vs. *Pativratyam*: Pulugurta Lakshmi Narasamamba and the Widow Remarriage Question in Colonial Andhra', *Studies in History*, Vol. 37, No. 1, February 2021, pp. 61–91.
6. Mahaboob Basha, Shaik, 'Misusing the Neighbours: Performing Andhra Child Marriages in Hyderabad State, 1930–1938', *History and Sociology of South Asia*, Vol. 13, No. 2, July 2019.

اکائی 2۔ برطانوی حکمرانی کا دانشورانہ رد عمل

رام موہن رائے، ایشور چندر ودیا ساگر اور سر سید احمد خان

(Intellectual Response to British Rule:

Ram Mohan Roy, Iswarchandra Vidya Sagar, and Sir Syed Ahmad Khan)

اکائی کے اجزا

2.0 تمہید

2.1 مقاصد

2.2 نوآبادیاتی پس منظر

2.3 راجہ رام موہن رائے

2.3.1 ابتدائی زندگی اور سفر حیات

2.3.2 سماجی و مذہبی اصلاحات کے مسئلہ کا تشکیلی دور

2.3.3 ستی کے خلاف جنگ

2.4 ایشور چندر ودیا ساگر

2.4.1 نوآبادیاتی پس منظر، ابتدائی زندگی اور سفر حیات

2.4.2 سماجی اصلاحات کا مسئلہ

2.4.3 انسانیت پسندی بحیثیت مذہب

2.5 سر سید احمد خان

2.5.1 نوآبادیاتی پس منظر اور مسلمانوں کے حالات

2.5.2 غدر اور اصلاح کے لیے کاوشیں

2.5.3 ایم اے او کالج کے قیام کے تئیں کوششیں

2.5.4 تعلیم بحیثیت سیاسی رد عمل

2.5 اکتسابی نتائج

2.6 کلیدی الفاظ

2.7 نمونہ امتحانی سوالات

2.8 تجویز کردہ اکتسابی مواد

2.0 تمہید (Introduction)

یہ اکائی ہندوستان میں انیسویں صدی کی نوآبادیاتی حکمرانی کے دانشورانہ ردعمل سے بحث کرتی ہے۔یہ اکائی برطانوی حکمرانی کے ہندوستانی دانشورانہ ردعمل کی ماہیت کو سمجھنے کے لئے انیسویں صدی پر پھیلے ہوئے تین شخصیات پر نظر کرتی ہے۔جیسا کہ اس اکائی میں ظاہر کیا گیا ہے،ان شخصیات کا ردعمل ان کے سماجی پس منظر کے لحاظ سے مختلف تھا۔

2.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- انیسویں صدی کے نوآبادیاتی پس منظر کو سمجھ سکیں گے۔
- اس دور کی شخصیات جیسے راجہ رام موہن رائے، سر سید احمد خان اور ایشور چندر ودیا ساگر کی زندگی کو سمجھ سکیں گے۔
- ہندوستانی سماج کی سماجی و مذہبی اصلاحات کے لئے ان کی تحریک کو سمجھ سکیں گے۔
- نوآبادیاتی حکمرانی کے تئیں ان کے دانشورانہ ردعمل کی ماہیت کو بیان کر سکیں گے۔
- ان شخصیات کے ردعمل میں پائے جانے والے تغیرات اور اختلافات کو ان کے پس منظر سے جوڑ سکیں گے۔

2.2 نوآبادیاتی پس منظر (The Colonial Context)

1757 میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے بنگال کو فتح کر لینے کے نتیجہ میں ہندوستان میں نوآبادیاتی حکمرانی کی ابتدا ہوئی۔حالانکہ ابتدائی دہوں میں (وارن ہیسٹنگ کے وقت تک) ہندوستان کو اس کے اپنے رواجوں کے مطابق حکمرانی کرنے کی کوشش کی جاتی تھیں اور انگریزیانہ کا عمل کارنوالس (Lord Cornwallis) کے دور سے شروع ہونے لگا اور یہاں سے ہندوستان میں انگریزی ثقافت اور انگریزی زبان کے فروغ کا ایک سانچہ تیار ہو گیا۔انگلیکن (برطانوی کلیسا کے رکن) اور مشنریز دونوں کے ہاں کچھ مشترکہ خصوصیات تھیں وہ یہ کہ دونوں ہندستانی سماج کو 'پس ماندہ' اور 'قدامت پسند' سمجھتے تھے اور اس نظریہ نے انہیں ہندوستان پر نوآبادیاتی حکمرانی کا جواز پیدا کیا۔اس سوال پر کہ ہندوستانی سماج میں کلیاں ہیں،ان دونوں کی مشترکہ سوچ یہ تھی کہ ہندوستانیوں کو برطانوی حکمرانی کے ذریعے اونچا اٹھانے کی ضرورت ہے۔ہندوستانی سماج نے ان دعوؤں پر کس طرح کا ردعمل ظاہر کیا ہے۔ہندوستانی سماج پر بیرونی حکمرانی کا ثقافتی اثر کیا تھا اور اس کا ثقافتی ردعمل

کیا تھا؟ہندوستانی سماج نے پسماندگی اورتاریکی جیسے دعوؤں پر اپناملاجلاردعمل ظاہر کیا۔ گورنمنٹ اور مشنریوں دونوں کی تنقیدوں نے انہیں اپنے خود کے ثقافتی طور طریقوں پر محاسبہ کرنے اور حکومت کے ثقافتی طور طریقوں سے اپنے آپ کو ہم آہنگ کرنے کی کوششوں کے مواقع فراہم کیے۔اس ردعمل میں مختلف ناموں سے پکارا جاتا ہے جیسا 'غفلت سے بیداری' یا 'بنگال کی نشاۃ ثانیہ' وغیرہ۔

ابتدائی ردعمل کو "عمل۔ردعمل ماڈل" (Action-Reaction Model) کے طور پر درجہ بندی کی جاسکتی ہے جس میں ہندوستانی سماج کو نوآبادیاتی حکمرانی سے قبل تاریک دور میں رہتے ہوئے دیکھا جاسکتا ہے۔البتہ دیگر مؤرخین انگریزوں کی حکمرانی کو انسویں صدی میں وقوع پذیر سماجی ومذہبی اصلاحات کا سبب قرار دیتے ہیں۔نوآبادیاتی حکمرانی کی متعارف کردہ جدیدیت (Modernity) کو نوآبادیاتی جدیدیت کہا جاتا تھا اور یہ بھی استدلال کیا جاتا تھا کہ یہ جدیدیت جو کہ نوآبادیاتی تجربہ کے ذریعے لائی گئی وہ کھوکھلی، بیکار تھی اور محض بیان بازی تھی۔چنانچہ وہ مغربی جدیدیت کا ایک 'نقلی' ماڈل تھا جس کا مقصد، اسکالروں کے مطابق، ایک ایسے طبقہ طبقہ کی تخلیق کرنا تھا جو ان کے کاموں میں دلّال/ایجنٹ کے بطور تعاون کریں گے۔البتہ ثقافتی میدان میں نوآبادیاتی مدبھیڑ اور ہندوستانی دانشوروں کے ردعمل میں اس قدر اختلاف اور فرق تھا کہ اوپر پیش کردہ کوئی بھی درجہ بندی ان اختلافات کو مکمل طور پر وضاحت نہیں کرسکتی۔بیش تر مواقع پر یہ ٹکراؤ محض مغربی تقلید اور ہندوستانی تناظر میں مغربی خیالات اور جدت پسند کاموں پر ہی موقوف نہیں تھا۔یہ خیالات عملی شمولیت، تنقیدی انوائری (تفتیش) اور عقلی اطلاق پر مبنی تھے۔حالانکہ جدید رجحانات اس تبدیلی کو بنگال کی نشاۃ ثانیہ کی طرف نشاندہی کرتے ہیں۔جہاں چند مخصوص مخصوص شخصیات 'تبدیلی ایجنٹ' کے طور پر دیکھے جاتے ہیں۔ان شخصیات کا مطالعہ محض اس لئے نہیں کیا جانا چاہیے کہ نوآبادیاتی حکمرانی کے ان کے تقابل کے نتیجہ کے طور پر ان کے افکار جیسے خودی اور شناخت، مذہب وغیرہ کی نشو نما ہو بلکہ اس وجہ سے بھی کہ نوآبادیاتی حکمرانی کو ہندوستانی دانشورانہ ردعمل کے مختلف مراحل میں یہ شخصیات ایک اہم نشان گر (markers) مانے جاتے ہیں۔

موجودہ اکائی، تین اہم شخصیات کی زندگیوں کے محاسبہ پر مرکوز ہے۔جنھوں نے انیسویں صدی کی اصلاحی تحریوں میں ایک اہم کردار ادا کیا۔ان کے ردعمل کے ردعمل کو استعمال کرتے ہوئے اس اکائی میں کوشش کی گئی کہ نوآبادیاتی حکمرانی کے تئیں ان دانشوروں کے ردعمل کے بیچ میں لکیر کھینچی جائے اور ان ردعمل کے طرز کو مختصراً سمجھا جائے اس کے۔ان شخصیات کے ذریعے یہ کوشش کی جائے گی کہ دانشورانہ ردعمل کو سادہ طور پر "ایکشن۔ری ایکشن ماڈل" نہیں کہا جاسکتا بلکہ وہ ایک پیچیدہ عمل تھا۔حالانکہ ان شخصیات کے ردعمل میں بہت سے اختلافات بھی پائے جاتے ہیں لیکن ان کے درمیان مشابہت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

2.3 راجہ رام موہن رائے (Raja Rammohun Roy)

پہلی شخصیت "راجہ رام موہن رائے" کی ہے جنھیں، جدید ہندوستان کا باوا آدم مانا جاتا ہے۔ان کے ساتھ ہی ہندوستان "ماضی کو توڑو اور" جدیدیت سے مقابلہ آئی کرو" کا دور شروع ہوتا ہے۔ہم کس طرح "اس ماضی کو توڑو" کو سمجھیں گے اور کیا تبدیلیاں پیش آئیں؟ بہت سارے لوگ اس پر یقین رکھتے ہیں اور استدلال کرتے ہیں کہ یہ ہندوستان اور اس کے تہذیبی ورثہ کے زوال کی نمائندگی کرتا ہے۔راجہ

رام موہن رائے1722(بعض کے مطابق1774)میں رادھا نگر نامی جگہ پر جو بنگال پریزیڈنسی کے ضلع ہگلی میں واقع ہے،ایک دولت مند زمیندار خاندان میں پیدا ہوئے ان کے اس خاندان کو کولن برہمن(Kulin Brahmin) کہا جاتا تھا۔ان کے والدین رماکانت رائے اور قرینی ویوی تھے۔ان کی ابتدائی تعلیم کے بارے میں کچھ زیادہ معلومات نہیں ہیں مگر یہ کہا جاتا ہے کہ انہیں فارسی اور عربی سیکھنے کے لئے پٹنہ بھیجا گیا تھااور پھر بعد میں سنسکرت سیکھنے کے لئے بنارس بھیجا گیا تھا۔انہیں اسلام کی وحدانیت اور ویدوں کی وحدانیت کو سمجھنے کا موقع ملا۔وہ کئی زبانوں پر بہ یک وقت عبور رکھتے تھے جیسے سنسکرت،بنگالی،فارسی،انگریزی اور دیگر زبانوں جیسے یونانی،لاطینی،عبرانی اور عربی پر بھی اچھی قابلیت رکھتے تھے۔

2.3.1 ابتدائی زندگی اور سفر حیات (Early Life and Career)

1790 کے دہے میں،بنگال/میں سیرم پور کے ڈینش آبادی والے علاقہ میں عیسائی مشنریز بہت سرگرم تھے۔ان میں سے ایک جن کا نام ولیم کیری(William Carey) تھا1793 میں ہندوستان آیا اور وہ بائبل کو بنگالی زبان میں ترجمہ کروانا چاہتا تھا اسی سلسلہ میں اسکی ملاقات راجہ رام موہن رائے سے ہوئی۔راجہ رام ہومن رائے نے ولیم کارے اور اس کے دیگر دو ساتھیوں ولیم وارڈ(Willium Ward)اور جوشوا مارش وان(Joshua Marshman) جنھیں صرف عام میں 'سیرم پور کے ثلاثی' (The Trio of Serampore) کہا جاتا تھا،اپنی دوستی قائم کی جس کی ابتدا میں مقصد انگریزی سیکھنا تھا۔ان تینوں کے ساتھ میل جول کہ نتیجہ تھا کہ وہ کولن برہمن کیمونٹی کے رواجوں جیسے ستی،کثیر ازدواج(Polygamy)جہیز وغیرہ کے سخت ناقد بن گئے۔

مشنریوں کے ہندو مذہب کے کثرت خدا کے عقیدہ توحید(Monotheism)اور بت پرستی پر تنقید کا راجہ رام موہن رائے پر اس قدر گہرا اثر پڑا کہ وحدت پرستی ان کے پہلے دانشورانہ کا موضوع بن گیا جب انہوں نے 1803ء میں اپنی کتاب "تحفۃ المواحدین" (وحدت پرستوں کے لئے تحفہ) تصنیف کی۔انہوں نے اس بات کو سمجھا کہ مذہب کو سادگی پسند ہونا چاہیے اور اسے اپنے ماننے والوں میں اقدار کو فروغ دینا چاہیے۔تمام مذاہب کا بنیادی تصور یہی ہے کہ ایک اعلیٰ ترین طاقت ہے جو وقت سے ماوراء ہے اور جو تمام انسانی عمل پر نظر رکھتا ہے۔اس اعلیٰ ترین ہستی کی ہندو مذہب میں نشاندہی کی کوشش انہیں ویدانت اور اپنیشد افکار کے قریب لائی۔جیسا کہ برئیان ہاچر(Brian Hatcher) کہتے ہیں کہ انہوں نے ان رواجوں کی نشاندہی کی کوشش کی جو جدیدیت کے تقاضوں پر پورا اترتے ہیں اور ساتھ ہی اجتماعی عبادت کو بھی فروغ دیتے ہیں۔

توحید اور غیر مرئی اور مجرد خدا کی کھوج اور جستجو نے انہیں کلکتہ کے مشنریوں اور خاص طور پر میرم پور کی ثلاثی کے ساتھ میل جول پر بھی اثر ڈالا۔سیرم پور کے باپٹسٹ مشن(Baptist Mission)نے انہیں اور مواقع فراہم کئے اور راجہ رام موہن رائے کی ستی کے خلاف لڑائی کی بھرپور ہمت افزائی کی کیونکہ اس طرح ان مشنریوں کو ہندو مذہب کی غلط اور ظالمانہ روایتوں اور رواجوں منظر عام پالانے اور ان پر تنقید کرنے کا اچھا موقع فراہم ہو رہا تھا۔اور اس طرح انہیں مقامی لوگوں کو ہندو دیوتاؤں کی حقیقت کو سمجھانے اور عیسائی مذہب

کو اختیار کرنے کی ترغیب دینے میں مدد ملی۔ یہ بات صحیح ہے کہ راجہ رام موہن رائے نے عیسائیت کے عقیدہ توحید اور تعلیمات کا بہت باریک بینی سے مطالعہ کیا لیکن توحید کے تئیں ان کی کھوج اور تلاش نے انہیں عیسائیوں کے عقیدہ "مقدس تثلیث (the Holy Trinity) جس میں باپ، بیٹا اور مقدس روح شامل ہیں، کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور انہوں نے مقدس تثلیث کو بھی اسی طرح تنقید کا نشانہ بنایا جس طرح وہ کثرت خداپرستی کو بناتے تھے۔ عیسائی مشنریوں کو بھی انہوں نے ہی اُسی صف میں کھڑا کیا جو ہندو مذہب کے کثرت پرستی کے عقیدہ رکھنے والوں کا تھا اور اس طرح ان مشنریوں کے "اعلیٰ ترین مذہب" کے دعوؤں کو کالعدم کر دیا۔ راجہ رام موہن رائے کے کاموں سے علحدگی اختیار کرنے لگے۔ باپٹسٹ مشن پریس (Baptist Mission Press) ان کی اگلی تصنیفات کو شائع کرنے سے انکار کر دیا۔ البتہ ان کی عیسائی مشنریوں کے ساتھ تثلیث کے موضوع پر بحث و گفتگو کے نتیجہ میں چند پر ضرور اثر ڈالا اور وہ تثلیث کے تصور کے منکر ہوئے اور عیسائیت میں وحدانیت (Unitarianism) کے تصور کو قبول کرنے لگے۔ غرض ان کی تلاش و جستجو کی کوشش اور عقیدہ پر سوال ہندو مذہب سے اندھی دوری نہیں تھی اور نہ ہی عیسائی تعلیمات پر اندھی تقلید تھی۔

انیسویں صدی کے ابتدائی سالوں میں رام موہن رائے کو انگریزی زبان اور ثقافت کے بارے میں سیکھنے کی خواہش تھی۔ انہیں انگریزی سیکھنے کی اہمیت کا اندازہ ہو چکا تھا اور وہ بھی اس بات کا یقین رکھتے تھے کہ ہندوستانی سماج کے لئے انگریزی ایک خدا کی نعمت ہے۔ کلاسیکی زبانوں کے ماہر اور ریوینیو اُمور کے ماہر کی حیثیت سے، انہوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی میں بحیثیت منشی اپنی خدمات کا آغاز کیا۔ ابتدا میں وہ انگریزی اڈمنسٹریٹر تھامس وڈروف (Thomas Woodroffe) کے پوائیوٹ کلرک پر فائز ہوئے بعد میں کلکٹر ولیم ڈگبائی (Sir William Digby) کے لئے خدمت پر مقرر ہوئے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی میں نوکری کرنے کے پیچھے ان کی انگریزی سیکھنے اور انگریزی ثقافت سیکھنے کی تڑپ تھی نہ کہ روزی روٹی کا حصول ان کا مقصد تھا۔ 1809 کے لگ بھگ، ایک نئے نئے ہندوستان آئے۔ اڈمنسٹریٹر نے نوٹ کیا کہ انہوں نے کبھی بھی کسی ایشیائی کو اتنی بہترین انگریزی بولتے ہوئے نہیں سنا جیسے کہ رائے بولتے ہیں۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت کے دوران رام موہن رائے نے برٹش کی نسل کی بنیاد پر کئے جانے والے کسی بھی قسم کے تعصب کو قبول نہیں کیا۔ جب ایک مرتبہ ایک انگریزی افسر نے انہیں ایک معمولی وجہ یعنی پالکی سے نہ اترنے کے سبب انہیں نسلی بے عزتی کا شکار کیا تو انہوں نے احتجاجاً گورنر جنرل کو اس تعلق سے میمورنڈم/یادداشت پیش کی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی میں 11 سال تک خدمات انجام دینے کے بعد رام موہن رائے سال 15-1815 میں کلکتہ منتقل ہو گئے۔

2.3.2 سماجی و مذہبی اصلاحات کے مسئلہ کا تشکیلی دور

(Formative Years on the Question of Social and Religious Reform)

کلکتہ کو لوٹنے کے بعد انہوں نے اپنے افکار جیسے توحید کی تبلیغ اور بت پرستی کے تئیں ان کی نکتہ چینی کو پھیلا سکیں۔ یہ وہی دور ہے جن انہیں اپنشد کا بنگالی میں ترجمہ کرنے کا کام شروع کیا۔ عیسائی مشنریوں کی بڑھتی ہوئی تحریک کی روشنی میں، جس میں وہ ہندوؤں کی مذہبی رسومات جیسے مورتی پوجا اور کثرت خداپرستی کو نشانہ بناتے تھے، رام موہن رائے نے اس کے برخلاف ہندوؤں کی ایسی رسومات کی نشاندہی کی

اور ان کی اصلاح کی جس سے کسی شکل کے بغیر "آتما" کی عبادت کی ج اس کے۔ مورتی پوجا اور کثرت خدا پرستی کے نظام کے تئیں ان کا انکار محض ہندوازم تک محدود نہیں تھا۔ انہوں نے قدیم ہندو مذہب کے مختلف نظاموں کا مطالعہ کیا جس میں وہ ویدانت اور اپنشد کے افکار سے قریب ہونے لگے۔ انہوں نے ویدانت کا گہرائی سے مطالعہ کیا تو ان پر یہ حقیقت آشکارا ہوئی کہ وحدانیت اور عبادت کی وہ اشکال یا فلسفیانہ مراقبہ جو کہ وحدت پرستی کے بنیادی اُصول ہیں، ان میں شامل ہیں۔ اپنشد اور ویدانت افکار کے تئیں ان کی وابستگی دراصل ایک اعلیٰ ترین ہستی کی اجتماعی عبادت کی کھوج کی ایک کوشش تھی۔ اپنشد کا ترجمہ سیاسی و مذہبی دونوں طرح کی منتق تھی۔ کیونکہ وہ مشنریوں کے برتی کے اخلاقی دعوؤں کا مقابلہ کرنا چاہتے تھے۔ وحدانیت (Monotheism) کے تئیں ان کی جانفشانی نے انہیں اپنشد کی فلسفیانہ تشریح کو بنگالی میں ترجمہ کرنے کے لئے راہنمائی کی۔ اپنشد کے افکار نے وحدانیت پر ان کے یقین اور عقیدہ کو مزید مستحکم کیا۔

اپنشد کا بنگالی ترجمہ کئی لحاظ سے اہم تھا۔ اولاً تو اس طرح کے متن (Tests) کو جو اس وقت تک محض زبانی طور پر منتقل ہوتے تھے اور جو پجاری طبقہ کے ہی علم کا علاقہ مانے جاتے تھے، شائع کرنا بڑا انقلابی عمل تھا۔ دوسرے، وہ چاہتے تھے کہ اپنشد کے افکار کو بنگال کی مڈل کلاس تک قابل رسائی بنایا جائے۔ اس طرح سے یہ رام موہن رائے کی زندگی کے ابتدائی مرحلہ سے نئے راستے کی طرف چل پڑنے کی علامت تھی۔ زندگی کے ابتدائی مرحلہ میں وہ دارسی کو ایک ادبی زبان کے بطور استعمال کرتے تھے۔ اس طرح کی کوششیں یقیناً بنگالی کو ایک جدید زبان /اشاعت کی زبان کا موقف دینے میں کامیاب رہیں۔ انہوں نے اپنے مقاصد کو مزید وسعت دیتے ہوئے کئی نئے اخباروں جیسے سموادی کومڈی، مراۃ الاکبر وغیرہ کو جاری کیا۔ کل ملاکر ان کی اس کوششوں نے تعلیم یافتہ طبقہ کو دانشورانہ مباحثوں میں شامل ہونے کے مواقع فراہم کیے۔ غرض راجہ رام موہن رائے ایک ایسے شخص تھے جنھوں نے اصلاحات کے سلسلے میں نئے نئے مواقع تلاش کئے جیسے انگریزی تعلیم، پرنٹنگ پریس، اخبارات وغیرہ۔

اس دور تک انگریزی تعلیم کے لئے ان کا یقین اور اعتقاد مزید بڑھتا گیا اور بالآخر انہوں نے انگلیکس۔ اورینٹل تنازعہ کا بڑی شدت سے ساتھ دیا۔ انہوں نے ڈیوڈ ہیر (David Hare) کی مدد سے 1917 میں ہندو کالج اور دیگر اداروں جیسے 1822 میں اینگلو۔ ہندو اسکول جو آگے چل کر ویدانت کالج کے نام سے مشہور ہوا، کے قیام میں ایک اہم کردار ادا کیا۔ انہوں نے کمپنی کے کلکتہ میں سنسکرت کالج قائم کرنے کے فیصلے کے خلاف گورنر جنرل لارڈ امہرسٹ (Lord Amherst) کو ایک میمورنڈم لکھا۔ اور ان پر دباؤ ڈالا کہ وہ اس کے بجائے انگریزی تعلیم کے اداروں کو قائم کریں۔ رائے جیسے مقامی دانشوروں نے انگریزی مستشرق تنازعہ اور بجٹ میں انگریزی کا ساتھ دیا اور اس طرح 1835 میں انگریزی کو سرکاری زبان بنانے میں اپنا رول ادا کیا۔

2.3.3 ستی کے خلاف جنگ (Crusade Against Sati)

رام موہن رائے اپنے والد کے انتقال اور پھر 1815 میں کلکتہ منتقل ہونے کے بعد اپنے خاندان سے ہندو رسم ورواج اور بت پرستی کی مخالفت کے سبب مزید دور ہو گئے۔ 1817 میں ان کے خاندان نے انہیں اپنی برادری سے خارج کر دیا۔ ان کے اپنے ہی بھتیجے نے رام

موہن کی جائیداد کے خلاف مقدمہ دائر کیا جو آخر الذکر کی والدہ کی ہی ایما پر کیا گیا۔اس کے باوجود رائے کولن طبقہ کی رسومات جیسے کثرت خدا پر ستی پر برابر تنقید کرتے رہے اور اگلے سال یعنی 1818 میں ستی کی رسم کے خلاف ایک فعال تحریک شروع کردی۔اس تحریک سے بعد میں بہت لوگ جڑ گئے جیسے ولیم کیرے (William Carey) اور دوارکاناتھ ٹیگور وغیرہ۔اس تحریک کا نتیجہ لارڈ ہیسٹنگز (Lord Hastings) کے حکم کی اجرائی کی شکل میں ظاہر ہوا جس کے تحت ان رسومات کی عمل آوری پر پابندی عائد کردی گئی۔

ستی کی رسم زمانہ قدیم سے چلی آرہی رسم تھی جس کے تحت ایک بیوہ کو اپنے شوہر کی چتا کے ساتھ آگ میں جلادیا جاتا تھا لیکن یہ ایک استثنائی عمل مانا جاتا تھا۔معاشرہ کے رسومات کے معیار میں۔البتہ کمپنی کے دور حکومت کے ابتدائی سالوں میں کلکتہ شہر اور اس کے اطراف واکناف کے علاقوں میں اسکی تعداد بڑھتی گئی۔اس دور میں یہ رسم محض اونچی ذات تک ہی محدود نہیں تھی بلکہ وسطی اور نچلے طبقات میں اونچے طبقات کے ساتھ سماجی برابری کی خواہش میں اس رسم کو اپنانے لگے۔اتفاق کی بات ہے کہ ستی محض ایک مذہبی/سماجی رسم ہی نہیں تھی بلکہ اسکا تعلق معاشی سبب سے بھی تھا۔وہ معاشی سبب تھا مشرقی ہندوستان میں رائج ماقبل نوآبادیاتی دور کا ایک معروف قانون یعنی "دیابھاگیہ" جس کے تحت ایک بیوہ کو اپنے فوت شدہ شوہر کی جائیداد میں اور زیادہ حقوق کی فراہمی کا تیقن دیا گیا تھا۔جائیداد میں حق کا یہ قانون پورے ہندوستان میں کہیں اور رائج نہیں تھا اور قانونی ضابطہ "متاکشرا" (Mitakshara) اسکول ہی کے پیروکار اس پر عمل کرتے تھے۔رائے کی شائع کردہ کتاب *Modern Encroachment on the Ancient Rights of Females according to Hindu Law of Inheritance* جو 1822 میں شائع ہوئی، پر تبصرہ کرتے ہوئے C.A. Bayly کہتے ہیں کہ "بنگال کے دیابھاگیہ قانون وراثت کی غلط اور بدعنوان تشریح کے نتیجہ میں بیواؤں کو جلانے کی رسم شروع کی گئی اور اس رسم کی شوخی ان کا اہم عوامی پراجکٹ تھا"

ستی کے خلاف تحریک محض ایک رسم کی مخالفت نہیں تھی بلکہ عورتوں کے حقوق اور حق جائیداد کے لئے بھی ایک جدوجہد تھی۔ انہوں نے دھرم شاستروں کا بہت وسیع پیمانہ پر استعمال کیا تاکہ یہ ثابت کریں کہ 'ستی' کی رسم کا مذہبی کتب میں کوئی حکم نہیں ہے۔اس کے علاوہ انہوں نے "یگنہ واکیہ سمرتی" سے اقتباسات کے ذریعے کثرت ازدواج (Polygamy) کی مذمت کی اور بتایا کہ اس صحیفہ میں دوسری بیوی رکھنے کے لئے 8 مخصوص شرائط عائد کئے گئے ہیں۔مذہبی کتب کی بنیاد پر اس طرح کی تنقید سے دو مقاصد کی تکمیل ہوئی۔1) کمپنی کے نظم ونسق کو مداخلت کے حق میں باور کرانے میں مدد ملی کیونکہ اول الذکر نے ہمیشہ "صحیفہ/کتاب پر مبنی قانون" کی حمایت کی تھی 2) اس نے قدامت پسند اپوزیشن کو بھی ان کی اساسی بنیاد کو کالعدم کرتے ہوئے ان کی قوت وطاقت پر ضرب لگائی۔

صحیفوں اور شاستروں کی طرف رجوع ہونے کا رجحان بعد میں آنے والے مصلحین میں بھی بڑے پیمانے پر پایا جاتا ہے۔رام موہن رائے کی ایسی فعال تحریک تھی جو عوامی مباحثوں، درخواستوں (petitions) کا موجب بنی اور بالآخر گورنر جنرل ولیم بنٹنک کو سال 1829 میں بنگال میں اس رسم پر روک لگانے کے حکم کے اجرا میں کامیاب ہوگئے۔رام موہن رائے کے خیالات محض ستی یا خواتین کے

مسائل تک محدود نہیں تھے۔عیسائی مشنریوں کے بڑھتے ہوئے تبلیغ کے کاموں کی روشنی میں جس میں مورتی پوجا، کثرت خداپرستی جیسے رسومات کونشانہ بنایا گیا تھا، انہوں نے ہندومذہب کے ان رسومات اور رواجوں کی نشاندہی کی جس میں بغیر کسی شکل اختیار کئے آتما کی عبادت کی تلقین ہے۔ایک واحد اعلیٰ ترین ہستی کی تلاش اور جستجو نے انہیں برہمو سماج جیسی توحید پرست تنظیم کے قیام کی راہ ہموار کی۔ابتداء میں اس تنظیم کے کوئی قواعد وضوابط نہیں تھے اور نہ سوسائٹی کا کوئی ضابطہ اخلاق اور نہ سوسائٹی کی کوئی رکنیت سازی موجود تھی۔برہمو سماج کی پہلی میٹنگ ان کے گھر پر 20اگست 1828 کو منعقد ہوئی اور پھر پوری انیسویں صدی میں بنگال کے تعلیم یافتہ لوگوں پر گہرے اثرات مرتب ہوئے۔

حالانکہ وہ پہلے بھی انگلینڈ کا سفر کرنا چاہتے تھے لیکن ستی کے خلاف پرائیوی کونسل(Privy Council)میں ان کی درخواست کے سبب وہ انگلینڈ کے لئے روانہ ہوئے۔انگلینڈ روانگی کی شام مغل بادشاہ اکبر ثانی نے انہیں 'راجہ' کا خطاب عطا کیا اور ساتھ میں ایک درخواست بھی حوالے کی جس میں انہوں نے برطانوی ملکہ سے گزارش کی تھی کہ ان کے الاؤنس میں اضافہ کیا جائے۔انگلینڈ میں رام موہن رائے کا قیام نہایت اہم اور واقعات سے بھرپور رہا۔وہاں ایک مستشرق کی حیثیت سے ان کی کافی پزیرائی ہوئی۔اور انہیں اہم شخصیات جیسے بنتھم(Bentham)وغیرہ سے ملاقات کا بھی موقع ملا۔انہوں نے ستی سے متعلق پرائیوی کونسل کی کاروائی کی صدارت بھی کی۔ستی کی منسوخی سے متعلق ان کی تمام کوششوں پر پانی پھر گیا جب کاروائی کے اختتام پر ان کی درخواست رد کردی گئی۔انگلینڈ کے وحدت پرست عیسائیوں(Unitarians)میں ان کی مقبولیت بڑھنے لگی۔نہ صرف انگلینڈ بلکہ اس دور میں امریکہ میں بھی ان کا نام مشہور ہونے لگا اور انہیں 'Hindu Man of Letters and Philosopher' کے نام سے یاد کیا جانے لگا۔اکتوبر 1833 میں ان کا انتقال برسٹل میں ہوا اور ہندو رسم ورواج کے مطابق ان کی تدفین ہوئی۔

وہ صرف ایک ماہر تعلیم اور سماجی مصلح ہی نہ تھے بلکہ بین الاقوامیت کے حامل شخص تھے۔فرانسیسی انقلاب کے بعد جب سیاسی آزادی، آئینی آزاد پسندی(Constitutional Liberalism)جیسے افکار وتصورات تمام یوروپ میں ابھر رہے تھے اور دنیا کے کئی حصوں میں پھیلنے لگے جس کے اثر سے جنوبی امریکہ کا کامیاب انقلاب رونما ہوا۔رام موہن رائے ان تمام حالات کا نہایت باریک بینی سے مطالعہ کرتے رہے اور آئینی آزاد پسندی کا پرچار بھی کیا اور اسکی کامیابی کا جشن بھی منایا۔جیسا کہ سی اے بائلی(C.A. Bayly)بیان کرتے ہیں "بمبئی، مدراس، کلکتہ جیسے شہروں میں عوامی سطح پر مختصر لیکن بڑھتی ہوئی عالمی آزاد خیالی پسند فکر پائی جارہی تھی۔جس میں سیاسی و آئینی آزاد خیالی پسندی کی کائنات میں وہ حصہ لے رہے تھے"

2.4 ایشور چندر ودیا ساگر (Iswarachandra Vidyasagar)

ایشور چندر ودیا ساگر بنگال پریزیڈنسی کے برسنگھا میں ایک غریب برہمن خاندان میں 1820 میں پیدا ہوئے۔ان کا پورا نام ایشور چندر بندھو پادھیائے تھا۔ان کے والد کا نام ٹھاکر داس اور والدہ بھاگیہ وتی دیوی تھا۔ان کی ابتدائی زندگی غریبی میں گزری اور جب وہ

انیس برس کے ہوئے تو انہوں نے سنسکرت اسکول میں داخلہ لیا اور بارہ سال تک اسکالرشپ کے حصول کے بعد انہیں "ودیاساگر" کے اعزازی خطاب سے نوازا گیا۔ فوراً ہی وہ نوآبادیاتی بنگال میں سماجی اصلاح کے کاموں سے جڑ گئے۔ ایک سماجی مصلح اور مفکر کے طور پر، ایشور چندر وسط انیسویں صدی کے اہم ترین شخصیات میں سے ایک تھے اور اس بات کے کافی ثبوت ہیں کہ عوام میں انہیں بہت قربت واحترام حاصل تھا۔ مثال کے طور پر، شانتی پور کے ہینڈلوم بافندوں کے (Weavers) نے ساڑیوں پر "ودیاساگر زندہ باد" کے الفاظ بُنے۔

2.4.1 نوآبادیاتی پس منظر، ابتدائی زندگی اور سفر حیات (Colonial Setting, Early Life, and Career)

اس وقت کا نوآبادیاتی پس منظر قدر مختلف تھا۔ 1830s اور 40s تک، کمپنی کی حکمرانی ہندوستانی رسموں، رواجوں اور روایتوں کے لئے اجنبی نہیں تھی۔ نوآبادیاتی حکمران ہندوستانی امور کی انجام دہی میں دھیرے دھیرے پُراعتماد ہو رہے تھے۔ ابتدا میں مشرقی علوم کے اکتساب کے تئیں جوجوش اور جذبہ پایا جاتا تھا وہ رفتہ رفتہ انجلی تعلیمات اور افادیتی افکار میں تبدیل ہونے لگا اور نسلی رویے مستحکم ہونے لگے۔ اس تبدیلی کی ابتدائی علامتیں تعلیم کے شعبہ میں دکائی دینے لگیں جب انگریزی اور مشرقی کے سوال پر بحث ہونے لگی اور انگریزی تعلیم کے متعارف ہونے سے اول الذکر کے موافقت میں معاملہ طے پایا۔

یہ کچھ حیرانی کی بات ہے کہ ودیاساگر نے اس وقت سنسکرت کی تعلیم حاصل کرنے کا انتخاب کیا جب اسکولوں میں انگریزی تعلیم کا پھیلاؤ ہو رہا تھا خاص طور پر کلکتہ شہر کا جہاں تک تعلق ہے وہ نوآبادیاتی بنگال کے اولین لوگوں میں سے ایک ہیں جنہوں نے اپنی ابتدائی زندگی کے بارے میں یادداشت (memoir) لکھی۔ اس یادداشت سے ہم کو بہتر پتہ چلتا ہے کہ کس طرح انہوں نے کلکتہ کی شاہراہ سے پہلی بار گزرتے ہوئے میل کے پتھروں سے انگریزی اعداد کو سیکھا جب کہ ان کی عمر محض 9 سال تھی۔ لیکن ان کے والد جو خود سنسکرت کی تعلیم حاصل نہیں کر پائے تھے، اپنی خواہش کو پورا کرنے کی خاطر انہیں سنسکرت کالج میں داخلہ دلوایا۔ کسی بھی حالت میں سنسکرت کالج سے فارغ التحصیل طلباء کو روزگار کے مواقع حاصل تھے اگر وہ لا کمیٹی (Law Committee) کے امتحان کامیاب ہو جاتے ہیں۔ ودیاساگر نے بارہ سال تک سنسکرت کالج میں تعلیم حاصل کرتے رہے اور 1841 میں ہندو لا کمیٹی کا امتحان کامیاب کرنے کے بعد انہیں "ودیاساگر" کا اعزازی خطاب ملا۔ چونکہ انہیں ہندو قانونی پنڈت کی نوکری میں دلچسپی نہیں تھی لہٰذا انہوں نے فورٹ ولیم کالج میں بنگالی پنڈت کی نوکری حاصل کرلی۔

کالج کے سکریٹری جارج مارشل ان کی بہت تعریف کرتے تھے۔ فورٹ ولیم کالج سے جڑنے کے بعد انہوں نے انگریزی سیکھنا شروع کیا۔ وہ سنسکرت کالج کے اسسٹنٹ سکریٹری کے عہدہ پر فائز ہوئے لیکن اس عہدہ پر اپنی خدمات کو جاری نہیں رکھ پائے۔ کچھ سالوں کے بعد اسی ادارہ میں وہ پرنسپل کی حیثیت سے دوبارہ شامل ہوئے۔ یہی وہ دور ہے جب انہوں نے کئی اصلاحات متعارف کئے جس نے وسط انیسویں صدی میں بنگال کے معاشرہ پر کافی اثرات مرتب کیے۔ انہوں نے اخبار "تتوابودھی تیریکا" کے لئے لکھنا شروع کیا اور سماجی اصلاح کے فروغ کے لئے سرگرم ہو گئے۔

2.4.2 سماجی اصلاحات کا مسئلہ (The Question of Social Reform)

وہ کون سے عوامل تھے جس سے متاثر ہو کر انہوں نے سماج کی اصلاح اور بالخصوص خواتین کے کام شروع کئے؟ نو آبادیاتی بنگال کے وہ اولین لوگوں میں تھے جنھوں نے اپنی سوانحی یادداشت لکھی۔ اس یادداشت سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ان کے بچپن کی کہانی میں خواتین ایک مرکزی حیثیت رکھتے تھے۔ وہ بچپن جو نہایت فعلی اور مشکلات میں گزرا۔ ان کی والدہ پر سات بچوں والے خاندان کی کفالت اور بھوک مٹانے کی ذمہ داری تھی۔ ان کی ماں کی شفقت کے علاوہ بھی کئی دیگر خواتین بشمول بیوائیں وقتاً فوقتاً ان کے خاندان کی مدد کیا کرتی تھیں۔ اپنی یادداشت میں وہ ایک واقعہ کا ذکر کرتے ہیں کہ کس طرح ان کے والد جو روزگار کی تلاش میں کلکتہ گئے ہوئے تھے اور غذا نہ ملنے پر بے ہوش ہو گئے تھے۔ ایک اوسط عمر کی خاتون نے جو قریبی دوکان میں مٹھائی فروخت کر رہی تھی، انہیں اس حالت میں دیکھا اور انہیں کھانا کھلایا اور اس بات کا تیقن دیا کہ جب کبھی وہ بھوک کا شکار ہوں تو ان (خاتون) کے پاس غذا حاصل کرنے آجایا کریں۔ ودیا ساگر اپنی یادداشت میں مزید لکھتے ہیں کہ "اگر وہ مددگار کوئی مرد ہوتا تو یقیناً ان کے والد کے ساتھ اس طرح کی رحم دلی کا مظاہرہ نہیں کرتا۔ اسی کتاب میں کچھ اور واقعات کا بھی ذکر ہے کہ جب وہ کلکتہ میں بڑے ہو رہے تھے، تو ایک بیوہ جس کا نام ریمونی تھا ان پر شفقت ورحم دلی سے ایسے پیش آتی تھیں جیسے وہ ان کا اپنا بیٹا ہو۔ اسی واقعہ کا حوالہ دیتے ہوئے وہ لکھتے ہیں! "ایک ایسا شخص جسے ریمونی کی محبت وشفقت" اور رحم دلی ملی ہو، کوئی حیرانی کی بات نہیں کہ وہ خواتین کا حمایتی نہ ہو۔ ورنہ اس سے زیادہ ناشکرا کوئی اور شخص نہیں ہو سکتا۔"

سنسکرت کالج میں پرنسپل کا عہدہ سنبھالتے ہیں سب سے پہلا کام انہوں نے یہ کیا کہ نچلے طبقات کو داخلہ لینے کی اجازت دی (برہمن اور ویدیہ کے سوا طبقات)۔ انہوں نے سنسکرت کی قواعد کی آسان اور سادہ شکلوں کو متعارف کیا۔ مثلاً" سنسکرت قواعد کا تعارف، ریجوپتھ (Rijupath) یعنی سادہ اسباق اور ویاکرنا کومڈی (Vyakarana Kaumudi)۔ بعد میں جب وہ انسپکٹر آف اسکولس مقرر ہوئے تب انہوں نے دیسی تعلیم کے ذریعے عوام تک تعلیم کے پھیلاؤ کے مقصد سے اسکولوں کے قیام کا بیڑہ اٹھایا۔ البتہ ان کا سب سے دیرپا اثر رکھنے والا اور مشہور کام بنگالی زبان کو پرنٹ کی اور ادب کی زبان بنانا تھا۔ انہوں نے بنگالی حروف تہجی پر ایک کتاب برنا پریچے (Barna Parichay) تصنیف کی جس کے ذریعہ حروف تہجی کو آسان اور مؤثر انداز میں سیکھا جا سکتا تھا۔ اس کے علاوہ انہوں نے سوانحی حالات پر مبنی کہانیاں بھی لکھیں جس کے ذریعے روشن خیال یوروپ کے کئی افکار سے لوگ واقف ہوئے۔ عوامی تعلیم اور زبان کی جدیدیت کی کوششوں کے علاوہ وہ خوبصورت نثر لکھنے کے لئے بھی یاد کئے جاتے ہیں جو آگے چل کر بنگالی نثر نگاری کے لئے ایک معیار قرار پائی۔

اوپر بیان کی گئی تمام کاوشوں کے علاوہ انہوں نے معروف ادبی کلاسکس جیسے ایسوپ فیبلس (Aesop's Fables) شیکسپیر کی کامیڈی آف ایررز (*Comedy of Errors*)، اور کالی داس کی ابھگیان شاکنتلم (*Abhigyana Shakumtalam*) کے بھی تراجم کیے۔ انہوں نے سماجی مسائل جیسے کم عمر بچوں کی شادی (بالیاوواہ)، بہو وواہ (کثرت ازواج) پر بھی مضامین لکھے۔ آخرالذکر پر مضمون خصوصی طور پر کولن رواجوں کی اصلاح پر مرکوز تھا۔ کولن کثرت ازواج (Kulin Polygamy) رواج پر اس سے قبل رام موہن رائے نکتہ چینی کر چکے تھے اور بعد میں ڈیروزینوں (Derozians) نے اس رسم کے خلاف احتجاج بھی کیا تھا۔ لیکن بہت سارے

فعالی دانشوران اور نو آبادیاتی افسران کا خیال تھا کہ کثرت ازدواج ایک ماضی کی چیز ہے اور یہ رسم خود بخود ختم ہو جائے گی۔ ودیا ساگر کی سوچ اس کے برخلاف تھی۔ لہٰذا انہوں نے ضلع ہگلی میں ایسے کولن برہمنوں کی جن کے چار سے زیادہ باحیات بیویاں ہو، اصلی تعداد کا اندازہ لگانے کے لئے ایک سروے کرایا۔ اس جدّت پسند سرگرمی سے انہیں ثبوت ملا کہ محض ایک ضلع میں ہی اس طرح کے 130 کولن برہمن موجود ہیں۔ حالانکہ انہوں نے کولنزم کو ممنون قرار دینے کے لئے دستخطی مہم چلائی تھی لیکن حکومت مذہبی و ثقافتی معاملوں میں دخل اندازی کے بارے میں شکوک وشبہات رکھتی تھی خاص طور پر 1857 کی بغاوت کے بعد۔ بہر حال انیسویں صدی کے اختتام تک نو آبادیت کی یہ رسم خود بخود دم توڑ گئی۔

ہندو بیواؤں کی دوبارہ شادہ کے مسئلہ پر انہوں نے تحریک چلائی جو کہ کامیاب رہی اور حکومت نے اس کی حمایت میں قانون منظور کر دیا۔ بیواؤں کی دوبارہ شادی پر ان کی تحریروں کا محرک انسانیت پسند موقف اور شاستروں کا موقف دونوں ہی تھے۔ اپنے پیش رو رام موہن رائے کی طرح ان کا بھی یہ خیال تھا کہ سماجی اصلاح کے اس طرح کے مسائل کو محض انسانیت پسند موقف کے ذریعے لڑا نہیں جا سکتا۔ لہٰذا جس طرح رام موہن رائے نے ستی کی رسم کے خلاف لِگنہ وا کیا کے حوالے سے ایک لکیر کھینچی تھی، اسی طرح ودیا ساگر نے پر ساراسمہتا میں بیواؤں کی دوبارہ شادی کے موضوع پر بات کہی گئی۔ ودیا ساگر کی درخواستوں اور مسلسل جدوجہد رنگ لائی اور وہ بالآخر گورنر جنرل لارڈ ڈلہوزی نے اس معامل پر ذاتی دلچسپی لیتے ہوئے سال 1856 میں ایک قانون کو نافذ کر دیا۔ اسی سال یعنی 1856 میں ودیا ساگر کے عظیم تعاون سے اونچی ذات کے اندر پہلی ہندو بیوہ کی دوبارہ شادی انجام پائی۔ کچھ سال بعد ان کے بیٹے نارائن نے بھی ایک بیوہ سے شادی کی۔ ودیا ساگر کو نسل در نسل چلے آرہے رسومات ورواجوں کی طاقت کا بہت عرصہ بعد احساس ہوا جس کا اعتراف انہوں نے بیواؤں کی دوبارہ شادی کے موضوع پر اپنی دوسری تصنیف میں کیا۔ ودیا ساگر کو نسل در نسل چلے آرہے رسومات ورواجوں کی طاقت کا بہت عرصہ بعد احساس ہوا جس کا اعتراف انہوں نے بیواؤں کی دوبارہ شادی کے موضوع پر اپنی دوسری تصنیف میں کیا۔ ہمارے ملک کے بیش تر افراد شاستروں کے تعلق سے لاعلم ہیں۔ لہٰذا جب کسی مسئلے پر بحث چھڑتی ہے تو وہ دونوں فریقین کے استدلالوں کا تجزیہ کر کے ان کے بارے میں اپنی رائے قائم کرنے سے قاصر رہتے ہیں اور سچائی کو حاصل کرنے میں ناکام رہتے ہیں۔

2.4.3 انسانیت پسندی بحیثیت مذہب (Humanism as Religion)

راجہ رام موہن رائے کے برخلاف جن کا مقصد ہندو مذہب کی اصلاح تھا۔ ودیا ساگر کے مذہب کے تعلق اور خدا کے وجود کے تعلق سے عقائد یا تو غیر واضح ہیں یا غیر معلوم ہیں۔ یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ ان کے نظریہ میں مذہب پس پردہ چلا جاتا ہے اور انسانیت پسندی کو مرکزی حیثیت حاصل ہو جاتی ہے۔ ان کے سماجی پس منظر اور پھر سنسکرت اسکول میں تعلیم کو پیش نظر رکھیں تو ہم تذبذب کا شکار ہو جاتے ہیں کہ آیا ہم انہیں قدامت پسندوں میں شمار کریں یا پھر ایک روایتی سنسکرت پنڈت کا درجہ دیں۔ درحقیقت کچھ ایسے سوال بھی اٹھائے گئے ہیں کہ کیا کوئی شخص بیک وقت قدامت پسند اور جدت پسند دونوں ہو سکتا ہے؟ کیا ان کے سماجی مصلح ار سنسکرت پنڈت کی حیثیت سے نبھائے گئے دونوں کرداروں میں کوئی تنازعہ تھا؟ ودیا ساگر نسلی تعصب کا شکار رہے اور یہ معاملہ 1857 کی بغات کے بعد سخت ترین شکل میں

نمودار ہوا۔اس کے علاوہ نوآبادیاتی طرز ترقی کے ماڈل(Colonial Model of Development)کے تعلق سے ان کی بات کو بہت کم لوگوں نے سمجھا۔اشوک سین بجا طور پر بحث کرتے ہیں کہ اصلاح کے تئیں ''کہنے اور کرنے'' کے درمیان بہت فرق پایا جاتا تھا کیونکہ آخرالذکر کے ہاں کوئی ایسا نظام نہیں تھا جس سے کہ وہ نموپ اس کے اور قائم رہ سکے۔ بریان ہاچر(Brian Hatcher)کے بقول 'یہ اس جائیداد کے سبب تھا جہاں ودیا ساگر جیسے لوگ زمیندار طبقہ کی صورتحال پر اپنا دباؤ بنانے میں ناکام ہوگئے،ان سے التجا کی اور امانت و امداد کو قبول کیا۔انہوں نے جائیداد اور ذات وغیرہ کی درجہ بندی کو یقینی بنادیا۔' جب ودیا ساگر تبدیلی لانے کے لیے شاستروں کا استعمال کررہے تھے،ت وہ دھرم کے لیے خطرہ نہیں بن رہے تھے بلکہ وہ دھرم کے دائرہ میں رہ کرہی درجہ بندی نظام (Hierarchical System) زمیندارانہ نظام کی بااختیاری کے لیے کام کررہے تھے۔

جیسا کہ پچھلے صفحات میں کہا جاچکا ہے کہ برطانوی سیاست برائے نمائندگی/ مستشرقی ساخت (Orientalist Discourse) پر ہندوستانیوں کا ملاجلا ردعمل تھا۔ہندوستانی دانشوران نوآبادیاتی مباحث سے مکمل طرپر اتفاق نہیں رکھتے تھے۔انہوں نے اپنا خود کا ایک الگ راستہ کھوج لیا تھااور رام موہن رائے اور ودیا ساگر دونوں شخصیات کے ہاں ان مباحث کی متبادل اشکال کی نشاندہی کو لے کر مشابہت پائی جاتی ہے اور ودیا ساگر ان مباحث کے جواب میں زیادہ واضح تھے۔وہ مغربی قوم پرستی سے متاثر تھے لیکن بیشتر اوقات وہ ہندوازم کے اندر پائی جانے والی سماجی برائیوں کے بارے میں اپنی بات کہتے تھے۔انہں نے قدیم ہندستانی صحیفوں اور متون کا استعمال مذہبی مسائل کا حل تلاش کرنے کے لیے کیااور اس کے ساتھ ہی مختلف مسائل جیسے خواتین سے جڑے سوالات کے جوابات کے لیے انہوں نے ان صحیفوں ار متون کی نئے سرے سے تشریح بھی کی جو کہ بلاشبہ ان کا تخلیقی کام تھا۔اس اعتبار سے انہوں نے راجہ موہن رائے کی جانب سے اصلاح کا جو سوال اٹھایا گیا تھا اس کو بہتر آگے تک لے گئے۔انیسویں صدی یا ابتدائی بیسویں صدی کے بنگال کے سماجی معاشرہ میں خواتین تاریخی اعتبار سے اس مقام تک نہیں پہنچ پائی جہاں وہ اپنے حقوق کو منوا سکیں۔کسی بھی مصلح کار(Reformer)نے خواتین کے موقف و مقام میں اصلاح کے تئیں خواتین کی رائے عامہ کو ہموار کرنے کی بابت سوچا ہے ہی نہیں چہ جائیکہ اصل اصلاح کے عمل میں ان کی فعال حصہ دار کے بطور ان کو شامل کرنے کی کوشش کے بارے میں کوئی بات کی جائے۔یہ اصلاح کی کوششوں کی ناکامی کے بارے میں بہت کچھ بیان کرتا ہے۔

2.5 سرسید احمد خاں (Sir Syed Ahmad Khan)

سرسید احمد خاں(1817تا1898)دہلی میں میں 1817 میں ایک اعلیٰ نسب گھرانے میں پیدا ہوئے۔ان کے والدین سید محمد متقی اور عزیزالنساء تھے۔ان کے خاندان نے کئی پشتوں تک مغل حکومت میں خدمات انجام دیں۔ان کے نانا خواجہ فریدالدین مغل بادشاہ اکبر شاہ ثانی کے دربار میں وزیر کے عہدہ پر مامور تھے جبکہ ان کے والد اکبر شاہ ثانی کے ذاتی مشیر تھے۔ان کی ابتدائی تعلیم غیر رسمی طریقے پر ہی ہوئی اور انہیں عربی قواعد،فارسی ادب،علم فلکیات اور اسلامی فقہ کی تعلیم دی گئی۔1838 میں ان کے والد کے انتقال تک انہوں نے عیش و عشرت میں زندگی گزاری۔والد کے انتقال کے بعد انہوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت اختیار کی جس پر ان کے نانا فائز تھے۔

2.5.1 نوآبادیاتی پس منظر اور مسلمانوں کے حالات (Colonial Context and Muslims' Condition)

سر سید احمد خاں کے نوجوانی کے در میں پہنچنے تک کمپنی ترقی کرتے ہوئے بہت مستحکم ہو چکی تھی۔ کمپنی کی حکومت جب شمالی ہندوستان میں دہلی تک پہنچ گئی تب مغل شاہی خاندان کے ارکان اور مسلمانوں کے طبقے اشرافیہ کو حاصل کردہ اختیارات میں عمومی طور پر گراوٹ آگئی۔ مسلمان طبقہ اشراف بڑی اور وسیع زمینوں کے مالک تھے۔ انہیں برطانوی کلکٹروں کی جانب سے ان کی جائیدادوں کے تعلق سے بار بار تفتیش کا سامنا کرنا پڑتا تھا جبکہ اسی دور میں گورنر جنرلس مغل وارثوں کو ان کے مقامات کو تبدیل کرتے رہنے میں دلچسپی رکھتے تھے۔ اور پھر بہادر شاہ ظفر کے بعد بادشاہوں کو محض ''شاہزادوں''کا درجہ دیا گیا اور بادشاہ کا لقب ان سے چھین لیا گیا۔

الغرض 1857 کے موقع پر مسلمان طبقہ اشرافیہ اور عوام دونوں میں ہی انگریزوں کے تئیں عدم اطمینان اپنے عروج پر تھا اور یہی عدم اطمینانی اور غصہ بغاوت کا ایک اہم سبب بھی تھا۔ انیسویں صدی میں مسلم طبقہ اشراف ایسٹ انڈیا کمپنی کے ابھرنے اور پھیلنے کے درمیان بہت حد تک الگ تھلگ رہا جبکہ دوسری طرف اسی طبقہ کی قدر و منزلت، عزت و وقار اور اختیارات میں بتدریج گراوٹ آتی رہی۔ مسلم اشرافیہ طبقہ کے مذہبی نظریات میں بھی ان حالات کی وجہ سے تبدیلیاں رونما ہونے لگیں۔ خاص طور پر شاہ ولی اللہ کی تعلیمات اور ''خالص تر اسلام'' پر ان کی تبلیغ نے مسلمانوں کو بہت متاثر کیا۔ روایت پسند علماء اور مہذبی مولویوں کے خلاف نفرت بھی ابھرنے لگی۔ یہاں تک کہ 1830 کے دہے میں جب شمالی ہندوستان میں ایک مشنری مرکز قائم ہوا اور اس مرکز میں ہندو اور مسلمان دونوں مذاہب کو بدعنان اور پسماندہ مذاہب کے بطور پیش کیا گیا۔ مسلمان مولویوں نے مغربی تہذیب اور عیسائی مشنریوں سے اس وقت بھی کسی قسم کی بات چیت کرنے سے گریز کیا۔ اس کی وجہ ان کی مغربی فلسفہ اور اور عیسائیت کے تئیں عدم واقفیت تھی۔ اس حوالے سے انیسویں صدی میں مذہب اسلام کی نئے انداز سے تشریح مسلمانوں میں بتدریج بڑھنے لگی اور اس ضابطہ اخلاق سے ایک چھوٹا سا بھی انحراف مذہب سے انحراف قرار دیا جانے لگا۔

مسلمانوں میں تعلیم کے تین طرح کے ادارے رائج تھے، مکتب، فارسی مدرسے اور دینی مدرسے۔ اور یہ مدارس مسلمانوں میں تعلیم کے مقاصد کو پورا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ جب 1827 میں دہلی میں جب ایک کالج قائم کیا گیا، تو طبقہ اشراف سے تعلق رکھنے والے مسلمانوں میں انگریزی تعلیم کے تعلق سے مثبت رجحان نہیں پایا گیا۔ البتہ کچھ نوجوان طلباء جن کے پاس سوائے اس کے کہ وہ برائے نام اشراف میں شمار ہوتے تھے، اس کالج میں داخلہ لیا کیونکہ یہ طلباء پرائیویٹ اداروں میں داخلے کے لیے معاشی طور پر اہل نہیں تھے۔ 1838 میں والد کے انتقال کے بعد خاندان کی کفالت کی ذمہ داری سر سید اور ان کے بھائی کے کاندھوں پر آپڑی۔ ان کے ماموں مولوی اثاثیل الدین جو دہلی کے صدر امین کے عہدہ پر فائز تھے، کے توسط سے سر سید نے ایسٹ انڈیا کمپنی میں آگرہ میں 1839 میں نائب منشی کی ملازمت اختیار کرلی۔ آگرہ میں ملازمت کے دوران انہیں کمپنی کے نظم و نسق انگریزی اور مغربی تعلیم کو بہت قریب سے مطالعہ کرنے کا موقع ملا۔ اور اسی نے آگے چل کر سر سید کے کیریئر اور مستقبل پر گہرا اثر ڈالا۔

2.5.2 غدر اور اصلاح کے لیے کاوشیں (Rebellion and Efforts for the Reform)

1857 میں رونما ہونے والا غدر کمپنی کے تئیں ان کی وفاداری کو جانچنے کے لیے ایک آزمائش کی حیثیت رکھتا تھا۔ یوں تو غدر کی شروعات سپاہیوں کی بے چینی اور بے اطمینانی کے سبب ہوئی تھی، لیکن بہت جلد سماج کے دیگر تمام طبقات اس میں شامل ہو گئے۔ حالانکہ غدر میں ہندو سپاہیوں کا فیصد دوسروں کی بہ نسبت زیادہ تھا، مگر انگریزوں نے اسے اپنا کھویا ہوا اقتدار حاصل کرنے کے لیے مسلمانوں کی جانب سے کی گئی سازش کے بطور دیکھا۔ بغاوت ک کچلنے کے بعد انگریز مسلمانوں کے تئیں مشکوک میں مبتلا ہو گئے۔ کچھ عرصہ تک مسلمانوں کے ساتھ امتیاز بھی برتا گیا۔ یہ پورا سانحہ سرسید کی زندگی میں ایک نئے موڑ کا سبب بنا۔ غدر کے بعد د سالوں تک وہ اس کے اسباب کا تجزیہ کرنے میں صرف کیے ار اس کے بعد اپنی کتاب ''اسباب بغاوت ہند'' نامی کتاب شائع کی، جو بلاشبہ غیر برطانوی فرد کی جانب سے اس موضوع پر لکھی جانے والی پہلی کتاب تھی۔ سرسید کے خیال میں بغاوت کا سب سے اہم سبب گورنر جنرل کونسل میں ہندوستانی نمائندگی کا فقدان تھا۔ اور اس فقدان کی وجہ یہاں کے مقامی لوگوں میں خواندگی کی کمی تھی۔ ان کی اس تصنیف نے بہت حد تک مسلمانوں اور برطانوی حکمرانوں کے درمیان حائل چیلنج کو پُر کرنے میں مدد کی۔ ان کی ابتدائی اشاعتوں میں ان کے جاری کردہ میگزین 'ہندوستان کے وفادار مسلمان'' بھی اس حوالے سے اہمہ ہے کہ اس میگزین کے ذریعے انہوں نے یہ بتانے کی کوشش کی کہ مسلمانوں انگریموں کے وفادار ہیں۔ مزید برآں انہوں نے مسلمانوں ار عیسائیوں کے درمیان فاصلے کو دور کرنے کی خاطر بائبل کا اردو اور فارسی میں ترجمہ بھی کیا اور ساتھ ہی بائبل کی تشریح قرآن کے حوالے سے کی۔ اس ترجمہ نے اس بات کو ظاہر کیا کہ دراصل بائبل اور عیسائیت خدا کے حقیقی پیغام ہیں اور اس کے ساتھ یہ ریمارک بھی کیا کہ ''اسلام بھی خدا کی جانب سے حاصل ہونے والا آخری پیغام ہے۔'

2.5.3 ایم اے او کالج کے قیام کے تئیں کوششیں

(Efforts for the Establishment of MAO College)

ہندوستانیوں میں سائنسی رویوں کو پرواز چڑھانے کی خاطر انہوں نے ''سائنٹفک سوسائٹی'' کو 1863 میں قائم کیا۔ اس سوسائٹی کا نام بعد میں بدل کر ''سائنٹفک سوسائٹی آف علی گڑھ'' رکھا گیا۔ بہت جلد اس سوسائٹی نے مقبولیت حاصل کر لی اور اس کے ارکان کی تعداد میں روز افزوں ترقی ہونے لگی۔ نوآبادیاتی حکومت اس سوسائٹی کو مثبت نظر سے دیکھتی تھی اور سوسائٹی کو چند باا ثر شخصیتوں جیسے راجہ جے کشن داس وغیرہ کی سرپرستی بھی حاصل رہی۔ یہ مسلمانوں اور انگریزوں کے تعلقات استوار کرنے کا ایک پلیٹ فارم تھا۔ سرسید کا اپنایا گیا یہ راستہ آسان نہیں تھا کیونکہ انہیں علماء اور مولویوں کی سخت تنقیدوں کا نشانہ بننا پڑا جو انگریزی تعلیم کی مخالفت کرتے تھے۔ ان علماء اور مولویوں کا یہ ماننا تھا کہ انگریزی تعلیم مسلمانوں کو دین کے راستے سے بھٹکائے گی اور اس مخالفت کا اثر تھا کہ سرسید کو کفر کا فتویٰ بھی صادر کیا گیا۔ ان تمام تر مخالفتوں کے باوجود سرسید اپنی کوششوں اور عزم سے باز نہیں آئے کیونکہ ان کا ایقان تھا کہ مسلمانوں کی سیاسی ترقی کے لیے انگریزی تعلیم کا حصول ناگزیر ہے۔ سائنٹفک سوسائٹی نے مختلف موضوعات پر لکھی گئی تقریباً 25 انتہائی اہمیت کے حامل تصانیف کا اردو میں تراجم بھی کیے جس میں تاریخی طور پر اہم جے یس مل کی تصنیف بھی شامل ہے۔

1869 میں سر سید نے انگلینڈ کا دورہ کیا جسے ان کی زندگی کا اہم ترین موڑ قرار دیا جاسکتا ہے۔اس دورہ نے ان کے تعلیم اور روایت پسندی کے تئیں نظریات میں تبدیلی لائی۔انگلینڈ کے دورہ کے بعد انہیں اس بات کا یقین ہو گیا کہ انگریزی یا مغربی تعلیم کو عوامی تحریک میں بدلنا چاہیے۔ انہوں نے مسلم کمیونٹی میں انگریزی تعلیم کے تئیں منفی ریّو کا اندازہ لگانے کے لئے ایک سروے کرایا۔بیش تر مسلمانوں کو یہ خدشات لاحق تھے کہ اسلامی اور قرآنی تعلیمات پبلک اسکوں میں نہیں پائے جاتے اور انہی خدشات کا نتیجہ تھا کہ مسلمانوں کا بہت کم فیصد پبلک اسکولوں میں تعلیم حاصل کرنے والوں میں تھا۔ان کو یہ بھی ڈر تھا کہ انگریزی تعلیم کم عمر بچوں کے ذہنوں کو آلودہ کرتے ہوئے انہیں اسلامی اعمال سے دور کردیں گے۔لٰہذا سر سید کے کاموں میں ایک اہم کام یہ تھا کہ تعلیم کا ایک ایسا ڈیزائن تیار کریں جہاں اسلامی تعلیمات کے ساتھ ساتھ مغربی تعلیم سے بھی بچے مستفید ہوں۔انہوں نے قرآن اور قدرتی قانون میں ہم آہنگی دیکھی کہ دونوں آپس میں ایک دوسرے کی معاونت کرتے ہیں اور لوگوں کا یہ اعتقاد کہ دونوں (قرآن اور قدرتی قانون) ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں۔ محض مسلمانوں کی لاعلمی اور قرآن کی مناسب تشریح کی کمی کے سبب سے ہے۔

لٰہذا کالج کے قیام کے لئے چندہ اکٹھا کرنے کی ہم کا آغاز ہوا۔سر سید کے ساتھ ان کے کئی رفقانے اس کام میں ان کا ساتھ دیا اور پھر یہ سعی ثمر آور ہوئی۔1675 میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج علیگڑھ کا قیام عمل میں آیا۔اس کالج کے قیام کا مقصد مسلم نوجوانوں کو بغیر ان کے مذہبی اعتقادات کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کئے مغربی تعلیم فراہم کرنا تھا۔شروعات میں اس کالج میں دو علٰحدہ شعبے تھے۔شعبہ انگریزی اور اورینٹل شعبہ۔پہلے شعبہ میں تمام مضامین انگریزی میں پڑھائے جاتے تھے جب کہ دوسرے شعبہ میں تمام مضامین اُردو میں پڑھائے جاتے تھے اور ساتھ میں انگریزی بھی بحیثیت زبان دوم سکھائی جاتی تھی۔یہ کالج آکسبرج (Oxbridge) طرز کا ادارہ تھا جہاں طلباء کے لئے اقامت خانہ کی بھی سہولت مہیا کی گئی تھی۔کالج کی عمارت کا طرز تعمیر بھی اسلامی اور مغربی ثقافت دونوں کا ایک نفیس امتزاج پیش کرتا تھا۔چونکہ کئی ہندوؤں نے بھی اس کے قیام کے لئے مالی امداد کی تھی اس وجہ سے ابتدائی مرحلہ میں اس کالج میں داخلہ کو غیر مسلمانوں کے لئے بھی کھلا رکھا گیا تھا۔اس کے باوجود کم از کم ابتدائی سالوں میں اس کالج میں مسلم امراء اور دولت مند طبقہ کے طلبا نے داخلہ لیا،اور اسطرح مسلم طبقہ اشراف کا مغربی تعلیم کی طرف رخ ہوا جس مین سر سید کی دور اندیشی نے کلیدی کردار ادا کیا۔

2.5.4 تعلیم بحیثیت سیاسی ردعمل (Education as Political Reaction)

مسلمانوں کو مغربی تعلیم کی طرف لے جانے کی کوششوں نے مسلمانوں کی شناخت اور مسلمانوں کی بحیثیت ایک قوم پہچان بنانے میں بہت مدد کی۔جیسا کہ پہلے بتایا جاچکا ہے،ان کی اس تحریک نے مغربی تعلیم کے حصول کے ضمن میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان پائی جانے والی خلیج کو کم کرنے کی کامیاب کوشش کی اور اس کے ساتھ ساتھ مسلم شناخت کو ایک سیاسی قوت کے اعتبار سے مستحکم کرنے میں مدد ملی۔

2.5 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

نوآبادیاتی حکومت کے ساتھ مقابلہ آرائی نے ہندوستانیوں میں تحریک پیدا کی اور انہیں خود کا محاسبہ کرنے پر مجبور کردیا۔ یہ محاسبہ ماقبل نوآبادیاتی ہندوستان کے سماجی اصلاحات کی تحریکوں سے مختلف تھا۔ انیسویں صدی میں مختلف طریقوں کے دانشورانہ ردعمل دیکھنے کو ملے جن کو اس اکائی میں تین مختلف شخصیات کی زندگیوں اور ان کے کارہائے نمایاں کے ذریعے پیش کیا گیا۔ انہوں نے سماج کے توہم پرستانہ اور قدامت پسندانہ رسول ورواج پر کڑی تنقید کرتے ہوئے ان میں اصلاحات لانے کی کوشش کیں۔ یہ شخصیات خاص طور پر راجہ رام موہن رائے اور ودیاسا گرنے خواتین کے حقوق کے حصول کی کوششیں کیں اور اس میں کامیاب ہوئے۔ رام موہن رائے اور سرسید احمد خان، دونوں نے انگریزی زبان اور جدید سائنسی سوچ کے درمیان ایک مضبوط ربط کو دیکھا اور سماج کو باشعور بنانے، دانشورانہ اصلاحی تحریک کو انجام دینے کو لازمی خیال کیا اور اسی سبب سے انگریزی اسکولوں کو قائم کرتے ہوئے علم کے اس خلا کو پُر کرنے کی جدوجہد کی۔ رام موہن رائے کو بحیثیت مصلح ہم جدیدیت کے پیشواکے طور پر دیکھتے ہیں جنہوں نے مذہبی وسماجی اصلاحات کے ساتھ ساتھ بنگالی کو بھی ادبی زبان بنانے میں اہم کردارادا کیا۔ سرسید کی اصلاحات کا نچوڑ یہ ہے کہ انہوں نے انگریزی زبان اور اسلامی اقدار اور رواجوں کو ہم آہنگ کرنے اور مسلمانوں میں ایک دانشور طبقہ کی تخلیق کرنے میں کامیاب رہے۔

2.6 کلیدی الفاظ (Keywords)

Polygamy	:	کثرت ازدواج یا متعدد بیویاں
Monotheism	:	توحید یا ایک خدا کو ماننا
Social Reform	:	سماجی اصلاح
Intellectual	:	دانشور

2.7 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

2.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Very Short Answer Type Questions)

1. کسے 'جدید ہندوستان کا بابا' کہا جاتا ہے؟
2. 'آتمیہ سبھا' کس نے قائم کی؟
3. رام موہن رائے نے اپنشدوں کا کس زبان میں ترجمہ کیا؟
4. رام موہن رائے کو 'راجہ' کا خطاب کس نے دیا؟
5. کس نے کالی داس کے ابھگیان شاکنتلم کا ترجمہ کیا؟

6. ایشور چندر کا لقب کیا ہے؟
7. تتوابودھینی پتریکا کس نے جاری کی؟
8. ‘Loyal Mohammedans of India’(ہندوستان کے وفادار مسلمان) کس نے لکھی؟
9. ’سائنٹیفک سوسائٹی‘ کس نے قائم کی؟
10. علی گڑھ میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کا قیام کس نے کیا؟

2.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. رام موہن رائے اور ودیاساگر کے اصلاحات کیوں صحیفوں کے ارد گرد مرکوز تھے؟
2. رام موہن رائے کی ستی کے خلاف لڑائی کو تفصیل سے بیان کیجیے۔
3. ایشور چندر ودیاساگر نے کس طرح روایتوں اور جدّت پسندی میں توازن قائم کیا؟
4. ودیاساگر نے بیواؤں کی دوبارہ شادی کے لئے کیوں صحیفوں کو بنیاد بنایا؟ ان کی کی گئی کوششوں میں کون سی خامیاں پائی جاتی ہیں۔

2.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. 1857 کی بغاوت کیوں کر برطانوی اور مسلمانوں کے مابین تعلقات کے لئے ایک اہم نشانی تھی؟ تفصیلی وضاحت کیجیے۔
2. انیسویں صدی کے ہندوستان میں بیواؤں کی دوبارہ شادی کے مسئلہ پر
3. سرسید احمد خان کی جانب سے محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کے قیام کے پیچھے کون سے عناصر کارفرما تھے! تفصیل سے وضاحت کیجیے۔

2.9 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Learning Resources)

1. Alam, Arshad, ‘Syed Ahmed Khan and His Educational Ideas’, *Contemporary Education Dialogue*, 16, no. 1 (2019): 108–124.
2. Belmekki, Belkacem, ‘Sir Sayyid Ahmad Khan’s Framework for the Educational Uplift of the Indian Muslims during British Raj,’ *Anthropos*, H. 1 (2009): 165–172.
3. Hardy, Peter, *The Muslims of British India*, Cambridge: Cambridge University Press, 1972.
4. Hatcher, Brian A., *Vidyasagar: The Life and After-life of an Eminent Indian*. Routledge India, 2014.
5. Hatcher, Brian A., ‘Bourgeois Vedānta: The Colonial Roots of Middle-Class Hinduism,’ *Journal of the American Academy of Religion*, 75, no. 2 (2007): 298 –323.
6. Hatcher, Brian A., ‘Remembering Rammohan: An Essay on the (Re-) Emergence of Modern Hinduism, *History of Religions*, 46, no. 1 (2006): 50–80.
7. Sen, Amiya P., *Social and Religious Reform*: *The Hindus of British India*, *New Delhi* (2003).
8. Sen, Amiya P., *Rammohun Roy: A Critical Biography*, Penguin, UK, 2012.
9. Sen, Amiya P., *Explorations in Modern Bengal*, *C. 1800–1900: Essays on Religion*, *History*, *and Culture*, Primus Books, Delhi, 2010.

اکائی 3۔ قوم پرستی: نظریات اور مباحث

(Nationalism: Theories and Debates)

اکائی کے اجزا

3.0 تمہید

3.1 مقاصد

3.2 قوم پرستی

3.3 ہندوستان میں قوم پرستی

3.4 ہندوستانی قوم پرستی کے مختلف نظریات

3.4.1 کیمبرج مکتبہ فکر قوم پرست نظریہ

3.4.2 قوم پرست نظریہ

3.4.3 مارکسی نظریہ

3.4.4 سبالٹرن اسکول

3.5 اکتسابی نتائج

3.6 کلیدی الفاظ

3.7 نمونہ امتحانی سوالات

3.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

3.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

3.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

3.8 تجویز کردہ اکتسابی مواد

3.0 تمہید (Introduction)

قوم پرستی نہ صرف ہندوستان بلکہ پوری دنیا میں عصری سیاست کا سب سے متنازعہ موضوع ہے۔اس کی مناسبت کے بارے میں اہل علم کے درمیان بحث موجودہ دور میں بھی جاری ہے۔ پچھلی دو صدیوں کے دوران قوم پرستی ایک زبردست سیاسی نظریہ کے طور پر ابھری ہے جس نے تاریخ سازی میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس نے پرجوش وفاداریوں کے ساتھ ساتھ گہری نفرت کو بھی متاثر کیا ہے۔ اس نے جہاں لوگوں کو متحد کیا ہے وہیں انہیں تقسیم بھی کیا ہے۔ جہاں اس نے لوگوں کو ظالم حکمرانی سے آزادی دلانے میں مدد کی، وہیں یہ تنازعات، تلخیوں اور جنگوں کا سبب بھی رہا ہے۔ سلطنتوں اور قوموں کے زوال کی ایک وجہ بھی رہی ہے۔ بیسویں صدی کے اوائل میں یورپ میں آسٹریا ہنگری اور روسی سلطنتوں کے ساتھ ساتھ ایشیا اور افریقہ میں برطانوی، فرانسیسی، ڈچ اور پرتگالی سلطنتوں کے ٹوٹنے کی جڑ نیشنلزم تھی۔ ہندوستان اور دیگر سابق کالونیوں میں نوآبادیاتی حکمرانی سے آزادی کی جدوجہد میں ایک قوم پرست جدوجہد بھی تھی۔ قوموں کی سرحدوں کو از سر نو ترتیب دینے کا عمل اب بھی جاری ہے۔ ہم اس سوال پر متفق ہو سکتے ہیں کہ قوم پرستی اب بھی دنیا میں ایک غالب قوت ہے۔ لیکن قوم یا قوم پرستی جیسے الفاظ کی تعریف کے حوالے سے کسی اتفاق رائے تک پہنچنا بہت مشکل ہے۔ آخر قوم کیا ہے؟ یہ کیسے اور کہاں سے ابھرا؟ کیا ہندوستان میں قوم پرستی انگریزوں کا تحفہ ہے یا اس کے عناصر اس سے پہلے بھی ہندوستانی سیاست اور معاشرے میں موجود تھے؟ اس یونٹ میں ان تمام سوالات کے جوابات تلاش کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ اس کے علاوہ قوم پرستی کے نقطہ نظر کے حوالے سے مختلف مورخین کے درمیان جاری بحث کا مختصر جائزہ لینے کی بھی کوشش کی جائے گی۔ اس یونٹ کی تیاری میں بنیادی طور پر شیکھر بندیوپادھیائے اور ابھے کمار کی تحریروں کو بنیاد بنایا گیا ہے۔

3.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- قوم پرستی کی ابتدا اور ارتقاء کو سمجھ سکیں گے۔
- مختلف مورخین کی طرف سے دیے گئے قوم پرستی کے نظریات کو سمجھنا آسان ہو جائے گا۔
- ہندوستان میں قوم پرستی اور اس سے متعلق مختلف نظریات کو سمجھ سکیں گے۔
- قوم پرست مورخین کے نظریے اور ان کے نتائج کو سمجھنے کے لیے ایک نیا نقطہ نظر سامنے آئے گا۔

3.2 قوم پرستی (Nationalism)

قوم پرستی بنیادی طور پر ایک جدید یورپی خیال ہے جس کی جڑیں اٹھارویں صدی تک تلاش کی جا سکتی ہیں۔ مورخین کا عام طور پر خیال ہے کہ قوم پرستی کا آغاز یورپ خصوصاً مغربی یورپ میں ہوا۔ یہاں سے یہ دنیا کے دوسرے حصوں میں پھیل گیا۔ عام طور پر، قوم کا مطلب لوگوں کا ایک گروہ ہے جو 'پیدائش' یا 'جائے پیدائش' سے جڑا ہوا ہے۔ اصل میں اس کا مطلب ایک ہی نوع کے لوگوں سے تعلق رکھتا تھا۔

تاہم، جب اس کی وضاحت کرنے کی بات آتی ہے، تو یہ معروضی اور موضوعی دونوں ہو سکتی ہے۔ اس کی معروضیت کی تعریف ثقافتی طور پر کی گئی ہے—جو ایک ہی زبان بولتے ہیں، ایک ہی مذہب کی پیروی کرتے ہیں، اور مشترکہ تاریخ اور یادوں کے پابند ہیں۔ تاہم، بینیڈکٹ اینڈرسن نے *(Imagined Communities: Reflections on the Origin and Spread of Nationalism* 1983) میں تسلیم کیا ہے کہ اس جیسی خصوصیات والی قوم کو تلاش کرنا ایک مشکل کام ہے۔ لہذا، اینڈرسن نے قوم کو اس کے اراکین کے ذریعہ تخلیق کردہ ایک نفسیاتی سیاسی عمل قرار دیا ہے، جسے اس نے Imagine Political Community کہا ہے۔ اسے Imagined Community کہا جاتا ہے کیونکہ ایک چھوٹی ریاست میں بھی لوگ ایک دوسرے کے بارے میں نہیں جانتے لیکن تصور کرتے ہیں کہ وہ ایک قوم کا حصہ ہیں۔ اینڈرسن اس پوری قوم کی تعمیر میں پرنٹ کیپیٹلزم، مقامی زبان، مردم شماری، نقشے، عجائب گھر وغیرہ کے کردار کو اہم سمجھتے ہیں۔

قوم پرستی کے ایک اور نظریہ نگار ارنسٹ گلینر نے اپنی کتاب نیشن اینڈ نیشنلزم *(Nations and Nationalism*, 1983) میں قوم پرستی کو جدیدیت سے جوڑا ہے۔ وہ پوری قوم پرستی کو ایک جدید نظریے کے طور پر دیکھتے ہیں اور اسے سترہویں اور اٹھارویں صدیوں میں یورپ میں ہونے والی صنعت کاری سے جوڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ جب کہ جاگیردارانہ معاشرے یا 'پری ماڈرن' معاشرے اپنے جاگیردارانہ بندھنوں اور رشتوں کے پابند ہوتے ہیں، جدید صنعتی معاشرے میں کوئی مستقل بندھن نہیں بن سکتا کیونکہ یہ معاشرہ زیادہ متحرک اور مسابقتی ہے۔ اس لیے کچھ اقدار اور نظریات کا ہونا ضروری ہے جو اس معاشرے کی ثقافتی یکسانیت کو برقرار رکھیں، جن کی بنیاد قوم پرستی ہے۔ لہذا، قوم پرستی کی ترقی صنعتی معاشرے کی ضروریات کو پورا کرتی ہے. یہ آنے والے معاشرے میں بھی جاری رہے گا کیونکہ اب پہلے والے معاشرے میں واپس جانا ممکن نہیں رہا۔ گلینر نے قوم پرستی کو بنیادی طور پر ایک سیاسی نظریہ کے طور پر بیان کیا ہے جو کہتا ہے کہ سیاسی اور قومی اکائیوں کو برابر ہونا چاہیے۔ قوم پرستی کو بطور جذبات، یا ایک تحریک کے طور پر، ان اصولوں کے ذریعے بہترین طریقے سے بیان کیا جا سکتا ہے۔ قوم پرست جذبات اصولوں کی خلاف ورزی سے پیدا ہونے والے غصے کا احساس یا خوشی کا احساس ہے جو اس کے پورا ہونے پر پیدا ہوتا ہے۔ ایک قوم پرست تحریک ایک ایسی چیز ہے جو اس قسم کے احساس سے متاثر ہوتی ہے۔

انٹونی ڈیوڈ اسمتھ نے گلینر کے نظریہ سے اختلاف کرتے ہوئے اپنی کتاب *The Ethnic Origins of Nation*, 1986) میں دلیل دی ہے کہ جدید اور ماقبل نسلی برادریوں کے درمیان ایک تسلسل ہے جو بتدریج ترقی کے عمل کا نتیجہ ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ جدید معاشرے میں قوم پرستی کا احساس اچانک پیدا ہوا، بلکہ یہ پرانے معاشرے میں نسلی بندھنوں کی صورت میں پیدا ہوا، جو جدید دور میں سیاسی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ لہذا اسمتھ کا خیال ہے کہ قوم تاریخی طور پر سرایت کرتی (historically embedded) ہے۔ گلینر کے برعکس ان کا کہنا ہے کہ قوم پرستی جدید معاشرے کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے پیدا کی گئی ہے جو کہ درست نہیں ہے۔ درحقیقت قوم پرستی ایک تاریخی ترقی کا نتیجہ ہے جو کسی معاشرے کے مشترکہ ثقافتی ورثے اور زبان سے نکلی ہے، جو قدیم زمانے میں موجود تھی۔ سمتھ کا کہنا ہے کہ جب پرانی نسل جدید دور میں سیاسی شکل اختیار کر لیتی ہے تو پھر قوم پرستی جنم لیتی ہے۔

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی
MAULANA AZAD NATIONAL URDU UNIVERSITY
Estd. 1998

3.3 ہندوستان میں قوم پرستی (Nationalism in India)

ہندوستانی قوم پرستی کے زیادہ تر مورخین کا کہنا ہے کہ ہندوستانی سیاسی قوم جدید معنوں میں برطانوی راج کے قیام سے پہلے موجود نہیں تھی۔ ہندوستان کو بحیثیت قوم کہا جانے والا کوئی شعور تھا یا نہیں یہ ایک ایسا موضوع ہے جس پر قوم پرست رہنما اور تاریخ دان مسلسل بحث کرتے رہے ہیں۔ پر سینجیت دوارانے اس طرح کے خیالات کو "روشن خیالی کی تاریخ کا عملی نمونہ" قرار دیتے ہوئے تنقید کی ہے کہ یہ ماڈل ایک "متنازع اور متضاد قوم" کو اتحاد کا غلط احساس فراہم کرتا ہے۔ ہندوستانی تاریخ کے نوآبادیاتی تناظر کی ایک پختہ شکل 19 ویں صدی میں اپنے عروج کو پہنچی۔ جیمز مل کی کتاب ہسٹری آف برٹش انڈیا سے شروع کرتے ہوئے بہت سے انگریز مورخین میں نوآبادیاتی نظریے کا اثر نظر آتا ہے۔ اور ان میں سے تقریباً سبھی نے ایک قوم کے طور پر ہندوستان کے تصور کو مسترد کر دیا۔ نوآبادیاتی مفکرین نے ہندوستان کے تنوع اور اتحاد کی کمی پر زیادہ زور دیا۔ اس نے اپنی نوآبادیاتی حکمرانی کا جواز پیش کرنے کے لیے ایسا کیا اور ان کی رائے میں نوآبادیاتی حکمرانی نے ہندوستان کو متحد کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔

اسی طرح ونسنٹ اسمتھ نے بھی اپنے خیال اظہار کو پیش کیا اور لکھا کہ ہندوستانیوں میں اتحاد کی بنیادی کمی ہے۔ قدیم ہندوستان میں عظیم سلطنتوں کی حکمرانی کے مختصر ادوار کے علاوہ، ہندوستانی سیاسی ڈھانچہ ہمیشہ "باہمی مزاحمتی عناصر" پر مشتمل تھا۔ ہندو ریاستوں میں اتحاد نہ ہونے کی وجہ سے وہ عربوں، ترکوں اور افغانوں کے مضبوط منظم لشکر کا شکار ہو گئے۔ اتحاد مخالف صورت حال کو تبھی ٹھیک کیا جا سکتا ہے جب انگریز جیسی مرکزی حکومت باہر سے مداخلت کرے۔ بھارت ایک بار پھر ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا اگر لبرل آمریت نے اس ہاتھ کو کھینچ لیا جسے اسنے اپنی آہنی پھندا میں باندھ رکھا ہے۔ جب انیسویں اور بیسویں صدیوں میں قومی تحریک ابھرنا شروع ہوئی اور بیسویں صدی میں پختہ ہوئی تو جان سٹریچی اور جان سیلی نے اس بات پر زور دیا کہ ہندوستان کا ایک قوم بننا تقریباً ناممکن ہے کیونکہ اس میں کبھی بھی قوم کی خصوصیات نہیں رہی اور نہ ہی مستقبل میں کبھی ایسا ہو پائے گا. ان کے مطابق ہندوستان مختلف اور بعض اوقات متصادم مذاہب، نسلی، لسانی اور علاقائی گروہوں کا مجموعہ ہے جو بحیثیت قوم کبھی متحد نہیں ہو سکتے۔

انیسویں صدی کے آخری سالوں میں ہندوستان میں قوم پرستی کا ظہور ہوا۔ اکثر یہ دلیل دی جاتی ہے کہ قوم پرستی کے عروج کو صنعت کاری، شہری کاری اور پرنٹ کیپٹلزم نے ہوا دی۔ بینیڈکٹ اینڈرسن کے مطابق، یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ایشیا اور افریقہ کی ترقی پذیر دنیا میں قوم پرستی کی ترقی مغرب میں تیار کردہ ماڈل کی طرز پر ہوئی۔ لیکن اس نظریہ پر کئی نظریاتی نقطہ نظر سے تنقید کی گئی ہے۔ پارتھا چٹرجی کا استدلال ہے کہ اگر مغرب نے وجہ کا تعین کیا اور ہماری قسمت کا فیصلہ کیا، اور اس نے ہماری طرف سے نوآبادیاتی نظام کے خلاف ہماری مزاحمت کی شکلوں کے بارے میں بھی سوچا، تو پھر ہمارے پاس سوچنے کے لیے کیا فائدہ باقی رہ جائے گا؟ اس لیے ان کا استدلال کہ ہندوستانی سماج نے اقتدار کے لیے سیاسی جدوجہد شروع ہونے سے بہت پہلے اپنی قومیت کو ایک نجی ثقافتی دائرے کے طور پر تصور کرنا شروع کر دیا تھا، حالانکہ اس وقت ریاست نوآبادیات کی تشکیل میں تھی۔ یہیں اس نے اپنی خود مختاری کے بارے میں سوچا اور ایک ایسی ہندوستانی جدیدیت پیدا کی جو جدید تھی لیکن مغربی نہیں۔

دوسری طرف سی اے بیلی نے بھی اسی سمت اشارہ کرتے ہوئے اپنی مضبوط رائے قائم کی اور ہمیں بتایا کہ ہندوستانی قوم پرستی نے قبل از نوآبادیاتی دور میں ہی جڑیں پکڑنا شروع کر دیے تھے۔ان کے مطابق اس کا جنم ”روایتی حب الوطنی“ سے ہوا جو "زمین، زبان، اور فرقے سے وابستگی کی ایک سماجی سطح پر مبنی ایک فعال احساس تھا" اور یہ احساس برصغیر میں مغربیت کا عمل شروع ہونے سے بہت پہلے پروان چڑھا۔ اٹھارویں صدی سے انیسویں صدی کے اوائل تک ہندوستان میں اس طرح کے جذبات علاقائی بنیادوں پر پروان چڑھنے لگے، جب جائے پیدائش کو ملک، وطن یا ناڈو کے طور پر بیان کیا جانے لگا اور آہستہ آہستہ علاقائی زبانوں اور مذہبی وابستگیوں کی ترقی کے ساتھ آہستہ آہستہ شناخت کی تعمیر شروع ہونے لگی تھی۔

3.4 ہندوستانی قوم پرستی کے مختلف نظریات (Various Approaches to Nationalism in India)

ہندوستانی قوم پرستی برطانوی راج کے خلاف آزادی کی تحریک کے دوران ترقی یافتہ کو پہونچی، جس کے مطالعہ کے لیے بہت سے مکتبہ فکر کا اہم کردار رہا ہے۔ ہندوستانی قوم پرستی پر تاریخ نویسی کی بہت سی روایات ہیں جن میں کیمبرج مکتبِ فکر، نیشنلسٹ اسکول، مارکسسٹ اسکول اور سبالٹرن مکتبِ فکر کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔ کیمبرج اسکول کے مفکرین کا خیال تھا کہ ہندوستانی قوم پرستی تمام لوگوں کی لڑائی کے بجائے ایک چھوٹی اشرافیہ کی لڑائی ہے۔ اگر قوم پرستی بھی پروان چڑھی ہے تو یہ برطانوی راج کا نتیجہ ہے کیونکہ یہ برطانوی حکومت تھی جس نے برصغیر پاک وہند کو اتحاد فراہم کیا۔ ہندوستانی قوم پرست اس پر تنقید کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہندوستان میں قوم پرستی کی ترقی برطانوی راج کے خلاف لوگوں کی جدوجہد کا نتیجہ ہے۔ اس کے علاوہ مارکسی نظریے کے مطابق ہندوستانی تحریک بورژوا طبقے کی تحریک ہے جو عام لوگوں کے لیے نہیں بلکہ اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے کام کر رہی تھی۔ مندرجہ بالا تینوں نظریات کے خلاف، ذیلی نقطہ نظر ہندوستانی قوم پرستی میں سماج کے پسماندہ لوگوں کے اہم کردار پر زور دیتا ہے۔ یہ چار فکر مکتب ہندوستانی قوم پرستی کے مطالعہ پر اپنے اہم خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔

3.4.1 کیمبرج مکتبہ فکر (The Cambridge School)

کیمبرج اسکول 1960 کی دہائی سے تاریخ نگاری سے وابستہ اسکالرز کا ایک گروپ ہے جو ہندوستان میں آزادی کی جدوجہد سے وابستہ اشرافیہ کے ذاتی عزائم، باہمی مسابقت اور تعاون پر توجہ مرکوز کرتا ہے۔ یہ مورخین ہندوستانی قوم پرستی کو ہندوستانی سامراج کا خفیہ تعاون سمجھتے ہیں۔ کیمبرج مکتب فکر، تاریخ دانوں کا ایک گروپ ہے جو کیمبرج یونیورسٹی سے وابسطہ رکھتے ہیں اور جنہوں نے قوم پرستی کے نظریات سے ہندوستانی سیاست کا دوبارہ تجزیہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ مشہور و مقبول کتاب *Locality, Province, and Nation: Essays on Indian Politics, 1870–1947* (1973) میں کئی مضامین کی تالیف، جس کی تدوین جان گالاگھر (John Gallagher)، گارڈن جانسن (Gordon Johnson) اور انیل سیل (Anil Seal) نے کی، پورے کیمبرج نظریے کو قائم کرنے میں سب سے اہم کردار ادا کیا ہے۔ کیمبرج اسکول کے مطابق سامراجیت اور قوم پرستی میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ کیمبرج

نظریہ کے مطابق ہندوستانی قوم پرستی کی خاصیت یہ ہے کہ یہ مقامی مفادات اور خود ہندوستانیوں کے درمیان مسابقت کا شکار ہے۔ اگر ہندوستانی قوم پرستی اتنے تضادات اور مسابقت کے بعد بھی پروان چڑھی ہے تو یہ صرف مرکزی حکمرانی اور جمہوری نمائندہ نظام کے نتیجے میں ہے جو برطانوی راج کے متوازی طور پر تیار کیا گیا تھا۔ جسے نشاط انگیز اور رد عمل (stimulus and response) کے لحاظ سے سمجھا جا سکتا ہے۔ اس نظریے کے مطابق، ہندوستانی قوم پرستی ایک سیکھنے کا عمل (learning process) ہے جس کے ذریعے مقامی اشرافیہ نوآبادیاتی طاقتوں کی تیار کردہ پالیسیوں، اداروں اور ثقافتی ماحول کے ساتھ تعامل کرتے ہیں اور خود کو اس عمل میں شامل کرتے ہیں۔ کیمبرج مکتبہ فکر کا خیال تھا کہ مقامی اشرافیہ نے قوم کی فلاح و بہبود کا احترام کرنے کے بجائے برطانوی راج کے تحت طاقت، وقار اور دولت کی شکل میں فوائد حاصل کرنے کی کوشش کی۔ انیل سیل اپنی کتاب *The Emergence of Indian Nationalism* میں لکھتے ہیں، ہندوستانی قوم پرستی ایک چھوٹے سے اشرافیہ کے گروہ کا کام ہے جو برطانوی تعلیمی اداروں کی پیداوار تھے۔ وہ مزید لکھتے ہیں کہ ہندوستانی اشرافیہ طبقے نے برطانوی حکومت کے ساتھ مقابلہ اور تعاون دونوں کیا تاکہ وہ اپنے اقتدار اور مراعات کو برقرار رکھ سکیں۔ ان تمام وجوہات کی بنا پر کیمبرج کے مورخین کا خیال ہے کہ ہندوستانی اشرافیہ کی طرف سے چلائی جانے والی تحریک کوئی آئیڈیلسٹ تحریک نہیں تھی بلکہ ان کے اپنے مفادات سے وابستہ تھی۔ کیمبرج آئیڈیالوجی یہ بھی ثابت کرنے کی کوشش کرتی ہے کہ برطانوی راج ہندوستان کے لیے کس طرح فائدے مند تھا۔ حکومت نے برصغیر پاک و ہند میں سیاسی اتحاد، جدید تعلیمی ادارے اور جدید صنعتیں نے جدید قوم پرستی اور قانون کی حکمرانی قائم کی ہے۔

کیمبرج مکتبہ فکر ہندوستانی قوم پرستی کو، خاص طور پر سیاست کو منفی نقطہ نظر سے دیکھتا ہے۔ ہندوستانی سیاست کو دیکھنے کا اس کا نقطہ نظر خالصتاً سیاسی ہے نہ کہ سماجی یا معاشی۔ اس نظریے کے مطابق، ایک شخص سیاست میں اقتدار حاصل کرنے کے لیے اسی طرح برتاؤ کرتا ہے جیسا کہ وہ بازار میں منافع حاصل کرنے کے لیے کرتا ہے۔ اس لیے، چاہے وہ قوم پرست ہو یا مارکسسٹ یا سبالٹرن، ہر کوئی کیمبرج اسکول کے اس مایوس کن نظریے پر تنقید کرتا ہے۔ لیکن بہت سے مورخین نے اس نظریے کے حق میں اپنی رائے دی ہے، جن میں سے ایک نمایاں نام تپن رائے چودھری کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔ انہوں نے اپنی کتاب *Indian Nationalism as Animal Politics* میں یہ رائے ظاہر کی ہے کہ کیمبرج آئیڈیالوجی نے دو طرح کے فائدے پہنچائے ہیں، پہلا یہ کہ سیاست کا ایک بڑا حصہ مقامی سیاست سے متاثر ہوا ہے، دوسرا یہ کہ اس متنوع معاشرے میں جہاں کئی قسم کی مقامی سیاست جاری رہی، برطانوی حکومت نے کل ہند سیاست کی ایک شکل تیار کی۔ اس سے قومی سیاست کے لیے مقام حاصل ہوا جس نے نہ صرف قومی شعور بیدار کرنے میں مدد کی بلکہ پوری تحریک کو ایک نظریاتی اور نفسیاتی بنیاد فراہم کی۔ ایک طرح سے، اس نے پوری تحریک کو رفتار بخشی۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ قومی سیاست کے بغیر قوم پرستی ممکن نہیں۔

3.4.2 قوم پرست نظریہ (The Nationalist Approach)

ہندوستانی قوم پرستی پر قوم پرست فکر اور قومی تحریک نوآبادیاتی سوچ کے رد عمل کے طور پر تشکیل دی گئی۔ اگرچہ قوم پرست مصنفین نے نوآبادیاتی تاریخ نگاری کے پیش کردہ کچھ نظریات کو قبول کیا، لیکن انہوں نے ہندوستان اور اس کے لوگوں کو بدنام کرنے کی

نوآبادیاتی سازشوں کی شدید مخالفت کی۔ اسی لیے قوم پرست مورخین کے دو گروہ نظر آتے ہیں، جن میں سے ایک کا کہنا تھا کہ قوم پرستانہ نظریات مغرب کے زیر اثر اپنائے گئے، جب کہ دوسرے گروہ کا خیال ہے کہ قوم پرست نظریات ہندوستان میں قدیم زمانے سے موجود تھے۔ قوم پرست تحریک کے ابتدائی دنوں میں، آزاد خیال قوم پرستوں کا خیال تھا کہ آزادی کا یہ احساس بنیادی طور پر مغربی اثرات سے پیدا ہوا ہے۔ ان مصنفین کے مطابق مغربی تعلیم اور آزادی کے نظریات کا پھیلاؤ قومی بیداری کی تشکیل کے لیے بنیادی طور پر ذمہ دار تھی۔ بعد میں جب قومی تحریک نے زور پکڑا تو ادیبوں نے اپنے ملک کی جڑوں میں ایسے خیالات کی تلاش شروع کی۔

پہلے نظریے کے مطابق مغربی افکار کے پرچار کی وجہ سے ہندوستان میں پیدا ہونے والی بدامنی نے انگریزی تعلیم یافتہ متوسط طبقے کو قوم پرستانہ شعور بیدار کرنے کے لیے تیار کیا۔ ان کی آزادی اور خود مختاری کو مضبوط کرنے کی خواہش نے ان کی حب الوطنی کے جذبے کو تقویت دی۔ اپنے آپ کو ظاہر کرنے اور اپنے دعوے دار کے طریقے کی تلاش انڈین نیشنل کانگریس کے نتیجے میں ہوئی۔ ویشیشور پرساد کے مطابق آزادی کھونے اور غیر ملکی تسلط کے خوف نے لوگوں کے دلوں میں بے چینی پیدا کی۔ آر سی مجمدار نے کہا کہ ہندوستان کو ایک مشترکہ جنم بھومی کے طور پر تصور کرنا اب بھی ایک خیالی بات تھی، جیسا کہ ہم آج دیکھتے ہیں ہندوستان ویسا نہیں تھا۔ وہاں صرف بنگالی، مراٹھا، ہندوستانی (لسانی)، سکھ وغیرہ تھے لیکن 19 ویں صدی کے اوائل میں کوئی ہندوستانی نہیں تھا۔ ان کے مطابق یہ کانگریس کی قیادت والی تحریک تھی جس نے ہندوستانی اتحاد کے آئیڈیل کو حقیقی شکل دی۔ تاراچند کا بھی یہی خیال ہے کہ ہندوستانی قوم کی تخلیق ایک حالیہ تصور ہے جو مشترکہ اقتصادی اور سیاسی تبدیلیوں کی وجہ سے ابھرا ہے۔

ایک اور مضبوط مورخین کا دعویٰ ہے کہ ہندوستان قدیم زمانے سے ایک قوم تھا۔ قدیم ہندوستانی تاریخ کے شاندار ماضی کے طور کے لیے ایسے قوم پرست مورخ بھی ہی جو اسے مذہبی نقطہ نظر سے دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ رادھا کمود مکھرجی نے اپنی کتاب *The Fundamental Unity of India* (1914) میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہندوستان قدیم دور سے عظیم تھا اور متحد تھا۔ ان کے مطابق جغرافیائی وحدت کا احساس ابتداء سے موجود تھا اور یہاں تک کہ ہندوستان میں قوم پرستی کا تصور بھی پہلے سے موجود تھا۔ لالہ لاجپت رائے (Lala Lajpat Rai) نے ینگ انڈیا (*Young India*) میں بہت زور کے ساتھ کہا کہ ہندوستان بنیادی طور پر پچھلے دو ہزار سالوں سے ایک قوم ہے۔ کے پی جیسوال (K.P. Jayaswal) نے اپنی کتاب ہندو پولیٹی (*Hindu Polity*) میں کہا کہ ہندوستانیوں کے پاس وہ سب کچھ ہے جس کا جدید برطانوی دعویٰ کرتے ہیں۔ ایک بڑی سلطنت، ایک مستحکم اور کامیاب جمہوریہ، نمائندہ منتخب ادارے، مضبوط پارلیمنٹ، آئینی بادشاہت اور ایگزیکٹو حکام پر قانون کی بالادستی۔ ان سب کے علاوہ اس نقطہ نظر کے مورخین یہ دکھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ ہندوستان روحانیت کے میدان میں کس طرح مغربی ممالک سے آگے تھا۔ اروبندو گھوش بھی ایسے ہی خیالات کے حامی ہیں۔

دوسری طرف رابندر ناتھ ٹیگور نے ہندوستان کو ایک ایسی تہذیب کے طور پر پیش کیا جہاں غیر ملکی حملہ آور جیسے یونانی، شکا، ہن، ترک، پارسی، افغان اور مغل وغیرہ آئے اور فطرت کے ساتھ گھل مل گئے اور ہندوستانی ثقافت کو فروغ دینے کا کام کیا۔ جامعیت اور شمولیت

کے اس جذبے میں، اور کسی نقصان دہ سیاسی اختلاف کی عدم موجودگی میں، ٹیگور نے ہندوستان کی قومی شناخت کو پہچاننے اور اسے یورپی قوم پرستی سے ممتاز کرنے کی کوشش کی۔ اسی طرح گاندھی، نہرو وغیرہ جیسے لیڈروں نے بھی ہندوستانی قوم پرستی کو دیکھنے کی کوشش کی۔ جواہر لال نہرو نے ہندوستانی ثقافت اور قوم پرستی کے بارے میں "تنوع میں اتحاد" اور تنوع کے درمیان ایک ثقافتی اتحاد کی بات کی، جو ایک مضبوط لیکن پوشیدہ دھاگے سے جڑے ہوئے تضادات کا ایک مجموعہ ہے۔

اس قسم کی قوم پرستانہ سوچ نے عوام میں عوامی تحریک کو تیز کرنے کی ایک مضبوط اور کامیاب کوشش کی لیکن اس نظریے کے کچھ منفی نتائج بھی دیکھنے کو ملے۔ اس اسکول نے، قدیم ہندوستانی تاریخ کو جلال دینے کی کوشش میں جیسا کہ یہ قدیم ہندو ثقافت سے متعلق ہے، نے فرقہ وارانہ تاریخ نویسی کی روایت کو جنم دیا۔ یہ دراصل مذہبی قوم پرستی کا نتیجہ ہے جو ہندو اور مسلم مذاہب کی شناخت کی سیاست سے جڑی ہوئی ہے۔ رجنی پام دت جیسے مارکسی مورخ اس نظریے پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ جس طرح کیمبرج کے مورخین نے اپنے سامراجی مفادات پر پردہ ڈالا اور اپنے اصل مقاصد کو "تہذیب سازی مشن" کے نام پر آگے بڑھایا، اسی طرح قوم پرستوں نے اپنے تعاون کو جواز بخشنے کے لیے پوری قوم تحریک بات کرتے ہیں جو حقیقت میں صرف سیاسی آزادی تک محدود ہے۔ یہ قوم پرست ہندوستان میں رائج سماجی برائیوں کو مکمل طور پر نظر انداز کرتے ہیں اور صرف چند طبقات کے مفادات کی نمائندگی کرتے ہیں۔

3.4.3 مارکسی نظریہ (The Marxist Approach)

مارکسی نظریہ نے کیمبرج مکتبہ فکر اور قومی نظریہ دونوں کے برعکس اپنے خیالات پیش کیے۔ وہ مندرجہ بالا دونوں نظریات پر تنقید تصورات کا اظہار کرتے تھے۔ وہ ہندوستان اور اس کے لوگوں کے بارے میں امتیازی نظریہ رکھنے کے لیے نوآبادیاتی نقطہ نظر کی تنقید کرتے ہے جبکہ قوم پرست مفکرین کو قوم پرستی کی تلاش میں قدیم جڑوں میں واپس جانے پر تنقید کا نشانہ بناتے ہیں۔ وہ قومیت کے اپنے تصور کے تجزیہ میں معاشی عوامل اور طبقاتی اختلافات کو مد نظر نہ رکھنے پر دونوں پر تنقیدی تصورات کو پیش کرتے ہیں۔ مارکسی نظریہ پیداوار اور طبقات کے نظام کے تجزیہ کو اپنی بنیاد بناتا ہے۔ مارکسی مورخین کا خیال تھا کہ سامراج اور ہندوستانی سماج کے درمیان بنیادی تضاد ہے لیکن ساتھ ہی انہوں نے ہندوستانی سماج کے اندر موجود طبقاتی تضاد سے بھی انکار نہیں کیا۔ ان کا ماننا تھا کہ ہندوستان ہمیشہ ایک قوم نہیں تھا لیکن جب قوم پرست تحریک نے ملک میں اہم کردار ادا کرنا شروع کیا تو اس نے جدید دور میں ایک قوم کی شکل اختیار کی۔ انہوں نے قومی تحریک کے طبقاتی کردار کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی ہے اور نوآبادیاتی دور کی معاشی ترقی کی بنیاد پر اس کی وضاحت کی ہے۔ اس تناظر میں بہت سی تصنیف کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔ اس کا تجزیہ سب سے پہلے 1920 کی دہائی میں قومی اور بین الاقوامی کمیونسٹ تحریک کی ایک بڑی شخصیت ایم این رائے نے اپنی کتاب انڈیا ان ٹرانزیشن (1922) میں پیش کیا تھا۔ اس کے بعد رجنی پام دت کی انڈیا ٹوڈے، اے آر دیسائی کی *Social Background of Indian Nationalism*، سمیت سرکار کی ماڈرن انڈیا وغیرہ کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔

ہندوستانی قوم پرستی کی سب سے زیادہ اثر انگیز مارکسی تشریح رجنی پام دت نے پیش کی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ 1857 کی بغاوت اس

کے بنیادی کردار میں پرانی قدامت پسند، جاگیردارانہ قوتوں اور شاہی ریاستوں کی بغاوت تھی جو کہ ریاست سے بے دخل ہو چکے تھے۔ اس لیے اُنھوں نے ہندوستانی قوم پرست تحریک کی ابتداء کو 19 ویں صدی کی آخری کے چوتھے دہائی میں تلاش کیا۔ 1885 میں قائم ہونے والی انڈین نیشنل کانگریس اس تحریک کی بنیادی تنظیم تھی۔ مارکسی طبقاتی تجزیے کو ہندوستانی قوم پرستی کے مطالعہ پر لاگو کرتے ہوئے، انہوں نے کہا کہ کانگریس اور قومی تحریک کی طبقاتی بنیاد وقت کے ساتھ بدلتی رہی، اس طرح، ابتدائی سالوں میں، ہندوستانی قوم پرستی بڑے بورژوا جاگیرداروں میں صرف ترقی پسند عناصر کی نمائندگی کرتی تھی۔ صنعتی نے بورژوازی اور ذہین طبقے کے درمیان امیر طبقے کی نمائندگی کی۔ اس کے بعد کے سالوں میں اور پہلی جنگ عظیم کے آغاز کے ساتھ، شہری پیٹی بورژوازی باا ثر بن کر ابھری۔ جنگ کے بعد ہندوستانی عوام، کسانوں اور صنعتی محنت کش طبقے نے اپنی موجودگی کا احساس دلایا۔ دت کہتے ہیں کہ قیادت اب بھی امیر طبقے کے ہاتھ میں رہی جو کانگریس میں باا ثر رہے۔ یہ باا ثر طبقے اس تحریک کو انقلابی بننے سے روکتے رہے کیونکہ ایسی تحریک ان کے مفادات کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتی تھی۔ دت گاندھی کے تئیں بہت سخت تھے جنھیں وہ بورژوازی کا نقاب سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ تحریک عدم تعاون اور عام نافرمانی کی تحریک ایک ایسے وقت میں ختم ہوئی جب لوگ پر تشدد ہو رہے تھے اور یہ کانگریس کے اندر اور باہر متمول طبقے کے لیے خطرہ بن رہی تھی۔ وہ مزید لکھتے ہیں کہ کانگریس کا دوہرا کردار تھا جو پوری تاریخ میں برقرار رہا اور یہ پوری ہندوستانی بورژوازی کا کردار رہا۔

رجنی پام دت اس بات پر زور دیتے ہیں کہ ہندوستان کا اہم مسئلہ نہ صرف قومی ہے بلکہ سماجی بھی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ سامراجیت کے خلاف چلنے والی قومی تحریک ہندوستان کی صرف ایک تہائی آبادی کو آزادی دلا سکتی ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ آزادی کے موجودہ مطالبات زیادہ گہرے ہونے چاہئیں اور صرف سیاسی آزادی تک محدود نہیں رہنا چاہیے۔ مزید لکھتے ہیں کہ ہندوستانی تحریک کے لیے سب سے بڑا چیلنج چار سو ملین لوگوں کو ان کی غربت، بھوک وغیرہ سے آزاد کرانا ہے اور خود مختاری کا حصول جدوجہد کا پہلا مرحلہ ہے۔

3.4.4 سبلٹرن اسکول (The Subaltern School)

سبالٹرن نظریہ 1980 کی دہائی سے نوآبادیاتی ہندوستان پر سیاسی تاریخ نگاری کی شکل میں شروع ہوا جن میں رنجیت گوہا، دیپش چکرورتی، پارتھا چٹرجی، گایتری چکرورتی، ہومی بھابھا، گیانیندر پانڈے جیسے اسکالرز کا اہم کردار رہا۔ ان میں قبائلیوں، مزدوروں، کسانوں وغیرہ پر منحصر طبقات کے مطالعہ کے ذریعے قوم، طاقت اور علم سے متعلق خدشات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس نظریے کو جدید تاریخ نویسی میں ایک انقلابی آغاز قرار دیا گیا جس نے ہندوستانی قومی تحریک کے بارے میں تمام سابقہ نظریات سے مختلف ہونے کا دعویٰ کیا۔ اس نظریے کے مطابق تاریخ نویسی میں پسماندہ طبقے کے لوگوں کے کردار کو آج تک اہمیت نہیں دی گئی۔ سبالٹرن کا لفظ صرف ایسے لوگوں کے مطالعہ کے لیے استعمال ہوا۔ انہیں خود مختار شناخت دینے کی کبھی کوشش نہیں کی گئی۔ تاریخی ریکارڈ میں بھی ان کے کردار کا ذکر نہیں ملتا۔ رنجیت گوہا کے مطابق، تمام قسم کی اشرافیہ کی تاریخوں میں ایک چیز مشترک ہے اور وہ ہے سیاست سے عوام کا ان کے تاریخ میں عدم موجودگی۔ اس طرح کے مطالعے کا آغاز یورپی مارکسی مفکرین میں دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ تمام مفکرین بنیادی طور پر تاریخ نویسی کے ایک نئے سلسلے "نیچے سے تاریخ" (History from Below) سے وابستہ ہیں۔

رنجیت گوہا نے سبالٹرن اسٹڈیز میں تاریخ نگاری کے دو سلسلے — کیمبرج اور قوم پرست مورخین کو اشرافیہ کے طور پر بیان کیا۔ ان دونوں نقطہ نظر کے مطابق قوم پرستی کی کامیابی کی تاریخ اشرافیہ طبقے کی کامیابی کی تاریخ ہے، خواہ ہندوستانی ہو یا برطانوی۔ ان دونوں مکاتب فکر کے دانشوروں کا وظیفہ خواہ کچھ بھی ہو، کسی نے یہ بتانے کی کوشش نہیں کی کہ خود سماج کے پسماندہ طبقوں کے لوگوں نے اپنی کوششوں سے قومی تحریک میں کیا حصہ ڈالا ہے۔ دوسرے لفظوں میں، رنجیت گوہا یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ہندوستانی قوم پرستی کی ترقی میں سماج کے پسماندہ طبقے کے لوگوں کے جو اشرافیہ (elitist) کے طبقے سے آزاد ہو کر، ان کے تعاون کو تسلیم کرنے کی ضرورت ہے۔ ان کا نقطہ نظر اشرافیہ مخالف ہے اور وہ تاریخ کو نیچے کے لوگوں کی شراکت کے نقطہ نظر سے دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس طرح سبالٹرن تاریخ قوم پرستی کو نچلے طبقے کے نقطہ نظر سے دیکھتی ہے اور اشرافیہ کی تاریخ نگاری پر تنقید کرتی ہے کہ وہ سماج کے پسماندہ طبقات کے لوگوں کی شراکت کو قوم پرستی کا حصہ نہیں سمجھتی۔

3.5 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

اس اکائی میں، ہندوستانی قوم پرستی کے علاوہ، قوم پرستی کے آغاز سے لے کر اس کی نشو و نما تک کا مختصر جائزہ لینے کی کوشش کی گئی۔ ہندوستانی قوم پرستی کا نوآبادیاتی نظریہ اسے ایک قوم کے طور پر کبھی بیان نہیں کرتا۔ ان کا خیال تھا کہ ہندوستان کبھی ایک قوم نہیں رہا تھا اور مستقبل میں اس کے ایک بننے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ لیکن قوم پرست مورخین نے اس خیال کو غلط ثابت کرنے کی کامیاب کوشش کی اور آج ہم بحیثیت قوم اپنی شناخت بنانے میں کامیاب رہے ہیں۔ اور ان نوآبادیاتی نظریات کو جھوٹا ثابت کرنے میں کامیاب بھی ہوئے۔ لیکن قوم پرست تاریخ دانوں اور رہنماؤں نے اس کامیابی کا سہرا صرف اشرافیہ طبقے تک ہی محدود رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ سبالٹرن اور مارکسی مورخین نے انہیں اپنی تنقید کا نشانہ بنایا۔ یہ واضح ہے کہ قوم پرستی کے عناصر ہندوستان میں قدیم زمانے سے موجود تھے، لیکن جس جدید قوم کی بات جدید یورپی مورخین کرتے ہیں وہ انیسویں صدی کے بعد تیار ہوئی۔ اس طرح سماج کے نچلے طبقے کے ساتھ ساتھ اشرافیہ اور برطانوی راج نے بھی ہندوستان میں قوم پرستی کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن یہ بھی یقین نہیں کیا جا سکتا کہ جدید قوم پرستی مکمل طور پر برطانوی راج کی پیداوار ہے۔ اس طرح، آخر میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہندوستانی قوم پرستی مختلف مذاہب، زبانوں، ثقافتوں اور برطانوی حکومت کی مشترکہ شراکت ہے۔

3.6 کلیدی الفاظ (Keywords)

سبالٹرن : تاریخ نویسی کا ایک انداز جس میں پسماندہ طبقے کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔

Imagined Political Community: بینیڈکٹ اینڈرسن کا قوم پرستی کا نظریہ

A social Background of Indian Nationalism: اے آر دیسائی کی مشہور کتاب

Indian Nationalism as Animal Politics: تپن رائے چودھری کی تصنیف

3.7 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

3.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Very Short Answer Type Questions)

1. مشہور کتاب *The Emergence of Indian Nationalism* کے مصنف کون ہیں؟
2. کیمبرج نظریہ سے وابستہ دو مورخین کے نام بتائیں۔
3. *The Fundamental Unity of India* کس کی تخلیق ہے؟
4. قوم پرست نظریہ سے متعلق دو مورخین کے نام بتائیں۔
5. قوم پرستی کا لفظ کس صدی میں ظہور ہوا؟
6. انیل سیل کا تعلق قوم پرستی کے کس نظریے سے ہے؟
7. انڈین نیشنل کانگریس کب قائم ہوئی؟
8. *The Ethnic Origins of Nation* کس کی تصنیف ہے؟
9. 'Imagined Community' کا تصور کس نے پیش کیا؟
10. رنجیت گہا کا تعلق قوم پرستی کے کس نظریے سے ہے؟

3.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. قوم پرستی کی ارتقاء پر ایک مختصر نوٹ لکھیں۔
2. ہندوستانی قوم پرستی کے مطالعہ میں سبالٹرن نظریے کی شراکت پر اپنی رائے کا اظہار کریں۔
3. کیمبرج نظریہ کی مختصر تفصیلات پیش کریں۔
4. مارکسی نظریہ نے ہندوستانی قوم پرستی کو سمجھنے کے لیے کیا نظریہ پیش کیا ہے؟
5. نو آبادیاتی سوچ نے قوم پرست مورخین کو کس حد تک متاثر کیا ہے۔ وضاحت کریں۔

3.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. ہندوستان میں قوم پرستی کا عروج برطانوی راج کا تحفہ ہے۔ آپ اس رائے سے کس حد تک متفق ہیں؟
2. کیمبرج مکتبہ فکر سے مارکسسٹ اور سبالٹرن نظر کیسے مختلف ہے۔ تفصیل سے جائزہ لیں۔
3. ہندوستانی قوم پرستی کے مطالعہ کے لیے قوم پرست نظریے کی اہمیت کی وضاحت کریں۔

3.8 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Learning Resources)

1. Anderson, Benedict, *Imagined Communities*: *Reflection on the Origins and Spread of Nationalism*, Verso, London, 2006. (First Edition: 1983)
2. Azad, Rohit and Janaki Nair et al., *What the Nation Really Needs to Know*: *The JNU Nationalism Lectures*, HarperCollins, Noida, 2016.
3. Bandyopadhyay, Sekhar (ed.), *Nationalist Movement in India*, Oxford University Press, New Delhi, 2009.
4. Banerjea, Surendranath, *A Nation in Making*, *Being the Reminiscences of Fifty Years of Public Life*, OUP, London, 1925.
5. Chatterjee, Partha, *The Nation and Its Fragments*: *Colonial and Postcolonial Histories*, Princeton University Press, Princeton, 1993.
6. Hobsbawn, E.J., *Nations and Nationalism Since 1780 Programme*, *Myth*, *Reality*, Cambridge University Press, Delhi, 1990.
6. Nandy, Ashish, *The Illegitimacy of Nationalism*: *Rabindranath Tagore and the Politics of Self*, OUP, New Delhi, 1994.
7. Smith, Anthony D., *Myths and Memories of the Nation*, OUP, Oxford, 1999.
8. Thakurta, Tapati-Guha, *The Making of a New* ‘*Indian*’ *Art*: *Artists*, *Aesthetics and Nationalism in Bengal*, c. 1850–1920, Cambridge University Press, Cambridge, 1992.

मौलाना आज़ाद नेशनल उर्दू यूनिवर्सिटी
Estd. 1998
MAULANA AZAD NATIONAL URDU UNIVERSITY

اکائی 4۔ابتدائی ہندوستانی سیاسی تنظیمیں

(Early Indian Political Associations)

اکائی کے اجزا

4.0 تمہید
4.1 مقاصد
4.2 سیاسی تنظیموں کے ابھرنے کے اسباب
4.3 ابتدائی ہندوستانی سیاسی تنظیمیں
4.3.1 بنگ بھاشا پرکاشک سبھا
4.3.2 زمینداری ایسوسی ایشن/لینڈ ہولڈرز سوسائٹی
4.3.3 برٹش انڈیا سائٹی
4.3.4 بنگال برٹش انڈیا سائٹی
4.3.5 برٹش انڈین ایسوسی ایشن
4.3.6 مدراس نیٹیو ایسوسی ایشن
4.3.7 بامبے ایسوسی ایشن
4.3.8 ایسٹ انڈیا ایسوسی ایشن
4.3.9 پونا سارو جنک سبھا
4.3.10 انڈین لیگ
4.3.11 انڈین سوسائٹی
4.3.12 انڈین ایسوسی ایشن
4.3.13 مدراس مہاجن سبھا
4.3.14 بامبے پریسیڈینسی ایسوسی ایشن
4.4 اکتسابی نتائج

4.5 کلیدی الفاظ
4.6 نمونہ امتحانی سوالات
4.7 تجویز کردہ اکتسابی مواد

4.0 تمہید (Introduction)

1757 میں پلاسی کی جنگ کو تقریباً 51 سال گزر چکے تھے جس نے انگریزوں کو بنگال کا اصل حکمران بنا دیا۔اس وقفے کے دوران ہندوستان میں بہت کچھ ہو چکا تھا۔ کیپ کومورین (Cape Comorin) سے لے کر وادی سندھ کے مشرقی حاشیے اور پنجاب سمیت پورے ہندوستان کو بلاواسطہ یا بالواسطہ طور پر برطانوی تسلط میں لایا جا چکا تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی ،اپنا تجارتی کردار مکمل کر کے ہندوستان کی 'سرکار' (حکومت) بن گئی تھی، جسے کمپنی بہادر کے نام سے جانا جاتا تھا۔ لیکن برطانوی پارلیمنٹ نے مداخلت کی اور ہندوستان میں کمپنی کے نظم ونسق کی حتمی نگرانی اور کنٹرول سنبھال لیا۔ ہندوستانیوں کی نظریں دور دراز برطانیہ میں اختیارات کی اعلیٰ ترین نشست کی طرف مڑ گئیں جس نے کم از کم نظریاتی طور پر ان کے حقوق کو سلطنت کی دوسری رعایا کے برابر تسلیم کیا اور جہاں وہ اپنے ہندوستانی حاکموں کے خلاف ضرورت پڑنے پر اپیل کر سکتے ہیں۔

انیسویں صدی کے دوران ہندوستان میں ہونے والی ذہنی بیداری ،درحقیقت برطانوی حکمرانی کے نتیجے میں معاشرے کی ساخت میں پیدا ہونے والی تبدیلیوں کی وجہ سے شروع ہوئی۔اس کے نتیجے میں نئے سماجی طبقات وجود میں آئے۔ان میں سب سے اہم تعلیم یافتہ دانشور طبقہ تھا، جس نے کہ مغربی تعلیم اور تمدن کے زیر اثر سماجی اصلاحات میں پہل کی۔ان ہی لوگوں کی کوششوں سے برطانوی حکمرانوں کی استحصال کی پالیسی لوگوں کی سمجھ میں آئی اور برطانیہ اور ہندوستان کے معاشی مفادات کا فرق بھی لوگوں کو معلوم ہوا۔اس عوامی بیداری کے نتیجے میں ہندوستان میں قومیت اور حب الوطنی کو فروغ حاصل ہوا۔آگے چل کر انہوں نے اپنے آپ کو سیاسی طور پر منظم کرنا شروع کیا جس کے نتیجے بہت سی سیاسی تنظیمیں وجود میں آئیں اور بالآخر ہندوستانی قومی کانگریس کا قیام ہوا جو اصلاحی پروگرام سے آغاز کرتے ہوئے آزادی کی جدوجہد کی علمبردار بن گئی۔

ابتدائی سیاسی انجمنیں،اپنے دائرہ کار، مفادات اور طریقہ کار کے سلسلہ میں کانگریس سے یا دیگر بعد کی سیاسی جماعتوں سے بیحد مختلف تھیں۔ان کے رہنماؤں کے ذہن میں 1857 کی بغاوت اور اس کے انجام کی یاد تازہ تھی۔وہ صرف استغاثوں اور عرضداشتوں کے ذریعے آئینی اصلاحات تک محدود تھے۔اس کے علاوہ وہ صرف اپنے طبقے اور علاقے کے فائدے کا سوچتے تھے۔ایک کل ہند سیاسی فکر پیدا ہونے میں ابھی وقت تھا۔ان محدودات کے باوجود یہ تنظیمیں اس لئے اہم ہیں، کیونکہ انہوں نے ہندوستانیوں کی سیاسی فکر کو بیدا کیا اور انہیں اس قابل بنایا کہ وہ اپنے حقوق کے لیے آئینی جدوجہد کر سکیں۔انہوں نے ہندوستانیوں کو سیاسی طور پر منظم ہونے اور ایک تنظیم بنانے کی راہیں ہموار کیں۔اس اکائی میں ہم ان انجمنوں یا تنظیموں کے بارے میں جاننے کی کوشش کریں گے۔

4.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- ہندوستان میں سیاسی تنظیموں کے ابھرنے کے اسباب جان سکیں گے۔
- ہندوستان میں ابتدائی سیاسی تنظیموں کے بارے میں جان سکیں گے۔
- ان کے مقاصد، دائرہ کار اور طریقہ کار سے واقف ہو سکیں گے۔
- ہندوستانی سیاست پر ابتدائی سیاسی تنظیموں کے اثرات کا تجزیہ کر سکیں گے۔
- ہندوستانی قومی کانگریس کے قیام میں ان تنظیموں کے کردار پر روشنی ڈال سکیں گے۔

4.2 سیاسی تنظیموں کے ابھرنے کے اسباب
(Causes for the Emergence of Political Associations)

برطانوی حکمرانی کا سب سے اہم نتیجہ یہ تھا کہ ہندوستان کی تاریخ میں پہلی بار ایک مکمل مرکزی حکومت وجود میں آئی اور صحیح معنوں میں ملک سیاسی اور انتظامی اعتبار سے متحد ہوا۔ برطانوی نظم و نسق میں یکسانیت، ملک میں سیاسی اتحاد، امن اور مغربی سیاسی نظریات کی مقبولیت کے نتیجے میں ملک میں سیاسی بیداری پیدا ہوئی۔ ملک کا معاشی ارتقا بھی ایک اکائی کی طرح ہونے لگا۔ انگریزی زبان کو جب ذریعہ تعلیم کی حیثیت دی گئی تو ملک میں ایک طرح کا لسانی اتحاد بھی پیدا ہوا۔ تعلیم یافتہ ہندوستانی اس زبان کے ذریعہ مغرب کے سائنسی، ادبی اور سیاسی افکار سے بے حد متاثر ہوئے۔ حریت پسندی، قوم پرستی، جمہوریت اور آزادی جیسے خیالات ان کے لیے بے حد دلچسپ ثابت ہوئے۔ ان ہی تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کی کوشش سے ملک میں سیاسی شعور بیدار ہوا۔ وہ حب الوطنی اور ترقی پسند نظریات کی نمائندگی کرنے لگے۔ مغربی نظریات نے ہندوستان میں قومیت اور حب الوطنی کے شدید جذبات کو پروان چڑھایا۔ سیاسی شعور اور جارحانہ قوم پرستی مغرب سے مستعار لیے گئے اور ان کا ہندوستانی تاریخ پر گہرا اثر مرتب ہوا۔ تلک کا یہ تبصرہ انتہائی مقبول ہے کہ ہندوستانی قوم پرستی در حقیقت برطانوی حکمرانی کے اثر سے وجود میں آئی۔ انیسویں صدی میں تمدنی اور سیاسی معاملات میں بنگال کے ذہین اور دانشور طبقے کی خاصی متاثر کن تعداد نے ملک کی رہنمائی کی۔ آخر کار ان ہی کی کوششوں سے قومی جدوجہد کو ایک واضح شکل ملی۔

4.3 کانگریس سے قبل ابتدائی ہندوستانی سیاسی تنظیمیں
(Early Indian Political Associations before the Congress)

برطانوی سامراجیت کے خلاف ہندوستان کی پہلی عظیم جدوجہد آزادی یوں تو کامیاب نہیں ہو سکی لیکن اس کی اہمیت یہ ہے کہ اس نے جدید قومی جدوجہد کے لیے راستہ ہموار کیا۔ برطانوی حکمرانی کے خلاف ہندوستانی احتجاج کی قیادت جو روایتی طور پر زمیندار اور اعلی طبقے کے ہاتھ میں رہی تھی، 1857ء کی بغاوت کے بعد انگریزی تعلیم یافتہ دانشور طبقے کو منتقل ہو گئی جو کہ قومیت، سیاسی آزادی اور دستوری حکومت

کے بارے میں بھرپور معلومات اور نئے نظریات رکھتا تھا۔ان کی یہ قیادت جدید قوم پرستی اور جمہوریت کے تصورات سے پر تھی۔

4.3.1 بنگ بھاشا پرکاشک سبھا (The Bang Bhasha Prakashak Sabha)

بنگ بھاشا پرکاشک سبھا 1836 میں قائم کی گئی تھی۔ اس کی بنیاد راجہ رام موہن رائے کے رفقا جیسے پرسنا کمار ٹیگور، کالی ناتھ چودھری، دوارکاناتھ ٹیگور وغیرہ نے رکھی۔ یہ سب زمیندار طبقے کے افراد تھے۔اس سبھا کے صدر گوری شنکر بھٹاچاریہ اور سکریٹری درگا پرساد ترک پنچانن تھے۔انہوں نے اعلیٰ سرکاری عہدوں پر ہندوستانیوں کی تقرری، پریس کی آزادی، رعیت پر زمینداروں کے ظلم و ستم کی روک تھام وغیرہ کے مطالبات کے ساتھ تحریک شروع کی۔ یہ ہندوستان میں قائم ہونے والی پہلی سیاسی انجمن تھی،حالانکہ اس کے مقاصد سیاسی سے زیادہ ثقافتی تھے۔اس نے انتظامی اصلاحات، انتظامیہ میں ہندوستانیوں کی شمولیت، تعلیم کے پھیلاؤ اور بنگالی زبان کے فروغ کے لیے کام کیا۔ساتھ ہی رائے عامہ کو بیدار کرنے اور عوام میں جدید قوم پرستی کی راہ ہموار کرنے میں مدد کی۔ ساتھ ہی انگریزوں کے ساتھ ہندوستانیوں کے انتظامی تعاون کو بہتر بنانے اور ہندوستانی مطالبات کو برطانوی پارلیمنٹ میں پیش کرنے کی سمت کام کیا۔ سبھا ناقابل محصول زمین پر ٹیکس عائد کرنے کی سخت مخالفت کر رہی تھی۔تاہم، انہیں ملک میں بڑے پیمانے پر تعاون نہیں ملا جس کی وجہ سے سبھا زیادہ عرصے تک جاری نہ رہ سکی۔

4.3.2 زمینداری ایسوسی ایشن/لینڈ ہولڈرز سوسائٹی

(The Zamindari Association/ Landholders' Society)

'سیاسی مقاصد کے لیے پہلی جماعت کی تشکیل پر جسے ہندوستان کے مقامی باشندوں نے عظیم اور آزاد خیال نظریات کے ساتھ، بلا امتیاز وسیع مفادات پر مبنی نتائج اور مقاصد کے ساتھ منظم کیا ہے، میں آپ سبھی حضرات کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ مجھے اس میں بڑے امور کا آغاز نظر آتا ہے اور میں مطمئن ہوں کہ ان شروعاتوں کو مناسب انجام تک پہنچانے کے لیے جس دیکھ بھال اور تدبر کی ضرورت ہے، وہ کبھی ناکافی نہیں ہوگا۔' یہ مقرر تھیوڈور ڈکنز (Theodore Dickens) تھے، جو ہندوستان میں ایک نامور انگریز بیرسٹر اور باغان کے مالک تھے۔ موقع تھا، 19 مارچ 1838 کو کلکتہ ٹاؤن ہال میں ایک عوامی میٹنگ میں لینڈ ہولڈرز سوسائٹی کے افتتاح کا، جس کا بنیادی مقصد ہندوستان میں برطانوی حکومت کی مبینہ طور پر من مانے، غیر منصفانہ اور نقصان دہ اقدامات کے خلاف آئینی تحریک چلانا تھا۔

جدید ہندوستان کی پہلی سیاسی تنظیم کے طور پر 'زمینداری ایسوسی ایشن' کا نام سرفہرست ہے جسے بنگال، بہار اور اڑیسہ کے زمینداروں نے قائم کیا تھا۔اس کا باقاعدہ آغاز، مارچ 1838 میں کلکتہ میں دوارکاناتھ ٹیگور (Dwarkanath Tagore) کے ذریعے ہوا۔اس کے کچھ عرصے بعد اس کا نام بدل کر 'لینڈ ہولڈرز سوسائٹی' (Landholders' Society) کر دیا گیا۔اس سوسائٹی کے ہندوستانی اراکین، دوارکاناتھ ٹیگور، راجا رادھاکانت دیو، پرسنا کمار ٹیگور، راج کمل سین، راجا کالی کرشنا اور بھوانی چرن متر وغیرہ جیسے زمیندار حضرات تھے۔ لینڈ ہولڈرز سوسائٹی کے ہندوستانی سکریٹری پرسنا کمار ٹھاکر اور انگریز سکریٹری، ولیم کابری تھے۔ جان کرافورڈ لندن

میں اس انجمن کے نمائندے تھے۔اس کاسب سے بڑا مقصد، برطانوی حکمرانوں کو درخواستوں اور عرضیوں کے ذریعے اورافسرشاہی کو نہایت ہوشیاری سے شیشے میں اتار کر زمینداروں کے مفادات کو فروغ دینا تھا۔علاوہ ازیں اس کا دوسرا مقصد حکومت کے ذریعے لگان معاف (rent-free)زمینوں کی بازیابی کو روکنا تھا۔اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ کمپنی کے دیوانی حقوق حاصل کرنے کے بعد بھی متعدد عوامی اداروں اور افراد کے پاس بنگال میں لگان معاف زمینیں تھیں۔ برطانوی گورنر جنرل ولیم بنٹنک نے کلکٹروں کو ایسی زمینوں کے مالکان کی چھان بین کرنے کے احکامات جاری کیے۔ جانچ کرنے سے پتہ چلا کہ زیادہ تر معاملات میں ملکیتی دستاویزیں فرضی تھیں یا کمپنی افسران کے توکم سے کم ایسا سمجھتے تھے۔ حکومت نے بنگال اور بمبئی میں ایسی لگان معاف زمینوں کی بازیابی شروع کر دی۔ نتیجتاً لینڈ ہولڈرس سوسائٹی کو اس کی مخالفت میں اترناپڑا۔

ایسوسی ایشن کے منصوبے میں مالگزاری کے مستقل بندوبست کو پورے ہندوستان میں پھیلانا، ٹھیکے پر بنجر زمینیں ان کے رہائشیوں کو دلوانا اور عدلیہ، پولیس اور محکمہ مالیات میں اصلاحات کا مطالبہ کرنا بھی شامل تھا۔ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے، تنظیم نے کلکتہ میں کمپنی کے افسران کے ساتھ نزدیکیاں بڑھائیں۔ساتھ ہی زمینداروں کے حقوق کے لیے کام کرنے والی ایک دوسری بیرون ملکی تنظیم 'برٹش انڈیا سوسائٹی آف لندن' کے ساتھ تعلقات قائم کیے اور لندن میں اس کے صدر جارج تھامسن (George Thompson) کو لینڈ ہولڈرز سوسائٹی کا نمائندہ تعینات کیا۔

برطانوی حکومت سے مکمل وفاداری کے اظہار کے ساتھ، لینڈ ہولڈرز سوسائٹی، مقامی زمینداروں اور غیر ملکی کاروباری نمائندوں (خریداروں) (compradors) کی ایک ممتاز تنظیم تھی۔ بعد میں بنگال میں تجارت اور کاروبار میں مصروف غیر سرکاری برطانویوں کو بھی تنظیم میں شامل کیا گیا۔ زمینداری ایسوسی ایشن میں شامل انگریز رہنماؤں میں تھیوڈور ڈکنز، ولیم کاربری، ولیم تھیوولڈ اور جے۔ اے۔ پرنسس نمایاں تھے۔ تنظیم کا رکن بننے کے لیے دولت کا جو معیار مقرر کیا گیا اور 250روپے جو ممبرشپ فیس رکھی گئی تھی وہ ایک عام آدمی کے بس کا روگ نہیں تھا۔لینڈ ہولڈرز سوسائٹی کی رسائی صوبہ بنگال سے باہر زیادہ نہیں رہی، کیونکہ دیگر صوبجات میں مستقل بندوبست کا نظام لاگو نہیں کیا گیا۔اپنے مختصر دائرہ کار اور محدود سرگرمیوں کے ساتھ،اس کا واحد کارنامہ، برطانوی حکومت سے برہموتر زمین (برہمنوں اور مندروں کی خدمات کے لیے عطیہ کی گئی زمین) میں دس بیگھ تک لگان معافی کی رعایت تھی۔ حالانکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ لینڈ ہولڈرز سوسائٹی نے ہندوستان میں جدید ادارہ جاتی سیاست کے نئے باب کا آغاز کیا تھا۔یہ سوسائٹی زیادہ دنوں تک قائم نہیں رہ سکی۔1842کے آس پاس تک یہ غیر فعال ہوگئی اور 1850تک یہ صرف برائے نام ہی باقی رہی۔بعد میں یہ بنگال برٹش انڈین سوسائٹی میں جا کر مل گئی۔

4.3.3 برٹش انڈیا سوسائٹی (The British India Society)

راجہ رام موہن رائے کے دوستوں میں سے ایک ولیم ایڈم(William Adam) کی کوششوں سے اور دیگر برطانوی اور امریکی غلامی مخالف لوگ، کمپنی کے افسران، نجی تاجروں اور بنگالی طبقہ اشراف کے افراد کی مدد سے برٹش انڈیا سوسائٹی 1839 میں لندن میں

قائم کی گئی تھی۔ ولیم ایڈم ہندوستان آئے تھے اور راجہ رام موہن رائے سے رابطے میں رہے اور جب وہ انگلینڈ واپس گئے تو انہوں نے جارج تھامسن (George Thompson)، ولیم ایڈنس (William Ednis) اور میجر جنرل بریگز (Major General Briggs) کے ساتھ مل کر ہندوستان کا مسئلہ اٹھایا۔ ان کا ماننا یہ تھا کہ اگر صحیح سے دیکھ ریکھ کی جائے تو ہندوستان کی 'زرخیز مٹی اور محنت کے لیے تیار لوگ' چینی، کپاس، اور دوسری گرم علاقے کی اشیا کا ایک مناسب ذریعہ ثابت ہو سکتے ہیں، جس کی وجہ سے امریکی جنوب میں غلامی کا خاتمہ کیا جاسکتا ہے۔ نتیجتاً کئی جگہوں پر میٹنگیں منعقد کی گئیں اور ہندوستان کے حالات کے بارے میں بیداری پیدا کی گئی۔ 1841 میں اس سوسائٹی نے ایک اخبار برٹش انڈین ایڈوکیٹ (British Indian Advocate) چھاپنا شروع کیا۔ 1842 میں، دوارکاناتھ ٹیگور، چندر موہن چٹرجی اور پرمانند متر کے ساتھ انگلینڈ گئے، جہاں سے وہ جارج تھامسن کے ساتھ ہندوستان واپس آئے۔ جارج تھامسن کی کوششوں سے بنگال برٹش انڈیا سوسائٹی قائم ہوئی۔ خیال یہ تھا کہ برطانوی حکومت کے ساتھ خالص وفاداری کے ساتھ زمیندار اور کاروباری طبقات کے مفاد اور فلاح و بہبود کے لیے کام کیا جائے۔

4.3.4 بنگال برٹش انڈیا سوسائٹی (The Bengal British India Society)

20 اپریل 1843 کو کلکتہ میں ایک نئی سیاسی تنظیم بنگال برٹش انڈیا سوسائٹی وجود میں آئی۔ یہ تنظیم جارج تھامسن کی سرپرستی میں قائم کی گئی۔ اس کے دیگر اہم اراکین، دوارکاناتھ ٹیگور، چندر موہن چٹرجی اور پرمانند میتر تھے۔ اس تنظیم نے بھی زمیندار، باغان مالک اور مہاجن طبقات کی ترقی اور حقوق کا مطالبہ کیا تھا۔ اس تنظیم کے قیام کے بعد لینڈ ہولڈرز سوسائٹی کی اہمیت ختم ہوتی چلی گئی۔ یہ تنظیم بھی ہندوستانیوں اور انگریزوں کی ایک غیر سرکاری تنظیم تھی۔ اس تنظیم کا بنیادی مقصد برطانوی حکومت سے وفادار رہتے ہوئے سبھی اہم اور اعلیٰ اور متوسط طبقات کی فلاح و بہبود اور ترقی کے لیے کوششیں کرنا تھا۔ یہ بھی زمینداری ایسوسی ایشن کی طرح محدود انگریز-ہندوستانی گٹھ جوڑ پر مبنی برطانیہ نواز انجمن تھی۔ ان کا دوسرا اہم مقصد ہندوستانیوں کی حقیقی حالت کے بارے میں معلومات حاصل کرنا اور دوسروں کو اس سے واقف کرانا تھا۔ ساتھ ہی، عوامی ترقی، سماجی بہبود اور جائز حقوق کے لیے پرامن اور قانونی ذرائع استعمال کرنا تھا۔ یہ سوسائٹی بھی 1846 تک غیر فعال ہو چکی تھی۔

4.3.5 برٹش انڈین ایسوسی ایشن (The British Indian Association)

لینڈ ہولڈرز سوسائٹی اور بنگال برٹش انڈیا سوسائٹی کوئی اہم پیش رفت نہ کر سکے اور ان کی ناکامیوں کی وجہ سے ان دونوں کو 29 اکتوبر 1851 کو برٹش انڈین ایسوسی ایشن بنانے کے لیے ملا دیا گیا۔ برٹش انڈین ایسوسی ایشن کے بانی راجا رادھاکانت دیو تھے اور پہلے جنرل سیکریٹری دیوندر ناتھ ٹیگور تھے۔ اس تنظیم کے قائدین زمیندار تھے اور یہ تنظیم بنیادی طور پر زمینداروں کے مفادات کے لیے کام کر رہی تھی۔ لیکن اس کی خاص بات یہ تھی کہ یہ خصوصی طور پر ہندوستانیوں پر مشتمل تھی اور اس نے ہندوستانیوں کی فلاح و بہبود کو بڑھانے کے لیے کام کیا۔ اس کے دیگر اراکین میں کرسٹوداس پال، پیاری چند مترا اور رام گوپال گھوش شامل تھے۔ 1853 میں چارٹر کی تجدید کے وقت برٹش

انڈین ایسوسی ایشن نے برطانوی پارلیمنٹ کے سامنے کئی مطالبات رکھے جن میں ہندوستانیوں کی تعلیم، ایسٹ انڈیا ٹریڈنگ کمپنی کی اجارہ داری کو ختم کرنا، ہندوستانی صنعت کاروں کی حمایت اور ہندوستانیوں کو سول سروس میں شامل کرنا شامل تھا۔ اس کے علاوہ مقبول قسم کی اسمبلی، عدلیہ اور عاملہ کی علیحدگی، اعلیٰ افسران کی تنخواہوں میں کمی، نمک محصول اور اسٹامپ ڈیوٹی کے خاتمے کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ ان مطالبات کو بعد میں انڈین نیشنل کانگریس نے اپنے مطالبات میں شامل کیا۔ تنظیم کی عرضداشت کا کچھ نہ کچھ اثر ضرور ہوا اور 1853 کے چارٹر ایکٹ میں گورنر جنرل کی ایگزیکٹو کاؤنسل میں قانون سازی کے لیے مزید چھ اراکین کو شامل کیا گیا۔

بنگالی زبان میں برٹش انڈین ایسوسی ایشن کا نام بھارت ورشی سبھا رکھا گیا۔ ہندوستانی زمینداروں کے علاوہ تاجر اور نئے دانشور حضرات بھی اس میں شامل تھے۔ برٹش انڈین ایسوسی ایشن نے سیاسی احتجاج کو کل ہند پیمانے پر جاری رکھنے کی ضرورت محسوس کی۔ ایسوسی ایشن نے قانون اور جمہوریت کے ذریعہ فیصلوں میں ہندوستانیوں اور یورپی افراد کے درمیان مساوات کی پالیسی کا مطالبہ کیا۔ اس نے تمام عہدوں بشمول انڈین سول سروس کو بنا کسی تفریق کے ہندوستانیوں پر کھول دینے کا مطالبہ بھی کیا۔ تعلیم یافتہ ہندوستانی دانشور طبقے نے ملک کے دوسرے شہروں میں سیاسی انجمنیں قائم کرنی شروع کیں۔ ان کے ذریعہ ملک اور عوام کو درپیش مسائل پر غور و خوص کیا جانے لگا۔

اس تنظیم نے نیل بغاوت کی تحقیقات کے لیے کمیشن بنانے کا مطالبہ کیا تھا اور 1860 میں قحط کے متاثرین کے لیے رقم بھی جمع کی تھی۔ اس کے سکریٹری پیاری چندر متر زمینداری نظام پر بھی تنقید کرتے تھے اور کسانوں کے حقوق کا سوال اٹھاتے تھے۔ برٹش انڈیا ایسوسی ایشن نے لارڈ کیننگ کے ذریعے 1860 میں انکم ٹیکس کے نفاذ کی مخالفت کی۔ تنظیم کا اہم جریدہ ہندو پیٹریاٹ *(Hindu Patriot)* تھا۔ ایک سیاسی ادارے کے طور پر یہ 20 ویں صدی تک آزادانہ طور پر موجود رہا جس کے بعد انڈین نیشنل کانگریس نے اس کی اہمیت کا خاتمہ کر دیا۔ حالانکہ برٹش انڈین ایسوسی ایشن کا رسمی اختتام 1954 میں جا کر ہوا جب ہندوستان میں زمینداری نظام کا خاتمہ کر دیا گیا۔

4.3.6 مدراس نیٹیو ایسوسی ایشن (The Madras Native Association)

19 ویں صدی کی مدراس پریزیڈنسی کی سب سے اہم سیاسی تنظیم 'مدراس نیٹیو ایسوسی ایشن' تھی۔ مدراس میں تنظیم کے اراکین اور سابقہ مقامی کمیونٹی کے اراکین نے جس غیر متزلزل جوش کے ساتھ نوآبادیاتی حکام کے خلاف ایک انتھک جنگ چھیڑی تھی اس کے لیے مختلف دانشوروں کے متضاد خیالات ہیں۔ ایسوسی ایشن کو ایک ایسی تنظیم قرار دیا گیا ہے جو زمیندار اور کاروباری عناصر کی نمائندہ تجارتی اشرافیہ اور ایسے لوگوں پر مشتمل تھی جو مسلمانوں کی حمایت کو اکٹھا کرنے میں ناکام رہے تھے۔ حالانکہ نئے آخذ خصوصاً ایسوسی ایشن کی سرگرمیوں سے متعلق سینٹ جارج (مدراس) کے کاغذات جیسے کہ خفیہ محکمے کے دستاویزات اور انگلینڈ کے لیے خفیہ پیغامات سے پتہ چلتا ہے کہ ایسوسی ایشن تقریباً ایک مقبول عوامی بنیاد کے ساتھ ایک عظیم سیاسی تحریک کو فروغ دینے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس اکائی میں 'مدراس نیٹیو ایسوسی ایشن' اور اس کی پیشرو 'نیٹیو کمیونٹی آف مدراس' کو نئے سرے سے دیکھنے اور پریسیڈنسی کی عصری سیاست میں ان کے کردار کا جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے۔

'مدراس نیٹیو ایسوسی ایشن' کا باقاعدہ آغاز 1852 میں گجلا لکشمن راسو چیٹی (Gujula Lakshminarasu Chetty) اوراس کے دوستوں جیسے جے۔ بی۔ نورٹن نے کیا تھا۔ تاہم، اس کے قیام کی راہ 1830 کی دہائی سے پہلے ہی ہموار ہو چکی تھی، کیونکہ مدراس نیٹیو ایسوسی ایشن کے زیادہ تر اراکین ہندو لٹریری سوسائٹی (1830) میں پہلے سے ہی سرگرمی سے حصہ لے رہے تھے۔ چیٹی اس نئی تنظیم کے صدر بنے اور ان کے گہرے معاون پی۔ سوم سندرم چیٹیار نے تنظیم کے سیکریٹری کے طور پر کام کیا۔ لکشمن راسو چیٹی اور اس کے دوستوں نے سوسائٹی کے بحث و مباحثے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ان لوگوں کے علاوہ، سماجی اصلاح کے کچھ دیگر علمبردار جیسے اینگولا ویراسوامیہ اور کومالیشوراپورم سری نواسا پلئی، لٹریری سوسائٹی کو منظم کرنے میں سرگرم تھے۔ سوسائٹی کا ایک حصہ ہوتے ہوئے، لکشمن راسو چیٹی نے منظم انداز سے نمائندگی میں دلچسپی پیدا کرلی۔ اس نے 1840 کی دہائی تک مدراس میں نیٹیو کمیونٹی کو منظم کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ تب سے ہی نیٹیو کمیونٹی نے برطانوی حکومت کی غیر مقبول پالیسیوں کے خلاف احتجاج شروع کر دیا۔ چیٹی نے 1844 میں کرسنٹ (*Crescent*) کے نام سے ایک جریدہ بھی شائع کیا۔ جریدہ یا جرنل کا اصل مقصد مشنری تبلیغ پر دفاعی حملہ کرنا اور نوآبادیاتی حکومت کی پالیسیوں میں کمیوں کو سامنے لانا تھا۔ اس وقت تک بنگال برٹش انڈین اسوسی ایشن کے ساتھ خط و کتابت جاری تھی جس میں اس نے تینوں پریسیڈنسیوں میں متعدد انجمنوں کی سرگرمیوں کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے پر زور دیا۔ 26 فروری 1852 میں بنگال برٹش انڈین اسوسی ایشن کی ایک شاخ بھی مدراس میں قائم ہوئی، مگر بعد میں دونوں تنظیموں کے درمیان اختلاف ہونے کی وجہ سے لکشمن راسو چیٹی نے اسی سال یعنی 1852 میں چنئی (سابق نام: مدراس) کے مقام پر مدراس نیٹیو ایسوسی ایشن کی بنیاد رکھی۔

ایسوسی ایشن کے صدر سی۔ وائی۔ مدلیار اور سیکریٹری وی۔ راما نجاچاریہ منتخب کیے گئے۔ لندن میں تنظیم کے نمائندے کے طور پر مالکم لیون کو مقرر کیا گیا جو مدراس میں جج رہ چکے تھے۔ اس تنظیم نے بھی چارٹر ایکٹ 1853 پاس ہونے سے پہلے وہی مطالبات برطانوی پارلیمنٹ کو بھیجے جو پہلے برٹش انڈین ایسوسی ایشن نے لکھ کر بھیجے تھے۔ یہ تنظیم 1857 کی بغاوت کے خلاف تھی اور اس کی کڑی تنقید کی تھی۔ یہ تنظیم بھی دیگر زمیندار طبقے کی تنظیموں کی طرح زیادہ دن نہیں چل سکی، کیونکہ زیادہ تر رہنما عوامی مشکلات سے بیخبر تھے اور عوام پر ان کا کوئی اثر نہیں تھا۔

4.3.7 بامبے ایسوسی ایشن (The Bombay Association)

بامبے ایسوسی ایشن، بمبئی پریزیڈنسی کی پہلی سیاسی تنظیم تھی جس کی بنیاد جگناتھ شنکر سیٹھ نے 26 اگست 1852 کو رکھی تھی۔ اس کے متعدد اہم ممبران سر جمشید جی جیجی بھائی، نوروجی فرسنگی، ڈاکٹر بھاؤ داجی لاڈ، دادا بھائی نوروجی اور ونائک شنکر سیٹھ وغیرہ تھے۔ سر جمشید جیجی بھائی اس تنظیم کے پہلے صدر تھے۔

4.3.8 ایسٹ انڈیا ایسوسی ایشن (The East India Association)

1865ء میں لندن میں دادا بھائی نوروجی نے لندن انڈیا سوسائٹی کی بنیاد رکھی تاکہ ہندوستانی مسائل پر بحث کے ذریعہ برطانوی

رائے عامہ کو ہندوستانیوں کی ابھرتی ہوئی سماجی اور سیاسی امنگوں کے حق میں کیا ج اس کے۔ انہوں نے اس سوسائٹی کی شاخیں ہندوستان کے کئی اہم شہروں میں بھی کھولیں۔ بعد میں اس کی جگہ نوروجی نے 1866 میں ایسٹ انڈیا ایسوسی ایشن کی بنیاد ڈالی۔ ایسوسی ایشن کے پہلے صدر لارڈ لیویڈن تھے۔ اس کی مجلسیں کیکسٹن ہال، ویسٹ منسٹر میں ہوئیں۔ اس تنظیم نے 1949 میں نیشنل انڈین ایسوسی ایشن کو اپنے میں شامل کیا اور اس کے بعد ایک مشترکہ برطانیہ، انڈیا اور پاکستان ایسوسی ایشن قائم ہوئی۔ 1966 میں یہ رائل انڈیا، پاکستان اور سیلون سوسائٹی میں جا کر مل گئی اور رائل سوسائٹی فار انڈیا، پاکستان اور سیلون وجود میں آئی۔

4.3.9 پوناسارو جنک سبھا (The Pune Sarvajanik Sabha)

پونا سروجنک سبھا، جسے سروجنک سبھا کے نام سے بھی جانا جاتا ہے، برطانوی راج میں ایک سماجی سیاسی تنظیم تھی جس کا قیام حکومت اور لوگوں کے درمیان بچولیے اور کسانوں کے قانونی حقوق دلوانے والے کے طور پر ہوا تھا۔ اس کا آغاز 2 اپریل 1870 کو 6000 افراد کے ذریعہ منتخب کردہ 95 ارکان پر مشتمل ایک منتخب ادارہ کے طور پر ہوا۔ یہ تنظیم انڈین نیشنل کانگریس کا پیش خیمہ تھی جس کا آغاز مہاراشٹر سے ہی ہوا تھا۔ 1875 میں سبھا نے ہاؤس آف کامنز کو ایک عرضی بھیجی جس میں برطانوی پارلیمنٹ میں ہندوستان کی براہ راست نمائندگی کا مطالبہ کیا گیا۔ پونے سروجنک سبھا نے ہندوستانی جدوجہد آزادی کو قومی سطح کے بہت سے ممتاز رہنما فراہم کیے جن میں بال گنگادھر تلک بھی شامل ہیں۔ اسے گنیش واسودیو جوشی نے 1867 میں قائم کیا تھا، جبکہ کچھ دوسرے ذرائع کا کہنا ہے کہ اس کی بنیاد مہادیو گووند راناڈے نے رکھی تھی، جو ایک نامور وکیل اور بعد میں بمبئی ہائی کورٹ میں جج تھے۔ سروجنک سبھا کے ساتھ وابستگی کی وجہ سے گنیش واسودیو جوشی 'سروجنک کاکا' کے نام سے مشہور ہوئے۔ سروجنک سبھا نے برطانویوں سے اپیل کی کہ برطانیہ کی حکومت ہندوستانیوں کو اپنے ملک کے شہری تسلیم کرے۔ اوندھ (Aundh) ریاست کے حکمران بھون راؤ شرینواس راؤ پنت پرتینیدھی اس تنظیم کے پہلے صدر تھے۔ کئی نامور شخصیات جیسے بال گنگادھر تلک، گوپال ہری دیش مکھ، مہارشی انا صاحب پٹوردھن وغیرہ نے اس تنظیم کے صدر کے طور پر خدمات انجام دیں۔ اس تنظیم کی جانب سے جسٹس راناڈے کی نگرانی میں ایک سہ ماہی جرنل بھی نکالا جاتا تھا، جس میں خصوصیت سے ہندوستان کی معاشی صورت حال پر ممتاز دانشوروں کے قیمتی مضامین شائع ہوتے تھے۔

4.3.10 انڈین لیگ (The Indian League)

بنگال میں انیسویں صدی کی تیسری دہائی کے آخر سے سیاسی سرگرمیوں کے آثار دکھنے لگے۔ لینڈ ہولڈرز سوسائٹی، جدید معنوں میں بنگال کی پہلی مشہور عوامی انجمن تھی۔ سیاسی سرگرمی اس کا بنیادی مقصد نہیں تھا، پھر بھی اس کے وجود نے لوگوں میں ایک نیا سیاسی شعور پیدا کیا جس کا اثر 1851 میں نظر آیا۔ برٹش انڈین ایسوسی ایشن کا قیام ہندوستانیوں کی شکایتوں کو لے کر برٹش پارلیمنٹ میں عرضی دینے کے خاص مقصد کے ساتھ کیا گیا تھا۔ تقریباً ایک چوتھائی صدی تک برٹش انڈین ایسوسی ایشن نے اگرچہ زمیندار اشرافیہ کی نمائندگی کرتے ہوئے ملک کے عوام پر اپنا تسلط برقرار رکھا لیکن جلد ہی ایسوسی ایشن اور عوام کے درمیان دراڑ پڑ گئی۔ بنگال میں انگریزی تعلیم کی مزید ترقی کے ساتھ،

وہاں ایک تعلیم یافتہ دانشور طبقہ پروان چڑھا جس کا تعلق بنیادی طور پر متوسط طبقے سے تھا۔اس طبقے کے افراد مغرب کے سیاسی نظریات سے بخوبی واقف تھے اور نظریاتی طور پر برٹش انڈین ایسوسی ایشن کی اکثریت کے مقابلے میں زیادہ آزاد خیال تھے۔ وہ ملک کی سیاست میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا چاہتے تھے اور اسی لیے سسر کمار گھوش نے 74-1873 میں اپنے جریدے امرت بازار پتر کا (*The Amrita Bazar Patrika*) کے کالموں کے ذریعے برٹش انڈین ایسوسی ایشن سے سالانہ چندے کی رقم 50 روپے سے کم کرنے کی اپیل کی، جو کہ متوسط طبقے کے لیے بہت زیادہ تھی اور تنظیم میں 'کم آمدنی والے باصلاحیت افراد' کو داخل کرنے میں رکاوٹ بنی ہوئی تھی۔ برٹش انڈین ایسوسی ایشن نے بظاہر مالی بنیادوں پر فیس کو کم کرنے سے انکار کر دیا تھا، لیکن حقیقت میں، وہ متوسط طبقے کے لیے اپنے دروازے کھولنے کے لیے تیار نہیں تھی۔ اس انکار نے متوسط طبقے کے لیے الگ سیاسی انجمن کی ضرورت پیدا کی، جس کے نتیجے میں 1875 میں انڈیا لیگ کی بنیاد پڑی۔انڈیا لیگ کی تشکیل 22 ستمبر 1875 کو ششیر کمار گھوش اور ان کے رفقا کے ذریعے ہوئی تھی۔ شیشر کمار نے تبصرہ کیا 'یہ عوامی اعلان اور قوم سے اس میں شرکت کرنے اور اسے اپنی پسند کے مطابق ڈھالنے کی اپیل کے ذریعہ تشکیل دی گئی غیر سیاسی تنظیم کی پہلی مثال ہے۔'

لیگ کے مقاصد:-لیگ کے مقاصد درج ذیل تھے۔

- لوگوں کے خیالات کا پتہ لگانا اور ان کی تشہیر کرنا تھا، تاکہ یہ دکھایا جاسکے کہ ہندوستانی لوگ سیاسی اور دیگر معاملات میں کیسے ترقی کر سکتے ہیں۔
- ہندوستانیوں کی بھلائی اور ان کے درمیان سیاسی تعلیم کے فروغ کے لیے ان کے ذرائع پر بحث کرنا اور ان میں سے مناسب سمجھے جانے والوں کو اختیار کرنا۔
- لوگوں میں قوم پرستی کے احساس کو ابھارنا اور ملک کے معاشی وسائل کی ترقی کے لیے ذرائع اختیار کرنا۔

اس کی رکنیت کی فیس ایک چھوٹی سی رقم 5 روپے سالانہ تھی۔ لیگ کے عارضی صدر شمبھو چندر مکھرجی تھے، جو 'رئیس اور رعیت' (*Reis and Rayyat*) اخبار کے ایڈیٹر بھی تھے۔اس کے سکریٹری کالی موہن داس تھے اور اسسٹنٹ سکریٹری خود شیشر کمار گھوش تھے۔ایک مضبوط مجلس عاملہ تشکیل دی گئی جس میں 38 ممبران تھے۔ان میں آنند موہن بوس اور دیگر حضرات شامل تھے۔

لیگ کی پہلی سیاسی مہم کلکتہ کے لیے ایک منتخب شدہ بلدیہ یا منسپلٹی کی تحریک تھی۔ لیگ کا کہنا تھا کہ 'ہندوستانی ایک ترقی یافتہ قوم کی طرح برتاؤ کرنا چاہتے ہیں۔۔۔اور ایک قوم کے طور پر ہندوستانیوں کو قومی زندگی کی علامات کو بھی ظاہر کرنا چاہیے۔اس موقع (کلکتہ کے لیے ایک منتخب شدہ بلدیہ یا میونسپلٹی کی تحریک) کا استعمال یہ دکھانے کے لیے کیا جانا چاہیے کہ ہندوستانی ایک مشترکہ مقصد کے لیے متحد ہو سکتے ہیں' بیدون چوک پر ایک ایک عوامی مجلس کلکتہ میونسپل بل 1875، پر غور و خوض کرنے کے لیے منعقد کی گئی۔اس مجلس میں عوام کے ہر ایک طبقے کے لوگ شامل تھے اور اس کے صدر ایک ہندوستانیوں کے ہمدرد یورپی تھے۔ کچھ ہمعصر اخباروں نے ایک یوروپی کے اس طرح کی مجلس کا صدر ہونے کی وجہ سے اس کی تنقید کی۔ لیگ کی پیامبر امرت بازار پتریکا نے اپنے خصوصی انداز میں اس الزام کا دفاع کیا۔اس نے کہا کہ

اگرایسا کرنے سے ایک دونسلوں کے درمیان سیاسی اتحاد ممکن ہو سکتا ہے تو یہ ملک کے لیے بیحد فائدے کا سوداہو گا۔ یہ پہلی مہم نہایت کامیاب رہی اور شیشر کمار کے مطابق اس سے ان تمام لوگوں کو عوامی مجلس میں شامل ہونے اور اپنی بات رکھنے کا موقع ملا جو برٹش انڈین ایسوسی ایشن کی ایسی کسی میٹنگ میں شامل نہیں ہو سکتے تھے۔ تاہم اس مہم کی وجہ سے برٹش انڈین ایسوسی ایشن سے لیگ کا جھگڑا ہو گیا۔ منتخبہ بلدیہ کی وجہ سے ٹیکس دینے والے، منصفوں کو کنٹرول کر سکیں گے، لیکن برٹش انڈین ایسوسی ایشن کے خیالات کو رکھتے ہوئے کرسٹو داس پال نے منصفوں کو بلدیہ کے اراکین چننے کا اختیار دینے کی بات کہی۔ اس کولے کر لیگ نے کرسٹو داس پر عوام کی حقیقی رائے سامنے نہ رکھنے کا الزام عائد کیا اور ایک طبقے (زمیندار) کا ساتھ دینے والا بتایا۔ بہر حال لیگ کی مہم سے بنگال کی حکومت کچھ حد تک محدود انتخابات پر راضی ہو گئی اور اجنبی حکومت ہونے کی وجہ سے لیگ نے اس پر قناعت کی۔ انڈین لیگ 1876 میں جاکر انڈین ایسوسی ایشن میں ضم ہو گئی۔

4.3.11 انڈین سوسائٹی (The Indian Society)

1872 میں، آنند موہن بوس نے برطانیہ میں ہندوستانی باشندوں میں قوم پرستی کے جذبے کو فروغ دینے کے لیے لندن میں ایک انڈین سوسائٹی بنائی۔ بعد میں یہ تنظیم ہندوستانیوں کے لیے اپنے مطالبات کی آواز اٹھانے کا ایک اہم پلیٹ فارم بن گئی۔

4.3.12 انڈین ایسوسی ایشن (The Indian Association)

کانگریس سے پہلے موجود قومی تنظیموں میں سب سے اہم انڈین نیشنل ایسوسی ایشن یا انڈین ایسوسی ایشن (Indian National Association یا Indian Association) تھی، جسے 26 جولائی 1876ء میں کلکتہ میں قائم کیا گیا تھا۔ اس نے ایک سال پہلے قائم ہوئی تنظیم انڈین لیگ کی جگہ لی۔ انڈین ایسوسی ایشن کے بانی اور اس کے روح رواں سریندر ناتھ بنرجی تھے اور اس کے سیکرٹری آنند موہن بوس تھے۔ بعدازاں کلکتہ کے ممتاز بیرسٹر منموہن گھوش اس کے صدر منتخب ہوئے۔ اس ادارے کا مقصد نہ صرف متوسط طبقے بلکہ عام لوگوں کو تنظیم میں شامل کرنا تھا۔ اس لیے اس کے اراکین کے لیے سالانہ چندہ 5 روپے رکھا گیا جبکہ برٹش انڈین ایسوسی ایشن کا سالانہ عطیہ 50 روپے تھا۔ جلد ہی انڈین ایسوسی ایشن تعلیم یافتہ طبقے کی ایک اہم نمائندہ تنظیم بن گئی۔ سریندر ناتھ بنرجی کے مطابق اس ایسوسی ایشن کے اہم مقاصد تھے۔

- ملک میں رائے عامہ کی ایک طاقتور تنظیم بنانا
- مشترکہ سیاسی مفاد کی بنیاد پر ہندوستانیوں کو متحد کرنا
- ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان دوستی کے جذبات کو بڑھاوا دینا
- اس زمانے کی اہم عوامی تحریکات میں عوام کے تمام طبقات کی شمولیت

اس انجمن میں زمینداروں کی جگہ متوسط طبقے کو ترجیح دی گئی۔ انڈین نیشنل ایسوسی ایشن سے پہلے بنگال میں ایسی کوئی سیاسی تنظیم نہیں تھی جو متوسط طبقے اور قوم پرستوں کے مفاد کی صحیح نمائندگی کرتی ہو۔ ایسوسی ایشن نے نوجوان متوسط طبقے کو جمہوری بنیاد پر ایک سیاسی محاذ مہیا

کرایا۔ انجمن کے اراکین میں زیادہ تر تعلیم یافتہ نوجوان، وکلاء اور صحافی شامل تھے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ بڑے کاروباری، زمیندار اور جاگیردار اس میں شامل نہیں تھے۔ انیل سیل (Anil Seal) کے الفاظ میں، 'انڈین ایسوسی ایشن نے گریجویٹس اور پیشہ ور افراد کے لیے ایک دباؤ گروپ کے طور پر کام کیا، جس نے 'متوسط طبقے' کی نمائندگی کرنے کا دعویٰ کیا۔'

انڈین ایسوسی ایشن نے 29 دسمبر 1883 کو کلکتہ کے البرٹ ہال میں آنند موہن بوس کی صدارت میں ایک قومی کانفرنس کا انعقاد کیا۔ البرٹ بل تنازعہ کے دوران، سریندر ناتھ بنرجی کو اپنے جریدے 'بنگالی' میں کلکتہ ہائی کورٹ کے جج جے ایف ماریش پر تنقید کرنے پر 5 مئی 1883 کو دو ماہ قید کی سزا سنائی گئی۔ اسی وجہ سے وہ انڈین نیشنل کانگریس کے پہلے اجلاس میں شریک نہ ہو سکے۔ جولائی 1883 میں انہیں رہا کر دیا گیا۔ دوسری انڈین نیشنل کانفرنس کلکتہ میں 25 دسمبر 1885 کو منعقد ہوئی جس کی صدارت سریندر ناتھ بنرجی نے کی۔ سریندر ناتھ بنرجی نے طوفان کی طرح تیز رفتاری سے ملک کا دورہ کیا۔ کچھ شہروں میں انڈین ایسوسی ایشن کلکتہ کی ذیلی تنظیمیں قائم کیں۔ ان کی بہترین خطیبانہ صلاحیت کو ہر جگہ سراہا گیا اور وہ ملک کی سیاسی زندگی میں اہم کردار ادا کرنے والے مقبول سیاسی رہنما بن گئے

اس نے سول سروسز تحریک بھی شروع کی، جسے 'بھارتیہ جن پد سیوا تحریک' بھی کہا جاتا ہے، یہ تحریک لٹن کی پالیسیوں کے خلاف چلائی گئی۔ کارن والس ہندوستان میں سول سروس کا بانی تھا۔ 1853 میں ہندوستانیوں کے لیے بھی سول سروسز کے دروازے کھول دیے گئے اور وہ اس مقابلہ جاتی امتحانات میں شریک ہونے لگے۔ 1861 تک اس امتحان میں شرکت کی زیادہ سے زیادہ عمر 22 سال تھی اور یہ امتحان صرف لندن میں لیا جاتا تھا۔ 1863 میں آئی سی ایس امتحان پاس کرنے والے پہلے ہندوستانی ستیندر ناتھ ٹیگور تھے۔ 1866 میں بالائی عمر کو کم کر کے 21 سال کر دیا گیا۔ 1869 تک سریندر ناتھ بنرجی سمیت چار ہندوستانی یہ امتحان پاس کر چکے تھے۔ جب سریندر ناتھ بنرجی آسام کے کلکٹر تھے تو انہیں 1874 میں برطرف کر دیا گیا۔ 1877 میں اس سروس کے لیے عمر کم کر کے 19 سال کر دی گئی تاکہ ہندوستانی پڑھے لکھے لوگ یہ امتحان نہ دے سکیں کیونکہ انہیں یہ امتحان دینے کے لیے لندن جانا پڑتا تھا اور کم عمری کی وجہ سے ان کا لندن جانا ناممکن تھا

کلکتہ میں انڈین ایسوسی ایشن نے اس کے خلاف احتجاج کے لیے 1877 میں ٹاؤن ہال میں ایک میٹنگ بلائی۔ کیشو چندر سین، جنھوں نے اپنی زندگی میں کبھی کسی سیاسی اجلاس میں شرکت نہیں کی، اس اجلاس میں شریک ہوئے۔ انڈین ایسوسی ایشن نے 1879 میں لال موہن گھوش کو برطانوی حکومت کو ایک میمورنڈم پیش کرنے کے لیے برطانیہ بھیجا تھا۔ 1923 سے سول سروسز کا امتحان ہندوستان اور برطانیہ میں بیک وقت لیا جانے لگا۔

البرٹ بل کو لے کر ہوئے تنازعہ کے موقعہ پر بھی ایسوسی ایشن نے کافی اہم کردار ادا کیا۔ اس بل کی حمایت میں ایسوسی ایشن نے جب بڑے پیمانے پر احتجاج منظم کیا تو اسے دیکھ کر برطانوی افسران بھی حیران رہ گئے۔ ایسوسی ایشن نے ہندوستانی پریس کے خلاف قانون سازی پر نکتہ چینی کی اور مالگزاری محصول (Revenue Tariff) ختم کیے جانے کو لے کر بھی حکومت کو تنقید کا نشانہ بنایا۔ اس قانون کے ذریعہ لنکا شائر کی مصنوعات کو ہندوستانی مصنوعات کے مقابلے میں چھوٹ دی گئی تھی۔ اس کے علاوہ ورنا کولر پریس ایکٹ، آرمس

ایکٹ اور البرٹ بل کے خلاف بھی اس نے تحریک چلائی۔ وائسرائے رپن کے دور میں یہ ایسوسی ایشن ایک اہم عوامی محاذ میں بدل گئی تھی۔ یہ انجمن انتہا پسند اور تنگ نظر ہندو قوم پرستی اور تعصب سے پرے تھی۔ مسلمانوں کے ساتھ دوستی اور خیر سگالی کے اظہار کے طور پر، اس نے نواب محمد علی کو اس کی دوسری سالانہ کانفرنس کی صدارت کے لیے مدعو کیا۔ ہندوستانی قومیت کی لہر کو ٹھوس روپ دینے اور ملک کے سیاسی اتحاد کو مضبوط بنانے کی غرض سے انڈین ایسوسی ایشن نے آل انڈیا کانفرنس کے نظریہ کو عملی جامہ پہنایا۔ اس کی پہلی میٹنگ کلکتہ میں 1883ء میں منعقد کی گئی۔ اس میں ایسے کئی موضوعات زیر بحث لائے گئے جو تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کے ذہن میں کھلبلی مچا رہے تھے۔ انڈین ایسوسی ایشن نے تقریباً وہی لائحہ عمل تیار کیا تھا جسے انڈین نیشنل کانگریس نے بعد میں اپنایا تھا اور جس میں آخر کار یہ انجمن 1886ء میں جا کر مل گئی۔

درحقیقت، انڈین ایسوسی ایشن نے قومی بیداری اور سیاسی شعور کی ترقی کی بنیاد رکھی جس کے نتیجے میں بالآخر 1885 میں انڈین نیشنل کانگریس کا قیام عمل میں آیا اور اس کے لیے بجا طور پر سریندر ناتھ بنرجی تعریف کے مستحق ہیں۔ دراصل ایسوسی ایشن، کانگریس کا پیش خیمہ تھی۔ اس نے 1877 میں ہندوستانی سول سروسز امتحان کے امیدواروں کے لیے عمر کی حد کو 21 سے کم کر کے 19 سال کرنے کے لیے کل ہند تحریک شروع کی۔ سریندر ناتھ بنرجی کی قیادت میں انجمن نے اس غیر منصفانہ فیصلے کے خلاف سخت احتجاج کیا۔ سریندر ناتھ کو ایک خصوصی نمائندہ کے طور پر منتخب کیا گیا تھا تاکہ وہ ہندوستان کے مختلف حصوں کا دورہ کرے اور وہاں سے اپنے مقصد کے لیے حمایت حاصل کی جا سکے جسے بالآخر ایسوسی ایشن برطانوی پارلیمنٹ کو بھیجنے کا ارادہ رکھتی تھی۔

انڈین نیشنل کانفرنس

انڈین نیشنل کانفرنس سے مراد، اجلاسوں کا ایک سلسلہ ہے جسے عام طور پر انڈین نیشنل کانگریس کا پیشرو سمجھا جاتا ہے۔ سریندر ناتھ بنرجی اور آنند موہن بوس اس کے مرکزی منتظم تھے۔ کانفرنس کے دو سیشن 1883 اور 1885 میں منعقد ہوئے اور ان اجلاسوں میں تمام بڑے شہروں کے نمائندے شامل ہوئے۔ انڈین نیشنل کانفرنس کا پہلا اجلاس 28 سے 30 دسمبر 1883 کو کلکتہ میں البرٹ ہال میں منعقد ہوا۔ اس کی تحریک فوجداری طریقہ کار ترمیمی بل (1883-1884) یا البرٹ بل کی حمایت کے ذریعے ملی۔ آنند موہن بوس نے اس کانفرنس کو قومی ہندوستانی پارلیمنٹ کی تشکیل کے پہلے مرحلے کے طور پر ظاہر کیا۔ کانفرنس نے ہندوستان کے لوگوں کی ترقی کے لیے نمائندہ اسمبلیوں کو متعارف کرانے کا مطالبہ کیا۔ دوسری انڈین نیشنل کانفرنس بھی 25 سے 27 دسمبر 1885 کو کلکتہ میں منعقد ہوئی۔ انڈین ایسوسی ایشن کے ساتھ ساتھ نیشنل محمڈن ایسوسی ایشن اور برٹش انڈین ایسوسی ایشن بھی اس میٹنگ کے کنوینر تھے۔ اپنے آخری دن، دوسری نیشنل کانفرنس نے انڈین نیشنل کانگریس کو خیر سگالی کا پیغام بھیجا۔ چونکہ ان دونوں میں ایک دوسرے سے مماثلت تھی، اسی لیے نیشنل کانفرنس دسمبر 1886 میں انڈین نیشنل کانگریس میں جا کر مل گئی۔

4.3.13 مدراس مہاجن سبھا (The Madras Mahajan Sabha)

لٹن کی پالیسیوں کی مخالفت مدراس میں بھی ہوئی۔ لارڈ رپن کے دور حکومت میں یہاں کچھ مقامی تنظیمیں وجود میں آئیں تھیں۔ اسی

دوران ایم۔ وجے راگھو اچاری (M. Vijay Raghavachariar)، جی سبرامنیہ ایر(G. Subramania Iyer)، پی۔ آنند اچارلو(P. Anandacharlu)اور دوسروں نے 1881ء میں چنئی(سابق نام: مدراس) میں 'مدراس مہاجن سبھا' کی بنیاد رکھی۔ مدراس نیٹیو ایسوسی ایشن کے زیادہ تر رہنما اس میں شامل ہوگئے۔ ساتھ ہی دوسری مقامی تنظیموں کو بھی ایک محاذ پر لانے کی کوشش کی گئی۔ سبھا کا دفتر شروع میں دی ہندو، ایلس روڈ جنکشن، ماؤنٹ روڈ کے دفتر میں قائم کیا گیا تھا۔اس کا پہلا اجلاس 29دسمبر 1884 سے 2جنوری 1885تک ہوا۔اسی دوران 'متدان میلا بھی چل رہا تھا اور ساتھ ہی تھیوسوفیکل سوسائٹی مجلس بھی جاری تھی۔ پہلے اجلاس میں سبھا نے انتخابی کونسلوں کی توسیع اور ان میں ہندوستانیوں کی شمولیت میں اضافے کی بات رکھی۔ ساتھ ہی عدلیہ اور مال گزاری اداروں کی علاحدگی کی مانگ کی اور کسان طبقات کے حالات پر غور کیا گیا۔ پی رنگیا نائڈو 1885 میں سبھا کے صدر منتخب ہوئے۔ ستمبر 1885 میں، سبھا نے بمبئی پریزیڈنسی ایسوسی ایشن اور انڈین ایسوسی ایشن کے تعاون سے ایک وفد انگلستان بھیجا تھا۔

مہاجن سبھا کے ممبران نے قوم کو برطانوی راج کے چنگل سے نجات دلانے اور ہندوستانیوں کے مسائل کو حل کرنے کے لیے آل انڈیا سطح پر ایک تنظیم بنانے کی ضرورت محسوس کی۔ سبھا کے ممبران نے اڈیار تھیوسوفیکل سوسائٹی میں منعقدہ کانفرنس میں اس خیال کا بہت پرزور انداز سے اظہار کیا جس میں بہت سے محب وطن اور قائدین نے شرکت کی، جنھوں نے بعد میں انڈین نیشنل کانگریس کی تشکیل کرکے اسے عملی جامہ پہنایا۔ مدراس مہاجن سبھا کو ایک منفرد تنظیم سمجھا جاتا تھا جس نے جنوبی ہندوستانیوں کے ذریعہ ہندوستان کی قومی آزادی کی راہ ہموار کی۔ اس طرح سبھا نے 1884 سے ہندوستانیوں کے بنیادی حقوق جیسے کہ قومی آزادی اور دیگر مشترکہ سماجی مسائل کو ہم وطنوں کی فلاح وبہبود کے لیے اٹھایا۔اس نے 1920 کے بعد سے انڈین نیشنل کانگریس کی سرگرمیوں کے ساتھ بہت گہرا رشتہ قائم کیا۔

4.3.14 بامبے پریسیڈینسی ایسوسی ایشن (The Bombay Presidency Association)

فیروز شاہ مہتا، کے ٹی تلنگ، اور بدرالدین طیب جی نے جنوری 1885 میں بامبے پریسیڈینسی ایسوسی ایشن کی بنیاد رکھی۔ یہ البرٹ بل تنازعہ اور لٹن کی رجعتی پالیسیوں کے جواب میں قائم کی گئی تھی۔ بمبئی پریزیڈنسی یا صوبہ بمبئی، بمبئی اور سندھ کے نام سے بھی جانا جاتا تھا، ایک برطانوی ہندوستانی انتظامی اکائی (صوبہ) تھا جس کا دارالحکومت بمبئی میں تھا۔ یہ معاہدہ باسین (1802) کے بعد کونکن کے علاقے میں حاصل ہونے والا پہلا زمینی علاقہ تھا۔ موسم گرما کے ہیڈ کوارٹر کے طور پر مہابلیشور کا تعین کیا گیا۔

بمبئی کے ہندوستانی شہریوں نے کلکتہ میں برٹش انڈین ایسوسی ایشن کے قیام کے بعد ایلفنسٹائن انسٹی ٹیوٹ میں ایک جلسہ عام کا انعقاد کیا جہاں بمبئی پریزیڈنسی میں پہلی سیاسی تنظیم کی بنیاد رکھی گئی تھی جس میں کھلے عام اور آزادانہ طور پر ہندو پارسی، یہودی اور پرتگالی بھی شامل تھے۔ بامبے ایسوسی ایشن، پریسیڈنسی کے لیے عوامی نمائندے کے طور پر کام کرنے لگی۔ جگناتھ شنکر سیٹھ کی صدارت میں منعقدہ اجلاس میں کیے گئے فیصلے کے مطابق اس کی سالانہ فیس پچیس روپے مقرر کی گئی۔ غیر متوقع طور پر، تنظیم کو شروع کرنے کے لیے 30,000روپے بطور عطیہ موصول ہوئے۔ پہلی قرارداد کے مطابق تنظیم 'بمبئی پریزیڈنسی میں ہندوستانی باشندوں کی خواہشات کا پتہ لگانا چاہتی تھی۔'

بمبئی پریسیڈینسی ایسوسی ایشن اور پونا سار وجنک سبھا کے ہمیشہ اچھے تعلقات رہے۔ برطانوی رائے دہندگان کے سامنے ہندوستان کا مقصد پیش کرنے کے لیے، بمبئی پریزیڈنسی ایسوسی ایشن، پونا سروجنک سبھا، مدراس مہاجن سبھا اور کلکتہ کی انڈین ایسوسی ایشن نے ستمبر 1885 میں ایک مشترکہ وفد انگلستان بھیجا۔ بمبئی کے چنداور کر، مدراس کے رامسوامی مدلیار، اور کلکتہ کے منموہن گھوش نے وفد کے قائدین کے طور پر خدمات انجام دیں۔ تین ماہ بعد بمبئی پریزیڈنسی ایسوسی ایشن نے پہلی کانگریس منعقد کی۔ فیروز شاہ مہتا، کاشی ناتھ تلنگ اور بدرالدین طیب جی تینوں کو بمبئی کی عوامی زندگی کے ارباب ثلاثہ یا تین روشنی کہا جاتا تھا۔

4.4 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

19 ویں صدی کے نصف آخر کے دوران، ہندوستان نے سماجی اور معاشی زندگی میں نمایاں تبدیلیاں دیکھی۔ اس وقت کی نمایاں پیشرفت میں سے ایک سیاسی شعور کا ارتقا تھا جس کے نتیجے میں سیاسی انجمنوں اور قومی تحریک آزادی کا آغاز ہوا۔ ہندوستان میں ہونے والی یہ ذہنی بیداری، در حقیقت برطانوی حکمرانی کے نتیجے میں معاشرے کی ساخت میں پیدا ہونے والی تبدیلیوں کی وجہ سے شروع ہوئی۔ اس کے نتیجے میں نئے سماجی طبقات وجود میں آئے۔ ان میں سب سے اہم تعلیم یافتہ دانشور طبقہ تھا، جس نے کہ مغربی تعلیم اور تمدن کے زیر اثر سماجی اصلاحات میں پہل کی۔ ان ہی لوگوں کی کوششوں سے برطانوی حکمرانوں کی استحصال کی پالیسی لوگوں کی سمجھ میں آئی اور برطانیہ اور ہندوستان کے معاشی مفادات کا فرق بھی لوگوں کو معلوم ہوا۔ اس عوامی بیداری کے نتیجے میں ہندوستان میں قومیت اور حب الوطنی کو فروغ حاصل ہوا۔ آگے چل کر انہوں نے اپنے آپ کو سیاسی طور پر منظم کرنا شروع کیا جس کے نتیجے بہت سی سیاسی تنظیمیں وجود میں آئیں اور بالآخر ہندوستانی قومی کانگریس کا قیام ہوا جو اصلاحی پروگرام سے آغاز کرتے ہوئے آزادی کی جدوجہد کی علمبردار بن گئی۔ ابتدائی سیاسی انجمنیں، اپنے دائرہ کار، مفادات اور طریقہ کار کے سلسلہ میں کانگریس سے یا دیگر بعد کی سیاسی جماعتوں سے بیحد مختلف تھیں۔ ان کے رہنماؤں کے ذہن میں 1857 کی بغاوت اور اس کے انجام کی یاد تازہ تھی۔ وہ صرف استغاثوں اور عرضداشتوں کے ذریعے آئینی اصلاحات تک محدود تھے۔ اس کے علاوہ وہ صرف اپنے طبقے اور علاقے کے فائدے کے لیے سوچتے تھے۔ ایک کل ہند سیاسی فکر پیدا ہونے میں ابھی وقت تھا۔ ان محدودات کے باوجود یہ تنظیمیں اس لئے اہم ہیں، کیونکہ انہوں نے ہندوستانیوں کی سیاسی فکر کو بیدار کیا اور انہیں اس قابل بنایا کہ وہ اپنے حقوق کے لیے آئینی جدوجہد کر سکیں۔ انہوں نے ہندوستانیوں کو سیاسی طور پر منظم ہونے اور ایک تنظیم بنانے کی راہیں ہموار کیں۔

ان سیاسی انجمنوں میں پہلی عام انجمن بنگ بھاشا پرکاشکا سبھا اور پہلی منظم سیاسی انجمن زمینداری ایسوسی ایشن تھی جسے، عام طور پر لینڈ ہولڈرز سوسائٹی کے نام سے جانا جاتا تھا۔ اسے 1838 میں کلکتہ میں زمینداروں کے مفادات کے تحفظ کے لیے قائم کیا گیا تھا۔ اس انجمن کے بانی دوار کاناتھ ٹیگور اور دیگر زمیندار معاونین تھے۔ زمینداری ایسوسی ایشن پہلی انجمن تھی جس نے منظم سیاسی کوششیں شروع کیں اور اپنی تکالیف کے ازالے کے لیے آئینی طریقوں کا استعمال شروع کیا۔ اس کے بعد دوسری کئی زمیندار انجمنیں جیسے برٹش سوسائٹی، برٹش انڈین سوسائٹی، مدراس مہاجن سبھا، بامبے ایسوسی ایشن وغیرہ تھیں۔ دوسری طرف کچھ متوسط طبقے کی انجمنیں بھی وجود میں آئیں جیسے انڈین

لیگ، انڈین ایسو سی ایشن وغیرہ جنہوں نے ایک مخصوص اعلیٰ طبقے کے بجائے پڑھے لکھے متوسط طبقے کو اجتماعی جدوجہد میں شامل کیا۔ بیرون ملک بھی کئی تنظیمیں قائم ہوئیں جیسے برٹش سوسائٹی، انڈین سوسائٹی وغیرہ۔ سب سے اہم اور واقعی ایک کل ہند حیثیت رکھنے والی تنظیم انڈین ایسو سی ایشن تھی جسے سریندر ناتھ بنرجی اور آنند موہن بوس نے قائم کیا تھا۔ ایسو سی ایشن کا ہدف تمام جائز ذرائع استعمال کرتے ہوئے ہندوستان کے لوگوں کی سیاسی، فکری اور مادی ترقی تھا۔ اس تنظیم نے ہندوستان کے تمام حصوں سے تعلیم یافتہ اور سماجی کارکنوں کو اپنی طرف متوجہ کیا اور ہندوستان کی آزادی کے خواہشمندوں کے لیے ایک مشترکہ پلیٹ فارم فراہم کیا۔ بعد میں یہ تنظیم انڈین نیشنل کانگریس میں جا کر مل گئی۔ ان تنظیموں سے ہندوستان کو کئی اہم قائدین فراہم ہوئے جیسے، سریندر ناتھ بنرجی، آنند موہن بوس، فیروز شاہ مہتہ، بدرالدین طیب جی، کے ٹی تلنگ وغیرہ جنہوں نے آگے چل کر انڈین نیشنل کانگریس کے ذریعے آزادی کی جدوجہد میں بہت اہم کردار نبھایا۔

4.5 کلیدی الفاظ (Keywords)

برہموتر : برہمنوں اور مندروں کی خدمات کے لیے عطیہ کی گئی زمین

البرٹ بل: البرٹ بل کو 25 جنوری 1884 کو انڈین لیجسلیٹو کونسل نے نافذ کیا تھا۔ اس میں ہندوستانی ججوں کو ہندوستان میں برطانوی لوگوں سے متعلق مقدمات کا فیصلہ کرنے کی اجازت دی گئی تھی۔ اس بل سے جڑے شدید جھگڑے نے انگریزوں اور ہندوستانیوں کے درمیان دشمنی کو گہرا کر دیا جو اگلے سال انڈین نیشنل کانگریس کے قیام کا سبب بنا۔

ورناکلر ایکٹ: 1878 میں ہندوستانی پریس کی آزادی پر پابندی لگانے والا ایک بل جسے لارڈ لٹن نے لگایا تھا۔

آرمس ایکٹ: 1878 میں ہندوستانیوں کے بنا لائسنس ہتھیار رکھنے پر پابندی لگانے والا ایکٹ۔

4.6 نمونہ امتحانی سوالات (Model Exanimation Questions)

4.6.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. اخبار برٹش انڈین ایڈوکیٹ (The British Indian Advocate) کس نے چھاپنا شروع کیا؟
2. برہموتر سے کیا مراد ہے؟
3. البرٹ بل کی مخالفت کس نے کی؟
4. ورناکلر ایکٹ کس نے لاگو کیا؟
5. آرمس ایکٹ میں ہندوستانیوں کو کیا رکھنا منع تھا؟
6. بنگ بھاشا پرکاشک سبھا کس سال میں قائم ہوئی؟
7. زمینداری ایسو سی ایشن کس نے قائم کی؟
8. لینڈ ہولڈرس سوسائٹی کا مقصد کس کے مفادات کی حفاظت تھا؟

9. بنگالی زبان میں برٹش انڈین ایسوسی ایشن کا نام کیا رکھا گیا؟

10. انڈین سوسائٹی کس نے قائم کی؟

4.6.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. بنگ بھاشا پرکاشک سبھا پر ایک نوٹ لکھیے۔
2. برٹش انڈیا سوسائٹی پر ایک نوٹ لکھیے۔
3. مدراس نیٹیو ایسوسی ایشن پر ایک نوٹ لکھیے۔
4. پونا سارو جنک سبھا پر ایک نوٹ لکھیے۔
5. بامبے پریسیڈینسی ایسوسی ایشن پر ایک نوٹ لکھیے۔

4.6.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. انڈین لیگ پر ایک تفصیلی مضمون لکھیے۔
2. انڈین ایسوسی ایشن پر ایک تفصیلی مضمون لکھیے۔
3. زمینداری ایسوسی ایشن پر ایک تفصیلی مضمون لکھیے۔

4.7 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Learning Resources)

1. Bandyopadhyaya, Sekhar, *From Plassey to Partition and After*: *A History of Modern India*, Orient Blackswan Private Limited, New Delhi, 2015.
2. Cumpston, Mary, 'Some Early Indian Nationalists and their Allies in the British Parliament, 1851–1906,' *The English Historical Review*, Vol. 76, No. 299, 1961, pp. 279–97.
3. Ghosh, Sujata, 'The India League (1875–77),' *Proceedings of the Indian History Congress*, Vol. 26, 1964, pp. 169–76.
4. Mehrotra, S.R., *The Emergence of the Indian National Congress*, Vikas Publications, New Delhi, 1971.
5. Mehrotra, S.R., (1966), 'The Landholders' Society, 1838–44,' *The Indian Economic and Social History Review*, 3(4), pp. 358–375.
6. Panikkar, K., 'Political Organisations in Bombay from 1850–1885,' *Proceedings of the Indian History Congress*, Vol. 42, 1981, pp. 439–43.

اکائی 5۔انڈین نیشنل کانگریس کا قیام

(Foundation of the Indian National Congress)

اکائی کے اجزا

5.0 تمہید
5.1 مقاصد
5.2 سیفٹی والو نظریہ
5.2.1 سات جلدوں والی رپورٹ
5.2.2 رپورٹ کی تفتیش
5.2.3 سیفٹی والو نظریہ کے حق میں دوسری دلیل
5.2.4 دوسری دلیل کا جواب
5.3 کانگریس کے قیام کا پس منظر
5.4 پہلا اجلاس
5.4.1 صدارتی خطاب
5.4.2 مشارکین
5.4.3 قرار دادیں اور کاروائی
5.5 ابتدائی کانگریسی قیادت کا تنقیدی تجزیہ
5.5 اکتسابی نتائج
5.6 کلیدی الفاظ
5.7 نمونہ امتحانی سوالات
5.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
5.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
5.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

मौलाना आज़ाद नेशनल उर्दू यूनिवर्सिटी
Estd. 1998
MAULANA AZAD NATIONAL URDU UNIVERSITY

5.8 تجویز کردہ اکتسابی مواد

5.0 تمہید (Introduction)

پچھلی اکائی میں آپ نے ہندوستانی قومی کانگریس سے پہلے ہندوستان میں قائم ہونے والی متعدد سیاسی انجمنوں کے بارے میں پڑھا۔ان میں سے کچھ انجمنیں تو قدامت پسند تھیں مگر بعد کی انجمنیں بہت حد تک انقلابی اور عوامی بن چکی تھیں۔انہیں انجمنوں کے ذریعے تیار کردہ ماحول میں کانگریس کی ابتدا ہوئی۔انیسویں صدی کے آخر میں ابھرتی ہوئی قوم پرستی کی لہر سے اسے استحکام حاصل ہوا اور اس نے عوام کو سیاسی اعتبار سے متحد کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔اس اکائی میں ہم انڈین نیشنل کانگریس کے پس منظر اور اس کی قیادت اور ابتدائی مسائل کے بارے میں جاننے کی کوشش کریں گے۔

5.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

1. کانگریس کے قیام سے متعلق بحث اور اس کے قیام کے پس منظر سے واقف ہو سکیں گے۔
2. سات جلدوں والی رپورٹ کے بارے میں جان سکیں گے۔
3. کانگریس کے پہلے اجلاس، صدارتی خطاب اور لائحہ عمل سے واقف ہو سکیں گے۔
4. ابتدائی کانگریسی قیادت کا تنقیدی جائزہ لے سکیں گے۔

5.2 سیفٹی والو نظریہ (Safety Valve Theory)

ہندوستانی قومی تحریک کی ترجمان انڈین نیشنل کانگریس کا قیام 1885 میں ہوا تھا۔ سیاسی طور پر متحرک اور متوسط بورژوا طبقے سے تعلق رکھنے والے 72 افراد نے گوکل داس تیج پال سنسکرت کالج ممبئی میں اس کی بنیاد رکھی تھی۔اے۔او۔ہیوم (A.O. Hume) نامی ایک رٹائرڈ انگریز آئی سی ایس افسر نے اس کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ سوال یہ اٹھتا ہے کہ ان 72 لوگوں نے کانگریس کی بنیاد کیوں رکھی اور یہی وقت اس کے لیے کیوں متعین کیا؟ اس سوال کے ساتھ سیفٹی والو کی ایک زوردار داستان لمبے عرصے سے چلی آرہی ہے۔ سیفٹی والو کی یہ داستان گذشتہ کئی پشتوں سے طالب علموں اور سیاستداں لوگوں کی گھٹی میں پلائی جارہی ہے لیکن اگر ہم تاریخ کی سچائی کو کھنگالیں، تو پتہ چلے گا کہ اس فرضی داستان میں اتنا دم نہیں ہے جتنا عام طور سے مانا جاتا ہے۔

وہ قصہ اس طرح ہے کہ اے۔او۔ ہیوم اور ان کے ساتھیوں نے انگریزی سرکار کے اشارہ پر انڈین نیشنل کانگریس کو قائم کیا تھا۔ وہ کوئی دوسرا شخص نہیں تھا بلکہ اس وقت کے وائسرائے لارڈ ڈفرن (Lord Dufferin) ہی تھے جن کے اشارہ اور مشورہ پر اس کی

پیدائش ہوا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ ہندوستانیوں میں اس وقت پنپتی اور بڑھتی ہوئی بے اطمینانی کے بخارات کو بغیر کسی خطرہ کے باہر نکلنے کے لیے ہلکا، پر امن، بے ضرر، اور آئینی اخراج کا سیفٹی والو فراہم کیا جاس کے، کیونکہ اگر ایسا نہ کیا گیا تو ان کی بے اطمینانی ان کو متشدد انقلاب برپا کرنے کے لیے اکسا سکتی تھی۔ اس طرح کانگریس کو قائم کر کے یعنی سیفٹی والو فراہم کر کے ہندستانی عوام کی جوش مارتی ہوئی انقلابی توانائی کا گلا گھونٹ دیا گیا۔ اس قصہ کی اصل جڑ یہ ہے کہ اس وقت ہندوستان میں تشدد آمیز انقلاب دستک دے رہا تھا جو کانگریس کے قیام کی وجہ سے ٹل گیا۔ زیادہ تر مورخین اس حقیقت پر یقین رکھتے ہیں۔ آزاد خیال (Liberals)، کانگریس کے قیام کو صحیح قدم بتاتے ہیں جبکہ انتہا پسند (Radicals) یہ ثابت کرتے ہیں کہ اگرچہ کانگریس سامراجیت نواز تو نہیں رہی مگر مصالحت پسند تو تھی ہی اور دائیں بازو والے انتہا پسند تو یہ ثابت کرتے ہیں کہ کانگریس شروع سے ہی غیر قوم پرست رہی ہے۔ بہر حال سبھی مکتبہ فکر کے لوگ اس بات پر متفق ہیں کہ کانگریس کا قیام جس طریقے سے ہوا اس نے اس کے بنیادی کردار اور مستقبل میں اس کے ذریعہ کیے جانے والے کاموں پر فیصلہ کن اثرات ڈالے ہیں۔

1916 میں شائع ہونے والے انتہا پسند لیڈر لالہ لاجپت رائے کے ہفتہ وار اخبار ینگ انڈیا(*Young India*) کے ایک مضمون میں لاجپت رائے نے سیفٹی والو کے اس نظریے کا استعمال اعتدال پسند کانگریس گروپ پر حملہ کرنے کے لیے کیا تھا۔ اس عنوان پر لمبی بحث کرتے ہوئے اپنے مضمون میں لکھا تھا کہ 'کانگریس کے قیام کا مقصد ہندوستان کو سیاسی آزادی دلانے سے کہیں زیادہ برطانوی حکومت کو خطرہ سے بچانا تھا۔ کانگریس کے نزدیک برطانوی سلطنت کی بھلائی پہلے نمبر پر اور ہندوستان کی خیر خواہی دوسرے نمبر پر تھی۔' انہوں نے مزید کہا تھا کہ 'کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ کانگریس اپنے نظریہ (انگریزی سلطنت کے تیئں وفاداری) کے تیئں ایماندار نہیں رہی ہے۔' بالآخر وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ 'کانگریس کی پیدائش اسی طرح ہوئی ہے اور صرف یہی بات اس کو وطن پرست لوگوں کی نگاہ میں مجرم ٹھہرانے کے لیے کافی ہے۔' ایک چوتھائی صدی سے کچھ زیادہ مدت کے بعد رجنی پام دت (Rajni Pame Dutt) کی مستند تحریر انڈیا ٹوڈے (*India Today*) نے سیفٹی والو کی داستان کو بائیں بازو کا کپال بتایا۔ بڑے ہی زور دار انداز میں پام دت نے لکھا کہ حکومت کی سیدھی پہل اور رہنمائی میں کانگریس وجود میں آئی۔ اس کے لیے وائسرائے سے مل کر خفیہ اسکیم بنائی گئی تاکہ اس وقت اٹھ رہی برطانوی مخالف عام طاقتوں سے انگریزی حکومت کے تحفظ کے لیے اس (کانگریس) کا استعمال اسلحہ کے طور پر کیا جائے یہ ہونے والے انقلاب کو ناکام کرنے کی کوشش یا اس کو روکنے کی پیش بندی تھی۔ یہ سچ ہے کہ وقت رہتے کانگریس ایک قوم پرست تنظیم میں تبدیل ہوگئی۔ اس کا قومی کردار اس کی وفادارانہ سیرت پر حاوی ہونے لگا اور یہ عوامی تحریکوں کا ذریعہ (vehicle) بھی بن گئی مگر اس کا ابتدائی گناہ، یعنی اس کی پیدائشی شکل اس کی سیاست پر مستقل داغ چھوڑ گئی۔

تنظیم کی حیثیت سے اس کا دوہرا رخ اس کی پوری تاریخ میں نظر آتا ہے یعنی اس کو پہلے حکومت نے بنایا پھر بعد میں یہ سامراج مخالف تحریک کی قائد بن گئی۔ اس نے حکومت کے خلاف جنگ بھی کی اور اس کے ساتھ مل کر کام بھی کیا۔ اس نے عوامی تحریک کی قیادت کی اور جب عوام نے انقلاب کے راستہ پر بڑھنا شروع کیا تو اس کو دھوکہ دے کر وہ حکومت کے ساتھ ہوگئی۔ اس طرح کانگریس کے دو رخ تھے۔ ایک طرف اس نے عوام کی تشدد پسند تحریکوں کے خلاف حکومت کا ساتھ دیا اور دوسری طرف اس نے قومی جدوجہد میں عوام کی قیادت کی

۔ گوکھلے سے لے کر گاندھی تک کانگریس کی قیادت کا یہی دوہرا پن دراصل ہندوستان کے بورژوا طبقہ کے دوسرے اور ڈھلمل کردار کو ظاہر کرتا ہے۔ برطانوی بورژوا کے خلاف بر سر جنگ رہتے ہوئے اور ہندستانی عوام کی قیادت کی خواہش دل میں سنجوئے ہوئے، وہ اس بات کے لیے فکر مند تھی کہ بہت تیزی سے آگے بڑھنے سے، حکومت نوازوں کو مل رہی امتیازی سہولتوں کے خاتمہ کے ساتھ ان کی بھی سہولتیں ختم ہوسکتی ہیں۔ اس طرح کانگریس حقیقی انقلاب یعنی پر تشدد انقلاب کی مخالف بن گئی مگر کانگریس کا یہ کردار گاندھی کے وقت سے نہیں شروع ہوا بلکہ یہ چیز تو برطانوی حکومت نے اس کے قیام کے وقت ہی جان بوجھ کر اس کی گھٹی میں پلائی گئی۔ اس کا دوہرا کردار اپنی بلندیوں پر اس وقت پہنچا جب اس نے ماؤنٹ بیٹن کے سمجھوتہ کو تسلیم کر لیا۔

اس سے پہلے 1939 میں راشٹریہ سویم سیوک سنگھ کے سربراہ ایم ایس گولواکر (M.S. Golwalkar) نے بھی کانگریس کو اس کے لامذہبی نظریہ (secularism) کی وجہ سے اور سیفٹی والو کی بنیاد پر وطن مخالف ٹھہرایا تھا۔ انہوں نے اپنے رسالہ 'وی' (We) میں یہ مان لیا تھا کہ ہندوؤں کے قومی شعور اور احساس کو ان لوگوں کے ذریعہ تباہ و برباد کر دیا گیا جو وطن پرست ہونے کا دعویٰ کرتے تھے۔ انہوں نے جمہوری اصولوں کو تقویت پہنچائی اور اس گمراہ کن نظریہ کی اشاعت کی کہ ہمارے قدیم دشمن حملہ آور مسلمانوں اور ہندوؤں میں کچھ باتیں مشترک ہیں اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہم نے دشمنوں کو اپنا دوست مان لیا اور اس طرح ہم نے سچی قوم پرستی کی جڑیں خود اپنے ہاتھوں کھود ڈالی۔ سچ تو یہ ہے کہ ہندوستان میں چل رہی جنگ صرف ہندوستانیوں اور انگریزوں کے ہی درمیان نہیں ہے بلکہ یہ سہ طرفہ جنگ ہے۔ ہندوؤں کو ایک طرف مسلمانوں سے لڑنا پڑ رہا ہے اور دوسری طرف انگریزوں سے۔ ہندوؤں کو قومیت کے راستے سے ہٹانے کے لیے، گولوالکر کے مطابق، ہیوم (Hume)، کاٹن (Cotton) اور ویڈر برن (Wedderburn) کے ذریعہ 1885 میں طے کی گئی پالیسی ہی ذمہ دار ہے۔ ان لوگوں نے اس وقت ابل رہی قوم پرستی کے جذبات کے خلاف سیفٹی والو کے طور پر کانگریس کو قائم کیا۔ اس وقت جاگ رہے ایک بڑے دیو کو سلا دینے کے لیے یہ ایک کھلونا تھا اور قومی شعور کو تباہ کرنے کا ہتھیار تھا۔ اور جہاں تک ان لوگوں کے مقصد کے پورا ہونے کی بات ہے وہ اس میں پوری طرح کامیاب رہے۔

آزاد خیال سی۔ ایف۔ اینڈریوز (C.F. Andrews) اور گرجا مکھرجی (Girja Mukherji) نے بھی 1938 میں شائع کی گئی اپنی تصنیف *The Rise and Growth of the Congress* میں سیفٹی والو والی بات کو پوری طرح تسلیم کیا ہے۔ ہاں وہ اس بات پر خوش ضرور ہیں کہ اس سے بیکار کے خون خرابے کو ٹالنے میں مدد ملی۔ 1947 سے پہلے اور بعد کے دسیوں ادیبوں اور سینکڑوں مصنفوں نے انہیں نظریات میں سے کسی نہ کسی کو ہرایا ہے۔

5.2.1 سات جلدوں والی رپورٹ (The Seven-Volume Report)

سیفٹی والو کے اس نظریہ کو تاریخی ثبوت فراہم کرنے میں سات جلدوں والی رپورٹ خفیہ رپورٹ کا رول فیصلہ کن رہا ہے جس کے بارے میں ہیوم نے بتایا کہ اس نے 1878 کی گرمیوں میں شملہ میں اس کو پڑھا تھا۔ اس کے مطالعہ کے بعد ان کو پختہ یقین ہو گیا کہ

ہندوستان میں بے اطمینانی ابال کھارہی ہے اور نچلے طبقے میں تشدد کے ذریعہ برطانوی حکومت کو ختم کرنے کی سازش چل رہی ہے۔اس سے پہلے کہ ہم ان سات جلدوں کے راز کی چھان بین کریں جس کے مطالعہ کا دعوی ہیوم نے کیا ہے، یہ سمجھ لینا بہتر ہو گا کہ اس خفیہ رپورٹ کا رچا تذکرہ کیسے شروع ہوا اور بعد میں وہ آگے کیسے بڑھا۔اس کا ذکر ہم کو سب سے پہلے ویڈر برن کے ذریعہ لکھی گئی ہیوم کی سوانح حیات جو 1913 میں شائع ہوئی تھی میں ملتا ہے۔ویڈر برن آئی سی ایس تھا۔اس کو ہیوم کے کاغذات میں بغیر تاریخ کا ایک میمورنڈم ملا۔اس میں کانگریس کے قیام کے بارے میں ذکر تھا۔اس نے اس دستاویز کا بڑی تفصیل سے حوالہ دیا ہے؟ یہ دستاویز کیا تھا اور ویڈر برن نے کیا لکھا تھا؟اس کی بات آگے کی جائے گی۔ابھی ہم ویڈر برن کے صرف ان حصوں پر بات کریں گے جن کا حوالہ ان سے بعد کے کئی مصنفوں نے اپنی تحریروں میں دیا ہے۔لالہ لاجپت کے مطابق ہیوم آزادی کے متوالے تھے اور تاج برطانیہ کی سرپرستی میں ہندوستانیوں کو سیاسی آزادی دلانا چاہتے تھے، مگر بہر حال وہ انگریز محب وطن تھے۔جب انہوں نے دیکھا کہ برطانوی حکومت پر سنگین مصیبت آنے والی ہے تو انہوں نے بے اطمینانی کے اخراج کے لیے سیفٹی والو کی تشکیل کا ارادہ کیا۔

اپنی بات کے ثبوت میں لالہ لاجپت رائے نے ہیوم کے میمورنڈم سے ایک لمبا اقتباس نقل کیا ہے جو ویڈر برن کی کتاب میں مع اس کے تبصرہ کے چھپا ہے؟ چونکہ بعد کے کئی دانشوروں نے اس اقتباس کا حوالہ دیا ہے،اس لیے یہ ضروری ہے کہ ہم یہاں پھر اس کو تفصیل سے تحریر کر دیں۔ہیوم نے لکھا تھا کہ ’مجھے کئی موٹی موٹی جلدیں دکھائی گئیں جن میں بے شمار خبریں اور رپورٹیں درج تھیں۔۔۔انگریزی اقتباسات یا ترجمے۔۔۔طرح طرح کی خبریں، سبھی ضلع وار مرتب خبروں کی تعداد بے شمار تھی۔کہا گیا تھا کہ اس وقت تیس ہزار سے زائد نامہ نگاروں نے اطلاعات دی ہیں۔‘ہیوم کہتا ہے کہ خبروں کے یہ نسخے اس کے پاس صرف ایک ہفتہ ہی رہے۔ان کی بہت ساری خبریں سب سے نچلے طبقہ کے لوگوں کی بات چیت پر مشتمل تھیں۔یہ اطلاعات ظاہر کرتی تھیں کہ موجودہ حالات میں یہ غریب لوگ اپنی زندگی سے ناامید ہیں۔فاقہ کشی سے ان کو مر جانے کا ڈر ہے۔وہ کچھ کرنا چاہتے ہیں، وہ متحد ہونا چاہتے ہیں اور اس کا مطلب ہے تشدد، تعلیم یافتہ لوگوں کا ایک چھوٹا سا مایوس گروہ ممکن ہے بلا وجہ حکومت کے خلاف ان کی جدوجہد میں شامل ہو جائے،ان کی قیادت کرے اور اس شورش کو قومی انقلاب کے راستے پر موڑ دے۔جلد ہی ان ساتوں جلدوں کے بارے میں قسم قسم کی باتیں کہی جانے لگیں۔حالانکہ لالہ لاجپت رائے نے اپنے اقتباس میں ان کے آغاز اور اوصاف کے سلسلہ میں کوئی تشریح نہیں کی تھی۔1933 میں گرمکھ نہال سنگھ نے ان ساری جلدوں کو سرکاری رپورٹ بتایا اور دوسری طرف اینڈریوز اور مکھرجی نے کہا کہ یہ سی آئی ڈی (C.I.D.) کے ذریعہ تیار کی گئی خفیہ رپورٹیں تھیں جو ہیوم کو سرکاری حیثیت میں ہونے کی وجہ سے ملی تھیں۔سب سے زیادہ ٹھوس اور زوردار دلیل رجنی پام دت نے دی ہے۔ انہوں نے لالہ راجپت رائے کے ذریعہ ویڈر برن کے حوالہ سے لیا اقتباس پیش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ’ہیوم کو اپنی سرکاری حیثیت کے تحت پولیس کی لمبی لمبی خفیہ رپورٹیں حاصل ہوئی تھیں۔‘

بعد کے مورخین جن میں آر سی مجومدار (R.C. Majumdar) اور تاراچند (Tarachand) شامل ہیں، نے ان لوگوں کے اس خیالی ثبوت کو تاریخی حقیقت مان لیا۔ہیوم کے ذریعہ بیان کردہ ان دستاویزوں کو اتنا پختہ سرکاری دستاویز مانا جانے لگا کہ 1950 کی دہائی

میں اور عہد حاضر میں کئی مورخین نے ملک کے محافظ خانوں کو کھنگالنے میں اپنی قیمتی صلاحیت، توانائی اور وقت کو جھونک دیا۔ جب ان کے ہاتھ اس کوشش میں کچھ نہ لگا تو انہوں نے یہ بات مان کر تسلی کر لی کہ 1947 میں ہندوستان چھوڑنے کے پہلے انگریزوں نے ان دستاویزوں کو ضائع کر دیا ہوگا۔ بہر حال اگر انہوں نے ذرہ برابر بھی سوجھ بوجھ سے کام لیا ہوتا اور اس سلسلہ میں تھوڑا سا بھی سوچتے تو شاید ان کو اپنی بات سے پیچھے ہٹنا پڑتا، کیونکہ ڈفرن (Dufferin) اور رپن (Rippon) کے ذاتی کاغذات کے دستیاب ہونے سے پہلے بھی تین قسم کے تاریخی ثبوت اور دلائل موجود تھے۔

5.2.2 رپورٹ کی تفتیش (Inquiry of the Report)

پہلا ثبوت تو اس نظام سے متعلق تھا جس کے تحت حکومت 1870 کی دہائی میں کام کرتی تھی۔ 1878 میں ہیوم شعبہ مال، زراعت اور تجارت کے سکریٹری تھے۔ ان شعبہ جات کے سکریٹری کی رسائی بھلا وزارت داخلہ کی فائلوں اور سی آئی ڈی رپورٹوں تک کیسے ہو سکتی تھی نیز اس وقت ان کا قیام شملہ میں تھا اور وزارت داخلہ کے کاغذات دہلی میں رکھے جاتے تھے۔ اس طرح تیس ہزار رپورٹر ان کے پاس کہاں سے آ گئے۔ اس وقت تو محکمہ جاسوسی میں ہی کچھ ہی سو افراد کا عملہ تھا اور اگر لالہ لاجپت رائے کے بقول کانگریس کا قیام بغاوت ہونے کے خوف سے ہوا تھا تو ہیوم اور انگریز افسر شاہی نے فوراً ہی یہ کام کیوں نہیں کیا؟ انہوں نے سات سال کی لمبی مدت تک انتظار کیوں کیا؟ اگر یہ جلدیں سرکاری دستاویزات نہیں تھیں تو پھر یہ جلدیں کیا تھیں؟ اس کا سراغ ویڈر برن کی کتاب میں ملتا ہے۔ اگر کوئی مصنف ویڈر برن سے لیے اقتباس پر بھروسہ کرنے کے بجائے سیدھے اس کی کتاب کا مطالعہ کرتا ہے تو اس کو اس میں موجود دوسرا تاریخی ثبوت مل جائے گا۔ لالہ لاجپت رائے، رجنی پام دت اور دوسرے لوگوں نے جن اقتباسات کا حوالہ دیا ہے وہ ویڈر برن کی کتاب کے صفحہ 80 اور 81 پر چھپے ہیں۔ ان سے دو صفحے پہلے 78 سے 80 تک اور ایک صفحہ آگے 81/80 پر ویڈر برن بتاتا ہے کہ یہ دستاویزات کیا تھے اور انہیں ہیوم کو کس نے دیا تھا؟ یہ اقتباسات کتاب کے جس باب میں ملتے ہیں اس کا نام 'Indian Religious Leaders' (ہندوستان کے مذہبی پیشوا) ہے۔ اس باب کے شروع میں ویڈر برن نے لکھا ہے کہ دھمکی سے بھرے خطرہ کی اطلاع ہیوم کو خاص ذریعہ سے ملی اور یہ ذریعہ تھا ان پیشواؤں کا جن کی زندگی مذہب کے لیے وقف تھی اور جو ملک میں ہر جگہ پائے جاتے تھے۔

ہیوم نے اپنے دستاویز میں اس بات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ جماعتوں اور طبقوں کے پیشوا (پیر) ہیں جو اعلیٰ خوبیوں کے مالک ہوتے ہیں اور جن کی خواہش روحانی معراج حاصل کرنا ہوتی ہے اور ان کو اپنے مریدوں کے ذریعہ زمین پر ہو رہے سارے واقعات کی خبر ہو جاتی ہے اور رائے عامہ بنانے میں ان کا کردار بڑا اہم ہے۔ ویڈر برن لکھتا ہے کہ وائسرائے اور لارڈ لٹن کے آخری دور میں ہیوم ایسے ہی پیروں کی صحبت میں آیا تھا۔ ان پیروں نے ہیوم سے اس لیے تعلق بنا لیا تھا کیونکہ ہیوم کو مشرقی ملکوں کے مذاہب سے بڑی دلچسپی تھی۔ اس کے علاوہ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ان پیروں کو یہ خدشہ تھا کہ پورے ملک میں پھیلی بدامنی کی نحوست ایک دن بھیانک سازش کی شکل اختیار کر لے گی اور ایسے حالات میں حکومت تک پہنچ رکھنے والے ہیوم جیسے لوگ ہی اس آفت کو ٹالنے میں مددگار ثابت ہو سکتے ہیں۔ ہیوم نے لکھا کہ اس طرح یہ بات میرے سامنے آئی۔ اس پس منظر میں اگر صفحہ 81-80 کا مطالعہ کریں تو بات اور بھی صاف ہو جاتی ہے۔ دوسرے لفظوں

میں سات جلدوں والی رپورٹ ہیوم کوان پیروں سے ملی جس کی اطلاع ان کے ہزاروں چیلوں نے ان کو دی تھی۔ مگر سوال یہ ہے کہ ہیوم نے ان خبروں کی سچائی پر یقین کیسے کر لیا؟ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ ایک خاص مسلک کے پیروکار تھے۔ ان کا تعلق کسی ایک فرقہ یا مذہب سے نہیں تھا بلکہ وہ تمام مذاہب سے تعلق رکھتے تھے اور سبھی ملت و مسلک کو مانتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ اور ان کے چیلے قول و قرار سے بندھے ہوتے تھے۔ وہ سب کسی پوشیدہ علم کی جستجو میں مصروف رہتے تھے اور وہ سب اس عہد کے پابند ہوتے تھے کہ خود کے علاوہ کسی دوسرے سچائی کی تلاش کرنے والے کے سامنے جان بوجھ کر اپنے عہد کو نہیں توڑ سکتے تھے۔ دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر ایسا ہی معاملہ تھا تو ان ہزاروں پیروں اور چیلوں کو کوئی جانتا کیوں نہیں تھا؟ ہیوم نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ مکمل رازداری ان کی زندگی کی خصوصیت تھی۔ انہوں نے ہیوم سے صرف اس لیے رابطہ قائم کیا کیونکہ وہ غیبی مصیبت کو ٹالنا چاہتے تھے۔

آخر میں ہم تاریخ نویسی کے تیسرے معیار پر غور کرتے ہیں جس کا انحصار پوری طرح وہم و گمان پر ہے۔ پیروں اور مریدوں کی خصلت کو ویڈر برن نے پوری طرح اجاگر نہیں کیا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ دوست سوانح نگاروں کی طرح اس نے اپنے دوست کی رازداری کا خاص خیال رکھا ہے۔ اس نے یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ یہ مذہبی پیشوا اور ان کے پیروکار عام انسان ہی تھے جبکہ حقیقت کچھ اور تھی۔ تھیوسوفیکل تحریک اور میڈم بلاوسکی (Blavatsky) کی کچھ کتابوں اور وائسرائے رپن اور ڈفرن کی تحریروں کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ پیر اپنی انوکھی مشرقی مذہبی سوچ اور عمل کی وجہ سے پر اسرار مافوق الفطرت قوتوں کے مالک تھے۔ یہ ہزاروں میل دور سے رابطہ قائم کر سکتے تھے، بات کر سکتے تھے، کسی جگہ داخل ہو سکتے تھے، کہیں جا سکتے تھے، کسی جگہ بغیر دکھائی پڑے بیٹھ سکتے تھے اور کسی بھی شخص کے خیالات اور عقیدہ کو بغیر اس کے علم کے متاثر کر سکتے تھے۔

1881 میں ہیوم، میڈم بلاوتسکی کے زیر اثر آئے تھے۔ میڈم کا یہ دعویٰ تھا کہ ان کا اُن پیروں (گروؤں) سے تعلق ہے۔ انہوں نے ان پیروں کو مہاتما یعنی عظیم روحانی شخصیتیں بتایا ہے۔ دور دراز تبت میں ان مہاتماؤں کا پوشیدہ مسکن تھا لیکن وہ دنیا کے کسی بھی آدمی سے اپنی روحانی طاقت کے ذریعہ تعلق بنا سکتے تھے۔ ایسے ہی ایک مہاتما کوٹ ہومی لال سنگھ (Koot Homi Lal Singh) سے بلاوتسکی نے ہیوم کی ملاقات کرائی۔ نظروں سے اوجھل یہی مہاتما اپنے مریدوں کے ذریعہ سے ہندوستان میں ہو رہے واقعات کے بارے میں معلومات حاصل کرتے تھے۔ بلاوتسکی کے دوسرے شاگرد اور پائینیر (Pioneer) کے اڈیٹر اے۔ پی۔ سینٹ (A.P. Sinnet) نے 1880 میں شائع ہوئی کتاب میں کوٹ ہومی لال سنگھ کے ایک خط کا ذکر کیا ہے جس میں انہوں نے یہ ظاہر کیا ہے کہ ان مہاتماؤں نے اپنی کرامات کے ذریعہ 1857 میں ہندستانی عوام کی بغاوت کو ناکام کر کے برطانوی حکومت کو گرنے سے بچا لیا۔ مستقبل میں بھی یہ مہاتما اسی قسم کے کسی اور موقع پر اپنی کراماتی طاقت کا استعمال کریں گے۔ ہیوم کو اس طرح کی ساری باتوں پر پورا یقین تھا اور وہ خود بھی ایسی ہی پراسرار طاقت حاصل کرنا چاہتے تھے جس سے حال اور مستقبل ان پر ظاہر ہو جائے۔ اسی مقصد کے تحت انہوں نے مہاتماؤں سے خط و کتابت کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ یوں تو ہیوم کی بلاواتسکی سے 1887 تک ان بن ہو گئی مگر ان پیروں اور مہاتماؤں میں ان کی عقیدت کم نہیں ہوئی۔ انہوں نے اپنے پسندیدہ ترین سیاسی مقصد کو پورا کرنے کے لیے مہاتماؤں کے تعلق کو استعمال کرنا شروع کیا۔ ان کی دلی منشا تھی کہ

حکومت کا مزاج بدلے اور وہ ہندوستانیوں کا پاس ولحاظ رکھ کر کام کرے۔

دسمبر 1883 میں ہیوم نے رپن کو لکھا کہ میرا تعلق ایسے لوگوں سے ہے جن کو عوام دیکھ نہیں سکتی، پھر بھی ان کی قدرو منزلت کرتی ہے، ان کو بھگوان مانتی ہے اور یہ روحانی شخصیتیں عوام کی اس عقیدت مندی سے بخوبی واقف ہیں۔ اس کا دعویٰ تھا کہ مافوق الفطرت قوت رکھنے والے کچھ ایشیائی لوگ عوام کے دل کی ہر ایک بات جانتے ہیں اور انہوں نے مجھے بھی کچھ حد تک عوام کا رازدار بنادیا ہے۔ جنوری 1884 میں اس نے رپن کو اطلاع دی کہ وہ تو 1848 سے ہی ان پیشواؤں کی صحبت میں آگیا تھا اور انہیں بزرگوں کی مداخلت سے 1848 کی تمام تحریکیں ناکام ہوئیں اور 1857 کی بغاوت کو کچلا جا سکا۔ دور دراز تبت سے یہی پیر اس (ہیوم) کے اور ان جیسے دوسرے لوگوں کے ذریعہ سے رپن کے اصلاحی قانون کو لاگو کرنے اور قومی انقلاب کو روکنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہیوم نے یہ بھی کہا کہ وہ رپن کو دوبارہ وائسرائے بنوانے کے لیے ملکہ کو منانے میں اور مقامی مخالفت کو کم کرنے میں انہیں کی مدد لے رہے ہیں۔

تھوڑی ہچکچاہٹ کے ساتھ ہیوم نے ڈفرن کو بھی یہ بتانے کی کوشش کی۔ اس نے ڈفرن کو یہ نہیں بتایا کہ اس کے مشیر مافوق الفطرت اشخاص ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ کئی تاریخ نویسوں نے یہ مان لیا کہ اس کے یہ مشیر ہیوم کے دوست کانگریسی لیڈران تھے۔ صرف ایک بار اس نے اس راز سے پردہ ہٹایا جب 1887 میں ڈفرن نے غصے میں آکر دریافت کیا کہ آخر تمہیں میرے رازدارانہ خطوط کا علم کیسے ہو گیا۔ یہ سن کر ہیوم نے بتایا کہ اس کے دوستوں نے بڑے پراسرار طریقے سے ان خطوں کی فوٹو کاپیاں حاصل کی ہیں، لیکن جب ڈفرن نے اس کو اصلی نسخے دکھا کر یہ ثابت کردیا کہ اس کی بات سراسر غلط ہے تو وہ لاجواب ہو گیا۔ اس سے پہلے بھی ایک بار اشارے سے ہیوم نے ڈفرن کو یہ بتانے کی کوشش کی تھی کہ اس کے صلاح کار عام سیاسی لیڈر نہیں تھے بلکہ پہنچی ہوئی ہستیاں اور مہاتما تھے۔ یہ بات اس نے بڑے محتاط انداز میں میں کہی تھی۔ نومبر 1986 میں ڈفرن کے نام ایک خط میں اس نے کہا کہ وہ یہی کوشش کر رہا ہے کہ شملہ میں جن لوگوں نے اسے سات حصوں کی رپورٹ دکھائی تھی وہ انہیں ڈفرن کو دکھادے تاکہ وہ رپورٹوں کی حقیقت کو جانچ پرکھ سکیں جن کو اس نے اپنے ذاتی طریقے سے حاصل کیا ہے۔ لیکن اس وقت وہ کہہ رہا تھا کہ یہ کام ناممکن ہے کیونکہ وہ پوشیدہ لوگ سیدھے وائسرائے سے بات ہی کرنا نہیں چاہتے، کیونکہ آپ نے وہ نہیں کیا جو آپ کو کرنا چاہیے تھا اور نہ آپ آگے ایسا کریں گے۔ پھر بھی ممکن ہے اس کا (ہیوم) ایک خاص دوست جس نے شملہ میں 1878 میں اس کے ساتھ ایک ماہ گزارا ہے اور جس نے اکثر ہندوستان میں قیام کیا ہے، وائسرائے سے ملاقات کرنے کے لیے راضی ہو جائے۔ ہیوم نے اطلاع دی کہ 'اگر ایسا کوئی پرائیویٹ سکریٹری ان سے ملنے آئے اور کہے کہ ہیوم نے اس کو وائسرائے سے ملاقات کرنے کے لیے بھیجا ہے تو وہ اس سے ملاقات کرلیں۔ دس منٹ کے اندر ہی وہ سمجھ جائیں گے یہ مہمان کوئی معمولی آدمی نہیں ہے.... خدا ہی جانے کہ کبھی آپ کو ایسا موقع ملتا ہے کہ نہیں۔۔۔ وہ پراسرار طریقے سے حیرت انگیز کام کرتے ہیں۔'

دوسری طرف ہیوم بذات خود بہت پریشان تھا کیونکہ اپنی بات ثابت کرنے کے لیے اس کے پاس کوئی شہادت نہیں تھی۔ اس نے وائسرائے سے کہا کہ وہ خود اپنے اوپر ناراض ہو رہا ہے اور حیران ہے کیونکہ جن باکمال حضرات کی رہنمائی میں وہ کام کر رہا ہے وہ عام لوگوں کے

سامنے آنا نہیں چاہتے۔ یہی وجہ تھی کہ ہندوستان میں مقیم سبھی یوروپی ہیوم کو پاگل اور جھوٹا سمجھتے تھے۔ اور اسی لیے اس نے وائسرائے کو بتایا کہ وہ سیاسی کام تو کرتا رہے گا مگر اپنے خفیہ دوستوں سے سارے تعلقات توڑ دیگا۔ اس طرح یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ سات جلدوں والی وہ رپورٹ جس کو ہیوم نے شملہ میں دیکھا تھا، اس کو کانگریسیوں نے نہیں بلکہ اس کے مافوق الفطرت اور پراسرار مہاتما دوستوں اور مشیروں نے تیار کیا تھا۔

5.2.3 سیفٹی والو نظریہ کے حق میں دوسری دلیل

(Second Argument in Favour of the Safety Valve Theory)

دوسری دلیل جو سیفٹی والو کے ثبوت کے طور پر پیش کی جاتی ہے وہ ووميش چندر بنرجی (W.C. Banerjee) کے اس بیان پر مبنی ہے جو انہوں نے 1898 میں *Indian Politics* میں دیا تھا کہ کانگریس کس طرح وجود میں آئی اور کس طرح اس کا نشو نما ہوا۔ یہ کام دراصل آوا اور ڈفرن کے مارکوئس فریڈرک ٹمپل بلیک ووڈ (لارڈ ڈفرن) کا ہے۔ بنرجی نے بتایا کہ ہیوم نے 1884 میں سوچا کہ سال میں ایک بار ہندوستان کے بڑے بڑے رہنماؤں کا ایک جلسہ کیا جائے جو 'صرف سماجی معاملوں پر غور کرے۔' وہ نہیں چاہتے تھے کہ 'سیاست ان کی بات کا موضوع ہو'، لیکن ڈفرن نے ان سے ٹھیک اس کا الٹ کرنے کے لیے کہا کہ وہ کوئی ایسی تنظیم بنائیں جس کے ذریعہ حکومت کو ہندستانی عوام کے خیالات کی جانکاری ملتی رہے اور یہ تنظیم ملکہ برطانیہ کی مخالف پارٹی جیسا کردار ہندوستان میں نبھائے۔

5.2.4 دوسری دلیل کا جواب (Reply to the Second Argument)

اس دور کے حالات کا جائزہ لینے سے بنرجی کا بیان صداقت پر مبنی نہیں لگتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یا توان کا حافظہ کمزور ہو گیا تھا یا وہ انیسویں صدی کے آخری دور میں انگریز حکومت کے غضبناک ردعمل سے کانگریس کو بچانا چاہتے تھے۔ کانگریس کے بارے میں ہیوم کی ہندستانی رہنماؤں سے جو باتیں ہوئیں وہ سیاست سے متعلق تھیں۔ اس سے پہلے کی تنظیمیں مثلاً پونا سارو جنگ سبھا، بامبے پریسیڈنسی ایسوسی ایشن، مدراس مہاجن سبھا اور انڈین ایسوسی ایشن کے اکثر کام سیاسی ہی تھے۔ انڈین سول سروس سے 1882 میں ہی ریٹائر ہونے کے بعد ہیوم ہندوستانیوں کو سیاست میں حصہ لینے کی نصیحت کرتے رہتے تھے۔ وہ اپنے دوستوں سے متواتر یہ کہتے رہتے تھے کہ ان کو سماجی مسئلوں کو لے کر آپس میں بٹنا نہیں چاہیے۔ جنوری 1885 میں *Indian Spectator* کے اداریہ میں جب ہیوم کے دوست بی۔ ایم۔ ملاباری (B.M. Malabari) نے تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کو سماجی اصلاح کے لیے تحریک شروع کرنے کی تلقین کی۔ اس مشورے کے جواب میں ہیوم نے انڈین اسپیکٹیٹر کو ایک خط لکھ کر ملاباری کے مشورہ کی تنقید کی اور خبردار کیا کہ ایسا قدم خطرناک ہوگا اور یہ تجویز پیش کی کہ سیاسی اصلاح کو سماجی اصلاح پر ترجیح دی جانی چاہیے۔

1888 میں ڈفرن نے 'سینٹ اینڈریوز ڈے' کی دعوت کے موقع پر اپنی تقریر میں کانگریس کی بہت صاف لفظوں میں تنقید کی کہ وہ اپنے ذاتی فائدے کے لیے سیاسی تحریکیں چلا کر سماجی اصلاح کے کام کو نظر انداز کر رہی ہے جس میں کروڑوں کی بھلائی ہو سکتی ہے۔ ڈفرن

نے انہیں احساسات کا اظہار سکریٹری آف اسٹیٹ کو ایک خط لکھ کر کیا۔ ڈفرن کے ذاتی کاغذات، جو 1950 کی دہائی کے آخری دنوں سے اہل علم طبقہ کو دستیاب ہیں، کا اگر مطالعہ کیا جائے تو یہ بات صاف ہو جائے گی کہ کانگریس کی تشکیل میں ڈفرن نے نہ تو کوئی تعاون کیا اور نہ ہی اس کی سرپرستی کی۔ یہ تو بہت بعد کی بات ہے جب ہیوم نے انڈین اسپیکٹیٹر کو خط کی ایک کاپی روانہ کی جس میں سماجی اصلاح کے متعلق ملاباری کے خیالات پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا گیا تھا اور جس کی تائید ڈفرن نے کی تھی۔ انہوں نے ہیوم سے یہ بھی کہا تھا کہ وہ ان سے ملاقات کر لیں۔ اس معاملہ کی مکمل تصدیق بمبئی کے گورنر ڈونالڈ میکے (Donald Mackay) کے نام تحریر کردہ ڈفرن کے اس خط سے ہوتی ہے جو انہوں نے ہیوم سے پہلی ملاقات کے بعد مئی 1885 میں لکھا تھا کہ 'ہیوم نے مجھ کو بتایا ہے کہ وہ اور ان کے دوست ایک سیاسی میٹنگ کرنے جا رہے ہیں۔ جہاں تک میرا خیال ہے ٹھیک اسی طرح کا اجتماع جیسا کیتھولک آزادی کے پہلے اوکونیل (O'Connell) نے کیا تھا۔

نہ تو ڈفرن اور نہ ہی بمبئی اور مدراس کے گورنر اس کے آزاد خیال ساتھی اور نہ الفرڈ لائل (Alfred Lyall)، جے۔ بی۔ لائل (J.B. Lyall)، ڈی۔ ایم۔ والیس (D.M. Wallace)، اے۔ کالون (A. Colvin) اور ایس۔ سی۔ بیلے (S.C.) Bayley) جیسے قدامت پسند افسروں کو کانگریس سے کوئی ہمدردی تھی۔ ڈفرن نے 1888 میں صرف پہلی بار ہی کانگریس کو برا بھلا کہا ہو، ایسی بات نہیں ہے۔ انہوں نے رے کو لکھا تھا کہ 'ہم کانگریس کا خاتمہ کر دیں گے۔ ہم اس کو رہنے نہیں دیں گے۔' اس سے پہلے مئی 1885 میں وہ رے کو لکھ چکے تھے کہ 'وہ کانگریس سے ہوشیار رہیں اور اصلاح پسندوں (reformers) اور رجعت پسندوں (reactionaries) کے نزدیک نہ پھینکیں۔' 18 جون 1885 میں رے نے اس کا جواب لکھ کے یہ اندیشہ ظاہر کیا کہ انگلینڈ کے سیاست میں ابھرے آئرش (Irish) نمائندوں کے مانند ہی ہندوستان میں 'ہندوستانی قومی پارٹی' کی شکل میں سیاسی کارکنوں نے بے چینی پیدا کر دی ہے۔ اس سے پہلے مئی میں ہی رے نے ڈفرن کو خبردار کیا تھا کہ ہیوم ایک ایسی تنظیم کا مرکز بن گئے ہیں جو ہندوستانیوں کے دلوں میں وطن پرستی کا جذبا جاگر کر رہی ہے۔ دراصل مئی 1885 کے بعد سے ہی ڈفرن کو ہیوم سے سرد مہری ہو گئی۔ وہ ان سے کنارہ کش ہو گئے۔ 1886 کے بعد تو ڈفرن بنگالی بابوؤں اور مراٹھا برہمنوں پر بھی برسنے لگے کہ 'ان لوگوں کے مقاصد مشتبہ ہیں اور یہ کہ وہ ہندوستان میں آئرلینڈ جیسی انقلابی کاروائی کرنا چاہتے ہیں۔' مئی۔ جون 1886 میں ڈفرن نے ہیوم کو آدھا پاگل، مکار، بے حد مغرور اور پرلے درجے کا جھوٹا آدمی بتایا۔ ہیوم کا صرف یہی قصور تھا کہ وہ ہوم رول (Home Rule) تحریک کا روح رواں بن گیا تھا۔ مختصر یہ کہ کانگریس کے وجود میں آنے کا سیفٹی والو والا نظریہ حقیقت میں مذہبی پیشواؤں کی کارگذاریوں تک ہی محدود ہے اور شاید انہیں سے اس کی ابتدا ہوئی۔

5.3 کانگریس کے قیام کا پس منظر (Background to the Foundation of the Congress)

اس تمام گفتگو سے یہ ثابت ہو گیا کہ کانگریس کا قیام کوئی انگریزی سازش نہیں تھی۔ بلکہ انیسویں صدی کی آخری دہائیوں میں ابھرنے والی قوم پرستی کی لہر کا مکمل اظہار تھی۔ 1870 کے آخر اور 1880 کے شروع میں اس ہندوستانیوں کی سیاسی سمجھ بوجھ میں مزید اضافہ ہوا اور 1885 تک یہ نقطہ انقلاب تک پہنچ گئی۔ اور اب ہندوستان کا ماہر سیاست داں اور جدید دانشور طبقہ انگریزی حکومت کے مد

مقابل، ذاتی مفاد کے تنگ دائرے میں سوچنے کے بجائے وسیع زاویہ نظر سے قوم کی بھلائی کے بارے میں سوچنے لگے۔ ان کی یہ کاوش کامیابی سے بھی ہمکنار ہوئی۔ انہوں نے ملکی سطح پر ایک ایسی تنظیم کی بنا درکھی جس کا ایک ہی منبر، ایک ہی قبلہ اور ایک ہی امام تھا۔ برطانوی افسران نے عوام کا قوم پرستانہ جوش جو کانگریس کی بنیاد تھا، کو بھانپنے میں ذرہ برابر غلطی نہیں کی۔ وہ اسے شک کی نظر سے دیکھ رہی تھی اور انگریزی حکومت کے حق میں فال بد مان رہی تھی۔ جیوں جیوں لوگوں کی سیاسی سرگرمی تیز ہوتی گئی حکومت کو آئرلینڈ جیسی غداری، بغاوت اور شورش کا خیال بری طرح ستانے لگا۔

انگریزی حکومت کا یہ شبہ وقتی نہیں تھا، جو کہ حال ہی میں 1857 کی بغاوت کے ہیجان سے ابھر پائی تھی۔ اس کے ٹھوس تاریخی ثبوت تھے۔ سطحی طور پر اس زمانے میں قوم پرست ہندوستانیوں کے خاص مطالبات تھے۔ سوتی کپڑوں پر درآمد محصول میں کمی نہ کرنا، اسلحہ رکھنے کا اختیار دینا، پریس کی آزادی، برما اور افغانستان میں توسیع پر روک، فوجی اخراجات میں تخفیف، قحط زدہ لوگوں کی مالی امداد میں اضافہ، سول سروسز میں ہندوستانیوں کی بھرتی، ہندوستانیوں کو نیم فوجی رضاکار دستہ میں شامل ہونے کا حق، ہندستانی ججوں کو انگریز شہریوں کے فوجداری مقدموں کی سنوائی کا اختیار، انگریز ووٹروں کے درمیان اس طرح کا پرچار کہ وہ اسی پارٹی کو ووٹ دیں جو ہندوستانیوں پر توجہ دے اور ان کی بھلائی کا خیال رکھے۔ ان مانگوں پر اگر الگ الگ غور کیا جائے تو بہت ہلکی لگیں گی، پھر بھی برطانوی حکومت آسانی سے ان کو ماننے والی نہیں تھی۔ اسے لگتا تھا کہ اگر یہ مطالبے مان لیے گئے تو ہندستانی عوام پر حکومت کا شکنجہ ڈھیلا ہو جائے گا اور سرکاری مشینری کی چولیں ہل جائیں گی۔ 1875 اور 1885 کے درمیان کے سالوں میں نیا سیاسی ابھار، زیادہ انتہا پسند نوجوان قوم پرست دانشوروں کی تخلیق تھا جن میں سے زیادہ تر اسی عرصے کے دوران سیاست میں داخل ہوئے۔ انہوں نے نئی تنظیمیں بنائیں اور بخوبی یہ محسوس کیا کہ پرانی تنظیمیں اپنے منصوبے اور سیاسی سرگرمیوں کے سلسلہ میں بہت تنگ نظر ہیں، مثلاً 'برٹش ایسوسی ایشن آف بنگال' دھیرے دھیرے زمیندار نواز بن گئی تھی اور اس طرح انگریزوں کے خلاف اس کا جوش ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔

'بامبے ایسوسی ایشن' اور 'مدراس نیٹیو ایسوسی ایشن' جیسی جماعتیں رجعت پسند بن کر قریب المرگ ہو گئیں تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ بنگال کے نوجوان قوم پرستوں نے سریندر ناتھ بنرجی اور آنند موہن بوس کی قیادت میں 1876 میں 'انڈین ایسوسی ایشن' کی بنیاد ڈالی۔ مدراس کے نوجوان سی۔ راگھو چیریار (C. Vijayaraghavachariar)، جی سبرامنیہ ایر (G. Subramania Iyer)، پی آنند چارلو (P. Anandacharlu) اور دوسروں نے 1884 میں 'مدراس مہاجن سبھا' قائم کی۔ کے ٹی ٹیلنگ (K.T. Telang) اور فیروز شاہ مہتا جیسے دانشور لوگوں نے دوسرے بڑے رہنماؤں جیسے دادا بھائی فرام جی (Dada Bhai Framiji) اور دین شاپیٹ (Dinshaw Petit) سے سیاسی اختلاف کی بنیاد پر اپنا ناطہ توڑ لیا اور 1885 میں بامبے پریسیڈنسی ایسوسی ایشن (Bombay Presidency Association) بنائی۔ دوسری دیگر تنظیموں میں صرف 'پونا سار وجنک سبھا' پہلے کی طرح کام کرتی رہی۔ اس وقت تک اس پر مکمل طریقہ سے علم داں قوم پرور طبقہ کا ہی غلبہ تھا۔

انہیں ایام میں ملک میں نئی سیاسی زندگی پیدا ہونے لگی۔ مخصوص قوم پرست اخبارات ہندو (*The Hindu*)، ٹریبون (*Tribune*)، بنگالی (*Bengalee*)، مہراٹا (*Mahratta*) اور کیسری (Kesari) جو ہندوستان کے سیاسی افق پر چھائے تھے، نیا پیغام دینے لگے۔ صرف امرت بازار پتر کا (*Amrita Bazar Patrika*) اس سے مستثنیٰ تھی۔ اس کی اشاعت تو پہلے ہی سے ہو رہی تھی اور 1878 میں یہ انگریزی زبان کا اخبار بن گیا۔ 1885 کے آتے آتے لوگ ایک کل سیاسی جماعت کی تشکیل کی ضرورت شدت سے محسوس کرنے لگے۔ لوگوں کی زندگی کا یہ ضروری مقصد بن گیا۔ 1877 کے بعد اس مقصد کے حصول کے لیے جو بھی کوششیں کی گئیں ان کے بارے میں حال کے بہت سارے مؤرخین نے بڑی تفصیل سے لکھا ہے۔ 1883 کے بعد ان کوششوں میں مزید تیزی آئی۔ اور سیاسی سرگرمیوں نے زور پکڑا۔ کلکتہ سے شائع ہونے والے 'انڈین مرر' نے تو اس مسئلہ کو لے کر باقاعدہ مہم چھیڑ رکھی تھی۔

دسمبر 1883 میں انڈین ایسوسی ایشن نے ایک آل انڈیا کانفرنس کا انعقاد کیا۔ یہی وجہ تھی کہ آل انڈیا نیشنل کانگریس سے جڑے سریندر ناتھ بنرجی 1885 میں انڈین نیشنل کانگریس کے قیام کے اجلاس میں شرکت نہ کر سکے۔ گذشتہ دس سالوں کے دوران بہت ساری تحریکوں کے چلانے کی وجہ سے ہندوستانیوں نے خاصہ تجربہ حاصل کر لیا تھا اور ان میں خود اعتمادی پیدا ہوئی تھی۔ 1875 کے بعد سے سوتی کپڑا درآمدگی محصول کو لے کر لگاتار مہم چلتی ہی۔ یہ مہم ہندوستان میں سوتی کپڑا صنعت کے حق میں درآمدگی فیس کو برقرار رکھنے کے لیے چلائی جارہی تھی۔ 78-1877 میں سرکاری نوکریوں میں ہندوستانیوں کی بھرتی کے لیے زبردست تحریک چلائی گئی۔ ہندوستانیوں نے لارڈ لٹن (Lord Lytton) کی افغانستان مہم کی سخت مخالفت کی اور حکومت کو مجبور کیا کہ وہ دوسری افغان جنگ میں ہوئے نقصان کی بھرپائی کرے۔ حکومت نے جب ورناکولر پریس ایکٹ (Vernacular Press Act) کے ذریعہ پریس پر شکنجہ کسنا چاہا تو انہوں نے اس کی سخت مخالفت کی۔ اسی طرح آرمس ایکٹ (Arms Act) کے تحت اسلحہ رکھنے پر جب پابندی لگائی گئی تب لوگوں نے شدید احتجاج کیا۔ 82-1881 میں پلانٹیشن لیبر ایکٹ (Plantation Labour) اور ان لینڈ امیگریشن ایکٹ (Inland Emigration Act) کے خلاف منظم تحریک چلائی کیونکہ اس کے تحت باغان مزدوروں کو ایک طرح کا غلام سا بنا دیا گیا تھا۔ 1883 میں البرٹ بل (Ilbert Bill) کی حمایت میں زبردست مہم چلائی گئی۔ اس قانون کے مطابق ہندوستانی جج یوروپی شہریوں کے خلاف فوجداری مقدموں کی سنوائی کر سکتے تھے۔ یوروپی شہریوں نے اس قانون کو تو پاس نہیں ہونے دیا مگر اس سے ہندوستانیوں نے ایک مفید سبق سیکھا کہ ان کی کوششیں کل ہند سطح پر منتظم نہ ہونے کی وجہ سے ناکام رہیں۔ اس کے برخلاف یوروپی شہریوں نے متحد ہو کر بل کی مخالفت کی تھی، اس لیے وہ کامیاب رہے۔

اس کے بعد 1883 میں ہندوستان اور انگلینڈ میں سیاسی تحریک چلانے کے لیے ملکی سطح پر چندہ وصولنے کا کام شروع ہوا۔ 1885 میں رضاکار دستوں میں شمولیت کے لیے مہم شروع کی گئی اور انگریز ووٹ دہندوں سے درخواست کی گئی کہ وہ اسی نمائندہ کو ووٹ دیں جو ہندوستانیوں کے حقوق کے لیے آواز اٹھائے۔ کئی ایک ہندستانی رہنماؤں کو انگلینڈ بھیجا گیا جہاں انہوں نے اپنی تقریروں کے ذریعہ ہم وطنوں کے حقوق کی وکالت کی۔

اس طرح یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ گذشتہ سالوں میں چلائی جارہی سیاسی مہم کی تکمیل کانگریس کے قیام کی شکل میں ہو گئی۔ 1885 تک ملکی سیاست ترقی کر کے ایسی منزل پر پہنچ گئی کہ کچھ بنیادی کام اور مقاصد کو مد نظر رکھ کر ان کے حصول کے لیے جد وجہد کرنا ضروری ہو گیا تھا۔ بس اس کے لیے ضروری تھا کہ سبھی سیاسی کارکن متحد ہو کر کل ہند جماعت کے تحت کام کریں ہوں۔ جو لوگ ممبئی میں 28 جون 1885 کے اجلاس میں شریک ہوئے تھے ان کو بھی جوش دلایا گیا تھا کہ وہ ان مقاصد کے حصول کے لیے سر گرمی دکھائیں۔ کانگریس کی کامیابی یا ناکامی اور اس کے مستقبل کا انحصار اس بات پر مطلق نہیں ہے کہ اس کو کن لوگوں نے قائم کیا تھا بلکہ اس بات پر ہے کہ شروعاتی دور میں یہ اپنے عزم میں کہاں تک کامیاب رہی۔ ہندوستان اب قوم بننے کے مرحلہ میں داخل ہو گیا تھا اور ہندوستانی قومی تحریک کے بانیوں کا مقصد ہی اس عمل کو تیز کرنا، ہندوستانیوں کو متحد کر کے ایک قوم بنانا اور اسی حیثیت سے اس کی شناخت قائم کرنا تھا۔ اس کے برعکس انگریز حکمراں اور اس کے حامی زور شور سے کہا کرتے تھے کہ ہندوستان متحد یا آزاد نہیں ہو سکتا کیوں کہ یہ قوم نہیں ہے، بلکہ محض ایک جغرافیائی نام ہے۔ یہ سینکڑوں مذہب وملت اور نسلوں کا مجموعہ ہے۔ ہندوستانیوں نے اس مفروضہ کی بالکل پرواہ نہیں کی بلکہ یہ کہا کہ ہندوستان قوم بننے کی سمت میں گامزن ہے۔ تلک، سریندر ناتھ بنرجی اور بہت سارے دوسرے حضرات کہا کرتے تھے کہ ہندستان قوم بننے کے مرحلہ میں ہے۔ کانگریسی رہنماؤں نے سمجھ لیا تھا کہ ملک کے سماجی، سیاسی اور مالی حالات لوگوں کو ایک دوسرے کے قریب لا رہے ہیں۔ لیکن وہ یہ بھی جانتے تھے کہ لوگوں کو ان حالات سے باخبر کرنا اور ان میں سیاسی فہم پیدا کرنا ضروری ہے۔ اسی سے ان کے دل میں قومی اتحاد کے جذبات ابھارے جا سکتے ہیں۔

اس کے علاوہ یہ بات کہ ہندوستان قوم بننے کے راستے پر ہے، یہی مان لینا کافی نہیں تھا۔ اس عمل کو آگے بڑھانا، پختگی اور مضبوطی دینا ضروری تھا۔ کانگریس کا خاص مقصد ہی قومی اتحاد کو فروغ دینا تھا اور بعد میں اس کا حصول ہی اس کی بڑی کامیابی تھی۔ مثال کے طور پر پی آنند چارلو نے 1891 میں کانگریس کے اجلاس میں خطبہ صدارت میں یہ بات کہی تھی کہ کانگریس زبردست قوم ساز ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ یہی کانگریس کا سب سے شاندار کام ہے۔ کانگریس کے پہلے صدر ڈبلو۔ سی بنرجی کے ذریعہ مرتب کانگریس کے بنیادی مقاصد میں ایک یہ تھا کہ قومی اتحاد کے جذبات کو پوری طرح مضبوط اور مکمل کیا جائے۔ روسی سیاح آئی۔ پی۔ منایف (I.P. Minayeff) نے اپنی ڈائری میں لکھا ہے کہ بنرجی کے ساتھ سفر کرتے وقت میں نے دریافت کیا کہ کانگریس لیڈران کانگریس پارٹی سے عملاً کس نتیجہ کی امید کرتے ہیں۔ بنرجی نے جواب دیا کہ 'وہ ہندوستانیوں کے درمیان قومی احساسات اور اتحاد کے پنپنے کی امید کرتے ہیں۔' اسی طرح کانگریس کے پہلے اجلاس پر رائے زنی کرتے ہوئے بمبئی کے اندو پرکاش نے لکھا تھا کہ یہیں سے نئی زندگی کی شروعات ہوتی ہے۔ یہ لوگوں کے دلوں میں قومی جذبات پیدا کرنے میں اس طرح مددگار ہوگی کہ دور دراز کے لوگ مشترک ہمدردی اور مقاصد کے تحت آپس میں متحد ہو جائیں گے۔

ہندوستان کا قوم میں بدلنا ایک طویل تاریخی سفر تھا۔ اس کے علاوہ کانگریس کے رہنماؤں نے اچھی طرح محسوس کر لیا تھا کہ ہندوستان میں کچھ ایسی تمدنی رنگارنگی ہے کہ کوئی خاص تدبیر قومی اتحاد قائم کرنے کے لیے کی جانی چاہیے جو دنیا کے دوسرے حصوں میں نا معلوم ہے۔ ملک کے سبھی علاقوں میں پہنچنے کے لیے یہ بھی طے پایا کہ کانگریس کا اجلاس باری باری سے سبھی علاقوں میں منعقد ہو۔ اور

صدارت کی ذمہ داری وہاں کے کسی شخص کو نہ دے کر دوسرے علاقہ کے آدمی کو دی جائے۔ سبھی مذاہب کے لوگوں تک پہنچنے کے لیے اور اقلیتوں کے دل سے خوف دور کرنے کے لیے 1888 کے اجلاس میں یہ طے کیا گیا کہ اگر کسی قرارداد پر ہندو یا مسلم نمائندوں کے بڑے حصے کو اعتراض ہو تو وہ پاس نہ ہو۔ 1899 میں اقلیتوں سے متعلق ایک قرارداد میں یہ دفعہ بھی شامل کی گئی کہ جہاں پارسی، عیسائی، مسلمان یا ہندو اقلیت میں ہوں وہاں کونسل میں ان کے منتخب نمائندوں کی تعداد آبادی کے تناسب سے کم نہیں ہونی چاہیے۔ قرارداد پیش کرنے والے نے اس کی وجہ یہ بتائی کہ ہندوستان یک رنگا ملک نہیں ہے اس لیے سیاسی طور طریقے یہاں یورپ جیسے نہیں ہیں۔ شروعاتی دور کے قومی رہنماؤں کا پختہ ارادہ ہندوستان کو سیکولر قوم بنانا تھا اور کانگریس بذات خود مکمل طور سے سیکولر تھی۔ کانگریس کا دوسرا بڑا مقصد ایک ایسا سیاسی اسٹیج یا پروگرام تیار کرنا تھا، جس کے تحت پورے ملک میں کام کر رہے سیاسی کارکنان آل انڈیا سطح پر جمع ہو کر لوگوں کو تعلیم کے ذریعہ متحرک کر کے سیاسی سرگرمی جاری رکھ سکیں۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ لوگوں کی عام شکایتیں دور کی جائیں اور حکومت سے ان کے حصول کی لڑائی لڑی جائے۔ اسی وجہ سے کانگریس نے سماجی اصلاح کا کام ہاتھ میں نہیں لیا۔ اس کے دوسرے اجلاس میں دادا بھائی نوروجی نے ایک اصول مرتب کیا اور کہا کہ نیشنل کانگریس خود کو صرف ان سوالات تک محدود رکھتی ہے کہ جن میں پوری قوم کا بلاواسطہ اشتراک ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ ہم ایک سیاسی تنظیم کی حیثیت سے یہاں جمع ہوئے ہیں جس سے اپنے سیاسی ارادوں سے حکومت کو مطلع کر سکیں۔

اس نئی سیاست کی خصوصیات یعنی لوگوں کی مجموعی شرکت اور اجتماعی تحریک جیسی چیزیں ہندوستان کے لیے نئی تھیں اس لیے یہ نظریہ کہ سیاست پر کچھ لوگوں کی اجارہ داری نہیں، بلکہ یہ سب کی دلچسپی کی چیز ہے، ایسی بات عوام کے خیال میں بھی نہیں تھی۔ اور جب تک لوگ اس حقیقت کو نہ سمجھ لیں کسی بھی طرح کی سیاسی تحریک چلانا ناممکن تھا۔ اس شعور کی بنیاد پر ہی ایک اور باخبر سیاسی عقیدہ پیدا کیا جا سکتا ہے۔ اس لیے کانگریس کا اہم کام لوگوں کو بیدار کرنا، تربیت دینا، منظم کرنا اور ان میں عام رائے قائم کرنا تھا۔ وطن پرستوں کی شروعاتی سرگرمی اسی مقصد کے ہی حصول کے لیے تھی۔ سیاسی بیداری اور سمجھ پیدا کرنے اور رائے عامہ کو ہموار کرنے کا کام سب سے پہلے تعلیم یافتہ طبقہ میں شروع کیا گیا۔ بروقت کانگریس کی خواہش لوگوں کی دشواریوں کو دور کرنے کے بجائے برطانیہ کی 'غلہ قانون مخالف تحریک' کی طرز پر لگاتار سیاسی سرگرمی چلانا تھا۔ قومی رہنماؤں کے ساتھ عوام میں بھی خوداعتمادی پیدا کرنا ضروری تھا جس سے وہ اپنی قابلیت اور صلاحیت کا استعمال کر کے دنیا کی سب سے طاقتور حکومت کے خلاف سیاسی مورچہ بندی کرنے کی کوشش کر سکیں۔ مگر یہ سب آسان نہیں تھا۔ ایسی بیداری کے لیے ایک طویل مدت درکار تھی۔

5.4 پہلا اجلاس (The First Session)

انڈین نیشنل کانگریس کی پہلی میٹنگ کے انعقاد کا سہرا ہیوم کو جاتا ہے۔ دسمبر 1884ء کے اوائل میں لارڈ رپن کو الوداع کہنے کے لیے وہ ممبئی گیا۔ وہاں وہ تین ماہ تک مقیم رہا اور اس دوران پریسیڈنسی کے بارسوخ افراد سے مشاورت کی۔ تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کے ذریعہ سیاسی عمل کے پروگرام کو مرتب کیا۔ مارچ 1885ء میں یہ طے کیا گیا کہ انڈین نیشنل یونین (ابتداء میں یہی نام طے کیا گیا تھا) کی کانفرنس پونا

میں کرسمس کے ہفتہ کے دوران منعقد ہوگی۔ابتداء میں ہیوم اوراس کے ساتھیوں نے اس کانفرنس کے لیے کلکتہ کو مناسب مقام سمجھا لیکن بعد میں پونا میں تجویز کیا گیا کیوں کہ یہ مرکزی مقام تھا اور پونا کی سار وجنک سبھا نے کانفرنس کے انعقاد کی ذمہ داری لی تھی۔ مناسب فنڈ بھی فراہم کرنے کا انتظام کیا۔ بد قسمتی سے پونا کو کانفرنس کی میزبانی کا موقع نہیں ملا اور کانفرنس بمبئی میں منعقد کی گئی کیوں کہ پونا میں ہیضہ کی وباچل رہی تھی۔ کانگریس کا پہلا اجلاس دوشنبہ 28دسمبر 1885کو گوکل داس تیج پال سنسکرت کالج بمبئی میں منعقد ہوا۔ اس میں 100لوگوں نے شرکت کی تھی۔ جس میں 72افراد غیر سرکاری عہدیدار تھے جن کو اراکین کے طور پر تسلیم کرلیا گیا۔کانگریس کے پہلے صدر ہونے کا اعزاز بنگال کے ڈبلیو سی بنرجی کو جاتا ہے۔وہ ہندوستان کے پہلے چار بیرسٹروں میں سے ایک تھے اوراس دور کے ماہر قانون تھے۔ ان کے اس انتخاب نے ایک بہترین مثال قائم کی کہ صدر کا انتخاب اس علاقہ سے باہر کی شخصیت کا ہونا چاہیے جہاں اجلاس منعقد ہو رہا ہو۔

5.4.1 صدارتی خطاب (The Presidential Adress)

کانگریس کے پہلے صدر کی تقریر کا مرکزی موضوع کانگریس کی وسعت، کردار اوراغراض ومقاصد پر مبنی تھا۔اس کے علاوہ صدارتی خطاب میں کئی غلط فہمیوں کا ازالہ کرنے کی کوشش کی گئی تھی جو عوام کے ذہنوں میں کانگریس کے مقاصد سے متعلق تھی۔ صدر نے کانگریس کے اغراض ومقاصد کو واضح طور پر سمجھایا۔اغراض ومقاصد اس طرح تھے۔

1. ملک کے تمام لوگوں میں شخصی قربت اور دوستانہ ماحول کو فروغ دینا چاہیے۔
2. نسل،مذہب یا علاقائی عصبیت کا خاتمہ
3. قومی یکجہتی کے جذبات کا فروغ
4. موجودہ مسائل سے متعلق تعلیم یافتہ طبقات کی رائے ہموار کرنا
5. عوامی مفاد کے لیے مستقبل کا لائحہ عمل تیار کرنا

ان مطالبات کے علاوہ صدر نے ان تمام اعزازات کا تذکرہ کیا جو برطانیہ نے ہندوستان کو دیے تھے۔اس نے یقین دلایا کہ تعلیم یافتہ ہندوستانی افراد حکومت کے وفادار اور خیر خواہ ہیں۔اس نے واضح کیا کہ کانگریس کے قیام کا مقصد حکمرانوں تک اپنے خیالات اور نظریات کی نمائندگی کرنا ہے اوران پر سازش اور غداری کا الزام غلط ہے۔وہ ہیوم کی صدارت کو قبول کر چکے تھے کیوں کہ ہندوستان میں برطانوی برادری کے کئی اراکین تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کو شک کی نظر سے دیکھتے تھے اوران پر اعتبار نہیں کرتے تھے۔آخر کار صدر نے بہت ہی محتاط الفاظ میں یہ واضح کر دیا کہ کانگریس کیا چاہتی تھی۔وہ چاہتی تھی کہ حکومت کو استحکام اور وسعت دی جائے۔اس طرح کی پالیسی نہ صرف حکومت بلکہ زیادہ تر عوام کے لیے مددگار ثابت ہوگی۔اس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ کانگریس حکومت میں نہ صرف اپنے طبقہ کے لیے بلکہ تمام ہندوستانیوں کے مفادات کے لیے اپنا حصہ مانگ رہی تھی۔ دراصل قومی یکجہتی کے علاوہ دوسری خواہشات کا اظہار نہیں کیا گیا۔ کانگریس قائدین کو برطانوی عدلیہ پر بہت زیادہ یقین تھا۔وہ چاہتے تھے کہ حکومت کی پالیسیاں ہندوستانیوں کے مفادات اور بھلائی اوران کی ترقی سے متعلق ہو۔اس مقصد کے تحت وہ حکمرانی میں اپنا زیادہ سے زیادہ رول چاہتے تھے اور یہ نمائندہ جاتی اداروں کی ترقی اور اعلیٰ عہدوں پر ہندوستانیوں کے تقرر کے

ذریعہ ممکن تھا۔

5.4.2 مشارکین (The Participants)

اکثر یہ بحث رہی ہے کہ کانگریس میں ہمیشہ قانون دانوں کا غلبہ رہا ہے۔ مثلاً مشہور مورخ انیل سیل(Anil Seal) نے نشاندہی کی کہ کانگریس کے پہلے اجلاس میں تقریباً نصف افراد یعنی 72 میں سے 39 وکلا تھے۔ کئی دہائیوں تک ایک تہائی مندوبین کا تعلق قانونی پیشہ سے تھا۔ راجہ مہاراجہ، بڑے زمیندار اور دولت مند تاجر اس سے غیر حاضر تھے۔ کسان اور دستکار طبقہ اس جانب متوجہ نہیں ہوا۔ ہندوستان میں یہ مسئلہ تھا کہ تعلیم یافتہ افراد کے لیے ملازمت کے بہت کم مواقع تھے۔ اس لیے بڑی تعداد قانونی پیشوں سے وابستہ ہو گئی۔ قدیم اشرافیہ طبقہ نے کانگریس کی کاروائی میں شرکت نہیں کی کیوں کہ وہ نئے حریت پسند نظریات سے خوفزدہ تھے۔ کچھ وقت کے لیے کئی رہنماؤں نے ہندوستان کی غریبی کے مسئلہ کو زیر بحث لایا اور خاص طور پر دادابھائی نوروجی نے جب کانگریس کے حالات پر بحث کی تو یہ طے کیا گیا کہ پہلے مرحلہ میں نمائندہ اداروں کو منظوری دی جائے۔ کانگریس نے عوامی مباحثہ کے ذریعہ مسائل پر توجہ دینا اور عرضیاں داخل کرنے کی پالیسی کو اپنایا اور یہ فطری تھا۔

5.4.3 قراردادیں اور کاروائی (The Resolutions and Actions)

کانگریس کی کاروائی بہت ہی منظم اور بہترین انداز میں انجام دی گئی۔ قراردادیں پیش کی گئیں۔ مباحثے ہوئے اور پارلیمانی انداز میں قراردادیں منظور کی گئیں۔ ہر قرارداد کو ایک علاقہ سے تعلق رکھنے والے رکن نے پیش کیا اور اس کی تائید دوسرے علاقہ کے رکن نے کی۔ تمام تقاریر اعتدال پسندی، راست بازی اور تاج برطانیہ سے وفاداری سے متعلق تھیں۔ برٹن مارٹن نامی مورخ نے تبصرہ کیا کہ پہلا کانگریس کا اجلاس مکمل طور پر ایک پیشہ وارانہ نوعیت کا اجلاس تھا جو امریکہ اور انگلینڈ میں ہونے والے اجلاس سے کم تر نہیں تھا۔ کانگریس کے پہلے اجلاس میں 9 قراردادیں منظور کی گئیں۔

- پہلی قرارداد میں ہندوستانیوں کے مسائل و معاملات کی تفتیش کے لیے رایل کمیشن کے قیام کا مطالبہ کیا گیا اور اس میں ہندوستانیوں کی قابل لحاظ تعداد کی نمائندگی کی تجویز پیش کی گئی۔
- دوسری قرارداد میں سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا کی انڈین کونسل آف کی برخواستگی کا مطالبہ کیا گیا۔ کانگریس چاہتی تھی کہ سکریٹری آف اسٹیٹ راست طور پر برٹش پارلیمنٹ کو جوابدہ ہونا چاہیے۔ یہ مطالبہ اس بنیاد پر کیا گیا کہ برطانوی افراد انصاف پسند ہوتے ہیں اور ان کو صحیح معلومات فراہم کی جائیں تو وہ صحیح راستے سے کبھی انحراف نہیں کریں گے۔
- ایک اور قرارداد خارجہ پالیسی سے متعلق تھی جس میں برما کو الحاق کرنے کی مذمت کی گئی۔
- دیگر قراردادوں میں دستور کی آزادی، مرکزی اور علاقائی قانون ساز مجلسوں کے اختیارات اور سول سروسز کے امتحانات برطانیہ اور ہندوستان میں بیک وقت منعقد کرنے اور فوجی اخراجات میں کمی سے متعلق تھے۔ اجلاس کے اختتام سے قبل کانگریس نے مزید دو فیصلے کیے۔

- پہلے فیصلہ کے مطابق کانگریس کے اجلاس میں منظور شدہ قراردادوں کو ملک کی تمام سیاسی انجمنوں سے توثیق حاصل ہونا۔
- کانگریس کا اگلا اجلاس 28 دسمبر 1886 کو کلکتہ میں منعقد کرنا۔

یہ فیصلے اہم تھے اس سے یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ قائدین کانگریس کے اجلاس کو علحدہ پروگرام نہ سمجھیں بلکہ اس کو تحریک کی شروعات کا نام دیا گیا۔ کانگریس کے اجلاس میں سماجی اصلاحات کا سوال نہیں اٹھایا گیا۔ بعض اراکین نے اس موضوع پر بحث کرنے پر زور دیا لیکن بنیادی اختلافات کی وجہ سے اس کو زیر بحث نہیں لایا گیا۔ بعض اراکین نے کئی لوگوں کی موجودگی کی وجہ سے کمسن بیاہ، بیواؤں کی شادی جیسے مسائل کو ایک عوامی جلسہ میں زیر بحث لایا جو کانگریس کے اجلاس کے اختتام کے فوراً بعد اسی مقام پر منعقد کیا گیا تھا۔

5.5 ابتدائی کانگریسی قیادت کا تنقیدی تجزیہ
(A Critical Analysis of the Early Congress Leadership)

بعد کے بہت سے مورخین اور ناقدین نے ابتدائی دور کے قومی رہنماؤں کے سیاسی جد وجہد کے طریقوں، ان کی درخواستوں، عرضداشتوں اور گذارشات پر ہی اپنی توجہ مرکوز کی۔ یہ سچ ہے کہ ان کی یہ کاوش عوام کو مجموعی طور سے متحرک نہ کر سکی مگر انہوں نے اپنی تحقیق میں ان قائدین کی سرگرمی کے سب سے نمایاں پہلو کو ہی نظرانداز کر دیا۔ سیاسی سنت کی حیثیت سے مشہور جسٹس رانا ڈے نے 1891 میں ہی اس حقیقت کو بھانپ لیا تھا۔ جب چھبیس سال کے نوجوان اور بے صبر گوکھلے نے پونا سار وجنک سبھا کے ذریعہ کافی محنت اور توجہ سے مرتب کی گئی تھی عرضداشت پر حکومت کے دوسطر کے جواب کو پڑھ کر اپنی مایوسی کا اظہار کیا تھا، تب رانا ڈے نے ان کو مطمئن کرنے کے لیے کہا تھا کہ 'تم ملک کی تاریخ میں اپنی اوقات نہیں سمجھتے ہو، یہ عرضداشتیں رسمی طور پر تو حکومت کو دی گئی ہیں، البتہ ان کے مخاطب تو حقیقت میں ملک کے لوگ ہیں، تاکہ وہ ان معاملات پر غور کرنا سیکھ سکیں۔ یہ کام تو نتیجہ کی پرواہ کیے بغیر سالوں چلنا چاہیے کیونکہ اس طرح کی سیاست اس ملک میں بالکل نئی ہے۔

ایک قومی تحریک کو پیدا کرنے کے بنیادی مقصد کے ایک حصے کے طور پر یہ ضروری تھا کہ ایک مشترکہ کل ہند قومی سیاسی قیادت کی تشکیل کی جائے، یعنی اسے تعمیر کیا جائے جسے مشہور اطالوی مارکسوادی اینٹونیو گرامشی (Antonio Gramsci) ایک تحریک کا مرکز کہتے ہیں قومیں اور لوگ اسی وقت بامعنی اور موثر سیاسی عمل کے قابل بنتے ہیں جب وہ منظم ہوں۔ وہ 'عوام' یا 'تاریخی موضوع' تب بنتے ہیں جب وہ اس طرح منظم ہوتے ہیں۔ قومی تحریک کا پہلا زینہ ہی تب شروع ہوتا ہے جب اس کے علمبردار، لوگوں کو متحد کرنے کے لیے کمر کستے ہیں اور اس کی کامیابی کا انحصار بھی قائدین کے آپسی اتحاد پر ہوتا ہے جب ان کی مجموعی شناخت، ایک نظریہ، ایک مقصد اور ایک ہی طرح کے احساسات ہوں۔ مارچ 1885 میں کانگریس کے ہونے والے اجلاس میں شرکت کے لیے جو پرچہ سیاسی کارکنوں میں جاری کیا گیا تھا، اس میں لکھا تھا کہ 'کانگریس کے قیام کا مقصد یہ ہے کہ قومی ترقی میں لگے سارے مستعد کارکنان ایک دوسرے کو ذاتی طریقہ سے اچھی طرح جان لیں' کانگریس کے پہلے صدر ڈبلو۔ سی۔ بنرجی نے اس بات کو پھر دہرایا کہ کانگریس کا اصلی مقصد یہ ہے کہ محبان وطن کے دلوں سے مذہبی،

نسلی اور علاقائی نفرت پوری طرح نکل جائے اور ملک کی بھلائی کے لیے سلطنت برطانیہ کے چپہ چپہ میں بسنے والے کارکنان میں قربت و دوستی اور زیادہ مضبوط ہو۔ دوسرے لفظوں میں کانگریس کے بنیاد گزار سمجھ گئے تھے کہ قومی تحریک کی پہلی ضرورت اس کی قیادت ہے یہ قیادت جو سماجی نظریاتی رنگت حاصل کرے گی وہ ایک ایسا سوال تھا جو قومی تحریک کی تشکیل کے بنیادی مقصد سے مختلف تھا۔ سماج کی یہ ساخت تو بہت ساری باتوں پر منحصر تھی جیسے سماج کے مختلف طبقات کا کردار اور ان کے نظریاتی کشمکش سے پیدا شدہ نتائج اور ان کے اثرات وغیرہ۔ ابتدائی رہنماؤں کا مقصد ہی سیاسی جمہوریت کو قومی اور بین الاقوامی شکل دینا تھا۔ ان کی سیاست عوام کی فرمانروائی (Sovereignty of People) کے اصول پر منحصر تھی۔ اس سلسلہ میں دادابھائی نوروجی نے اس طرح لکھا تھا کہ 'نیا سبق یہ ہے کہ راجے مہاراجے لوگوں کے لیے ہیں، لوگ ان کے لیے نہیں ہیں۔'

ابتدا میں کانگریس کی تشکیل پارلیمنٹ کی طرح ہوئی تھی۔ دراصل لفظ 'کانگریس' شمالی امریکہ کی تاریخ سے ماخوذ ہے جس کا مطلب ہے لوگوں کی جماعت۔ کانگریس کی اجلاسی کاروائی جمہوری طرز پر چلتی تھی۔ ایک ایک مسئلہ پر فیصلہ سے پہلے خوب بحثیں ہوتی تھیں۔ ضرورت پڑنے پر ووٹ کا سہارا لیا جاتا تھا۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ وہ افسر شاہی اور انگریزی حکومت نہیں تھی، جیسا کچھ مورخین نے سمجھنے میں غلطی کی ہے، بلکہ کانگریس تھی جس نے پارلیمانی جمہوریت کو دیسی شکل دے کر مقبول عام کیا۔ ٹھیک اسی طرح ابتدائی قومی رہنماؤں نے شہری آزادی (Civil Liberty) کے وجود کو قائم رکھنا اور اس کو فروغ دینا قومی تحریک کا لازمی جز بنادیا تھا۔ انہوں نے تحریر و تقریر کی آزادی میں مداخلت اور تخفیف کے خلاف جدوجہد کی۔ انہوں نے عدالتی اور انتظامی اختیارات کی علاحدگی کے لیے مہم چھیڑی اور نسلی امتیاز کے خلاف جم کر لڑائی لڑی۔

برطانوی حکومت کے خلاف جدوجہد کے لیے ضروری تھا کہ حکومت کو ٹھیک سے سمجھا جائے اور اسی سمجھ کی بنیاد پر قومی نظریہ کی نشو و نما کی جائے۔ اس سلسلہ میں ابتدائی قومی لیڈران بیک وقت استاذ اور شاگرد دونوں تھے۔ 1870 اور 1880 کی دہائیوں میں انگریزی حکومت کے خلاف کوئی نظریہ پہلے سے موجود نہیں تھا۔ اپنے تجربہ اور موجودہ حالات کے مطالعہ سے حاصل نتائج کی بنیاد پر ہی رہنماؤں کو برطانوی مخالف نظریہ کو پروان چڑھانا تھا۔ ظاہر ہے کہ بغیر کسی نظریاتی اصول کے کوئی بھی قوی تحریک نہیں چلائی جاسکتی تھی۔ یہ بات ان رہنماؤں کو واضح طور پر معلوم تھی کہ ملک کے لوگ ایک قوم ہیں اور برطانوی حکومت ہماری دشمن ہے اور اسی دشمنی کے خلاف ہماری یہ جنگ ہے۔ ان کو کئی سوالات کے جوابات بھی فوراً دینے تھے، مثلاً کیا انگلینڈ ہندوستان کی ہمدردی میں حکومت کر رہا ہے؟ کیا حاکم اور محکوم کی دلچسپیوں میں فرق ہے؟ کیا یہ تضاد ہندستانی عوام اور نوکر شاہی میں ہے یا حکومت اور عوام کے درمیان یا پھر عوام اور طرز حکومت کے درمیان ہے؟ کیا ہندستانی عوام کی یہ جنگ عظیم برطانوی سلطنت کے مقابلہ چل سکے گی اور پھر یہ سوال کہ یہ جنگ لڑی کیسے جائے گی؟

ان اور ان جیسے دوسرے سوالات کے جوابات کو تلاش کرنے میں کئی غلطیاں بھی سرزد ہوئیں، مثلاً اس دور کے قومی رہنما کم سے کم بیسویں صدی کے آغاز تک برطانوی حکومت کے کردار کو سمجھنے میں ہی ناکام رہے۔ مگر اس وقت ایسی غلطیوں کو کسی طرح ٹالا بھی نہیں جاسکتا

تھا۔ وجہ یہ تھی کہ اس وقت حالات سے نمٹنے کے لیے ایسے کوئی تیار شدہ مناسب اصول لوگوں کو دستیاب نہیں تھے۔ ہاں، کچھ تھے مگر وہ بھی گھسے پٹے، بے جان اور غیر مؤثر تھے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس وقت کے قومی رہنماؤں نے برطانوی حکومت کے خلاف سیدھے کوئی عوامی تحریک نہیں چلائی۔ اس کے برعکس انہوں نے حکومت کے خلاف صرف نظریاتی تحریک پر اکتفا کیا۔ یہاں اس بات کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ قومی یا سامراج مخالف کوئی جدوجہد، حکومت مخالف بننے کے پہلے حکومت کے بارے میں مخالفت کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اس لیے کانگریس کے بانیان نے حکومت کے بارے میں یہ تحریک واقعی بڑی عقلمندی سے چھیڑی۔ شروع ہی سے کانگریس نے خود کو ایک پارٹی کی شکل میں نہیں بلکہ ایک تحریک کی شکل میں پیش کیا۔ صرف ان بنیادوں اور وسیع مقاصد پر ایک رائے ہونے کے علاوہ، جس کا ذکر اوپر آ چکا ہے، کانگریس میں شامل ہونے کے لیے کسی اور خاص طرح کے سیاسی اور اصولی قول و قرار کی ضرورت نہیں تھی۔ اس میں شامل ہونے کے لیے کسی خاص سماجی طبقہ اور گروپ کی پابندی بھی نہیں تھی۔ تحریک کی حیثیت سے اس نے جمہوریت اور سیکولر قومیت کے تئیں پابند سبھی مختلف سیاسی نظریات، رجحانات اور طبقات کے لوگوں کو اپنے اندر شامل کیا۔ اس کے علاوہ کانگریس نے اپنے آغاز سے ہی قائدین کی اعلی صف میں مختلف سیاسی سوچ و معیار اور مختلف اقتصادی نظریات کے لوگ شامل کر رکھے تھے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اس دور کے قومی لیڈران کے بنیادی مقاصد یہ تھے کہ لوگوں میں سیاسی شعور پیدا کیا جائے اور انہیں سیاسی اعتبار سے تعلیم دی جائے، تحریک کا ایک مرکز بنایا جائے اور انگریزی حکومت کے خلاف قومی نظریہ کو ترقی دی جائے اور اس کی خوب اشاعت کی جائے۔

تاریخ، بے بنیاد پیمانہ سے نہیں بلکہ اپنے ٹھوس تاریخی معیار سے جانچ پرکھ کر یہ فیصلہ کرے گی کہ ابتدائی قومی تحریک اپنے بنیادی مقاصد کے حصول میں کہاں تک کامیاب یا ناکام رہی۔ اس معیار سے اس کی کامیابیاں بہت اہم ہیں اور یہی وجہ ہے کہ یہ 1880 کی دہائی میں معمولی آغاز سے بڑھ کر 20 ویں صدی کی مقبول عوامی تحریکوں میں سب سے زیادہ شاندار بن گئی۔ ابتدائی مرحلے میں اس کے دو بڑے رہنماؤں کی ذریعے اس کے کام کے جائزے سے متعلق تاریخ دان یقیناً متفق ہوں گے۔ 1885 اور 1905 کے دوران کانگریس نے تحریک کے لیے جو زمین تیار کرنے کا کام کیا تھا، اس کے بارے میں دادابھائی نوروجی نے ڈی۔ ای۔ واچا (D.E. Wacha) کو جنوری 1905 میں لکھا تھا کہ 'بیدار ہوتی ہوئی نسل میں کانگریس کے خلاف جو بے اطمینانی اور بے قراری ہے وہ اس کی دھیمی اور غیر ترقی یافتہ رفتار کی پیدا کردہ ہے۔ ۔۔۔ یہی اس کا سب سے اچھا ماحصل اور ثمرہ ہے۔ یہی اس کا ارتقاء یعنی اُس کی ترقی ہے۔۔۔ اصل کام یہ ہے کہ انقلاب کی شروعات ہو ۔۔۔ چاہے یہ پر امن طریقے سے ہو یا تشدد سے، انقلاب کی شکل کیسی ہو یہ برطانوی حکومت کی دانائی اور نادانی اور انگریزوں کی کاروائی پر منحصر ہے۔

اسی طرح بیس سالوں کے دوران کانگریس کے ذریعہ کیے گئے کاموں کا تجزیہ کرتے ہوئے گوپال کرشن گوکھلے نے 1907 میں لکھا تھا کہ ہم کو یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ ملک کی ترقی کی اسی منزل پر پہنچ گئے ہیں جہاں ہماری کامیابیاں چھوٹی ہی ہوتی ہیں اور ناامیدیاں بہت اور مشکل۔ جہاں تک اس جدوجہد کو لے جانے کی ذمہ داری خدا نے ہم پر ڈالی تھی، وہاں تک ہم پہنچ گئے ہیں۔ اب ہماری ذمہ داری ختم ہوتی ہے۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ اب ہندوستان کی نئی نسل کو یہ ذمہ داری دی جاتی ہے کہ وہ اپنی کامیابیوں کے ذریعہ ملک کی خدمت کرے۔

ہمیں یعنی موجودہ پیڑھی کے لوگوں کو تو اس بات سے مطمئن ہونا چاہئے کہ ہم نے اپنی ناکامیوں کے ذریعہ ہی حق المقدور ملک کی خدمت کی۔ یہ کام چاہے جتنا مشکل اور کٹھن رہا ہو مگر ناکامیابیوں کے اندر سے ایسی قوت ابھرے گی جو آگے چل کر نمایاں کارنامے انجام دے گی۔

اب ایک بار پھر ہم ہیوم کی طرف واپس ہوتے ہیں، آخر ہیوم کا کردار کیا تھا؟ اگر کانگریس کے بانیان میں اتنی صلاحیت، قابلیت اور وطن پرستی تھی تو ہم کو کانگریس کا خاص ناظم بنانے میں ان کو کون سی ضرورت پڑی تھی۔ بلاشبہ بااصول اور مثالی شخص کی حیثیت سے ہیوم نے اپنے ہم عصر سبھی وسیع النظر اور جمہوریت کے حامی اشخاص جن میں لالہ راجپت رائے شامل تھے، کو اس طرح متاثر کیا تھا کہ ان کو تعاون دینے میں، ان لوگوں کو کسی طرح کی بدنامی کا خدشہ نہیں تھا۔ مگر اس کا صحیح جواب اس وقت کے حالات میں پوشیدہ ہے۔ ہندوستان کے طول و عرض کے تناسب سے 1880 کی دہائی میں سیاسی سوچ رکھنے والے حضرات بہت کم تھے اور برطانوی حکمرانوں کی کھلی مخالفت کی جڑیں اس وقت تک مظبوطی سے جم نہیں سکی تھیں۔

دادابھائی نوروجی، جسٹس رانا ڈے، فیروز شاہ مہتا اور سبرامنیہ ایر اور ایک سال بعد شامل سریندر ناتھ بنرجی جیسے باہمت اور قول و قرار کے پابند لوگوں نے ہیوم سے اس لیے مدد لی، کیونکہ وہ اپنے کام کے آغاز میں ہی حکومت سے دشمنی نہیں لینا چاہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اگر کانگریس جیسی حکومت مخالف جماعت کا سربراہ کوئی رٹائرڈ انگریز سول افسر ہو تو اس کے تئیں حکومت کا شک وشبہ کم ہوگا اور اس طرح اس پر سرکاری حملہ کی گنجائش بھی کم ہوگی۔ گوکھلے نے 1913 میں اپنی نمایاں انکساری اور سیاسی سوجھ بوجھ سے اس بات کو واضح کیا تھا کہ کوئی بھی ہندستانی انڈین نیشنل کانگریس کو قائم نہیں کر سکتا تھا۔ اگر کوئی ہندستانی پورے ملک میں ایسی کوئی تحریک چلانے کے لیے آگے بڑھتا تو ملک کے حکمراں اس کو جود میں نہ آنے دیتے۔ اگر کانگریس کا بانی کوئی مشہور اور بڑا رٹائرڈ انگریز افسر نہ ہوتا تو ان دنوں سیاسی تحریک کے بارے میں ایسی بدگمانیاں پیدا ہوتیں کہ حکومت کو اس کے کچلنے کا کوئی نہ کوئی بہانہ مل ہی جاتا۔ دوسرے لفظوں میں اگر ہیوم اور دوسرے وسیع النظر انگریزوں نے کانگریس کا استعمال سیفٹی والو کے طور پر کرنا چاہا ہو تو کانگریسی رہنماؤں نے ان کا ساتھ اس امید پر دیا کہ ہیوم کانگریس کے لیے برق گش آلہ کے طور پر کام آئیں گے۔ حکومت کے ذریعہ کانگریس پر گرنے والی ظلم کی بجلی سے وہ اسے بچالیں گے۔ بعد کے حالات نے یہ بات ثابت بھی کر دی۔

5.6 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

1885 میں انڈین نیشنل کانگریس کا قیام ایک نئے دور کا آغاز تھا۔ یہ ہندوستانی عوام میں بڑھتی ہوئی قوم پرستی کی مظہر تھی۔ کچھ لوگوں کے مطابق کانگریس کی بنیاد ایک ہندوستانی قوم پرستی کے ابلتے ہوئے لاوے کو باہر نکالنے کے لیے سیفٹی والو کے طور پر کی گئی اور ایسا برطانوی حکومت اور اس کے افسران کی حمایت سے ہوا۔ اس کے لیے ہیوم کی سات جلدوں والی پر اسرار رپورٹ اور ومیش چندر بنرجی کے بیان کو بنیاد بنایا گیا۔ مزید تحقیق سے ثابت ہوا کہ ایسا نہیں تھا بلکہ کانگریس کا قیام اس وقت کے حالات کے تحت ہوا اور متعدد ابتدائی سیاسی انجمنوں نے اس کے لیے راہ ہموار کی۔ متعدد سیاسی رہنماؤں کی کوششوں سے ایک کل ہند سیاسی پلیٹ فارم کا قیام عمل میں آیا۔ اس میں تمام

علاقوں اور مذاہب کے لوگوں کو شامل کیا گیا۔ علاقائیت اور مذہبیت کو قطعاً درکنار کر کے اقلیتوں کے حقوق کی خصوصی رعایت کی گئی۔ ابتدائی دور میں کانگریس نے ایک انگریز کو برطانوی حکومت کے شک وشبہ کو کم کرنے کے لیے اپنا سرپرست منتخب کیا جب کہ ووميش چندر بنرجی اس کے پہلے اجلاس کے صدر بنے۔ ابتدائی دور میں کانگریس رہنما عرضداشتوں اور درخواستوں تک محدود رہے۔ انہوں نے برطانوی حکومت سے وفاداری کے ساتھ اپنی جائز مانگیں اٹھانے پر اکتفا کیا۔ حالانکہ ان کے اس طریقے پر ان کی تنقید کی گئی مگر اپنے مقاصد کے لحاظ سے قومی تحریک میں ان کی حصے داری سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ ایک معمولی سی شروعات سے انہوں نے اسے ایک باقاعدہ تحریک میں تبدیل کر دیا۔

5.7 کلیدی الفاظ (Keywords)

غلہ قانون مخالف تحریک	:	1838 میں انگلینڈ میں کوبڈن (Cobden) اور برائٹ (Bright) کے ذریعہ بنائی گئی انجمن جو غلہ قانون کی اصلاح کی ضامن تھی۔
سیفٹی والو نظریہ	:	اسے حفاظتی ڈھال نظریہ بھی کہتے ہیں۔ اس کے مطابق کانگریس کو برطانوی حکومت کے اشارے پر عوام کے قوم پرستی کے جوش کو پرسکون انداز سے نکالنے کے لیے بنایا گیا۔

5.8 نمونہ امتحانی سوالات (Model Exanimation Questions)

5.8.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. اے او ہیوم کون تھا؟
2. گوکل داس تیج پال سنسکرت کالج کہاں واقع ہے؟
3. کانگریس کے پہلے اجلاس میں کتنے لوگ تھے؟
4. ابتدا میں کانگریس کا کیا نام تجویز کیا گیا؟
5. ینگ انڈیا ہفتہ وار اخبار میں کس نے سیفٹی والو نظریے کو لے کر اعتدال پسندوں پر حملہ کیا؟
6. انڈیا ٹوڈے کس کی تحریر ہے؟
7. کانگریس کا پہلا اجلاس کہاں منعقد ہوا؟
8. *The Rise and Growth of the Congress* کس کی تصنیف ہے؟
9. ہیوم نے سات جلدوں والی رپورٹ کہاں پڑھی تھی؟
10. ویڈر برن نے کس کی سوانح حیات لکھی؟

5.8.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. سات جلدوں والی رپورٹ پر نوٹ لکھیے۔
2. سیفٹی والو نظریہ کے حق میں دوسری دلیل کے بارے میں بتائیے۔
3. پہلے اجلاس کے صدارتی خطاب پر نوٹ لکھیے۔
4. پہلے اجلاس کے مشارکین پر نوٹ لکھیے۔
5. پہلے اجلاس کی قرارداد پر نوٹ لکھیے۔

5.8.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. ابتدائی کانگریسی قیادت کا تنقیدی تجزیہ کیجیے۔
2. کانگریس کے قیام کے پس منظر پر ایک تفصیلی مضمون لکھیے۔
3. سیفٹی والو نظریہ پر تفصیلی طور پر روشنی ڈالیے۔

5.9 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Learning Resources)

1. Bandyopadhyay, Sekhar, *From Plassey to Partition*, Orient Longman, New Delhi, 2004.
2. Chandra, Bipan, et. al., *India's Struggle for Independence*, 1857-1947, Penguin Books, New Delhi, 1989.
3. Grover, B.L., *A Documentary Study of British Policy Towards Indian Nationalism, 1885–1909*, National Publications, Delhi, 1967.
4. Mehrotra, S.R, *Emergence of Indian National Congress*, Rupa Publications, Delhi, 2004.
5. Mukherjee, Amitabh, 'Genesis of the Indian National Congress', in *A Centenary History of the Indian National Congress* (*1885–1985*), General Editor, B.N. Pande, Academic Foundation, New Delhi, 1985, Vol.1: 1885–1919
6. Ranjan Ray, Nisith, et. al., *Concise History of the Indian National Congress, 1885–1947*, Vikas Publishing House, 2019.
7. Rag, Pankaj, 'Indian Nationalism 1885–1905: An Overview,' *Social Scientist*, Vol. 23, No. 4-6, 1995, pp. 69–97.
8. Tripathi, Amales, *Indian National Congress and the Struggle for Freedom, 1885–1947*, Oxford University Press, 2014.
9. Wedderburn, William, *Allan Octavian Hume, C.B., Father of the Indian National Congress, 1829 to 1912*, T.F. Unwin, London, 1913.

اکائی 6۔اعتدال پسند اور انتہا پسند

(Moderates and Extremists)

اکائی کے اجزا

6.0 تمہید

6.1 مقاصد

6.2 کانگریس کی ہیئت ترکیبی

6.3 اعتدال پسند قوم پرستی

6.3.1 اعتدال پسندوں کے طریقے

6.3.2 اعتدال پسندوں کی کامیابیاں

6.3.3 اعتدال پسندوں کی خامیاں

6.4 انتہا پسند قوم پرستی کے ابھرنے کے اسباب

6.4.1 اعتدال پسندوں کے طریقہ کار سے بیزاری

6.4.2 گروہ بندی

6.4.3 کرزن کی رجعت پسندانہ پالیسیاں اور تقسیم بنگال

6.5 انتہا پسند قوم پرستی کا ظہور

6.6 سورت کی تقسیم/سورت کی پھوٹ

6.7 منٹو مارلے اصطلاحات

6.8 سورت کی تقسیم کے بعد

6.9 ہوم رول لیگ

6.10 اکتسابی نتائج

6.11 نمونہ امتحانی سوالات

6.12 تجویز کردہ اکتسابی مواد

6.0 تمہید (Introduction)

ہندوستانی قومی تحریک قیادت اور طرز رسائی کے حوالے سے مختلف مراحل سے گزری۔انیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں سے لے کر، مختلف صوبائی تنظیموں (لینڈ ہولڈر سوسائٹی-1838، مدراس مہاجن سبھا-1884، پونا سارجنک سبھا-1870 وغیرہ) نے نوآبادیاتی ہندوستان کے مختلف حصوں میں رہنے والی عوام کی سیاسی و معاشی خواہشات کے اظہار کے لئے علاقائی فورم مہیا کئے تھے۔سیاسی طور پر باشعور اور تعلیم یافتہ ہندوستانیوں نے بالآخر ایک کل ہند فورم کے قیام کی ضرورت کو محسوس کیا۔ملک کے مختلف حصوں سے تعلق رکھنے والے تعلیم یافتہ ہندوستانیوں میں ایک ساتھ جڑنے، سرگرمیوں کے ایک عمومی پروگرام کو تیار کرنے اور وسیع پیمانے پر آزادی کی جدوجہد کے حصول کی ضرورت کے شعور میں اضافہ ہوتا گیا جس کے نتیجہ میں 1885 میں انڈین نیشنل کانگریس کا قیام عمل میں آیا۔انڈیل نیشنل کانگریس کے اہم مقاصد یہ تھے:

1. ملک کے مختلف حصّوں سے تعلق رکھنے والے سیاسی کارکنان کو ایک جگہ لانا۔
2. عوام میں قومی شعور کو فروغ دینا۔
3. عوام کو ملک کے مفاد میں عوامی رائے پر اثرانداز ہونا۔

انڈین نیشنل کانگریس کے قیام سے قومی تحریک منظم طور پر چلنے لگی۔قومی تحریک کو قیادت کے تین مرحلوں کے بطور دیکھا جاسکتا ہے جسے عام طور پر اعتدال پسند(1885تا1905)،انتہاپسند(1905تا1919)اور گاندھیائی(1920تا1947)مرحلے کہاجاتاہے۔

6.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- ابتدائی کانگریس کی ہیت اور کردار کو بیان کر سکیں گے۔
- کانگریس میں اعتدال پسندوں اور انتہاپسندوں کے ابھرنے کو جان سکیں گے۔
- اعتدال پسندوں اور انتہاپسندوں کے درمیان کون سے اختلافات تھے؟ بحث کر سکیں گے۔
- کس طرح اعتدال پسندوں اور انتہاپسندوں کے درمیان اختلافات نے کانگریس میں پھوٹ ڈالی، یہ جان سکیں گے۔
- قومی تحریک پر اس پھوٹ کے برے اثرات کا تجزیہ کر سکیں گے۔

6.2 کانگریس کی ہیئت ترکیبی (Composition of the Congress)

اعتدال پسند سیاست دانوں کا سماجی پس منظر یہ ظاہر کرتا ہے کہ ان میں زیادہ تر کا تعلق اثاثہ رکھنے والے طبقہ جیسے زمیندار، وکلاء اور تاجروں سے تھا۔وکلاء میں بھی زیادہ تر وہ لوگ تھے جو زمیندار گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے۔انڈین نیشنل کانگریس کی سنہ 1885 میں منعقد ہونے والی پہلی کانفرنس میں بہتر (72) غیر سرکاری ہندوستانی نمائندوں نے شرکت کی۔ یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ ان میں زیادہ تر لوگ

وکیلوں، تاجروں، بنک کاروں، زمیندار، طبیب، جرنلسٹ، ماہرین تعلیم، مذہبی اساتذہ اور مصلحتیں طبقات سے تعلق رکھنے والے لوگ تھے۔ابتدائی قوم پرستوں کا سماجی پس منظر یہ بھی ظاہر کرتا ہے کہ وہ لوگ انگریزی کے تعلیم یافتہ تھے جو اونچے عہدوں پر فائز تھے اور برطانوی خطابات کے حامل تھے۔

6.3 اعتدال پسند قوم پرستی (Moderate Nationalism, 1885-1905)

انڈین نیشنل کانگریس (INC) کے ابتدائی بیس سال کا پہلا مرحلہ تھا اور مؤرخین نے اسے اعتدال پسند قوم پرستی کا نام دیا ہے۔ اس دور کو اعتدال پسند اس لئے کہا جاتا ہے کہ کانگریس پر اس وقت ایسے لیڈروں کا غلبہ تھا جن کا جھکاؤ برطانوی اقتدار کی جانب تھا۔ یاد رہے کہ نو آبادیاتی ہندوستان کے مختلف حصوں سے تعلق رکھنے والے تعلیم یافتہ اور سیاسی طور پر باشعور دانشوروں نے مسائل کو اٹھانے کے لئے ایک عمومی سیاسی پلیٹ فارم کی ضرورت کو محسوس کر لیا تھا۔ اہم قائدین میں بنگال کے ڈبلیو۔ سی۔ بنرجی، رش بہاری گوش، سریندر ناتھ بنرجی، مہاراشٹرا سے دادا بھائی نوروجی، گوپال گوکھلے، فیروز شاہ مہتا، جسٹس راناڑے۔ اترپردیش سے پنڈت مدن موہن مالویہ، انگریز نژاد اے۔او۔ ہیوم اور ویڈر برن (Wedderburn) تھے۔

6.3.1 اعتدال پسندوں کے طریقے (Methods of the Moderates)

بیشتر اعتدال پسند انگریزی تعلیم یافتہ تھے اور اونچے طبقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ اعتدال پسندانہ قوم پرستی کے معاملہ میں اور خاص طور پر انگریزی تعلیم یافتہ دانشوروں کے درمیان تعلیم کا ایک اہم مقام تھا۔ آر۔ سی۔ دت کا لکھنا ہے کہ برطانوی دور حکومت میں مغربی تعلیم ہندوستان کو حاصل ہونے والی شاید بہت عظیم نعمت تھی۔ انگریزی تعلیم خاص طور پر اعلیٰ تعلیم کو محض مہارتوں کی منتقلی یا خواندگی کے طور پر ہی نہیں دیکھا جاتا تھا بلکہ اس کا دائرہ نہایت وسیع تھا۔ ہندوستان کی تخلیقِ نَو کو مؤرخین جیسے شیکھر بندیو پادھیائے بحث کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جب ہم انگریزی تعلیم کی ابتدا، ترقی اور اس کے اثرات پر نظر ڈالتے ہیں تو بہت سے لوگ اسے برطانوی راج کے محض ایک پہلو کے طور پر نہیں دیکھتے ہیں بلکہ انگریزی تعلیم کے متعارف ہونے کو برطانوی راج کے لیے ایک ضروری شرط قرار دیتے ہیں۔ نہ صرف تعلیم بلکہ 'قانون کی بالادستی' جس نے حاکموں کی من مانی، گورننس، نمائندگی کرنے والا ادارہ، آزادانہ پریس وغیرہ ایسی اہم خصوصیات تھیں جسے حاکموں اور قوم پرستوں دونوں نے نشاندہی کی۔

ان خصوصیات نے ابتدائی قوم پرست اور اعتدال پسند قائدین میں برطانوی راج کے تئیں اعتماد قائم کیا۔ برطانوی تاج کے تئیں نہایت وفادار جذبہ پیدا کیا۔ ان لوگوں کا یہ احساس تھا کہ برطانوی حکومت کو ختم کر دینے سے ہندوستان کا کوئی بھلا نہیں ہوگا۔ اس مرحلہ کے دوران کانگریس کا مطالبہ حکومت وقت سے رعایت حاصل کرنا تھا نا کہ برطانوی حکومت سے آزادی۔ اعتدال پسندوں کو برطانوی اقتدار پر مکمل بھروسہ تھا اور احتجاج کے لئے آئینی ذرائع کا استعمال کیا جاتا تھا۔ درخواستیں (Prayers)، عرضیاں (Petitions) اور اپیلیں اُس وقت کے طریقے تھے۔ اعتدال پسندوں کا ماننا تھا کہ برطانوی سامراج ہندوستان کے حقیقی حالات سے باخبر نہیں ہیں۔ لہٰذا برطانوی

حکومت کو درخواستوں اور عرضیوں کے ذریعے باخبر کرنے کی ہر ممکنہ کوشش کرنی چاہیے۔1860 کے بعد سے وہ بتدریج سماجی ترقی کی حقیقت سے غلط فہمی کا شکار ہو رہے تھے۔ان کا ماننا تھا کہ ہندوستانی غریب تھے اور روز بہ روز غریب تر ہو رہے تھے لہٰذا غربت ان کے احتجاج کا ایک اہم موضوع بن گیا۔ان کی سمجھ میں یہ آنے لگا کہ سامراجی حاکم دولت کے تحفظ کے بجائے آزادانہ تجارت اور بیرونی سرمایہ کاری کے ذریعہ کام کر رہے ہیں۔دادا بھائی نوروجی نے غربت کو اپنے دعویٰ کا مرکز بنایا۔

دادا بھائی نوروجی،یم جی راناڑے اور آر سی دت وہ دانشوران تھے جنہوں نے برطانوی سامراج کے معاشی تجزیہ کی تبلیغ کی۔جی وی جوشی، سبرامینہ ائیر،جی کے گوکھلے، پرتھوی چندر راؤ وہ دانشوران تھے جنہوں نے سامراجی استحصال کے ضمن میں مختلف معاشی تحقیقات انجام دیں۔1867ء میں دادا بھائی نوروجی کا پیش کردہ 'نظریہ نکاسی' (Drain Theory) تمام ابتدائی قوم پرستوں کی تنقید کا مرکز و محور تھا۔ان کا دعویٰ تھا کہ ہندوستان کا ایک کثیر سرمایہ سیول اور ملٹری افسران کی تنخواہوں اور پنشن کے ذریعہ باہر چلا جاتا ہے۔اس کے علاوہ ہندوستان کی حکومت کی جانب سے لیا جانے والا قرض، اندرونی اخراجات اور ہندوستانی سرکار کے برطانیہ میں ہونے والے اخراجات بھی اس معاشی نکاسی میں شامل ہیں۔ابتدائی قوم پرستوں کے اہم مسائل میں سے ایک اور مسئلہ یہ تھا کہ ہندوستانی روایتی دستکاری کو آہستہ آہستہ برباد کرتے ہوئے اس کو ختم کر دیا گیا۔اس ضمن میں سب سے بڑی رکاوٹ 'آزاد تجارت' (free trade) تھی۔جی وی جوشی اور یم جی راناڑے نے مختلف پہلوؤں پر تحقیقات کیں جیسے بیرونی تجارت۔ریلویز، ٹیرف(tariff)، کرنسی مبادلہ،مالیات،اور لیبر کی قانون سازی۔انہوں نے اس بات کی وکالت کی کہ جدید ٹکنالوجی اور سرمایہ کاری کے سبب ہندوستانی معیشت کی مکمل طور پر تخلیق نو ہو سکتی ہے اور یہ بھی کہا کہ اس معیشت کی بنیاد ہندوستانی سرمایہ پر ہو نہ کہ بیرونی سرمایہ پر۔وہ لوگ مغربی آزاد خیالی (Liberalism) سے متاثر تھے۔انہوں نے اپنے مختلف انتظامی ،سیاسی اور معاشی شعبوں سے متعلق مطالبات کو اٹھانے کے لئے احتجاج کے آئینی ذرائع کا استعمال کیا۔ شیکھر بندھو اپادھیائے نے اس ضمن میں چار کلیدی عناصر کی نشاندہی کی جس کی بنا پر انہیں اعتدال پسند کہا جا سکتا ہے۔وہ یہ ہیں

1. یہ ایسے قوم پرست تھے جنہوں نے واجب مطالبات اٹھائے۔
2. ان مطالبات کے اٹھائے جانے کے ذرائع بھی ابتدائی اعتدال پسندانہ تھے۔
3. اعتدال پسند قوم پرستی کی حکمت عملی کا سب سے اہم عنصر برطانوی حکومت سے وفاداری تھا۔
4. ہندوستانی غربت کو غیر معمولی طور پر اجاگر کرنا تھا۔

بپن چندرا نے اعتدال پسندوں کے سیاسی طریقہ کار کا اس طرح خلاصہ کیا۔'قانون کی چہار دیواری کے اندر آئینی احتجاج اور سست رفتار، ترتیب وار سیاسی ترقی،انہوں نے برطانوی سامراج کو جدیدیت لانے کا ذریعہ بھی سمجھا تھا۔'

آئینی مطالبات

انہوں نے درج ذیل آئینی مطالبات پیش کیے:

- کونسل مقننہ اور مجلس مقننہ کی توسیع

- مقامی باڈیز، چیمبر آف کامرس، یونیورسٹیوں وغیرہ سے چند ارکان کو شامل کرتے ہوئے ہندوستانیوں کی رکنیت میں اضافہ کرنا۔
- عوامی خزانہ پر کنٹرول رکھنا اور اس نعرہ کو بلند کیا 'No Taxation without Representation' (بغیر نمائندگی کے کوئی ٹیکس ادائیگی نہیں)۔
- آسٹریلیا اور کنیڈا کی طرز پر مرحلہ وار طریقہ پر خود کار حکومت (Self-Government) چلانا۔

معاشی مطالبات

- مال گزاری میں کمی اور کسانوں کو زمینداروں کے غیر منصفانہ مطالبات سے تحفظ۔
- فوج پر ہونے والے اخراجات میں کمی اور بچی ہوئی رقم کو صحت اور تعلیم جیسے فلاحی کاموں میں خرچ کرنا۔
- زرعی بنک کاری، آب پاشی، طبّی اور صحت کی سہولیات کی فراہمی۔
- تجارتی تحفظ کے ذریعے صنعتی ترقی۔ درآمد شدہ اشیاپر کثیر ٹیکس اور لوہے، کاغذ، کوئلہ اور شکر کی صنعتوں کی ترقی کے لیے قرضے۔

انتظامی مطالبات

- ہندوستان اور برطانیہ میں بہ ایک وقت انڈیل سیول سروس امتحانات کو منعقد کرتے ہوئے خدمات میں ہندوستانیت کو فروغ دینا۔
- عاملہ اور عدلیہ کی مکمل علاحدگی۔
- مقامی اداروں (میونسپل) کے اختیارات میں اضافہ اور ان پر سرکاری کنٹرول میں کمی کرنا۔
- امتیازی کردار کی وجہ سے اسلحہ ایکٹ (Arms Act) کو رد کرنا۔
- انتظامی خدمات میں ہندوستانیوں کو اعلیٰ عہدوں پر ملازمت دینا۔
- عوام میں تحتانوی تعلیم کو پھیلانا۔
- پولیس نظام کو بہتر، دیانت دار، مؤثر و مقبول بنانا۔

شہری حقوق کی مدافعت

- برطانوی حکومت کی جانب سے آزادی تقریر، اور پریس کی آزادی پر عائد تحدیدات کو ختم کرنا۔
- احتیاطی حراست ایکٹ (Preventive Detention Act) کو منسوخ کرنا اور فرد کی آزادی کو بحال کرنا۔
- انجمن بنانے کے حق کی بحالی۔

6.3.2 اعتدال پسندوں کی کامیابیاں (Achievements of the Moderates)

جیسا کہ اوپر بحث کی جاچکی ہے، اعتدال پسند لوگ برطانوی سامراج کے ظالمانہ طرز حکومت کے خلاف تھے۔ انہوں نے قومی سطح

کے ایک پلیٹ فارم کو تیار کیا تاکہ استحصال کرنے والی پالیسیوں کے خلاف اپنی آواز کو اٹھا سکیں اور ان پر بحث کر سکیں۔ جیسا کہ بپن چندرا نے کہا اپنی قوم پرستی کو جدید نوآبادیت کے پیچیدہ معاشی میکانزم، ہندوستانی عوام کی خواہشات اور برطانوی حکومت کے عمدہ سائنسی تجربات سے آراستہ کریں۔ اس سے وہ ہندوستانیوں میں ایک قومی شعور بیدار کرنا چاہتا تھا۔ انہوں نے نظریہ نکاسی (Drain Theory) کی وجہ سے آزاد تجارت کا مطالبہ کیا۔

6.3.3 اعتدال پسندوں کی خامیاں (Shortcomings of the Moderates)

اعتدال پسند قوم پرستوں نے قومی سطح پر ایک پلیٹ فارم بنایا جو اپنے آپ میں خود ایک بڑی کامیابی ہے۔ حالانکہ اُن میں پورا سیاسی شعور پیدا نہیں ہوا تھا۔ عام لوگوں کے تئیں ایقان کی کمی تھی۔ وہ ان کے ساتھ کام نہیں کر سکتے تھے اور ان کی جڑوں کو مضبوط نہیں کر پاتے تھے۔ وہ ان کی کمیوں کو دور کرنے میں ناکام رہے اور نوجوان نسل کو اس جانب متوجہ کرنے اور حالات کے ساتھ چلنے میں ناکام رہے۔ حالانکہ انہوں نے سودیشی تحریک میں تعاون دیا لیکن سوائے بنگال کے وہ سودیشی تحریک کے اہم قائدین نہیں تھے۔ وہ کسی بھی سیاسی اور معاشی اصلاح کی کوشش کرنے میں یقین رکھتے تھے۔ لیکن برطانوی حکمرانوں نے ان کی اس اعتدال پسندی کو اپنی توہین سمجھا اور ان کے احتجاج کو سختی سے دبایا۔ بالآخر 1907 سورت سیشن کے بعد اعتدال پسندوں کا کردار ختم ہو گیا۔

6.4 انتہا پسند قوم پرستی کے ابھرنے کے اسباب

(Causes for the Emergence of Extremist Nationalism)

6.4.1 اعتدال پسندوں کے طریقہ کار سے بیزاری (Discontent with the Methods of Moderates)

اعتدال پسند قومی لیڈروں کی رائے تھی کہ سیاسی آزادی بتدریج حاصل ہوگی۔ برطانوی حکومت کی برمحل فطرت پر ان کا یقین تھا اور وہ اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ نوآبادیاتی حکومت کہیں انہیں فتنہ انگیز قرار دے کر انہیں دبا نہ دیں۔ ان کی وفاداری اور اعتدال پسندانہ اور آئینی طریقوں سے اپنے مطالبات پیش کرنے کے باوجود انہیں جو کچھ بھی ملا وہ مایوسانہ تھا۔ لارڈ کراس (Lord Cross) کے ایکٹ یا انڈین کونسل ترمیمی ایکٹ 1892 ناکافی نہیں تھا۔ اس لئے کہ انہیں مرکز اور صوبوں دونوں کونسل مقننہ میں نہایت معمولی رکنیت کا اضافہ ہوا۔ کونسلوں کے قیام میں بھی الیکشن کے بجائے سلیکشن کو ذریعہ بنایا گیا۔ مقامی ادارے اپنے انہی نمائندوں کو بھیجتے تھے جنہیں مرکز پر گورنر اور صوبوں پر وائس رائے منتخب کرتے تھے لیکن یہ کہ انہیں ووٹ ڈالنے کا حق تھا۔ اپوزیشن کو کسی ریزیلوشن کو پیش کرنے کا حق نہیں تھا۔ اس ایکٹ کے ذریعے اعتدال پسندوں کے بہت کم مطالبات پورے ہوئے۔

اسی طرح اگر ہم نظم ونسق کے نظام کو دیکھتے ہیں تو وہاں بھی توقعات پوری نہیں ہوئیں۔ ان کا پہلا مطالبہ تھا خدمات (services) میں ہندوستانیت کو لانا تاکہ اُس سے وہ ہندوستانیوں کی ضروریات کو بہتر بنایا جائے۔ اُس دولت کی نکاسی پر روک لگائی جائے جو یوروپی افسروں کی سالانہ تنخواہ اور پنشن کے ذریعے ملک سے باہر جارہی تھی۔ یہ نسل پرستی کے خلاف ایک اہم قدم مانا جاسکتا تھا۔ جیسا کہ

انھوں نے ہندوستان اور لندن میں بہ یک وقت سیول سروس امتحانات منعقد کرنے اور ان امتحانات میں شرکت کے لئے حد عمر انیس(19)سال سے بڑھاکر تیئیس (23)سال کرنے کی مانگ کی لیکن حکومت نے اس کو پوری طرح منظور نہیں کیا۔حالانکہ چارلس ایچنسن (Charles Aitchison) کی جانب سے قائم ہونے والا پبلک سروس کمیشن نے اعلیٰ ترین حد عمر کو بڑھانے کی سفارش کی،لیکن بہ یک وقت امتحانات منعقد کرنے کورد کردیا۔چارلیس وڈ (Charles Wood) جوبورڈآف کنٹرول کے صدر تھے' نے اس وجہ سے اس کی مخالفت کی کہ ہندوستان میں کوئی ایسا ادارہ نہیں ہے جو لڑکوں کو امتحان کی ٹریننگ دے۔ 1992-93 میں ولیم گلاڈسٹون(William Gladstone) کی سرکردگی میں ایوان عام (The House of Commons) نے ایک قرار داد پاس کی جس کے تحت بہ یک وقت امتحانات منعقد کرنے کو منظور کرلیا گیا، لیکن سکریٹری آف اسٹیٹ نے اس کی مخالفت کی۔اُلٹا،امتحان کی اعلیٰ ترین حد عمر کومزید کم کردیا گیا۔یہ صورت حال اعتدال پسند قائدین کے توقعات کے برعکس تھی اور اسے ہندوستانیوں کے لئے نقصان دہ مانا گیا۔اس کے علاوہ فوج کے اخراجات بھی ایک ایسا مسئلہ تھا جہاں اعتدال پسندوں کے مطالبات پورے نہیں ہوئے۔برطانوی فوج کئی جنگوں میں ملوث تھی اور اس کے تمام تر اخراجات ہندوستانی مالیہ سے استعمال کئے جاتے تھے۔اس فوج میں ہندوستانیوں کو اونچے رینک سے محروم رکھا جاتا تھا اور انہیں زبردستی فوج میں بھرتی کرکے کم تر رینک دیے جاتے تھے۔اعتدال پسندوں کا مطالبہ تھا کہ فوج کے اخراجات میں برطانیہ اور ہندوستان دونوں ملکوں کا برابر کا حصہ ہو اور فوج میں ہندوستانیوں کی بھی شمولیت رضاکارانہ ہو نہ کہ جبر وزبردستی سے اور یہ کہ انہیں بھی اعلیٰ رینک دیے جائیں۔لیکن ان کے یہ تمام مطالبات بھی رد کردیے گئے۔

6.4.2 گروہ بندی (Grouping)

مؤرخین اس بات پر استدلال کرتے ہیں کہ قومی تحریک میں انتہا پسندی کے ابھرنے کی ایک اہم وجہ گروہ بندی بھی ہے۔ شیکھر بندھو یادیائے بیان کرتے ہیں کہ صدی کے اختتام تک ہندوستان میں عوامی زندگی کی ہر سطح پر گروہی لڑائی پائی گئی۔جیسے کہ برہمو سماج میں پھوٹ جو اعتدال پسند لیڈر سریندھر ناتھ بنرجی کی بنگالی اخبار *The Bangalee* اور موتی لال گھوش کی اخباری اشاعت *Amrit Bazar Patrika* کی مخلصانہ روشوں سے مزید بڑھ گئی۔وندے ماترم کی ادارت کولے کرار بندو گھوش اور دوسری جانب بپن چندر پال اور برہما بند ھاب کے درمیان کشاکشی تھی۔ مہاراشٹرا میں بھی پونا سرواجنک سبھا پر کنٹرول کولے کر جی کے۔گوکھلے اور یم۔جی۔راناڑے۔کے درمیان دعوے داری تھی۔اس کے علاوہ شیکھر بندھواپادھیائے کا کہنا تھا کہ اعتدال پسند قیادت میں کانگریس پر ایک غیر جمہوری دستور کی حکومت تھی اور بال گنگادھر تلک کی متعدد کوششوں کے نتیجہ میں ایک مسودہ تیار کیا گیا اور 1899 میں اسے منظور کیا گیا۔

6.4.3 کرزن کی رجعت پسندانہ پالیسیاں اور تقسیم بنگال

(Curzon's Reactionary Policies, and Partition of Bengal)

قوم پرست گروہوں کے درمیان مختلف قانونی،معاشی معاملات کولے کر بے چینی وبے اطمینانی پائی جاتی تھی جس کے سبب وہ ان

میں اصلاحات لانے کے خواہش مند تھے۔ کرزن کے نظم ونسق نے قوم پرستوں کے غصہ کو مزید بھڑکایا۔ لارڈ کرزن کے دور (1899 تا 1905) میں کئی تبدیلیاں لائی گئیں جن میں سے کچھ نے قوم پرستوں کے غصہ کو اور بھڑکایا۔ وہ تبدیلیاں اس طرح تھیں:

کلکتہ میونسپل ترمیمی ایکٹ 1899 کے ذریعے کلکتہ کارپوریشن کی تنظیم جدید کی گئی جس سے اس میں شامل منتخبہ نمائندوں کی تعداد گھٹ گئی۔ انڈین یونی ورسٹی ایکٹ 1904 نے کلکتہ یونیورسٹی کو مکمل طور پر حکومت کے قبضہ میں کر دیا، انڈین آفیشیل سیکرٹس امینڈمنٹ ایکٹ 1904 (Indian Official Secrets Act, 1904) نے پریس کی آزادی کو مزید محدود کر دیا۔ اس کے علاوہ 1905 میں وقوع پذیر تقسیم بنگال کا واقعہ، بنگالی قوم پرستوں کی طاقت کو کمزور کرنے کے مقصد سے کیا گیا جو کانگریس کی ترقی اور اس کی کارکردگی پر اپنی مضبوط پکڑ رکھتے تھے۔ 1901 کی مردم شماری نے ظاہر کیا کہ بنگال کی آبادی 78.5 ملین تک پہنچ چکی تھی۔ تقسیم بنگال سے یہ بات بخوبی ظاہر ہوتی تھی کہ نظم ونسق میں مؤثریت کے لئے یہ انتہائی ضروری قدم تھا۔ تقسیم بنگال کا سرکاری اعلان 19/جولائی کو کیا اور تین ماہ بعد 16/اکتوبر 1905 سے اسکا نفاذ ہوا۔ ڈیموگرافک خصوصیات کی بنا پر اس تقسیم نے کئی سوال کھڑے کیے۔ کیا تقسیم حقیقتاً نظم ونسق کی مؤثریت کے لئے کی گئی؟ مورخین جیسے شیکھر بندھوپادھیائے استدلال کرتے ہیں کہ اگر تقسیم خالصتاً نظم ونسق کی بنیاد پر کی گئی ہوتی تو حکومت کو چاہیے تھا کہ وہ متبادل تجاویز کو قبول کرلیتی جن میں زیادہ بہتر طور پر لسانی بنیاد پر تقسیم کے منصوبوں کو پیش کیا گیا تھا۔ ان منصوبوں پر عمل کیا جاتا تو بنگالی سیاستدانوں کے موقف کو مزید مستحکم کیا جاسکتا تھا۔ مؤرخین کا یہ بھی استدلال ہے کہ نوآبادیاتی بیوروکریسی کے اندر مخالف بنگالی احساسات، کرزن کے وائسرائے بننے سے قبل ہی پیدا ہو گئے تھے۔ تقسیم کا یہ عمل سیاسی طور پر طاقت ور کمیونٹی کو کمزور کرتا تھا۔ ہوم سکریٹری ہربرٹ رسلے (Herbert Risley) نے 7/فروری 1904 کے اپنے اس نوٹ میں بخوبی واضح کیا۔ 'متحدہ بنگال ایک طاقت ہے۔ بنگال کی تقسیم اس کو مختلف راستوں پر کھینچے گی۔ یہ پوری طرح صحیح ہے اور اسکیم کی یہ ایک اہم خوبی ہے۔'

6.5 انتہاپسند قوم پرستی کا ظہور (The Emergence of Extremist Nationalism)

1905 میں تقسیم بنگال نے قومی تحریک کے لئے ایک نئے راستہ ہموار کیا۔ سودیشی تحریک کے ذریعے سیاسی انتہاپسندی پر خاطر خواہ اثر پڑا تھا لیکن بنگال کی تقسیم نے سیاسی انتہا پسندی کو ایک مکمل شکل فراہم کی۔ سیاسی انتہا پسندی پر بحث کرتے ہوئے مورخ شیکھر بندیوپادھیائے کہتے ہیں کہ ہندوستان میں سیاسی انتہاپسندی انیسویں صدی کے دوسرے حصہ سے دیکھی جاسکتی ہے جو نہ صرف یہ کہ اعتدال پسندوں کی ناکامیوں کا ردعمل تھی بلکہ اس طرز فکر (Ideology) نے انڈین نیشنل کانگریس کی اعتدال پسندانہ سیاست کے شانہ بہ شانہ ثقافتی اور دانشوران کی تحریک کی آبیاری کی۔ 1887 میں نیشنل سوشیل کانفرنس پروگرام کا وجود نیشنل کانگریس کی اسی سوچ کا مظہر تھا۔ مزید یہ کہ 1903 میں تقسیم کے خلاف شروع ہونے والے احتجاج نے اس کو مزید مستحکم، منظم کیا۔

ابتداء میں نوآبادیاتی ہندوستان کے تین علاقے ایسے تھے جہاں انتہاپسند گروہ تھے اور جن کی آوازیں واضح طور پر سنائی دیتی تھیں وہ تھے بنگال، مہاراشٹرا اور پنجاب۔ مہاراشٹرا گروپ کے صدر بی جی تلک تھے۔ بنگال گروپ کی نمائندگی بی۔ سی۔ پال اور اربندو کرتے تھے اور

پنجاب گروپ کی قیادت لالہ لاجیت رائے کے ہاتھ میں تھی۔INC کے انتہا پسند لیڈران جیسے بال گنگال دھر تلک۔بپن پال، لالہ لاجیت رائے اور اربند گھوش نے نوآبادیاتی حکومت کے خلاف انقلاب سیاسی فکر کی آوازیں لگائیں۔اربند گوسوامی دیانند کی تعلیمات سے بہت زیادہ متاثر تھے جو کہ مغرب کی کسی بھی فکر سے اپنے آپ کو الگ تھلک رکھتے تھے۔بنگال کے انتہا پسند بنکم چندر چٹر جی، دیانند اور وویکانند کے خیالات سے بہت متاثر تھے۔ان کی فکری بنیاد اور فلسفہ نے انتہاپسندوں کو اپنے سیاسی پروگرام کو طے کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔

1905 کی تقسیم بنگال کے بعد وہ نمایاں ہوگئے۔ان کی انقلابی فکر اور پروگرام کو تقسیم بنگال کے خلاف تحریک کے دوران مقبولیت حاصل ہوئی۔ جسے ''سودیشی تحریک'' بھی کہا جاتا ہے۔ابتداً میں سودیشی تحریک کا مقصد تقسیم بنگال کی منسوخی تھا لیکن رفتہ رفتہ وہ ایک وسیع تر سماجی تحریک میں تبدیل ہوگئی۔مؤرخ سمیت سرکار نے بنگالی سودیشی تحریک کے چار رجحانات کی نشاندہی کی ہے جو اس طرح ہیں: اعتدال پسند رجحان، تعمیری سودیشی، سیاسی انتہاپسندی، اور باغیانہ دہشت گردی، سمیت سرکا استدلال کرتے ہیں کہ یہ تمام رجحانات کم و بیش اس پورے دور میں موجود رہے۔ان کے علٰحدہ دور کی واضح نشاندہی ممکن نہیں ہے۔

6.5.1 انتہاپسندوں کا طریقہ کار (Methods of Extremists)

انتہاپسندوں کی جانب سے اختیار کئے جانے والے طریقے مختلف مرحلوں سے گذرے یعنی تعمیری پروگرام سے لے کر دہشت گرد قوم پرستی تک۔اعتدال پسند سمجھتے تھے کہ خود کار حکومت (Self-Governance) کو بتدریج آنا چاہئے۔اس کے برعکس انتہا پسند خود انحصاری کے ذریعے 'سوراج' لانے میں یقین رکھتے تھے۔ شیکھر بندھوپادھیائے بیان کرتے ہیں کہ 'اگر ہم دستوری میدان پر نظر کریں تو پتہ چلتا ہے کہ اعتدال پسند سیاست دان برطانوی مملکت سے علاحدگی نہیں چاہتے تھے بلکہ ایک محدود خودکار حکومت کا حصول ہی ان کا مطالبہ تھا۔' وہ (شیکھر) کہتے ہیں کہ اعتدال پسندوں کا مطالبہ تھا کہ انڈیا کونسل کو منسوخ کردیا جائے جس کی وجہ سے سکریٹری آف اسٹیٹ کو ہندوستان میں آزادانہ پالیسیاں بنانے میں رکاوٹ ہورہی تھی، ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ مقننہ میں ہندوستانی نمائندگی کو وسعت دی جائے۔ مقامی اداروں، چیمبر آف کامرس، یونیورسٹیوں وغیرہ سے منتخب نمائندگی کو 50 فیصد تک بڑھایا جائے اور شمالی مغربی صوبوں اور پنجاب کے لئے نئے کونسل بنائے جائیں اور وائس رائے کی ایگزیکیٹو کونسل میں دو ہندوستانی ارکان اور بامبے اور مدراس کے ایگزیکیٹو کونسل میں سے ایک ایک منتخب رکن ہونا چاہئے۔ان کا مطالبہ یہ بھی تھا کہ ایوان عام کی اسٹانڈنگ کمیٹی کو حکومت کے خلاف اپیل کرنے کا حق بھی دیا جائے۔الغرض ان تمام کے ذریعے جمہوریت یا خودکار حکومت ان کا حصول نہیں تھا بلکہ ان کا مطالبہ صرف یہ تھا کہ ہندوستانی سماج کے تعلیم یافتہ ممبران کے لئے جمہوری حقوق حاصل کئے جائیں۔اس کے برعکس انتہاپسند قوم پرست قومی تحریک میں عوام کی فعال شمولیت پر یقین رکھتے تھے۔وہ عوام کو سوراج کے حصول کے لئے اکسانے اور فروغ دینے کا کام کررہے تھے۔ تلک کے ہاں سوراج کا مطلب تھا نظم و نسق پر ہندوستانیوں کا کنٹرول جبکہ بپن چندر پال کا ماننا تھا کہ برطانوی راج کے ہوتے ہوئے خودکار حکومت (Self-Governance) کا حصول ناممکن ہے لہٰذا ان کے لئے سوراج کا مطلب تھا ایسی خود مختاری جو برطانوی کنٹرول سے پوری طرح آزاد ہو۔ان کے پروگرام آف ایکشن کے تحت سرگرمیوں میں عوام کو متحد کرنا اور آزادی کے تئیں انہیں باشعور بنانا، ان میں خود احترامی کا جذبہ فروغ دینا اور ثقافتی اقدار کے تئیں ان

میں فخر کا احساس پیدا کرنا۔ مؤرخ بپن چندر اس سلسلے میں مزید وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ انتہا پسند قائدین عوام کے جذبے کو ابھارنے کے لئے مذہبی علامتوں کا استعمال کرتے تھے۔ حالانکہ انہوں نے سیاست کو کبھی بھی مذہب سے نہیں جوڑا، اور ان کے لئے "قوم" کا تصور ہندوستان کے تمام مذاہب کو شامل کرتا تھا۔ تلک اور لالہ لاجپت نے "دھرم" کو فروغ دیا جو یوں تو بظاہر ایک مذہبی اصلاح نظر آتی تھی لیکن اس اصطلاح سے ان کی مراد "ہمہ گیر اخلاقی قانون" تھا جس کے ذریعے ہندوستان کے تمام مذاہب اور کمیونٹیوں کے لوگ امن کے ساتھ باہم مل جل کر رہ سکیں۔

ابتدا میں انتہا پسندی کے ذرّات بنگال کی سرگرمیوں میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ وہاں کے ان انتہا پسندوں کا رجحان شروعات میں تعمیری پروگراموں کی طرف تھا جس میں روزمرہ ضروریات کی اشیا کو تیار کرنا، قومی تعلیم کو فروغ دینا، عدالتوں اور دینی تنظیم کا قیام وغیرہ شامل تھے۔ 1980 سے سودیشی اشیا کی فروخت کا دوکانات و نمائش کے ذریعے آغاز کیا گیا۔

1893 میں بنگال کیمیکل، ایک سودیشی انٹرپرائز کے بطور شروع کی گئی اور پھر 1901 میں پورسلین (Porcelain) تیار کرنے کی فیکٹری قائم ہوئی۔ اس طرح دیگر پروجکٹوں میں، 1895 میں بھگاوت جاؤسیتی کی شروع کردہ قومی تعلیمی تحریک، ستیش چندر مکھرجی کی ڈان سوسائٹی (1902-07)، برہمہ بندھو اپادھیائے کی ''سرسوت آیتن'' (Saraswat Ayatan) 1902 اور رابندر ناتھ ٹیگور کی شانتی نکیتن (1901) شامل ہیں۔ ان تمام تنظیموں کا زور اس بات پر تھا کہ سیاسی احتجاج سے قبل غیر سیاسی تعمیری پروگراموں یا خود استحکامی تحریک چلائی جائے۔ شیکھر بندیا اپادیائے بیان کرتے ہیں کہ چونکہ ہندو مذہب کو پورے ملک کے لئے اتحاد کے بندھن کے طور پر توقع کی جا رہی تھی۔ لٰہذا ہندو مذہب کے احیا کے تئیں بھی اہمیت دی گئی۔ اس تعمیری سودیشی تحریک میں رابندر ناتھ ٹیگور ایک اہم مبلغ کے بطور ابھرے۔ ان کے افکار (1901 تا 1906) ان کی تحریریوں میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ 1904 میں بنگال کی تقسیم کے بعد، قومی اسکولوں کے قیام اور 1906 میں بنگال نیشنل کالج اور اسکول کے قیام کے ساتھ قومی تعلیم کی تحریک آگے بڑھی۔

بنگال کی تقسیم کے بعد اور 1904 کے آس پاس اس رجحان پر سیاسی انتہا پسندوں جیسے اربندو گھوش، بپن چندر پال اور برہما بندھب اپادھیائے نے سخت تنقید کی۔ ان کی رائے تھی کہ آزادی کے بغیر قومی زندگی کا احیائے نو ممکن نہیں ہے۔ اور پھر 1904 کے بعد اس تحریک نے ایک نیا موڑ لیا۔ ان کی سرگرمیاں اور پروگرام محض تقسیم بنگال کی منسوخی تک محدود نہیں تھے بلکہ مکمل سوراج یا آزادی ان کا ہدف تھا۔ اور جیسا کہ شیکھر بندھو یادھیائے کہتے ہیں کہ ان معنوں میں اس تحریک کو کسی بھی طرح سے ایک محدود بنگالی ذیلی قوم پرستی کا اظہار قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس مرحلہ پر اس پروگرام میں چار چیزیں شامل تھیں:

- برطانوی اشیا اور اداروں کا بائیکاٹ کرنا
- ان کے مقامی متبادل کو فروغ دینا
- غیر منصفانہ قانون کی مخالفت کرنا

- برطانوی جبر وظلم کی پالیسیوں کی مخالفت

اس سیاسی پروگرام کے لئے عوام کی بڑے پیمانے پر شمولیت کی ضرورت تھی۔اربندو جیسے قائدین نے عوام تک پہنچنے کے لئے مذہب کا سہارا لیا۔لہٰذا مذہب کا احیاء نو اس نئی سیاست کی ایک خصوصیت تھی۔رفتہ رفتہ پر تشدد احتجاج بھڑکنے لگے۔ہندوستان میں 1857 کی بغاوت کے کچلنے کے بعد بھی سیاسی احتجاج میں تشدد کا ثقافت ہمیشہ زندہ تھا۔

6.6 سورت تقسیم (The Surat Split)

1905 تا 1907 کا دور عوامی بحث اور اعتدال پسندوں اور انتہا پسندوں کے درمیان عدم موافقت کا دور تھا، حالانکہ وہ دونوں تقسیم بنگال کے خلاف مل جل کر کام کررہے تھے۔اسی وقت یعنی 1906 کی ابتداء میں لارڈ منٹو (Lord Minto) جو حکومت ہند کے وائسرائے تھے اور جان مارلے (John Morley) جو سکریٹری آف اسٹیٹ تھے، ان دونوں نے لیجسلیٹیو کونسل میں کچھ نئے اصطلاحات پیش کیے۔اور پھر ان اصطلاحات پر کانگریس کی اعتدال پسند قیادت سے بات چیت کی۔اعتدال پسندوں نے حکومت سے تعاون کرنے اور اصلاحات پر بحث کرنے سے اتفاق کرلیا۔دوسری جانب حکومت عوام کی ایک مقبول تحریک کو کچلنے کی کوشش کررہی تھی۔اس کے نتیجہ میں قوم پرستوں کے اعلیٰ رینکوں میں پھوٹ پڑ گئی۔

تقسیم بنگال کے خلاف کانگریس کے دونوں گروپس، اعتدال پسند اور انتہا پسند کی جانب سے سودیشی تحریک کے ذریعے احتجاج کیا جارہا تھا لیکن دونوں کے طریقے جداگانہ تھے۔سودیشی تحریک کے بائیکاٹ والے قصہ کو اعتدال پسند محض بنگال تک محدود رکھنا چاہتے تھے۔اعتدال پسندوں کی سوچ یہ تھی کہ ہندوستان پر سیاسی اور حکومتی اختیار حاصل کرنے کا ان کا خواب ضرور شرمندہ تعبیر ہوگا لیکن اگر اس بیچ کوئی غیر ذمہ دارانہ عمل ہوجاتا ہے تو پورا معاملہ بگڑ سکتا ہے۔اعتدال پسند گروپ نوآبادیاتی سرکار کی توڑ جوڑ کی پس پردہ حکمت عملی کو دیکھ نہیں پارہی تھی۔دوسری طرف انتہا پسند یہ نہیں سمجھ رہے تھے کہ اعتدال پسند ان کے لئے فطری طور پر باہری ڈیفنس لائن ہے۔(شہری آزادی وغیرہ کے حوالے سے) 1906 میں کلکتہ سیشن کے دوران، اعتدال پسندوں اور انتہا پسندوں کے درمیان اختلافات مزید وسیع ہوگئے۔دونوں گروہوں نے اپنے نمائندے صدارت کے لئے پیش کئے لیکن دونوں گروہوں نے دادا بھائی نوروجی کو متفقہ طور پر صدارت کے لئے قبول کرلیا۔انتہا پسند گروپ سودیشی، قومی تعلیم اور بائیکاٹ جیسے اُمور پر قرارداد منظور کروانے میں بھی کامیاب ہوگیا لیکن اعتدال پسند گروپ 1906 میں کلکتہ سیشن میں پیش آئے حالات سے خوش نہیں تھا اور سورت سیشن میں وہ اس کو پلٹنا چاہتے تھے۔

1907 کے سورت سیشن میں، کانگریس کے قائدین دو گرہوں میں بٹ گئے۔اعتدال پسند اور انتہا پسند۔حالانکہ دونوں کے درمیان یہ تفریق بنارس سیشن (1905) میں اس وقت کھل کر ظاہر ہوچکی تھی جب تلک کی قیادت میں کچھ قوم پرست لوگوں نے اعتدال پسندوں کے طریقے 'غیر فعال مزاحمت' (Passive Resistance) کی مذمت کی۔ان کے درمیان اختلافات 1906 کے کلکتہ

سیشن کے دوران کانگریس کی صدارت کے مسئلہ پر اور گہرے ہو گئے۔انتہاپسند گروپ کو اعتدال پسندوں پر اعتماد نہیں تھا کیونکہ وہ منٹو مالے کونسل کے ساتھ جڑے تھے۔اس پھوٹ سے بچنے کے لئے کانگریس کے صدر کے طور پر دادا بھائی نوروجی کو چنا گیا کیونکہ وہ تمام قوم پرست گروہوں کے ایک قابل احترام قائد تھے اور ایک عظیم محب وطن تھے۔

اس سیشن میں چار امور پر یعنی سودیشی، بائیکات، قومی تعلیم اور خودکار حکومت، پر قراردادیں منظور ہوئیں۔لیکن دونوں گروہوں نے ان منظور کردہ قراردادوں کی تفہیم الگ الگ طرح سے کی۔1907 کے ختم ہوتے ہوتے،دونوں گروہ ایک دوسرے کو دشمن کی نظر سے دیکھنے لگے۔انتہاپسندوں کا یہ ایقان تھا کہ آزادی کی جنگ کی شروعات ہو چکی ہے اور اس جنگ کو اور زیادہ طاقتور بنانا چاہیے۔ان کا احساس تھا کہ اعتدال پسند اس تحریک کے لئے ایک بڑی رکاوٹ ثابت ہو رہے ہیں اور اب وقت آچکا ہے کہ اعتدال پسندوں کا ساتھ چھوڑ دینا چاہئے۔لیکن دونوں طرف کچھ ایسے سنجیدہ سیاست دان بھی تھے جو اس وقت عدم اتحاد کے خطرہ کو سمجھ چکے تھے۔ان میں تلک (انتہا پسند)اور گوکھلے(اعتدال پسند)شامل تھے۔

اعتدال پسندوں کا ایک سیکشن جس کی قیادت فیروز شاہ مہتا کر رہے تھے،اس پھوٹ / تقسیم کی حمایت کر رہا تھا۔ان کا احساس تھا کہ انتہاپسندوں کا ساتھ دینا،پر خطر پانی میں کودنے سے کم نہیں۔انہیں ڈر تھا کہ کانگریس آرگنائزیشن جو کہ پچھلے بیس سالوں میں بڑی احتیاط کے ساتھ بنائی گئی ہے وہ چکنا چور ہو جائے گی۔گوکھلے جیسے کچھ دوراندیش قائدین پھوٹ کے خطرات کو بھانپ چکے تھے اور وہ اس سے بچنا چاہتے تھے۔اکتوبر 1907 میں گوکھلے اپنے ایک دوست کو خط میں لکھتے ہیں۔"اگر پھوٹ ہوتی ہے تو یہ ایک بربادی ثابت ہوگی،کیونکہ پھر بیوروکریسی دونوں حصوں کو بغیر کسی مشکل کے ختم کر دے گی۔" انہوں نے برطانوی اشیا اور حکومتی اداروں کے بائیکاٹ کی بھی تبلیغ کی۔سیشن کے اختتام پر لوک مانیا تلک اور ان کے پیروکاروں نے ایک علیحدہ کانفرنس منعقد کی اور انتہاپسند پارٹی کے قیام کا اعلان کیا۔اس کے باوجود انہوں نے انڈین نیشنل کانگریس کے ایک حصہ کے بطور کام کرنے کا فیصلہ کیا۔

سورت میں،کانگریس کی صدارت کے لئے انتہاپسند گروپ نے اپنے نمائندہ کے طور پر لالہ لاجپت رائے کو پیش کیا اور دوسری جانب اعتدال پسند گروپ نے ڈاکٹر راس بہاری گوش کو پیش کیا۔اس ناخوشگوار صورت حال کو بچانے کے لیے لالہ لاجپت رائے نے صدارتی امیدوار سے سبکدوشی اختیار کی اور اس طرح ڈاکٹر رس بہاری گھوش صدر بن گئے۔اصل مصیبت اس وقت کھڑی ہوئی جب اعتدال پسندوں نے نافذ کردہ بائیکاٹ،سودیشی اور قومی تعلیم کی قراردادوں کو رد کر دیا۔اور یہ بات انتہاپسندوں کو قبول نہیں تھی۔اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کھلے طور پر جھڑپ شروع ہوگئی اور سیشن کو ملتوی کر دیا گیا۔اس کے بعد اعتدال پسندوں نے ایک علاحدہ کنونشن منعقد کیا جس میں انتہاپسندوں کو باہر کر دیا گیا اور اس طرح کانگریس میں مکمل طور پر پھوٹ پڑ گئی۔

یہ تقسیم مزید اس وقت گہری ہوئی جب مدراس سیشن کے دوران انڈین نیشنل کانگریس نے 1908 میں اپنے آئین میں تبدیلی لائی۔اس تبدیلی کے مطابق کانگریس کمیٹی کے اراکین کو محض کانگریس کمیٹی ہی منتخب نہیں کر سکتی تھی۔بلکہ کانگریس سے جڑی تنظیمیں بھی

اس عمل میں شامل ہوسکتی تھی اور نتیجتاً انتہا پسندوں کو کانگریس سے خارج کر دیا گیا۔ تلک اور ان کے پیروکار 1915 تک کانگریس سے باہر رہے۔ پھر 1915 میں جب صلح ہوئی تو وہ دوبارہ اس پارٹی میں شامل ہوگئے۔ سورت کی پھوٹ ہندوستان کی قومی تحریک میں ایک اہم موڑ تھا۔ اسکا مفہوم انتہا پسندوں کو اعتدال پسندوں پر سبقت حاصل کرنا تھا۔ 1909 کے منٹو مارلے اصلاحات کو سورت کی پھوٹ کا راست نتیجہ کہا جاسکتا ہے۔ اس پھوٹ سے دونوں گروپ بہت کمزور ہوئے۔ جہاں انتہا پسند گروہ کے لوگ افسروں کے جبر کا شکار ہوئے تو وہیں اعتدال پسندوں کو اپنے ہی لوگوں نے اکیلا چھوڑ دیا۔

6.7 منٹو مارلے اصلاحات (Minto-Morley Reforms)

دوسری طرف سے حکومت ہند کونسل مقننہ میں کچھ اصلاحات پیش کررہی تھی جس کی رو سے 1909 میں ایک نیا ایکٹ لایا گیا۔ کونسل کی صدارت لارڈ منٹو بحیثیت وائس رائے اور جان مارلے بحیثیت سکریٹری آف اسٹیٹ کررہے تھے۔ اس ایکٹ کو انڈین کونسل ایکٹ 1909 یا منٹو مارلے اصلاحات کہا جاتا ہے۔

اس ایکٹ کے تحت درج ذیل اصلاحات پیش کی گئیں۔

- ایک ہندوستانی کو گورنر جنرل کی ایگزیکیٹو کونسل کے رکن کے بطور تقرر کیا گیا۔
- امپیریل کونسل مقننہ کے جملہ اڑسٹھ (68) ارکان میں چھبیس (26) افسران تھے اور پانچ نامزد کردہ غیر افسران تھے۔
- ستائیس (27) منتخبہ ارکان میں سے چھ کو بڑے زمیندار منتخب کرتے تھے اور دو کو برطانوی سرمایہ کار منتخب کرتے تھے۔
- ارکان کو یہ اجازت حاصل تھی کہ وہ قراردادیں پیش کرسکیں اور کونسل میں سوالات اٹھا سکیں۔
- علیحدہ بجٹ مدّات پر رائے دہی کی بھی اجازت دی گئی تھی۔

باوجود اس کے اعتدال پسند اس ایکٹ کی اصلاحات سے ناخوش تھے۔ اصلاح شدہ کونسل سے کوئی حقیقی اختیار فراہم نہیں ہوا تھا اور ان کا موقف محض ایک مشاورتی ادارہ کا رہ گیا تھا۔ برطانوی راج کا غیر جمہوری اور آمرانہ کردار بہ دستور قائم رہا۔ شیکھر بندھوپادھیائے بیان کرتے ہیں کہ انتہا پسند اس بات کا یقین رکھتے تھے کہ منٹو مارلے اصلاحات اس لئے لائے گئے تاکہ تشدد کے امکانی عمل کو روکا جاسکے۔

6.8 سورت کی تقسیم کے بعد (After the Surat Split)

1907 کے اختتام پر سورت کی تقسیم کے بعد ایک نئے سیاسی رجحان کی راہ ہموار ہوئی۔ یعنی انقلابی دہشت گردی۔ بنگال کے چند بے صبر نوجوانوں نے عوام کو اس تحریک میں شامل ہونے پر زور دیا۔ افسران کی ہٹ دھرمی اور جبر سے مشتعل انہیں اپنی حب الوطنی کے اظہار کے لئے کوئی اور ذریعہ نظر نہیں آیا تھا لہٰذا وہ 'سیاست کے بم' کی جانب راغب ہوئے اور اس طرح انہوں نے انقلابی دہشت گردی کی راہ اختیار کی۔ اپریل 1908 میں پرافل چندر چاکی اور خودی رام بوس نے ایک ریل کے ڈبے پر بم پھینکا جس کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ اس ڈبے میں مظفرپور کے غیر مقبول جج 'کنگ فورڈ' سفر کررہے ہیں۔ اُلٹا اس سے دو انگریزی خواتین ہلاک ہوئی۔ اس واقعہ کے بعد پرفل چاکی نے خود کو

گولی مار کر ہلاک کر لیا جب کہ خودی رام بوس پر مقدمہ چلایا گیا اور انہیں پھانسی دی گئی۔

کئی ہزار لوگوں نے ان کی شہادت پر آنسو بہائے۔ بوس اور چاکی کا شمار قوم پرست بہادروں میں ہونے لگا جن پر لوگ گیت لکھے گئے اور تمام ملک میں انہیں گایا جانے لگا۔ یہ انقلابی دہشت گردی کی شروعات تھی۔ "انوسشیل"، یوگانتر" (Yugantar) اس دور میں قائم کی گئی انقلابی تنظیموں میں سے تھیں جو پورے ملک میں ابھرنے لگیں۔ یہ تنظیمیں جابر افسران کے قتل اور ڈاکوزنی جیسی سرگرمیوں کو انجام دینے لگیں تاکہ فنڈ اکٹھا کیا جا سکے۔ ان ''ڈاکوؤں'' کو عرف عام میں ''سودیشی ڈاکو'' کہا جاتا تھا۔ رش بہاری گھوش اور سچن لال کی قیادت میں لارڈ ہرڈنگ کو قتل کرنے کی کوشش، لندن میں مدن لال ڈھنگرا کا کرزن وائلی (Curzon Wylie) کا قتل، اس انقلابی دہشت گردی کی چند اہم سرگرمیاں تھیں۔ 1908 سے لے کر 1918 کے دوران 186 انقلابیوں کو مجرم قرار دیا گیا اور انہیں قتل کر دیا گیا۔ ایہ انقلابی دہشت گردی صرف ہندوستان تک ہی محدود نہیں تھی بلکہ بیرون ملک بھی ان انقلابیوں نے سرگرم حصہ لیا اور اپنے آپ کو مستحکم کیا۔ لندن میں وی ڈی ساور کر اور لالہ ہر دیال اور یوروپ میں میڈم کاما اور اجیت سنگھ بہت مشہور انقلابی تھے۔ بپن چندرا استدلال لکھتے ہیں کہ ان انقلابیوں میں غیر معمولی بہادری تھی لیکن ایک طاقتور نوآبادیاتی سامراج کے دباؤ کے آگے وہ ٹک نہ سکے کیونکہ ان میں ایک طاقتور عوامی بنیاد کا فقدان تھا اور وہ چھوٹے چھوٹے گروہوں میں تقسیم تھے۔ لیکن کم تعداد اور ناکامی کے باوجود انہوں نے ہندوستان کی قوم پرستی کے فروغ میں اپنا گرانقدر کردار ادا کیا۔

6.9 ہوم رول لیگ (Home Rule League)

1907 میں سورت میں منعقد ہونے والے کانگریس سیشن کے دوران انتہا پسندوں اور اعتدال پسندوں کے درمیان چار قراردادوں کو لے کر ایک تنازعہ کھڑا ہوا جو آگے چل کر غصہ، جوش اور تشدد میں تبدیل ہو گیا۔ جس ہال میں سیشن چل رہا تھا وہاں ان دونوں گروہوں کے درمیان تشدد روکنے کے لئے پولیس کو مداخلت کرنی پڑی۔ اس صورت حال کا فائدہ اٹھاتے ہوئے حکومت نے فی الفور ایکشن لیا اور انتہا پسندوں پر بڑے پیمانے پر حملے شروع کر دیئے۔ کچھ لیڈروں کو جیل بھیج دیا گیا اور چند کو انقلابی سازش کے کیس میں مجرم ثابت کیا گیا۔ تلک اور دیگر چند اہم قائدین کو چھ سال کے لئے جیل بھیج دیا گیا۔ اربندو اور ان کے ہم خیال ساتھیوں پر انقلابی سازش کا الزام عائد کیا گیا اور جب وہ بے قصور پائے گئے تو انہوں نے سیاست سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ بی سی پال نے سیاست سے کچھ عرصہ کے لئے بریک لے لیا اور لالہ لاجپت رائے نے جب اپنے آپ کو بے یار و مددگار پایا تو 1908 میں برطانیہ کے لئے روانہ ہو گئے اور 1909 میں واپس ہندوستان چلے آئے۔ مجموعی طور پر انتہا پسند اپنے آپ کو ایک مؤثر طریقے پر منظم نہیں کر پائے جس کا فائدہ سرکار کو ملا۔ دوسری جانب اعتدال پسند اور عوام انڈین کونسل ایکٹ 1909 کے ''آئینی اصلاحات'' سے سخت مایوس تھے۔ کئی اعتدال پسند لیڈران 1907 کے دوران کئے گئے فیصلوں سے ناخوش تھے۔ 16 جون 1914 کو چھ سال کی جیل کی سزا کے بعد بال گنگادھر تلک کو رہا کر دیا گیا۔ ان کا زیادہ تر عرصہ برما منڈالے کی جیل میں گزرا۔ رہائی کے بعد تلک نے اپنی تمام تر توجہ اپنی اور دیگر انتہا پسندوں کے کانگریس میں دوبارہ داخلہ کے لئے صرف کر دی۔

انی بسینٹ (Annie Besant)ایک آئرش شہری تھیں اور وہ آزادانہ سوچ(Free Thought)، بنیاد پرستی (Radicalism)، فیبونی اشتراکیت(Fabianism)اور وجدانی معرفت(Theosophy)کی تبلیغ کار تھیں ۔انہوں نے اپنا سیاسی سفر انگلینڈ سے شروع کیا تھا۔وہ 1893میں تھیوسوفیکل سوسائٹی کے قیام کے سلسلے میں ہندوستان آئیں۔ہندوستان آنے کے بعد وہ کانگریس میں شامل ہوئیں اور 1907سے وہ مدراس میں تھیوسوفیکل سوسائٹی کے پیغام کو پھیلانے لگیں۔تھوسوفیکل سوسائٹی کا ہیڈ کورٹر مدراس کے قریب کے ایک علاقہ اڈیار میں واقع تھا۔1914میں انہوں نے اپنی سرگرمیوں کو وسعت دینے کاارادہ کیااور آئرش ہوم رول لیگ کی طرز پر ہوم رول تحریک شروع کرنے کا فیصلہ کیا۔انہوں نے محسوس کیا کہ اس تحریک کو فروغ دینے کے لئے انہیں کانگریس کی اجازت اور انتہا پسند دونوں کی ضرورت ہے۔لٰہذا انہوں نے اعتدال پسندوں اور انتہا پسندوں کو باہم جوڑنے کے لئے اپنی وسیع تر کوششیں شروع کردیں۔وہ اعتدال پسندوں کوراغب کرنے لگیں کہ وہ کانگریس کے دروازے انتہا پسندوں کے لئے کھول دیں۔اسی دوران بال گنگادھر تلک جیل سے رہاہوئے اور اپنی سیاسی سرگرمیوں کا دوبارہ آغاز کرتے ہوئے اس بات کی کوشش میں لگے رہے کہ کسی طرح وہ کانگریس میں دوبارہ شامل ہوجائیں۔بال گنگادھر تلک اور انی بسینٹ کی مسلسل کوششیں ثمرآور ہوئیں۔کانگریس کے دسمبر 1951کے سالانہ اجلاس میں انتہا پسندوں کو دوبارہ کانگریس میں شامل ہونے کی اجازت دے دی گئی۔اس فیصلہ کی شروعات میں بمبئی کے اعتدال پسندوں نے مخالفت کی لیکن فیروز شاہ مہتا کے انتقال کے بعد یہ مخالفت ماند پڑگئی۔

کانگریس اور مسلم لیگ کے ساتھ کئی نااتفاقیوں کے باوجود تلک اور انی بسینٹ دونوں نے ہوم لیگ رول کو قائم کیا۔اپریل 1916میں بال گنگادھر تلک نے بمبئی کی صوبائی کانفرنس جو کہ بلگام میں منعقد ہوئی تھی ہوم رول لیگ کے قیام کا اعلان کیا۔اسی طرح ستمبر 1916میں انی بسینٹ نے اپنے تھیوسوفیکل پیروکار جارج ارون ڈیل(George Arundale)کے ہمراہ ہوم رول لیگ کا اعلان کیا۔بپن چندرا کے مطابق دونوں لیگوں نے کسی بھی آپسی ٹکراؤ سے اجتناب کیا اور اپنی اپنی سرگرمیوں کے دائرہ کو تقسیم کرلیا۔تلک کی لیگ مہاراشٹرا(بمبئی کو چھوڑکر)کرناٹک،مرکزی صوبہ اور برار میں کام کررہی تھی جب کہ انی بسینٹ کی لیگ کو ان علاقوں کے ماسوا پورے ہندوستان کی ذمہ داری سونپی گئی۔

تلک نے اپنے دوروں اور لکچروں کے ذریعے ہندوستان بھر میں ہوم رول کے مطالبہ کی صراحت کی اور اسے مقبول بنایا ان کا کہنا تھا کہ 'ہندوستان اس بیٹے کی مانند ہے جو اب بالغ ہوچکا ہے۔اب اس کے نگران کار یا باپ کو چاہیے کہ وہ اپنے بیٹے کے تمام واجب حقوق اس کے حوالے کردے۔' انہوں نے لسانی ریاست اور دیسی زبانوں میں تعلیم کا مطالبہ کیا جو وہ سوراج کے سوال سے جوڑتے تھے۔دسمبر 1916 میں انڈین نیشنل کانگریس کے لکھنو سیشن نے ہوم رول کے لیڈروں کو دیرینہ موقع فراہم کیا کہ وہ اپنی طاقت کا مظاہرہ کرسکیں۔اعتدال پسند صدر امبیکا چرن اور مجمدار نے تلک اور ان کے ساتھیوں کا کانگریس میں دوبارہ شامل ہونے پر استقبال کیا۔تقریباً دس سال تک ناخوشگوار تنازعات اور غلط فہمیوں کے بیابان میں بھٹکنے اور تکلیف دہ علاحدگی کے بعد ہندوستان کی قوم پرست پارٹی کی دونوں شاخوں نے اس حقیقت کو سمجھا کہ ''متحدہ ہوئے تو کھڑے پائیں گے اور اگر تقسیم ہوئے تو گرجائیں گے،اور آخر کار بھائیوں نے بھائیوں سے ملاقات کرلی۔''لکھنو سیشن

جس کو عام طور پر لکھنو معاہدہ کہا جاتا ہے' میں تلک اور انی بسینٹ دونوں نے کانگریس اور لیگ کے درمیان معاہدہ قائم کرنے میں بڑی کوششیں کیں جس کے لئے کانگریس کے کئی اہم قائدین بشمول مدن موہن مالویہ راضی نہیں تھے۔ لکھنو کانگریس نے خود کار حکومت کے قیام کے تئیں ایک اور قدم کے بطور مزید آئینی اصلاحات کا بھی مطالبہ کیا۔

6.10 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

اس اکائی کے مطالعہ کے بعد، آپ نے یہ سیکھا کہ اعتدال پسند اور انتہا پسندوں کے دونوں جانب اپنی طاقت، صلاحیتں اور کمزوریاں تھیں۔ مؤرخ بپن چندرا قومی تحریک میں دونوں کیمپوں کی ایک دوسرے کی طاقت کو دیکھنے کی نااہلی کو بیان کرتے ہیں۔ انہوں نے خلاصہ کرتے ہوئے کہا اعتدال پسند یہ نہیں دیکھ پاتے کہ نوآبادیاتی ریاست ان کی مقبولیت یا طاقت کی وجہ سے ان سے بات چیت کر رہی تھی بلکہ انہیں انتہا پسندوں کا خوف تھا۔ دوسری جانب، انتہا پسند بھی یہ نہیں سمجھ پارہے تھے کہ اعتدال پسند ان کے لئے فطری طور پر باہری حفاظتی خط ہے اور یہ کہ نوآبادیاتی ریاست کے جبر سے نمٹنے کے لئے انہیں ان کی طاقت درکار ہے۔

بپن چندرا نے اعتدال پسندوں کے سیاسی طریقہ کار کو آئینی احتجاج قانون کی مہیار دیواری کے اندر اور سست رفتار منظم سیاسی ترقی سے تعبیر کیا ہے۔ ان کے خیال میں انہیں عوام کے تئیں اعتماد کا فقدان تھا۔ وہ ان کے ساتھ اچھی طرح مل کر کام نہیں کر سکتے تھے۔ اور اپنی جڑوں کو مستحکم نہیں کر سکتے تھے۔ اعتدال پسند اور انتہا پسند دونوں متضاد نظریات رکھتے تھے۔ ان کے درمیان متضاد طریقوں اور نظریات کے باوجود جدوجہد آزادی کے ابتدائی مرحلہ میں ان کا کردار نہایت اہم ہے۔ اس کے علاوہ، ابتدائی ہندوستانی قوم پرستوں نے قومی تحریک کو آگے بڑھانے کے لئے ایک ٹھوس اور پائیدار بنیاد فراہم کی۔ انیسویں صدی کے آخر تک انہوں نے اپنے سیاسی مطالبات کو سیاسی اختیارات میں حصہ لینے تک ہی محدود رکھا۔ صرف 1905 کے بعد ہی بیشتر اہم قوم پرستوں نے خود کار حکومت قائم کرنے کے اپنے مطالبات آگے رکھے۔ اعتدال پسندوں کے برخلاف انتہا پسندوں کا لائحہ عمل خصوصی طور پر عوام کے اندر برطانوی سامراج کے خلاف احتجاج کا جذبہ پیدا کرنا اور احتجاج میں عوام کی شمولیت کو یقینی بنانا تھا۔ بہر حال ملکی مفاد کی خاطر آخر کار اعتدال پسندوں اور انتہا پسندوں کے درمیان کی خلیج کم ہوگئی، جس کے لئے بہت سارے حُب الوطن سیاست دانوں کا اہم کردار تھا۔

کلیدی الفاظ

احتیاطی حراست ایکٹ	:	(Preventive Detention Act) جس میں کسی فرد کو بغیر مقدمہ کے حراست میں رکھا جاتا ہے۔
سودیشی	:	مقامی اور گھریلو طور پر بنی چیزوں کا استعمال
خود کار حکومت	:	(Self-Government) جس میں اپنی حکومت اپنے ہاتھوں میں ہو۔

6.11 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

6.11.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. کون سے دور کو اعتدال پسند قوم پرستی کا دور قرار دیا جاتا ہے؟
2. سریندر ناتھ بنرجی کون تھے؟
3. کوئی پانچ انتہا پسند قائدین کے نام بتایئے؟
4. نیشنل سوشیل کانفرنس کب قائم ہوگی؟
5. نظریہ نکاسی (Drain Theory) کس نے پیش کی؟
6. امرت بازار پتریکا کے ایڈیٹر کون تھے؟
7. تقسیم بنگال کب رونما ہوا؟
8. منٹو مارلے اصطلاحات کب لائے گئے؟
9. یونی ورس ایکٹ کب منظور ہوا؟
10. انی بسینٹ کون تھیں؟

6.11.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. ابتدائی قوم پرستوں کے پیش کردہ برطانوی راج کی معاشی سیاست پر کیا تنقید تھی؟
2. انتہاپسندوں کا سیاسی پروگرام کیا تھا؟ اور مذہبی حیات نو میں ان کا کیا کردار تھا؟
3. سودیشی تحریک کی اہمیت پر بحث کیجیے۔
4. کانگریس میں پھوٹ کیوں پڑی؟
5. سورت کی تقسیم نے کس طرح قومی تحریک پر اثر ڈالا؟

6.11.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. 1885 تا 1905 کے دوران کانگریس کے اہم مطالبات کیا تھے؟
2. انتہاپسندوں کے ابھرنے کی فکری اساس کیا تھی؟
3. ہوم رول لیگ اور لکھنو معاہدہ کی اہمیت پر بحث کیجیے۔

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی
MAULANA AZAD NATIONAL URDU UNIVERSITY Estd. 1998

6.12 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Learning Resources)

1. Bandyopadhyay, Sekhar, *From Plassey to Partition*: *A History of Modern India*, Orient BlackSwan, New Delhi, 2012 (first pub. in 2004).
2. Chandra, Bipan, *Nationalism and Colonialism in Modern India*, Orient Longman, New Delhi, 2004 (first pub. in 1979).
3. Chandra, Bipan, *The Rise and Growth of Economic Nationalism in India*, Anamika Publishers, New Delhi, 2004 (first pub. in 1966).
4. Chandra, Bipan, *Essays on Indian Nationalism*, Har-Anand, New Delhi, 1993.
5. Sarkar, Sumit, *Modern India*, *1885–1947*, MacMillan, New Delhi, 1996 (first pub. in 1983).

اکائی 7۔انقلاب پسند

(Revolutionaries)

اکائی کے اجزا

7.0	تمہید
7.1	مقاصد
7.2	ابتدائی سرگرمیاں
7.3	انقلابی تحریک کے ظہور کا آغاز اور اس کے اسباب
7.4	انقلاب پسندی: پہلا مرحلہ
7.5	انقلاب پسندی کا دوسرا مرحلہ
7.5.1	شمالی ہندوستان میں انقلابی تحریک
7.5.2	ہندوستان سوشلسٹ ریپبلکن ایسوسی ایشن
7.5.3	شمالی ہند کی انقلابی تحریک میں نظریاتی پیشرفت
7.5.4	بھگت سنگھ اور ہندوستان سوشلسٹ ریپبلکن ایسوسی ایشن
7.6	بنگال میں انقلابی تحریک کی احیا
7.6.1	چٹاگونگ اسلحہ خانے پر حملہ
7.7	انقلابی تحریک کا زوال
7.8	اکتسابی نتائج
7.9	کلیدی الفاظ
7.10	نمونہ امتحانی سوالات
7.11	تجویز کردہ اکتسابی مواد

7.0 تمہید (Introduction)

ہندوستان میں تقسیم بنگال (1905)، سودیشی اور بائیکاٹ تحریک اور اعتدال پسند اور انتہا پسند رہنماؤں کے درمیان پھوٹ کے بعد عسکریت پسند قوم پرستی کے عروج کی وجہ سے انقلابی تحریک وجود میں آئی۔ انقلاب پسندوں نے انقلابی نظریات کو پھیلانے کے لیے متعدد طریقے جیسے ہندوستان اور بیرون ملک میں خفیہ تنظیموں کی تشکیل، کتابوں، کتابچوں اور رسالوں وغیرہ کا استعمال کیا۔ اپنے مقاصد کے حصول کے لئے اس تحریک نے بیسویں صدی کی پہلی تین دہائیوں کے دوران سیاسی تشدد کا استعمال کیا۔ نظریاتی طور پر، اس تشدد کی سیاست میں حصہ لینے والے سر گرم کارکن بنکیم چندر چٹرجی اور اربندو گھوش کے بنیاد پرست افکار سے متاثر تھے۔ ان کے خیالات نے نوجوانوں کو اس حد تک متاثر کیا کہ انہوں نے نوآبادیاتی حکومت کو طاقت کے بل بوتے پر ہندوستان سے باہر نکالنے کا عزم کیا۔ انقلاب پسندوں نے مختلف خفیہ تنظیموں جیسے جگانتر ('Jugantar') اور انوشیلن سمیتی ('Anushilan Samiti') قائم کیا۔ وہ سیاسی سر گرمیاں انتہائی پوشیدہ طور پر انجام دیتے تھے۔ اس تحریک کے دو اہم مراحل تھے۔ پہلے مرحلے میں (1905 سے 1918 تک)، انقلاب پسندوں نے بہت سے ریاستی اہلکاروں کو قتل کیا اور، جوابی کاروائی میں متعدد انقلابی کارکن مارے گئے۔ متعدد کارکنوں کو تعزیرات ہند کے تحت اسلحہ رکھنے کے جرم میں سزا سنائی گئی۔ ریاست کی طرف سے سخت جوابی اقدامات اور چوکسی کے نتیجے میں، انقلابی تحریک کا پہلا مرحلہ (1905-18) ظاہری طور پر ختم ہو گیا۔ بہتر سیاسی حالت اور آئینی اصلاحات سے رائے عامہ کو مطمئن کرنے کے خیال سے حکومت نے شاہی معافی نامہ کے تحت تمام سیاسی قیدیوں کو ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ (Defence of India Act) کے تحت رہا کر دیا۔ قید و بند سے رہا ہو کر متعدد انقلاب پسندوں نے تشدد کا راستہ ترک کر دیا اور انڈین نیشنل کانگریس اور کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا میں شامل ہو گئے۔ 1922 میں عدم تعاون تحریک کی ناکامی انقلابی تحریک کے دوسرے مرحلے کے احیاء کا سبب بن گئی۔ فروری 1922 میں عدم تعاون تحریک کی معطلی اور گاندھی کی قیادت سے عدم اطمینان نے انقلابی تحریک کے دوسرے مرحلے کو جنم دیا۔ اس مرحلے میں، انقلاب پسند کارکنوں نے انفرادی بہادری اور مذہبی قوم پرستی کو چھوڑ کر مسلح عوامی تحریک اور سیکولر حب الوطنی کو پسند کیا۔ اس مرحلے میں دو خطوں (پنجاب، یوپی، بہار اور مدھیہ پردیش؛ اور بنگال) کے انقلاب پسند سر گرم رہے۔ یہ مرحلہ بالآخر 1934 کے آس پاس سوریا سین کی پھانسی کے بعد ختم ہوا۔ اگرچہ انقلاب پسند مسلح بغاوت کے ذریعے حصول آزادی کے متعین مقصد کو حاصل کرنے میں ناکام رہے، لیکن پھر بھی وہ لوگوں کو بیدار کرنے، ان کے ذہنوں سے اقتدار کا خوف نکالنے اور حکمرانوں کے دلوں میں خوف پھیلانے میں کامیاب رہے۔ یہی انقلابیوں کی سب سے بڑی کامیابی تھی۔

7.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- سودیشی تحریک کے بعد ہندوستان میں ابھرنے والی انقلابی تحریک کی نوعیت کے بارے میں جان سکیں گے۔
- ان عوامل کی نشاندہی کر سکیں گے جس نے انقلابی تحریک کے ابھرنے میں خاصا اہم کردار ادا کیا۔

- ہندوستان میں انقلابی تحریک کی ابتدااور سے واقف ہو سکیں گے۔
- انقلابی تنظیموں کے مقاصداور نظریاتی تبدیلیوں کا تجربہ کر سکیں گے۔
- انقلابی تحریک کے زوال کے اسباب کا تنقیدی جائزہ کر سکیں گے۔

7.2 ابتدائی سر گرمیاں (Early Activities)

سیڈیشن کمیٹی رپورٹ (Sedition Committee Report) 1918 کے مطابق انقلابی تحریک کی پہلی علامتیں مہاراشٹر میں پونا کے چتپاون برہمنوں میں پائے گئے۔ یہ برہمن پیشواؤں کی نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ لارڈ ہاسٹنگز کے دور میں برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی نے پیشوا حکومت کو ختم کیا تھا۔ لیکن ان برہمنوں نے آزادی اور اقتدار میں واپسی کے لیے اپنی محبت اور عقیدت برقرار رکھی۔ آزادی کی حمایت اور برطانوی مخالف تحریک پیدا کرنے کے لئے بال گنگادھر تلک نے مہاراشٹر کی سیاست میں 1893 میں گنپتی تہوار اور 1895 میں شیواجی تہوار کا آغاز کیا۔

اگرچہ انقلابی تحریک 08–1907 کے بعد ایک حقیقی قوت بن چکی تھی، لیکن اس سے پہلے بھی کچھ انقلابی سر گرمیاں واقع ہوئیں تھیں۔ 1892 میں اربندو گھوش نے انڈین نیشنل کانگریس پر مضامین کا ایک سلسلہ لکھ کر خود کو ادبی اور سیاسی جذبوں کے لیے وقف کر دیا۔ انہوں نے بمبئی کے ہفتہ وار اخبار 'اندوپرکاش' میں "New Lamps for Old" کے عنوان سے مضامین لکھ کر اپنے قوم پرستانہ نقطہ نظر سے کانگریس پر تنقید کی۔ فرانسیسی اور آئرش انقلابیوں سے متاثر ہو کر، گھوش نے برطانوی حکومت کی مخالفت شروع کر دی۔ راناڈے نے جو اس ہفت وار جریدے کے سابق ایڈیٹر تھے خدشہ ظاہر کیا کہ حکومت کی طرف سے ان پر غداری کا الزام عائد ہو سکتا ہے۔ تاہم، ان مضامین کے ذریعے مغربی تعلیم یافتہ نوجوانوں جیسے لالہ لاجپت رائے، بال گنگادھر تلک اور بپن چندر پال میں مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی مہاراشٹر میں انتہاپسندی ایک غالب رجحان کے طور پر سامنے آئی۔ جب تقسیم بنگال کا منصوبہ عام ہوا تو تلک، لاجپت رائے اور پال نے اس کی مخالفت کی اور خفیہ تنظیموں کے قیام کے لیے اربندو کا کھل کر ساتھ دیا۔

سودیشی تحریک نے بنگالیوں میں سیاسی بیداری پیدا کی۔ اس تحریک نے اربندو کے خیالات کو مشتہر کرنے کا ایک شاندار موقع بھی فراہم کیا۔ بروڈہ میں قیام کے دوران، انہوں نے مہاراشٹر کے سیاسی کارکنوں اور بمبئی پریزیڈنسی کے انقلاب پسندوں سے رابطہ قائم کیا تھا، اور اپنے بھائی بریندر کمار گھوش کو انقلابی تحریک منظم کرنے کے لیے بنگال بھیجا تھا۔ اپنے کتابچے *New Lamps for Old* میں انہوں نے امیر اور غریب کے درمیان بڑھتے ہوئے خلیج اور نچلے طبقے کے ہاتھوں انقلاب کے ظہور کی بات کی ہے۔ 1890 کی دہائی کے دوران، تلک نے اپنے جرائد کیسری (*Kesari*) اور مہراتا (*Maharatta*) کے ذریعے گنپتی اور شیواجی تہواروں، تشدد کا استعمال اور عسکریت پسند قوم پرستی کے جذبے کا پرچار کیا۔ پہلا سیاسی قتل پونہ میں 22 جون 1897 کو ان کے دو شاگردوں دامودر چاپیکر اور بال کرشن چاپیکر نے کیا تھا۔ حملے کا ہدف پونا میں طاعون کمیٹی (Plague Committee) کے صدر رینڈ تھے، لیکن لیفٹیننٹ آئرسٹ کو حادثاتی طور پر گولی

لگ گئی۔ چاپیکر برادران کو مجرم قرار دے کر پھانسی دے دی گئی۔ وی۔ ڈی۔ ساور کر اور گنیش ساور کر نے ناسک میں گنپتی تہوار پر اشتعال انگیز ترانے لکھے۔ اگرچہ گنپتی تہوار براہ راست انقلابی تحریک سے منسلک نہیں تھا، لیکن انہوں نے انقلابی خیالات کو پھیلانے کے لئے ان تہواروں کا استعمال کیا۔ وی ڈی ساور کر اور ان کے بھائی گنیش ساور کر نے 'متر میلا'('Mitramela')ایک خفیہ تنظیم قائم کی، جسے 1904 میں 'ابھینو بھارت'('Abhinav Bharat')میں ضم کر دیا گیا۔ جلد ہی ناسک، پونا اور بمبئی میں بم بنانے کے مراکز قائم کئے گئے۔ متعدد اخبارات جیسے سندھیا یوگانتر، بندے ماترم اور کال نے قومی اتحاد، اقتصادی ترقی، سماجی اصلاح اور سیاسی آزادی کے بارے میں لکھنا شروع کیا۔ 1905 میں، شیام جی کرشن ورما نے ہوم رول سوسائٹی (Home Rule Society) قائم کی، جسے انڈیا ہاؤس (India House)کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ انہوں نے اپنے مقصد کی حمایت کے لیے ایک ماہانہ جریدہ *The Indian Sociologist* بھی شروع کیا۔ بہت جلد انڈیا ہاؤس لندن میں ہندوستانی سرگرمیوں کا مرکز بن گیا۔ متعدد ہندوستانی انقلاب پسند لوگ جیسے وی۔ ڈی۔ ساور کر، لالہ ہر دیال اور مدن لال ڈھنگرا انڈیا ہاؤس کے سرگرم کارکن بن گئے۔

7.3 انقلابی تحریک کا آغاز اور اس کے اسباب

(Causes for the Rise of Revolutionary Nationalist Movement)

انقلابی تحریک سیاسی عمل کی ایسی شکل تھی جسے انتہائی قوم پرست نوجوانوں کی ایک نسل نے اپنایا جن کی تخلیقی توانائیاں موجودہ اعتدال پسند سیاسی رجحانات میں اپنی مناسب جگہ تلاش کرنے میں ناکام رہیں۔ انتہا پسندوں کی تنقید نے اعتدال پسند رہنماؤں کو اس بات کا قائل کیا تھا کہ عرضیوں اور معقول دلیلوں کے ذریعے برطانوی حکمرانوں کو تبدیل کرنے کی کوشش ایک فضول عمل ہے۔ انہوں نے اس امید اور یقین کے ساتھ سودیشی تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا کہ بائیکاٹ اور غیر متشدد مزاحمت(Passive Resistance) کے ذریعے اشرافیہ طبقے کے علاوہ عام لوگوں کو بھی تحریک میں شامل کیا جائے۔ لیکن سودیشی تحریک عوام کے وسیع طبقہ کو متحرک کرنے میں ناکام رہی۔ تاہم، یہ ناکامی تقریباً ناگزیر، حتمی اور ناقابل ترمیم تھی، کیونکہ یہ تحریک بڑے پیمانے پر متحرک ہونے کی پہلی تحریک تھی۔ اس کے علاوہ، اس تحریک کے رہنما اور لوگ اس میں اپنائے گئے طریقوں سے ناواقف تھے۔ اس سے نوجوانوں میں بے صبری پیدا ہو گئی، اور انہوں نے لوگوں کو بیدار کرنے کے لیے نئے طریقے کھوجنے شروع کیے۔

سودیشی تحریک پر قابو پانے کے لئے برطانوی حکومت نے لوگوں پر بہت مظالم ڈھائے۔ مثال کے طور پر پولیس نے 27 اپریل 1906 کو باریسل پولیٹیکل کانفرنس میں پرامن ہجوم پر حملہ کیا، جس کی وجہ سے قومی اخبار 'جگانتر'('Jugantar')نے یہ اعلان کیا کہ "اس کا جواب عوام کے پاس ہے۔ ہندوستان میں بسنے والے 30 کروڑ عوام کو ظلم کی اس لعنت سے بچنے کے لئے اپنے 60 کروڑ ہاتھ اٹھانے چاہئے، تاکہ طاقت کے ذریعے طاقت کو روکا جائے۔" 1907 کے سورت اجلاس میں اعتدال پسندوں اور انتہا پسندوں کے درمیان ہوئی تقسیم سے بھی حکومت کے جبر میں اضافہ ہوا۔ اعتدال پسندوں کو آئینی اصلاحات کے وعدوں سے لبھاتے ہوئے، حکومت نے انتہا پسندوں پر ہمہ

وقت حملے شروع کیے۔ تلک کو برما میں چھ سال کی جلاوطنی کی سزا سنائی گئی، اور اربندو گھوش کو انقلابی سازش کے مقدمے میں گرفتار کیا گیا۔ اس عرصے کے دوران قوم پرست نوجوانوں کی ایک پوری نسل، خاص طور پر بنگال میں، ریاستی جبر اور تشدد کے حامل کا شکار ہوئی۔ حکومت سے فوری مراعات حاصل کرنے اور عوام کو متحرک کرنے کے لیے، انقلابی نظریات نوجوان اعتدال پسندوں کے طریقہ کار پر اعتماد کھو چکے تھے اور انتہا پسندوں کی سیاسی بصیرت اور پالیسی سے نالاں تھے۔

عسکریت پسند قوم پرست رہنما عوام کو مثبت قیادت دلانے میں بھی ناکام رہے۔ وہ انقلابی تحریک کو ایک مضبوط تنظیم بنانے میں بھی ناکام رہے۔ انہوں نے لوگوں کو بیدار کیا لیکن یہ نہیں جانتے تھے کہ لوگوں کی نئی توانائیوں کو کس طرح استعمال کیا جائے۔ اگرچہ وہ اپنے قوم پرست عقائد میں بنیاد پرست تھے، لیکن عملی طور پر آئینی طرز کے حامی تھے۔ وہ ملک کے حقیقی عوام یعنی کسانوں تک پہنچنے میں بھی ناکام رہے۔ ان کی تحریک شہری نچلے اور متوسط طبقے تک ہی محدود رہی۔ ظاہر ہے کہ حکومت کو انہیں دبانے میں کافی حد تک کامیابی ہوئی۔ یہ تحریک تلک کی گرفتاری اور بپن چندر پال اور اروبندو گھوس کی سیاست سے سبکدوشی کے بعد باقی نہ رہ سکی، لیکن قوم پرست جذبات کی لہر بھی قائم ودائم رکھی۔ لوگ صدیوں کی نیند سے بیدار ہو چکے تھے۔ انہوں نے سیاست میں جرات مندانہ اور بے خوف رویہ اختیار کرنا سیکھ لیا تھا۔ اب وہ ایک نئی تحریک کے ابھرنے کا انتظار کر رہے تھے۔

دوسرے مرحلے کے حوالے سے، عدم تعاون تحریک کی ناکامی اور قوم پرست منظر نامے پر آنے والی اداسی نے ایک بار پھر ایسے حالات پیدا کر دیے جو جرات مندانہ اور انقلابی سرگرمیوں کا مطالبہ کر رہے تھے۔ بنگال میں پرانی انوشیلن اور یوگانتر سمیتی دوبارہ نمودار ہوئیں اور شمالی ہندوستان کے تقریباً تمام اہم شہروں میں انقلابی تنظیمیں وجود میں آئیں۔ چنانچہ اکتوبر 1924 میں ہندوستان کے تمام علاقوں کے انقلاب پسند رہنماؤں کی ایک نشست کانپور میں بلائی گئی۔ اس نشست میں سچندر راسانیال، جوگیش چندر چڑجی، رام پرساد بسمل، بگھت سنگھ، شیو ورما، سکھ دیو، بگوتی چرن ووہرا اور چندر شیکھر آزاد جیسے انقلاب پسند کارکنوں نے شرکت کی۔ اس نشست میں گفت وشید کے نتیجے میں ہندوستان ریپبلکن ایسوسی ایشن کا قیام عمل میں آیا۔ اسے ستمبر 1928 میں ہندوستان سوشلسٹ ریپبلکن ایسوسی ایشن کے طور پر دوبارہ منظم کیا گیا۔ جس نے آزادی کے جنگ میں نمایاں کردار ادا کیا۔

اس نوجوان نسل نے انفرادی بہادری یا انقلابی عمل کے راستے کو پسند کیا۔ یہ راستہ ان سے پہلے آئرش قوم پرستوں اور روسی عصبیت پسندوں (Nihilists) نے اختیار کیا تھا۔ لہذا، برطانوی سامراج کا تختہ الٹنے کے لیے انہوں نے وہ راستہ اختیار کیا جس کے ذریعے غیر مقبول برطانوی افسروں کا قتل کیا جاتا تھا۔ اس طریق کار کے ذریعے انقلاب پسند چاہتے تھے کہ:

- سرکاری اداروں میں خوف پیدا کیا جائے۔
- لوگوں کے اندر خوف، جمود اور غیر عملیت دور کیا جائے۔
- اور لوگوں کے قوم پرست شعور کو بیدار کیا جائے۔

7.4 انقلاب پسندی: پہلا مرحلہ (Revolutionism: The First Phase, 1905–1918)

انقلاب پسندی کی سرگرمیاں اعتدال پسند قوم پرستی کی نشوونما کے نتیجے میں شروع ہوئی۔ اس کا پہلا مرحلہ سودیشی اور بائیکاٹ تحریک کے بعد شروع ہوا، اور 1918 تک جاری رہا۔ بنگال کے نوجوان ریاستی ظلم اور تشدد سے نالاں تھے اور غیر ملکی حکمرانی کو ناپسند کرتے تھے۔ انہوں نے پرامن احتجاج اور سیاسی کارروائی کے تمام راستے مسدود پایا اور مایوسی کی وجہ سے وہ تشدد کے راستے پر عمل پیرا ہو گئے۔ انہیں اس کا ہرگز یقین نہیں تھا کہ بغیر متشدد مزاحمت کے قوم پرست مقاصد حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ لہذا، ان کا ماننا تھا کہ انگریزوں کو ہندوستان سے زبردستی ہی باہر نکالا جا سکتا ہے۔ انہوں نے روسی عصبیت پسندوں (Nihilists) اور آئرش قوم پرستوں کے نقش قدم پر چلنے کا انتخاب کیا۔ ان کی انفرادی سرگرم کارروائیوں میں غیر مقبول افسروں، غداروں اور مخبروں کا قتل، انقلابی سرگرمیوں کے لیے سودیشی ڈکیتیوں کو انجام دینا، سازشوں کے ذریعے برطانیہ کے دشمنوں سے مدد کی توقع کرنا، وغیرہ شامل تھیں۔ ان کا ماننا تھا کہ غیر ملکی حکمت سیاسی آزادی، مذہبی آزادی، اخلاقیات اور ہندوستانی ثقافت کے لئے نقصان دہ ہے۔ اگرچہ انقلابیوں کے سیاسی فلسفے کی نشاندہی کرنا مشکل ہے لیکن ان کا ایک مشترکہ مقصد یہ تھا کہ کس طرح برطانوی راج سے مادر وطن کو آزادی کیا جائے۔

1906 کے اواخر میں، انوشیلن سمیتی کے ارکان نے مشرقی بنگال کے غیر مقبول لیفٹیننٹ گورنر کو قتل کرنے کی ناکام کوشش کی۔ کوشش ناکام ہونے کے بعد، ہیم چندر قانونگو فوجی اور سیاسی تربیت حاصل کرنے کے لیے بیرون ملک چلے گئے۔ ہیم چندر قانونگو انقلاب پسندوں کی پہلی نسل میں سب سے نمایاں شخصیت تھی۔ جنوری 1908 میں ان کی واپسی پر کلکتہ کے مضافاتی علاقے مانیک تالا میں ایک بم فیکٹری اور ایک مذہبی ادارہ قائم کیا گیا۔

یہ مرحلہ اس وقت شروع ہوتا ہے جب 11 اپریل 1908 کو چندرنا گور کے صدر بلدیہ (Mayor) کے گھر میں بم پھینکا گیا۔ اس کے بعد، اسی مہینے کی 30 تاریخ کو خودی رام بوس اور پرفل چاکی نے ایک گاڑی میں بم پھینکا جس میں ان کا خیال تھا کہ مظفرپور کے غیر مقبول ڈسٹرکٹ جج پریزیڈنسی مجسٹریٹ کنگس فورڈ سفر کر رہے ہیں۔ لیکن بدقسمتی سے اس گاڑی میں دو برطانوی خواتین سوار تھیں جو غیر ارادی طور سے ہلاک ہو گئیں۔ پرفل چاکی نے گرفتار ہونے کے بجائے خود کو گولی مار لی، لیکن خودی رام بوس کو گرفتار کر کے پھانسی دے دی گئی۔ دہشت گردی کے نتیجے میں اربندو گھوش اور انکے بھائی برندرا کمار گھوش کے ساتھ مانیک تالا بم فیکٹری سے منسلک پورے گروہ کو پکڑ لیا گیا۔ اس معاملے میں اربندو کا دفاع چترنجن داس نے کیا لیکن ان کے بھائی باریندر کمار گھوش اور بہت سے دوسرے لوگوں کو جلاوطنی اور قید کی سزا سنائی گئی۔ انقلاب پسندی کی تحریک نے متعدد بنگالیوں کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ خودی رام بوس کی پھانسی کو لوک گیتوں میں امر کر دیا گیا اور ان جوانوں کی بے لوث حب الوطنی اور قربانی کے جذبے کو ادب اور گیتوں میں عزت کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ 1908 میں، انقلاب پسندوں نے چندہ جمع کرنے کے لیے 'ڈھاکہ انوشیلن' کے ذریعے پلن داس کی قیادت میں برہ (Barrah) زمیندار کے گھر پہ ڈاکہ ڈالا۔ اس سمیتی نے ان دولت مند تاجروں کے گھروں میں انقلابی ڈکیتیاں ڈالیں جنہوں نے بائیکاٹ تحریک پر توجہ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ 1909 میں، اے۔ ایم۔

ٹی۔ جیکسن (ناسک کے کلکٹر اور ہند شناسی [Indology] کے مشہور دانشور) کو 'ابھینو بھارت' کے رکن اننت لکشمن کانہری نے مار ڈالا۔ 1909 میں، ایک سرکاری ملازم (public prosecutor) کو کلکتہ میں گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا۔ فروری 1910 میں، ایک ڈپٹی سپر نٹنڈنٹ آف پولیس کو کلکتہ ہائی کورٹ سے رخصت ہوتے وقت جان سے مار دیا گیا۔ 1912 میں، راس بہاری بوس اور سچن سانیال نے چاندنی چوک دہلی میں ایک ریاستی جلوس میں ہاتھی پر سوار وائسرائے لارڈ ہارڈنگ پر بم پھینکا۔ اس حملے میں وائسرائے زخمی ہو گئے، جبکہ ان کے ساتھی زخموں کی تاب نہ لا کر چل بسے۔ قاتلانہ حملے کے بعد ہونے والی تحقیقات نے دہلی سازش کا مقدمہ چلایا۔ مقدمے کے اختتام پر، بسنت کمار بسواس، امیر چند اور اودھ بہاری کو مجرم ٹھہرایا گیا، اور پھانسی دے دی گئی۔ راس بہاری بوس کو اس منصوبے کا اصل ذمہ دار شخص ٹھہرایا گیا لیکن وہ بھیس بدل کر فرار ہو گئے۔ مدن لال دھنگرا نے 1909 میں انڈیا آفیس کے سرکاری ملازم کرزن ویلی کو قتل کر دیا۔ پیرس اور جنیوا میں انقلاب پسندی کے مراکز قائم کئے گئے جہاں سے ایک پارسی انقلابی بھیکا جی کاما نے فرانسیسی سوشلسٹوں کے ساتھ روابط استوار کیے، اور 'بندے ماترم' اخبار شائع کیا۔ 1909 کے بعد جب اینگلو جرمن تعلقات بگڑ گئے، تو وریندر ناتھ چٹوپادھیائے نے برلن سے انقلابی سرگرمی شروع کی۔

پہلی جنگ عظیم کے دوران، جگانتر پارٹی کے انقلابیوں نے جرمنی سے اسلحہ اور گولہ بارود درآمد کرنے کا انتظام کیا۔ بگا جتن مکھرجی (Bagha Jatin Mukherjee) نے راس بہاری بوس کو ہندوستان کے متعدد علاقے اپنی تحویل میں لینے کے لئے کہا، جہاں پہ 'جرمن پلاٹ' یا 'زِمرمین پلان' کے مطابق ایک کل ہند بغاوت کا منصوبہ بنایا۔ 1915 میں، جرمن دفتر خارجہ کی مدد سے 'زمرمین پلان' کے تحت وریندر ناتھ چٹوپادھیائے، بھوپندر ناتھ دت اور لالہ ہر دیال نے برلن کمیٹی برائے ہندوستانی آزادی قائم کی۔ ان انقلاب پسندوں کا مقصد بیرون ملک میں مقیم ہندوستانیوں کو متحد کرنا اور ہندوستان میں ہتھیار بھیجنے کے لئے متحرک کرنا تھا تاکہ ہندوستان میں بغاوت لا کر ملک کو آزاد کیا جائے۔ جگانتر پارٹی نے ڈکیتیوں کے ذریعے فنڈ اکٹھے کیے تاکہ ہند۔ جرمن سازش کو کامیاب بنایا جائے۔ اس کے لئیے ایک گوریلا فورس کو منظم کرنے کا منصوبہ بنایا گیا۔ جو فورٹ ولیم پر قابض ہو کر برطانوی حکومت کے خلاف بغاوت کرے۔ بد قسمتی سے انقلابیوں کی سازش کو کسی غدار نے افشا کر دیا۔ پولیس کو معلوم ہوا کہ بگا جتن بالاسور میں جرمن اسلحہ کی ترسیل کے انتظار میں ہے۔ جتن اور ان کے ساتھیوں کو پولیس نے تلاش کیا۔ گولی باری میں کچھ انقلابیوں کو مارا گیا، اور کچھ گرفتار کر لئے گئے۔ اس طرح جرمن سازش ناکام ہو گئی، اور ستمبر 1915 میں اڑیسہ کے ساحل پر بالاسور میں بگا جتن مکھرجی کو گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا۔

غدر پارٹی ایک انقلابی گروہ تھا جو ایک ہفتہ وار اخبار *The Ghadar* کے ارد گرد منظم ہوا۔ اس کا دفتر سان فرانسیسکو، امریکہ میں تھا اور شاخیں امریکہ کے مختلف علاقوں میں پھیلی ہوئی تھی۔ بنیادی طور پر، ان انقلابیوں میں سابق فوجی اہلکار اور کسان شامل تھے جو روزگار کے بہتر مواقع کی تلاش میں پنجاب سے امریکہ اور کینیڈا آئے تھے۔ وہ بحرالکاہل کے مغربی ساحل پر امریکہ اور کینیڈا کے شہروں میں مقیم تھے۔ انقلابی سرگرمیوں کو انجام دینے کے لیے انہوں نے وینکوور (Vancouver) میں 'سودیش سیوک ہوم' اور سیٹل (Seatle) میں 'یونائیٹڈ انڈیا ہاؤس' قائم کیا۔ آخر کار 1913 میں غدر پارٹی کا قیام عمل میں آیا۔ غدر پارٹی کا مقصد سرکاری افسران کے قتل

کا منصوبہ بنانے کا اہتمام کرنا، انقلابی اور سامراج مخالف ادبیات شائع کرنا، بیرون ملکوں میں تعینات ہندوستانی فوجیوں کے درمیان کام کرنا، اسلحہ خریدنا اور تمام برطانوی نوآبادیات میں بیک وقت بغاوت برپا کرنا تھا۔ غدر پارٹی کے پیچھے متحرک شخصیات میں لالہ ہردیال، رام چندر، بھگوان سنگھ، کرتار سنگھ سرابا، برکت اللہ اور بھائی پرمانند شامل تھے۔ کوماگاتامارو واقعہ اور پہلی عالمی جنگ کے آغاز سے غدر رہنماؤں کے منصوبوں کو حوصلہ افزائی ہوئی۔

غدر تحریک کا نظریہ جمہوریت اور عقیدۂ مساوات انسانی پر مبنی تھا۔ غدر رہنماؤں نے یہ واضح طور پر کہا تھا کہ ان کا مقصد ایک آزاد جمہوریہ ہند کا قیام ہے۔ اس کی وجہ سے متعدد غدر پارٹی کے رہنما 1920 اور 1930 کی دہائیوں میں کسان اور کمیونسٹ تحریک میں شمولیت حاصل کرلی۔ مزید اس تحریک کے باعث دوسرے غدر انقلاب پسندوں میں بین الاقوامی سوچ پیدا ہوگئی۔ لالہ ہردیال کے لیکچر اور مضامین آئرلینڈ، میکسکن اور روسی انقلابیوں کے حوالوں سے بھرے ہوتے تھے۔ اس طرح غدر کے عسکریت پسندوں کو ان کے سیکولر، مساوات پسند، جمہوری اور بین الاقوامی نقطہ نظر کے لحاظ سے منفرد اور نمایاں سمجھا جاتا تھا۔ تاہم غدر کی تحریک موثر اور پائیدار قیادت پیدا کرنے میں اور تحریک کے مختلف پہلوؤں کو مضبوط رکھنے میں ناکام رہی۔ بال گنگادھر تلک نے بنگال کے انقلابیوں کو ان کے اعلیٰ مقاصد اور عزائم کے لیے خوب سراہا۔ 22 جون 1908 کے اپنے اخبار کیسری میں انہوں نے لکھا کہ 1897 کے قتل اور بنگال کے بم کے استعمال میں کافی فرق ہے۔ 1897 میں ان کا مقصد طاعون کے نتیجے میں ہونے والے ظلم کو ختم کرنا تھا۔ لیکن، 1907 میں، ان کی نظریں تقسیم بنگال کے بعد سامنے آنے والے وسیع منصوبے پر تھیں۔ رولٹ کمیٹی کی رپورٹ کے مطابق، 17-1906 کے درمیان صرف بنگال میں ڈکیتوں کی تعداد 110 اور قتل کی کوششوں کی تعداد 60 بتائی گئی ہے۔

انگریزوں کے جبر اور تشدد کی وجہ سے کئی خفیہ تنظیمیں وجود میں آئیں، اور انہوں نے حکومت کے خلاف متعدد سرگرمیاں انجام دیں۔ بنگال میں سرگرمیوں کی سربراہی ستیش چندر بوس کی قائم کردہ انوشیلن سمیتی نے کی تھی۔ صرف ڈھاکہ میں انوشلن سمیتی کی 500 شاخیں تھی۔ تقسیم بنگال، برطانوی سامان کے بائیکاٹ اور سودیشی ردعمل نے لوگوں کے شعور کو کافی حد تک بیدار کردیا۔ تقسیم بنگال کی منسوخی کا اصل مقصد جیہ کا حصول میں بن گیا۔ 1905 میں، بریندر کمار گوش نے 'بھوانی مندر' شائع کیا، جس میں انہوں نے انقلابی سرگرمیوں کے ایک مرکز کو منظم کرنے کے لیے تفصیلی منصوبہ بندی کی۔ شری اربندو کی قائم کردہ جگانتر نے انگریز مخالف نظریات کی تبلیغ کی۔ مہاراشٹر میں پونا، ناسک اور بمبئی انقلابی سرگرمیوں کے مراکز بن گئے۔ مدراس میں، 'بھارت ماتا ایسوسی ایشن' کے وانچی آئر نے ایک اہلکار کو قتل کردیا جو انتہا پسند رہنما چدمبرم پلائی کی گرفتاری کے خلاف احتجاج کرنے والے ہجوم پر فائرنگ کرنے کا ذمہ دار تھا۔ دوسرے انقلابی، جیسے شیام جی کرشن ورما، لالہ ہردیال، وی ڈی۔ ساورکر، اجیت سنگھ اور بھکاجی کاما نے یورپ میں ایسے مراکز قائم کیے جہاں سے انہوں نے انقلاب پسندی کا پیغام پھیلانے کی کوشش کی۔ احمد آباد بم کیس (نومبر 1909) اور ستارا سازش مغربی ہندوستان میں انقلابی سرگرمیوں کے دیگر واقعات تھے۔ مجموعی طور پر، یہ اندازہ لگایا جاتا ہے کہ 1908 سے 1918 تک 186 انقلاب پسندوں کو قتل کردیا گیا یا مجرم قرار دے کر قید کردیا گیا۔

برطانوی افسران کے قتل کے ذریعے، انقلاب پسندوں نے سرکاری اہلکاروں کے حوصلے پست کرنے، انتظامیہ کو مفلوج کرنے اور آزادی کے دشمنوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کی کوشش کی۔ اپنے منصوبوں کی مالی اعانت کے لیے انہوں نے بینکوں، دفاتر اور ریل گاڑیوں کو پٹری سے اتار کر لوٹ لیا۔ در حقیقت، انفرادی بہادری کی وجہ سے انقلاب پسندوں کو بہت زیادہ مقبولیت اور ہمدردی حاصل ہوئی۔ ان میں سے متعدد انقلابی جیسے خودیرام بوس اور پرفول چاکی لوک گیتوں میں آج بھی یاد کئے جاتے ہیں۔ اس سیاسی عمل کو صرف چند افراد ہی پیروی کر سکتے، نہ کہ عوام کی بڑی تعداد، جو ابھی تک ایک ایسی تحریک کے منتظر تھے جو ان کی کمزوریوں کو دور کرکے اور ان کی طاقت کا موثر استعمال کر سکے۔

تاہم، متعدد سخت قوانین، ریاستی جبر اور عوامی رد عمل کی وجہ انقلابی تحریک بتدریج زوال کا شکار ہوگئی۔ متعدد انقلاب پسندوں کو حکومت نے عام معافی کے تحت رہا کیا تاکہ مونٹ فورڈ اصلاحات کے لیے ایک سازگار ماحول پیدا کیا جاسکے۔ 1920 میں، عدم تعاون تحریک کے آغاز کے بعد مہاتما گاندھی اور چترنجن داس نے بہت سے انقلابی رہنماؤں سے بات کی اور انہیں مجبور کیا کہ وہ عدم تشدد کی عوامی تحریک میں شامل ہو جائیں یا کم از کم انقلابی تحریک کو اس کی مدت کے لیے معطل کر دیں۔ انقلاب پسندوں کو محسوس ہوا کہ ملک میں ایک نئی سیاسی صورتحال پیدا ہو رہی ہے۔ اس لئے، متعدد انقلاب پسندوں نے ناگپور اجلاس میں شرکت کی اور انڈین نیشنل کانگریس میں شامل ہو گئے۔ اس کے علاوہ عدم تشدد پر مبنی عدم تعاون کے پروگرام کے ساتھ گاندھی کے منظر عام پر آنے سے لوگوں میں ایک نئی امیدیں پیدا ہو گئی تھی۔

7.5 انقلاب پسندی کا دوسرا مرحلہ (Revolutionism: The Second Phase)

انقلاب پسندوں کو پہلی جنگ عظیم کے دوران ظلم اور تشدد کا نشانہ بنایا گیا، جس کی وجہ سے 1918 کے بعد یہ تحریک زوال کا شکار ہو گئی۔ متعدد انقلاب پسندوں کو 1919 کے اواخر اور 1920 کے اوائل میں رہا کیا گیا، تاکہ حکومت مونٹ فورڈ اصلاحات کے لیے ایک قابل قبول ماحول پیدا کرے۔ ان میں سے بہت سے لوگ گاندھی کی قیادت سے نالاں تھے اور عدم تشدد کی جدوجہد کی بنیادی حکمت عملی پر سوال اٹھانے لگے۔ عدم تعاون تحریک کی ناکامی کے بعد ایک بار پھر وہ برطانوی حکومت کے پر تشدد خاتمے کے خیال کی طرف متوجہ ہوئے۔ اس سلسلے میں وہ روس، آئرلینڈ، مصر اور چین کی انقلابی تحریکوں اور بغاوتوں سے متاثر ہوئے۔ پرانے انقلابی رہنماؤں نے اپنی تنظیموں کو دوبارہ قائم کیا۔ تقریباً سبھی انقلاب پسند رہنماؤں جیسے جوگیش چندر چٹرجی، سوریا سین، بھگت سنگھ، سکھ دیو، چندر شیکھر آزاد، شیو ورما، بھگوتی چرن ووہرا، جیدیو کپور اور جتن داس نے عدم تعاون تحریک میں پرجوش حصہ لیا۔ 1922 کے بعد، انقلابی تحریک کے دو بڑے سلسلے وجود میں آگئے۔ ایک پنجاب، یوپی، بہار اور مدھیہ پردیش (وسطی صوبے) میں ابھرا، اور دوسرا بنگال میں۔ دونوں محاذ نئی نظریاتی قوتوں کے زیر اثر آگئے، جو مندرجہ ذیل ہیں:

- ہندوستان میں سوشلسٹ نظریات اور گروہوں کا فروغ۔
- محنت کش طبقے کے درمیان ٹریڈ یونینزم (Trade Unionism) کا عروج۔

1917 کا روسی انقلاب اور اس کے نتیجے میں سوویت جمہوریہ کا قیام عمل میں آیا۔ انقلاب پسند سوویت ریاست اور اس کی بالشویک پارٹی سے سیکھنے اور ان کی مدد حاصل کرنے کی کوشش میں لگ گئے۔ سچندر ناتھ سانیال کی کتاب 'بندھی جیون' اور شرت چندر چڑجی کی ناول 'پتھر دابی' جیسے تحریرات نے انقلابی سرگرمی کی مقبولیت میں مزید اضافہ کیا۔ تقریباً تمام انقلابی گروہ نئی سوشلسٹ ریاست کی قیادت کے ساتھ روابط بڑھانا چاہتے تھے اور نظریات، تنظیم سازی اور مادی امداد کے لحاظ سے مدد لینا چاہتے تھے تاکہ ہندوستان میں انگریز مخالف تحریک کو مزید مستحکم کیا جا سکے۔

7.5.1 شمالی ہندوستان میں انقلابی تحریک (Revolutionary Movement in Northern India)

شمالی ہند کے انقلاب پسندوں نے سچندر ناتھ سانیال، جوگیش چڑجی اور رام پرساد بسمل کی قیادت میں اپنی تنظیم نو کا آغاز کیا۔ اکتوبر 1924 میں، انہوں نے کانپور میں ایک اجلاس منعقد کیا اور ہندوستان ریپبلکن ایسوسی ایشن (Hindustan Republican Association) قائم کی۔ اس تنظیم کا مقصد نو آبادیاتی حکمرانی کے خلاف مسلح انقلاب کو منظم کرنا، اور بالغان رائے دہندگی (Adult Franchise) کی بنیاد پر متحدہ ہندوستانی ریاستوں کی ایک وفاق قائم کرنا تھا۔

اپنی تنظیم کو مالی اعانت اور اسلحہ فراہم کرنے کے لیے، ایچ۔ آر۔ اے۔ کے رہنماؤں نے حکومت کے خلاف منصوبہ بند ڈکیتی ڈالنے کا فیصلہ کیا۔ ان ڈکیتیوں میں سب سے اہم کاکوری ڈکیتی ہے۔ 9 اگست 1925 کو انقلاب پسندوں نے سہارنپور۔ لکھنؤ ریلوے لائن پر لکھنؤ کے قریب کاکوری کے مقام پر ریل گاڑی میں ڈکیتی کو کامیابی سے انجام دیا، اور سرکاری زر نقد لوٹ لیا۔ حکومت نے بڑی تعداد میں ایچ۔ آر۔ اے۔ کے ارکان اور ڈکیتی میں ملوث رہنماؤں کو گرفتار کیا، اور ان کے خلاف کاکوری سازش کے سلسلے میں مقدمہ چلایا اور قید کی سزا سنائی۔ ان قیدیوں کے ساتھ جیلوں میں ظالمانہ سلوک کیا جاتا تھا، جس کے نتیجے میں انہیں کئی بار بھوک ہڑتال کرنا پڑتا تھا۔ اس سازش میں ملوث انقلاب پسندوں جیسے اشفاق اللہ خان، رام پرساد بسمل، روشن سنگھ اور راجندر لہری کو پھانسی دی گئی۔ دیگر چار لوگوں کو عمر بھر کے لیے انڈمان (کالا پانی) بھیج دیا گیا، اور 17 لوگوں کو طویل قید کی سزا سنائی گئی۔ روشن لال نے 'بندے ماترم' کے نعرے اور رام پرساد بسمل نے 'میں برطانوی سلطنت کے زوال کی خواہش کرتا ہوں' کے نعرے کے ساتھ پھانسی کا پھندا قبول کیا۔ اس طرح، چاروں شہداء نے مثالی جرات کے ساتھ جام شہادت نوش کیا۔ مرتے وقت رام پرساد بسمل نے کہا کہ 'ہم دوبارہ جنم لیں گے، دوبارہ ملیں گے اور مشترکہ طور پر ایک بار پھر مادر وطن کی خاطر ہتھیاروں کے ساتھ کامریڈ بن کر لڑیں گے۔' اپنی شہادت سے ایک دن پہلے اشفاق اللہ نے اپنے بھتیجے سے کہا کہ 'تمہیں یاد رکھنا چاہیے کہ ہندوؤں نے ہندوستانی جدوجہد آزادی کے لیے خودیرام اور کنیالال جیسی عظیم شخصیتوں نے قربانی پیش کی ہے۔ میرے لیے یہ خوش قسمتی ہے کہ مسلم معاشرے سے تعلق رکھتے ہوئے میں نے ان عظیم شہداء کے نقش قدم پر چلنے کا شرف حاصل کیا ہے۔ ایچ۔ آر۔ اے۔ کے رہنماؤں میں سے چندر شیکھر آزاد اکیلے شخص تھے جو پولیس کے جال سے بچ نکلنے میں کامیاب ہوئے اور روپوش ہو کر بھی تحریک کے سرگرمیوں کو فروغ دیتے رہے۔

7.5.2 ہندوستان سوشلسٹ ریپبلکن ایسوسی ایشن (Hindustan Socialist Republican Association)

کاکوری مقدمے نے انقلابی تحریک کو بے حد کمزور کر دیا۔ لیکن بہت جلد ہی نوجوانوں کی نئی نسل نے اس خلا کو پر کیا۔ متحدہ صوبوں میں بیجو کمار سنہا، شیو ورما اور جے دیو کمار؛ اور پنجاب میں بھگت سنگھ، بھگوتی چرن ووہرا اور سکھ دیو نے چندر شیکھر آزاد کی قیادت میں ایچ۔ آر۔ اے۔ کی تنظیم نو شروع کی۔ وہ بھی سوشلسٹ نظریات کے زیر اثر آ گئے۔ آخر کار، 9 اور 10 ستمبر 1928 کو شمالی ہند کے انقلاب پسند رہنماؤں نے دہلی کے فیروز شاہ کوٹلہ میں ایک اجلاس منعقد کیا۔ اس اجلاس میں انہوں نے سوشلزم کو اپنا مقصد تسلیم کیا، اور ایچ۔ آر۔ اے۔ کو ہندوستان سوشلسٹ ریپبلکن ایسوسی ایشن (آرمی) میں تبدیل کیا۔ ہندوستان سوشلسٹ ریپبلکن ایسوسی ایشن کے مقاصد مندرجہ ذیل ہیں:

- لوگوں کے شعور کو گاندھی کے عدم تشدد کی غیر مطابقت کے بارے میں بیدار کرنا۔
- مکمل آزادی حاصل کرنے کے لیے انقلاب کی ضرورت اور خواہش کا مظاہرہ کرنا۔

روسی انقلاب اور سوشلسٹ فکر سے نظریاتی طور پر متاثر ہو کر یہ تنظیم ہندوستان میں برطانوی سامراج کی جگہ وفاقی جمہوریہ ہند قائم کرنا چاہتی تھی۔ ایچ۔ ایس۔ آر۔ اے۔ کی قیادت انفرادی بہادری کو چھوڑ کر بڑے پیمانے پر مسلح جدوجہد کے خیال کی طرف بڑھ رہی تھی۔ لیکن جب 30 اکتوبر 1928 کو لاہور میں سائمن کمیشن مخالف مظاہرے کی قیادت کرتے ہوئے لالہ لاجپت رائے لاٹھی چارج کے نتیجے زخمی ہو کر ہلاک ہو گئے، تو مشتعل نوجوانوں نے عزم کیا کہ قوم اس سنگین توہین کا بدلہ ضرور لے گی۔ اس کی وجہ سے انہیں ایک بار پھر انفرادی سرگرمی کی مشق کا سہارا لینا پڑا۔ اس طرح، 17 دسمبر 1928 کو، بھگت سنگھ، چندر شیکھر آزاد اور راج گرو نے لاٹھی چارج میں ملوث (ایک پولیس اہلکار) سانڈرز کو لاہور میں قتل کر دیا۔

ایچ۔ ایس۔ آر۔ اے۔ کی طرف سے لگائے گئے پوسٹر میں قتل کو اس طرح جائز قرار دیا گیا کہ "ایک عام پولیس اہلکار کے نااہل ہاتھوں سے ایک قابل احترام رہنما کا قتل... قوم کی توہین کے برابر ہے۔ اس توہین کو قوم کے چہرے سے ہٹانا ہندوستان کے نوجوانوں کا فرض ہے... ہمیں افسوس ہے کہ ہمیں ایک شخص کا قتل کرنا پڑا۔ چونکہ وہ شخص اس غیر انسانی اور غیر منصفانہ حکم کا حصہ تھا، اس لئے اسے مارنا پڑا۔ انسانی خون کا بہانا ہمیں مغموم کرتا ہے لیکن انقلاب کے میدان میں خونریزی ناگزیر ہے۔ ہمارا مقصد ایک ایسے انقلاب کے لیے کام کرنا ہے جو انسان کے ہاتھوں انسان کے استحصال کا خاتمہ کرے۔" لالہ لاجپت رائے کے قتل نے انقلابیوں کو ایک بار پھر انفرادی سرگرمی کی طرف راغب کیا۔

انفرادی حوصلہ کو آگے بڑھانے کے لئے، ایچ۔ ایس۔ آر۔ اے۔ کے رہنماؤں نے اب لوگوں میں اپنی سیاسی سوچ کو پھیلانا شروع کیا تاکہ ایک عوامی انقلابی تحریک کو منظم کیا جا سکے۔ 8 اپریل 1929 کو بھگت سنگھ اور بی۔ کے۔ دت کو مرکزی قانون ساز اسمبلی میں بم پھینکنے کے لیے منتخب کیا گیا تھا تاکہ پبلک سیفٹی بل (Public Safety Bill) اور تجارتی تنازعات کی بل (Trade Disputes Bill) کی منظوری کے خلاف احتجاج کیا جا سکے، جس سے عام شہریوں کی آزادی اور مزدوروں کے حقوق متاثر ہونے کا خدشہ تھا۔ بم پھینکنے کا

مقصد قتل کرنا نہیں تھا، بلکہ بہروں تک آواز پہنچانا تھا۔ بھگت سنگھ اور بی۔ کے۔ دت نے فرار ہونے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ ان کا مقصد گرفتار ہونا تھا اور کورٹ میں پروپیگنڈے کے ذریعے انقلابی تحریک کا پرچار کرنا تھا۔

بھگت سنگھ اور بی۔ کے۔ دت پر اسمبلی بم کیس میں مقدمہ چلایا گیا۔ اسی اثنا میں پولیس سانڈرز کے قتل کی تفصیلات سے پردہ اٹھانے میں کامیاب ہوگئی اور بھگت سنگھ، سکھ دیو، راج گرو اور دیگر انقلاب پسندوں پر لاہور کیس میں مقدمہ چلایا گیا۔ بھگت سنگھ اور ان کے ساتھیوں نے عدالت کو پروپیگنڈے کا ایک فورم بنا دیا۔ ان کے بیانات اخبارات میں شائع ہوئے اور لوگوں میں ان کا خوب چرچا ہوا۔ عدالت میں ان کے دلیر اور جرأت مند طرز عمل سے لوگوں میں ان کی مقبولیت عام ہوگئی۔ حتیٰ کہ عدم تشدد کے ماننے والے بھی ان کی حب الوطنی کی وجہ سے ان سے محبت کرتے۔ ہر سنوائی کے بعد وہ عدالت میں 'انقلاب زندہ باد'، 'برطانوی سامراج مردہ باد'، 'سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے' اور 'میرا رنگ دے بسنتی چولا' کے نعرے لگاتے تھے۔ یہ نعرے اور حب الوطنی کے گیت اخبارات میں شائع ہوتے تھے، جس کی وجہ سے ان کو ملک بھر میں ہمدردی حاصل ہوتی تھی۔ جب 23 مارچ 1931 کو انہیں پھانسی دی گئی، تو پورا ملک خون کے آنسو رو رہا تھا۔ ان کے بارے میں سینکڑوں گیت لکھے اور گائے گئے۔ ان کی مقبولیت گاندھی کی مقبولیت کا مقابلہ کر رہی تھی۔

پھانسی سے چند روز قبل تینوں نے قید خانے کے منتظم کے نام لکھے گئے خط میں اس بات کی پیشن گوئی کی کہ "بہت جلد ایک ایسی جنگ شروع ہو جائے گی، جس کا نتیجہ فیصلہ کن ہوگا۔ ہم نے اس جدوجہد میں حصہ لیا اور ہمیں ایسا کرنے پر فخر ہے۔" اپنے آخری دو خطوط میں، بھگت سنگھ نے سوشلزم میں انقلابی عقیدے کی تصدیق کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ 'کسانوں کو نہ صرف اپنے آپ کو غیر ملکی آمرانہ طاقت سے بلکہ جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے طوق سے بھی آزاد کرنا ہوگا۔' 3 مارچ 1931 کے اپنے آخری پیغام میں انہوں نے کہا کہ ہندوستان میں یہ جدوجہد اس وقت تک جاری رہے گی جب تک 'چند استحصال کرنے والے اپنے مقاصد کے لیے عام لوگوں کا استحصال کرتے رہیں گے۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ یہ استحصال کرنے والے خالصتاً برطانوی سرمایہ دار ہیں، یا برطانوی اور ہندوستانی اتحاد ہیں، یا خالص ہندوستانی ہیں۔

انقلابیوں کی طویل بھوک ہڑتال سے بھی ملک میں شورش پیدا ہوگئی تھی جو انہوں نے جیل کے خوفناک حالات کے خلاف احتجاج کے طور پر کی تھی۔ انہوں نے مطالبہ کیا کہ ان کے ساتھ عام مجرموں جیسا نہیں بلکہ سیاسی قیدیوں جیسا سلوک کیا جائے۔ 13 ستمبر 1929 کو ایک پختہ ذہن نوجوان، جتن داس، 63 دنوں کی بھوک ہڑتال کے بعد انتقال کر گیا۔ جب ریل گاڑی میں ان کی میّت کو لاہور سے کلکتہ لایا جا رہا تھا، اس وقت ہر سٹیشن پر ہزاروں لوگ انہیں خراج عقیدت پیش کرنے آگئے۔ کلکتہ میں چھ لاکھ سے بھی زیادہ لوگوں کا دو میل لمبا جلوس ان کے تابوت کو شمشان لے گیا۔ لاہور کے اخبار 'ٹربیون' (*Tribune*) نے جتن داس کی موت پر لکھا کہ 'اگر کبھی کوئی شخص کسی عظیم مقصد کے لیے ہیرو اور شہید ہو کر مرتا ہے، تو وہ جتندر ناتھ داس ہے۔'

یہ انقلابی تحریک، جس نے قوم پرست اور سوشلسٹ شعور کو پھیلانے میں اہم کردار ادا کیا، بہت جلد ختم ہوگئی۔ فروری 1931 میں، چندر شیکھر آزاد الٰہ آباد کے ایک پبلک پارک (بعد میں آزاد پارک) میں پولیس کی فائرنگ سے مارے گئے۔ فروری 1933 میں، سوریا

سین کو گرفتار کر لیا گیا اور جنوری 1934 میں انہیں پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ سینکڑوں دوسرے انقلاب پسندوں کو گرفتار کیا گیا اور انہیں طویل مدتی سزائیں سنائی گئیں۔

7.5.3 شمالی ہند کی انقلابی تحریک میں نظریاتی پیشرفت

(Ideological Advancement in the Revolutionary Movement in North India)

انقلابی تحریک مختلف نظریاتی پیش رفت کا تجرباتی دور سے گذرا۔ ایچ۔ آر۔ اے۔ نے پہلے ہی ایک وسیع، سیکولر، جمہوری اور سماجی ڈھانچہ کے اندر اپنا پروگرام تیار کیا تھا۔ 1925 میں، اس کے منشور میں ایک منظم اور مسلح انقلاب کے ذریعے ہندوستان میں جمہوری وفاق کے قیام کو اپنا مقصد بنالیا۔ جمہوری وفاق کا بنیادی اصول عالمی حق رائے دہی کی شناسائی اور ان تمام نظاموں کا خاتمہ تھا جو انسان کے کسی بھی قسم کے استحصال کو ممکن بناتے تھے۔" اکتوبر 1924 میں، ایچ۔ آر۔ اے۔ نے اپنے اجلاس میں یہ فیصلہ کیا تھا کہ وہ سماجی، انقلابی اور کمیونسٹ اصولوں کی تبلیغ کرے گی۔ اس تحریک نے مزدور اور کسان تنظیمیں شروع کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس نے ریلوے اور دیگر بڑی صنعتوں کو بھی قومی تحویل (nationalisation) میں لینے کی وکالت کی پرزور حمایت کی تھی۔

کال کوٹھری میں رام پرساد بسمل نے نوجوانوں سے اپیل کی تھی کہ وہ پستول رکھنے کی خواہش ترک کریں اور انقلابی سازشوں میں کام کرنا چھوڑ دیں؛ اور کھلی تحریک قائم کریں۔ انہوں نے لوگوں سے کہا کہ وہ ہندو مسلم اتحاد قائم کریں اور کانگریس کی قیادت میں تمام سیاسی گروہوں کو متحد کریں۔ انہوں نے کمیونزم اور اس اصول کی بھی تائید کی جس میں ہر انسان کو قدرتی وسائل پر مساوی حقوق حاصل ہو۔

7.5.4 بھگت سنگھ اور ہندوستان سوشلسٹ ریپبلکن ایسوسی ایشن

(Bhagat Singh, and the Hindustan Socialist Republican Association)

انقلاب پسندوں کی نظریاتی ترقی میں ایک بڑی تبدیلی اس وقت ہوئی جب بیجے سنہا، شیو ورما، سکھ دیو، بھگوتی چرن ووہرا اور بھگت سنگھ جیسے نوجوان رہنماؤں نے سوشلزم اور مارکسزم کی طرف رجوع کیا۔ بھگت سنگھ 1907 میں ایک مشہور محب وطن گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کانگریسی تھے اور ان کے چچا مشہور انقلابی اجیت سنگھ تھے۔ بھگت سنگھ غدر کے ہیرو کرتار سنگھ سربھ سے بہت متاثر تھے۔ بھگت سنگھ کتب بینی کے شوقین تھے اور انہوں نے سوشلزم، سوویت یونین، آئرلینڈ اور اٹلی کی انقلابی تحریکوں پر وسیع مطالعہ تھا۔ انہوں نے سکھ دیو کے ساتھ نوجوان طلبہ کے لیے مطالعہ گاہوں (study circles) کا اہتمام کیا، جہاں پر انقلابی رہنما آپس میں سیاسی بحث و مباحثہ کرتے تھے۔ جب ایچ۔ ایس۔ آر۔ اے۔ کا دفتر آگرہ منتقل کیا گیا، تو انہوں نے فوری طور پر ایک لائبریری قائم کی اور اراکین سے سوشلزم اور دیگر انقلابی نظریات کو پڑھنے اور ان پر گفتگو کرنے کی تاکید کی۔ ان کی قمیض کی جیبیں ہمیشہ کتابوں سے بھری رہتی تھیں، جو وہ اکثر اپنے ساتھیوں کو پڑھنے کے لیے دیتے تھے۔ گرفتاری کے بعد انہوں نے قید خانے میں گہرا مطالعہ کیا۔ انقلاب کی تشکیل میں نظریات کے کردار پر زور دیتے ہوئے، انہوں نے لاہور ہائی کورٹ کے سامنے کہا کہ 'انقلاب کی تلوار خیالات کے پتھر پر تیز ہوتی ہے۔' گہرائی سے پڑھنے کی یہ لگن

بجوئے سنہا، یشپال، شیو ورما اور بھگوتی چرن ووہرا میں بھی تھی۔ چندر شیکھر آزاد انگریزی کم جانتے تھے، لیکن وہ سیاسی مباحثوں میں بھرپور حصہ لیا کرتے تھے۔ اجوئے کمار گھوش چندر شیکھر آزاد کے بارے میں لکھتے ہیں کہ "اپنی فعال زندگی کے درمیان، انہوں نے اپنے آپ کو انتھک مطالعہ میں مصروف رکھا۔ ان کے خیالات روز بروز پختگی کی شکل اختیار کر رہے تھے۔ بہت سے نکات کی وضاحت کے لیے اپنے انگریزی جاننے والے ساتھیوں کی مدد لینے میں کبھی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے تھے۔"

1929 میں گرفتار ہونے سے پہلے ہی بھگت سنگھ تشدد اور انفرادی سرگرمی ترک کر چکے تھے۔ ان کا اس بات پر یقین تھا کہ وسیع تر عوامی تحریک ہی ہندوستان کو غلامی سے آزاد کر سکتی ہیں۔ جیسا کہ انہوں نے کہا کہ انقلاب صرف "عوام کے لیے عوام کے ذریعے" حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اسی لیے 1926 میں، انہوں نے نوجوانوں، کسانوں اور مزدوروں کے درمیان سیاسی بصیرت پیدا کرنے کے لیے 'نوجوان بھارت سبھا' کی بنیاد رکھی۔ انہوں نے سکھ دیو کے ساتھ کھلے عام سیاسی کام کرنے کے لیے لاہور اسٹوڈنٹس یونین کو منظم کیا۔ دراصل، بھگت سنگھ نے کبھی بھی انقلاب لانے کے لئے بم کے استعمال کو ضروری نہیں سمجھا۔ جیسا کہ ہم نے پہلے ہی بیان کیا ہے کہ بھگت سنگھ اور بی کے۔ دت نے سنہ 1929 میں مرکزی قانون ساز اسمبلی میں نسبتاً غیر مضر یا بے ضرر بم پھینکا تھا۔ ان کی حکمت عملی یہ تھی کہ وہ گرفتار ہو جائیں اور پھر عدالتوں کو اپنے نظریات کی تبلیغ کے لیے استعمال کریں۔

1929 سے 1931 تک اپنے بیانات اور تحریروں میں بھگت سنگھ اور ان کے ساتھیوں نے اپنے نظریے کا بار بار اظہار کیا کہ انقلاب کا مطلب عوام کو بیدار کرنا اور عوامی تحریک کو منظم کرنا ہے۔ پھانسی سے پہلے، بھگت سنگھ نے اعلان کیا کہ "حقیقی انقلابی فوجیں گاؤں اور فیکٹریوں میں ہیں۔ 2 فروری 1931 کو لکھے گئے آخری بیان میں، انہوں نے بتایا کہ "بظاہر میں نے ایک دہشت گرد کی طرح کام کیا ہے۔ لیکن میں دہشت گرد نہیں ہوں... مجھے یہ اعلان کرنے دو کہ میں دہشت گرد نہیں ہوں اور نہ کبھی تھا، اور مجھے یقین ہے کہ ہم ان طریقوں سے کچھ حاصل نہیں کر سکتے ہیں۔" پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بھگت سنگھ نے کھل کر دہشت گردی کی مخالفت کیوں نہیں کی؟ وہ نوجوانوں کو ان کی قربانی کے جذبے کو ٹھیس پہنچائے بغیر کہتے تھے کہ وہ کسی بھی طرح سے انفرادی بہادری کے جذبے کو ترک کریں۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ عوامی سطح پر یہ ظاہر ہو کہ اس نے سزائے موت کے ڈر سے اپنی سیاست پر نظر ثانی کی ہے، اور وہ نوآبادیاتی حکمرانوں سے اپنی جان کی بھیک مانگ کر سیاسی پسپائی اختیار کر رہا ہے۔

بھگت سنگھ اور ان کے ساتھیوں نے بھی انقلاب کے معنی اور مفہوم کی نئی تعریف کی۔ انقلاب اب محض عسکریت پسندی یا تشدد کے مترادف نہیں رہا۔ اس کا پہلا مقصد قومی آزادی اور پھر ایک نئے سوشلسٹ معاشرے کی تعمیر کرنا تھا۔ قانون ساز اسمبلی بم کیس (Central Legislative Assembly Bomb Case) میں انہوں نے واضح طور پر بیان کیا کہ انقلاب سے ان کا مطلب ہے "ایک بنیادی تبدیلی قائم کرنا ہے"۔ اور یہ تبدیلی ان لوگوں کا فرض ہے جو محسوس کرتے ہیں کہ وہ معاشرے کی تنظیم نو کریں۔" وہ چاہتے تھے کہ "انسان کے ذریعے انسان اور قوم کے ذریعے قوم کے استحصال" کو ختم کیا جائے۔ سبھاش چندر بوس کے مطابق "انقلابیوں کا مقصد دہشت

گردی نہیں بلکہ انقلاب ہے اور انقلاب کا مقصد قومی حکومت کا قیام ہے"۔ چندر شیکھر آزاد اور یشپال نے انقلاب کو آزادی، سماجی، سیاسی اور معاشی قرار دیا جس کا مقصد معاشرے کا ایک نیا نظام قائم کرنا ہے جس میں سیاسی اور معاشی استحصال ناممکن ہو۔ اسمبلی بم کیس میں بھگت سنگھ کہتے ہیں کہ انقلاب میں جھگڑے، خون ریزی اور انفرادی انتقام کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اس میں بم اور پستول کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ "انقلاب" سے ہمارا مطلب یہ ہے کہ نظام کی موجودہ ترتیب، جو صریح ناانصافی پر مبنی ہے، کو بدلنا چاہیے۔ 1929 میں ایچ۔ ایس۔ آر۔ اے۔ کے منشور میں یہ اعلان کیا گیا تھا کہ عام لوگوں کی امید اب سوشلزم پر مرکوز ہے جو اکیلے ہی مکمل آزادی کے قیام اور تمام سماجی امتیازات اور مراعات کو ختم کرنے کا باعث بن سکتا ہے۔ مشہور کتاب *The Philosophy of the Bomb* بھگوتی چرن ووہرا نے انقلابیوں پر گاندھی کی تنقید کے جواب میں لکھی تھی۔ سچندر ا سانیال کی لکھی ہوئی 'بندھی جیون' نے شمالی ہندوستان کے انقلابیوں کے لیے ایک درسی کتاب کا کردار ادا کیا۔

بنیادی طور پر بھگت سنگھ نے سوشلزم کو سرمایہ داری اور طبقاتی تسلط کے خاتمے کے لئے ضروری قرار دیا۔ وہ سوشلزم سے متاثر تھے۔ اپنی سیاسی فکر کا اعلان کرتے ہوئے، اکتوبر 1930 میں انہوں نے جیل سے ایک پیغام میں کہا کہ "انقلاب سے ہمارا مطلب ہے موجودہ سماجی نظام کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنا ہے، جس کے لیے ریاستی اقتدار پر قبضہ کرنا ضروری ہے۔ اس وقت ریاست کا نظام مراعات یافتہ طبقے کے ہاتھ میں ہے۔ لیکن عوام کے مفادات کا تحفظ اور کارل مارکس کے اصولوں کے مطابق معاشرے کی بنیاد رکھنا، ہم سے موجودہ نظام پر قبضہ کرنے کا مطالبہ کرتے ہیں۔"

بھگت سنگھ ان چند ہم عصر رہنماؤں میں سے تھے جو فرقہ پرستی سے ہندوستانی سماج اور ہندوستانی قومی تحریک کے ممکنہ مضمرات کو پوری طرح سمجھتے تھے۔ وہ اکثر اپنے سامعین کو بتاتے تھے کہ فرقہ پرستی اتنا ہی بڑا خطرہ ہے جتنا کہ نوآبادیاتی نظام۔ 1924 کے بعد، جب لاجپت رائے نے فرقہ وارانہ سیاست کی طرف رخ کیا تو بھگت سنگھ نے ان پر تنقید کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی۔ نوجوان بھارت سبھا کے قواعد، جو بھگت سنگھ نے تیار کیے تھے، وہ لکھتے ہیں کہ "تنظیم کو ان سیاسی اداروں یا دیگر جماعتوں سے کوئی تعلق نہیں جو فرقہ وارانہ خیالات کو پھیلاتے ہیں،" اور 'مذہب کو ذاتی عقیدے کا معاملہ سمجھتے ہوئے عوام میں رواداری کا جذبہ پیدا کرنا ہے اور مکمل طور پر اس پر عمل کرنا ہے۔' بھگت سنگھ کا یہ بھی ماننا تھا کہ لوگوں کو مذہب اور توہم پرستی کی ذہنی غلامی سے آزاد ہونا چاہیے۔ شہادت سے پہلے انہوں نے اپنے مقالے *Why I am an Atheist* میں مذہب کی بہت تنقید کی۔ وہ لکھتے ہیں کہ ایک انقلابی کو بہادر ہونے کے ساتھ ساتھ تنقیدی اور آزاد سوچ کا مالک ہونا چاہیے۔

7.6 بنگال میں انقلابی تحریک (The Revolutionary Movement in Bengal)

1922 کے بعد، بنگال میں بھی انقلاب پسندوں نے انقلابی تحریک کو از سر نو منظّم کرنا شروع کر دیا۔ انہوں نے پریس کے ذریعے تحریک کا پروپیگنڈہ شروع کیا۔ ساتھ ہی یہ انقلابی رہنما گاؤں سے لے کر صوبائی سطح تک کانگریس میں کام کرتے رہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ

انہوں نے محسوس کیا کہ ایم۔ کے۔ گاندھی کی قیادت میں کانگریس نے ایک بڑے پیمانے پر لوگوں کو تحریک آزادی میں شامل کیا، اور کانگریس کے اندر کام کرنے سے انقلاب پسندوں کو عام لوگوں تک رسائی حاصل ہوتی تھی۔ بہت سے طریقوں سے، سی۔ آر۔ داس نے انقلاب پسندوں اور کانگریس رہنماؤں کے درمیان ایک جذباتی ربط پیدا کیا۔ ان کی وفات کے بعد، بنگال کانگریس کی قیادت دھیرے دھیرے دو حصوں میں تقسیم ہوگئی، ایک کی قیادت سبھاش چندر بوس اور دوسرے کی جے۔ ایم۔ سین گپتا نے کی۔ اس کے ساتھ انقلاب پسند رہنما بھی تقسیم ہوگئے۔

1924 سے پہلے ہی انقلاب پسند رہنماؤں نے انفرادی سرگرمی کو ایک ناکافی عمل بتایا، اور عوامی بغاوتوں اور مسلح قبضے کے ذریعے حصول آزادی کی حکمت عملی کو ترجیح دی۔ لیکن، عملی طور پر، وہ پھر بھی ڈکیتیوں اور اہلکاروں کے قتل پر انحصار کرتے تھے۔ اس طرح کی متعدد 'کارروائیوں' میں سے ایک چارلس ٹیگارٹ کے قتل کی کوشش ہے۔ جنوری 1924 میں، گوپی ناتھ ساہا نے کلکتہ کے غیر مقبول پولیس کمشنر چارلس ٹیگارٹ کو قتل کرنے کی کوشش کی۔ غلطی سے ڈے (Day) نام کا ایک دوسرا انگریز مارا گیا۔ کوشش ناکام ہونے کے باوجود گوپی ناتھ ساہا کو 1 مارچ 1924 کو گرفتار کیا گیا، مقدمہ چلایا اور پھانسی دے دی گئی۔ ان سرگرمیوں کو روکنے کے لئے حکومت نے نئے حکم ناموں کے تحت بڑی تعداد میں انقلابی رہنماؤں کو گرفتار کر لیا۔ مزید برآں، سبھاش چندر بوس سمیت متعدد کانگریسی، جن پر انقلابیوں کے ہمدرد ہونے کا شبہ تھا، کو بھی گرفتار کیا گیا۔ تقریباً تمام بڑے رہنما جیل میں ہونے کی وجہ سے انقلابی سرگرمیوں کو شدید دھچکا لگا۔

اس کے علاوہ، انقلاب پسندوں کے مابین ذاتی جھگڑوں کی وجہ سے بھی انقلابی سرگرمیوں کو نقصان پہنچا۔ یوگنتر اور انوشیلن کے درمیاں کئی جھگڑے ہوگئے۔ تاہم، 1926 میں ان کی رہائی کے بعد کئی نوجوان انقلابیوں نے اپنے آپ کو بڑے گروہوں میں منظم کرنا شروع کر دیا، جو باغی گروہوں کے نام سے مشہور ہوگئے۔ ماضی کے تجربات سے سیکھتے ہوئے، ان گروہوں نے انوشیلن اور یوگانتر سمیتی کے ساتھ دوستانہ تعلقات استوار کیے۔ نئے گروہوں میں، سوریا سین کی قیادت میں چٹاگانگ گروہ تھا، جس نے کافی شہرت اور مقبولیت حاصل کی۔

7.6.1 چٹاگونگ اسلحہ خانے پر حملہ (Raiding the Chittagong Armoury)

سوریا سین نے عدم تعاون کی تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ وہ چٹاگونگ کے ایک قومی اسکول میں استاد کی حیثیت سے کام کرتے تھے۔ اس کی وجہ سے وہ ماسٹر دا (Masterda) کے نام سے مشہور ہوئے۔ انہیں 1926 میں گرفتار کیا گیا اور پھر 1928 میں رہا کر دیا گیا۔ 1929 میں سوریا سین چٹاگونگ ڈسٹرکٹ کانگریس کمیٹی کے سکریٹری بن گئے۔ سوریا سین ایک مثالی اور مخلص انسان تھے۔ وہ ایک بہترین منتظم تھے جس نے نوجوان مردوں اور عورتوں کو متاثر کیا اور اپنی طرف متوجہ کیا۔ وہ کہتے تھے کہ انسانیت انقلاب پسندوں کی ایک خاص خوبی ہے۔ وہ شاعری کے دلدادہ اور ٹیگور اور قاضی نذرالاسلام کے مداح تھے۔ سوریا سین نے بہت جلد انقلاب پسندوں کا ایک بڑا گروہ جمع کیا جن میں اننت سنگھ، گنیش گھوش، امبیکا چکرورتی اور لوک ناتھ پال شامل تھے۔ 1929 کے اوائل میں انہوں نے ایک مسلح بغاوت کو منظم کرنے کا منصوبہ بنایا۔ اس بغاوت کا مقصد یہ تھا کہ چھوٹے پیمانے پر یہ ظاہر کیا جائے کہ برطانوی حکومت کو ہتھیاروں کے ذریعے بھی چیلنج کیا جاسکتا ہے۔ اپنے آپ کو اسلحے سے لیس کرنے کے لیے انہوں نے کئی اضلاع میں اسلحہ خانوں پر حملہ کرنے کا منصوبہ بنایا۔

پہلی کارروائی چٹاگونگ میں ہوئی۔ 18اپریل 1930کی رات میں اس منصوبے کو عمل میں لایا گیا۔ گنیش گھوش کی قیادت میں چھ نوجوانوں نے 'انقلاب زندہ باد'، 'برطانوی سامراج مردہ باد' اور "گاندھی راج قائم ہو چکا ہے" کے نعرے لگاتے ہوئے پولیس کے اسلحہ خانوں پر قبضہ کر لیا۔ "یہ حملہ سوریا سین کی قیادت میں ہوا، جس میں انہوں نے اپنے آپ کو عارضی آزاد حکومت ہند کا صدر قرار دیا۔ اس کارروائی میں چٹاگونگ کے دو اسلحہ خانوں کو لوٹا گیا، اور انقلابیوں کو ہتھیاروں سے مسلح کیا گیا۔ چٹاگونگ اور بقیہ بنگال کے درمیان ٹیلی فون، ٹیلی گراف اور ریلوے کے مواصلاتی نظام کو درہم برہم کیا گیا۔

لوک ناتھ پال کی قیادت میں ایک اور گروہ نے لیوس ایک دوسرے اسلحہ خانے پر قبضہ کر لیا۔ انقلابیوں نے ٹیلی فون اور ٹیلی گراف مواصلات کو منقطع کرنے اور ٹرین کے ذریعے نقل و حرکت میں خلل ڈالنے میں بھی کامیابی حاصل کر لی تھی۔ یہ حملہ انڈین ریپبلکن آرمی، چٹاگونگ برانچ کے نام سے جانا گیا۔ اس چھاپے میں مجموعی طور پر 65 لوگ شامل تھے۔ تمام انقلابی پولیس اسلحہ خانے کے باہر جمع ہوئے جہاں سفید کھادی کی دھوتی، لمبے کوٹ اور گاندھی کی ٹوپی میں ملبوس سوریا سین نے فوج کو سلامی دی۔ اس کے بعد 'بندے ماترم' اور 'انقلاب زندہ باد' کے نعروں کے ساتھ قومی پرچم لہرایا گیا؛ اور عارضی انقلابی حکومت قائم کرنے کا اعلان کیا گیا۔ بدقسمتی سے وہ گولہ بارود تلاش کرنے میں ناکام رہے، جس کی وجہ سے انقلاب پسندوں کے منصوبوں کو ایک تباہ کن دھچکا لگا۔ حملے کے بعد انقلابیوں نے جلال آباد کی پہاڑی پر اپنی پوزیشن سنبھال لی جہاں 22اپریل کو دشمن کے ہزاروں فوجیوں نے انہیں گھیر لیا۔ ایک زبردست لڑائی کے بعد جس میں 12 انقلابی مارے گئے، سوریا سین نے پڑوسی دیہاتوں سے گوریلا جنگ شروع کرنے کو کہا۔ سخت اقدامات کے باوجود، انقلاب پسند لوگ تقریباً تین سال تک دیہات کی طرف سے فراہم کردہ پناہ کی وجہ سے زندہ رہے۔ بالآخر، 16فروری 1933 کو سوریا سین کو گرفتار کر لیا، اور 12 جنوری 1934 کو انہیں پھانسی دے دی گئی۔

چٹاگونگ اسلحہ خانے کے چھاپے کی وجہ سے بنگال کے لوگوں پر بہت گہرا اثر پڑا۔ جیسا کہ ایک سرکاری اشاعت نے تبصرہ کیا کہ اس نے 'انقلابی سوچ رکھنے والے نوجوانوں کے جذبات کو بھڑکا دیا' اور 'مختلف دہشت گرد گروہوں میں بھرتی ہونے والے افراد کو ایک مستحکم دھارے میں کھڑا کیا۔' سال 1930 میں انقلابی تحریک کو ایک نئی زندگی حاصل ہوئی، اور اس کی کاروائی 1931 اور 1932 تک جاری رہی۔ ضلع مدناپور میں تین برطانوی مجسٹریٹوں کو قتل کر دیا گیا۔ دو گورنروں کی جان لینے کی کوشش کی گئی۔ دو انسپکٹر جنرل آف پولیس مارے گئے۔ اس تین سال کے عرصے میں بائیس سرکاری اور دیگر بیس اہلکار مارے گئے۔ ان انقلابی سرگرمیوں کی وجہ سے افسر شاہی، پولیس اور فوج بھی متاثر ہو گئی۔ مثال کے طور پر، کلپنا جوشی (کلپنا دتا) نے اس سلسلے میں ایک دلچسپ واقعہ بیان کیا ہے۔ جب کلپنا دتا سمیت ایک گروہ نے سخت لڑائی کے بعد مئی 1933 میں ہتھیار ڈال دیے، تو جاٹ رجمنٹ کے ایک صوبیدار نے اسے تھپڑ مار دیا۔ فوری طور پر، سپاہیوں نے صوبیدار کو گھیر لیا اور اسے خبردار کیا کہ 'انہیں ہاتھ نہیں لگایا جائے گا۔ اگر آپ نے ایک بار پھر ان پر ہاتھ اٹھایا تو ہم آپ کا حکم نہیں مانیں گے۔' اسلحہ خانوں پر حملہ اور انقلابی تحریک کی احیاء کے بعد سرکاری ردعمل شروع ہوا۔ چٹاگونگ میں، پولیس نے کئی دیہاتوں کو جلا دیا، متعدد لوگوں پر جرمانہ عائد کیا گیا، اور دہشت کا راج قائم کیا۔ چونکہ جواہر لعل نہرو نے کلکتہ میں ایک تقریر میں برطانوی سامراج کی مذمت، انقلابی نوجوانوں کی

بہادری کی تعریفیں کی، اور تشدد کی پالیسی کو فضول اور فرسودہ قرار دینے والوں کی تنقید کی تھی، اسی لئے، 1933 میں پولیس نے ان کو گرفتار کیا، اور بغاوت کے الزام میں دو سال قید کی سزا سنائی۔

بنگال میں انقلابی تحریک کے نئے نئے رجحانات بھی سامنے آئے مثلاً ایک یہ کہ خواتین نے بڑے پیمانے پر اس تحریک میں شرکت کی۔ سوریا سین کے گروہ میں، انہوں نے نہ صرف انقلاب پسندوں کو پناہ دی، بلکہ پیغام رساں اور اسلحہ بردار کے طور پر بھی کام کیا، اور ہاتھ میں بندوق لے کر برطانوی راج کے خلاف جنگ میں حصہ لیا۔ چٹاگونگ کے پہار تلی (Paharatali) میں واقع ریلوے انسٹی ٹیوٹ پر چھاپہ مارتے ہوئے پریتی لتا ودیدر کی موت ہوگئی، جب کہ کلپنا دتا اور سوریہ سین کو گرفتار کیا گیا، ان کے خلاف مقدمہ چلایا گیا اور عمر قید کی سزا سنائی گئی۔ دسمبر 1931 میں کومیلا کی دو طالبات، شانتی گھوش اور سونیتی چودھری نے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ فروری 1932 میں، بینا داس نے کانووکیشن میں ڈگری حاصل کرتے وقت گورنر پر گولی چلائی۔

پہلے مرحلے کے انقلاب پسندوں اور بھگت سنگھ اور اس کے ساتھیوں کے مقابلے میں چٹاگونگ کے باغیوں نے ایک اہم پیش قدمی کی۔ کسی فرد کے قتل کے بجائے، انہوں نے مجموعی طور پر نو آبادیاتی ریاست کی املاک کو نشانہ بنایا۔ دراصل، انقلاب پسند لوگ نوجوانوں کے سامنے ایک مثال قائم کرنا چاہتے تھے، اور افسر شاہی کے حوصلے پست کرنا چاہتے تھے۔ کلپنا جوشی (کلپنا دتا) کہتی ہیں کہ انقلاب پسندوں کا منصوبہ یہ تھا کہ چٹاگونگ بغاوت کے بعد حکومت چٹاگونگ پر قابض ہوگی، اور انقلابی لڑتے لڑتے مر کر ایک مثال قائم کریں گے۔ یا جیسا کہ سوریا سین نے آنند گپتا سے کہا ہے کہ 'نوجوانوں کے ایک سرشار گروہ کو انفرادی سرگرمی کی جگہ منظم اور مسلح جدوجہد کا راستہ اختیار کرنا چاہیے۔ ہم میں سے بیشتر لوگوں کو اس عمل میں مرنا پڑے گا لیکن اس عظیم مقصد کے لیے ہماری قربانی رائیگاں نہیں جائے گی۔'

چٹاگونگ اسلحہ خانے پر حملے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ شمالی ہندوستانی کے انقلاب پسندوں کے برعکس، بنگال کے نئے باغی گروہ مسلح بغاوت کے مقصد سے اجتماعی سرگرمی کی طرف رہے۔ اگرچہ وہ بڑے پیمانے پر مسلح بغاوت کو منظم کرنے میں ناکام رہے لیکن ان کی سرگرمیوں کی سمت واضح تھی۔ بنگال کے انقلاب پسند کبھی فرقہ پرست نہیں تھے۔ لیکن ان کا نظریہ ابتدائی مراحل میں ہندو مذہب سے جڑا ہوا تھا۔ 1920 اور 1930 کی دہائی کے انقلابیوں نے آہستہ آہستہ اس مذہبیت کو ختم کر دیا۔ اس کے بعد بہت سے گروہوں میں مسلمان بھی شامل ہوگئے۔ چٹاگونگ گروپ میں متعدد مسلمان شامل تھے جیسے ستار، میر احمد، فقیر احمد میاں اور تونو میاں۔ سوریا سین اور ان کے ساتھیوں کو مسلمان دیہاتیوں نے بڑے پیمانے پر مدد فراہم کی تھی، جس کی وجہ سے وہ تقریباً تین سال تک برطانوی راج کے خلاف مزاحمت کرنے میں کامیاب رہے۔ کلکتہ کے عبدالرزاق خان ایک باغی گروہ کے بانی تھے اور انہوں نے یوگانتر، انوشیلن اور دیگر انقلابی گروہوں کے ساتھ تعاون کیا تھا۔ سراج الحق اور حامد الحق کو انقلابی سرگرمیوں کے لیے انڈمان بھیجا گیا تھا۔ رضیہ خاتون سمیت بہت سے دوسرے مسلمان یوگنتر اور انوشیلن سمیتیوں سے وابستہ تھے۔ بوگرا کے ڈاکٹر فضل القادر چودھری کو، بجلی ڈکیتی کے سلسلے میں انڈمان بھیج دیا گیا۔ تاہم، بنگال کے انقلاب پسند لوگ ایک وسیع تر بنیاد پرست سماجی و معاشی پروگرام تیار کرنے میں ناکام رہے۔ اس کے علاوہ، سوراج پارٹی میں کام کرنے والے زیادہ تر

انقلاب پسند بھی زمینداروں کے خلاف کسانوں کی حمایت کرنے میں ناکام رہے۔

7.7 انقلابی تحریک کا زوال (Decline of the Revolutionary Movement)

دراصل، تشدد کا استعمال بحیثیت ایک سیاسی ہتھیار کے طور پر کسی بھی انقلابی تحریک کا ناکام کرنے کے لئے کافی تھا۔ انگریزوں کو باہر نکالنے کا اعلانیہ مقصد شاید ہی ان کو حاصل ہو سکتا تھا۔ لیکن انقلاب پسندوں نے قوم پرستی کے فروغ میں گراں قدر تعاون کیا۔ جیسا کہ ایک مورخ نے کہا ہے کہ "انہوں نے ہم میں ہماری جواں مردی کا فخر دوبارہ زندہ کیا۔" اپنی بہادری کی وجہ سے انقلاب پسند اپنے ہم وطنوں میں بے حد مقبول ہو گئے، حالانکہ سیاسی طور پر باشعور لوگوں کی اکثریت ان کے سیاسی طرز عمل سے متفق نہیں تھی۔ 1930 کی دہائی میں انقلابی تحریک بتدریج زوال کا شکار ہوتی چلی گئی۔ اس کے متعدد وجوہات تھے۔ گاندھی کی قیادت میں چلنے والی قومی تحریک کی مرکزی دھارا تشدد کے خلاف تھی، تاہم، متعدد کانگریس رہنماؤں نے انقلاب پسند نوجوانوں کو سراہا، عدالتوں میں ان کا دفاع کیا اور ان کے خلاف پولیس کے مظالم کی مذمت کی۔ حکومت کے سخت اقدامات نے بھی رفتہ رفتہ انقلاب پسندوں کی توانائی کو زائل کر دیا۔ 27 فروری 1931 کو الہ آباد کے ایک پبلک پارک میں پولیس کے ساتھ ایک مڈبھیڑ میں چندر شیکر آزاد کی موت کے ساتھ ہی، شمالی ہندوستان میں انقلابی تحریک کا عملی خاتمہ ہو گیا۔ سوریا سین کی شہادت سے بنگال میں انقلابی تحریک کا خاتمہ ہو گیا۔ قید خانوں میں انقلاب پسندوں نے اپنی سیاست کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنا شروع کیا۔ سیاسی مذاکرات اور حکومت ہند قانون 1935 کے نفاذ سے بھی انقلابی سرگرمیاں متاثر ہو گئی۔ دریں اثنا، انقلابیوں کی ایک بڑی تعداد نے مارکسزم کی طرف رجوع کیا، جیسا کہ 1920 کی دہائی میں بھگت سنگھ اور ان کے ساتھیوں نے کیا تھا۔ متعدد انقلاب پسندوں نے کمیونسٹ پارٹی، کانگریس، کانگریس سوشلسٹ پارٹی، ریوولیوشنری سوشلسٹ پارٹی اور بائیں بازو تحریکوں میں شمولیت اختیار کی۔

7.8 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

ریاستی جبر اور عوامی رد عمل کی وجہ سے انقلابی تحریک کی پہلی لہر زوال کا شکار ہو گئی۔ متعدد انقلاب پسندوں کو حکومت نے عام معافی کے تحت رہا کیا تاکہ مونٹ فورڈ اصلاحات (Montford Reforms) کے لیے ایک موثر فضا قائم کی جس کے 1920 میں عدم تعاون تحریک کے آغاز کے بعد، مہاتما گاندھی، چترنجن داس نے بہت سے انقلابی رہنماؤں سے درخواست کی کہ وہ عدم تشدد ترک کر کے عوامی تحریک میں شامل ہو جائیں اور اپنی تحریک کو معطل کر دیں۔ ملک میں نئی سیاسی صورتحال کے پیش نظر ناگپور اجلاس میں متعدد انقلاب پسندوں نے شرکت کی اور انڈین نیشنل کانگریس میں شمولیت اختیار کی۔ اس کے علاوہ، عدم تشدد پر مبنی عدم تعاون تحریک اور گاندھی کے منظر عام پر آنے سے انقلاب پسندوں میں ایک نئی امید پیدا ہو گئی۔ 27 فروری 1931 کو الہ آباد کے ایک پبلک پارک میں پولیس کے ساتھ ایک مڈبھیڑ میں چندر شیکھر آزاد کی موت کے ساتھ ہی، انقلابی تحریک کے دوسرے مرحلے کا عملی خاتمہ ہو گیا۔ اس کے بعد، سوریا سین کی شہادت نے بنگال میں اس تحریک کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا۔ مختلف قید خانوں میں نظربند انقلاب پسندوں نے اپنی سیاست کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنا شروع کیا، اور بڑی تعداد میں مارکسزم سے متاثر ہو کر سوشلسٹ انقلاب برپا کرنے کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اگرچہ 1920

اور 1930 کی دہائیوں کے انقلاب پسند رہنما بڑے پیمانے پر مسلح جدوجہد قائم کرنے اور عوام سے رابطہ قائم کرنے میں ناکام رہے، لیکن انہوں نے نوآبادیاتی حکومت کے خلاف جاری قومی جدوجہد میں اہم کردار ادا کیا۔ان کی ہمت، قربانی اور حب الوطنی نے ہندوستانی عوام کو بیدار کیا۔اس کے علاوہ، شمالی ہندوستان میں بھگت سنگھ اور ان کے ساتھیوں نے سوشلسزم اور مارکسزم کے بیج بوئے۔درحقیقت، انقلابی تحریک کا دوسرا مرحلہ نہ صرف رومانویت پسند اور احیاء پسند تھا بلکہ اس نے تحریک میں سوشلسٹ رجحان بھی تھا۔

7.9 کلیدی الفاظ (Keywords)

بالغان کی حق رائے دہی (Adult Franchise): 18 سال اور اس سے زیادہ عمر کے تمام شہریوں کا ووٹ دینے کا حق۔

کمیونزم : تاریخ کے آخری مرحلے کے بارے میں مارکس کا تجزیہ جو یک طبقاتی معاشرے اور عقیدۂ مساوات کا تصور پیش کرتا ہے۔

شہادت : جب کسی شخص کو اپنے مذہبی یا سیاسی عقائد کی وجہ سے قتل کیا جاتا ہے۔

مارکسزم : مارکس کے ذریعے پیش کردہ نظریات کا مجموعہ۔انہوں نے معاشرے کی ترقی سماج، سیاست اور ثقافت کے حوالے سے پیداواری قوتوں کے کردار پر زور دیا ہے۔

انقلابی تحریک : وہ تحریک جس میں تشدد کے ذریعے سماجی تبدیلی لانے کا دعوی کیا جاتا ہے۔

سوشلزم : کمیونزم کی طرف منتقلی کا ایک مرحلہ جس میں محنت کش طبقہ یا پرولتاریہ آمریت کا مطالبہ کرتا ہے جس کے زیر اثر وسائل اور دولت کو مساوی طور پر تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

7.10 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

7.10.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Very Short Answer Type Questions)

1. *New Lamps for Old* کس کی تصنیف ہے؟
2. چترنجن داس کی وفات کب ہوئی؟
3. غدر پارٹی پر ایک مختصر نوٹ لکھیے۔
4. 1907 میں انڈین نیشنل کانگریس کے سورت اجلاس کی صدارت کس نے کی؟
5. *The Philosophy of Bomb* کس نے لکھی ہے؟
6. بنگال انقلابی تحریک میں شامل مسلم رہنماؤں کے نام بتایئے؟
7. ہوم رول سوسائٹی کس نے قائم کی؟
8. تین اہم خفیہ تنظیموں کے بتایئے؟

9. چٹاگونگ اسلحہ خانے کی چھاپہ ماری کب واقع ہوئی؟
10. بنگال انقلابی تحریک میں شامل خواتین کے نام بتائے؟

7.10.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. بنگال میں انقلابیوں کی اہم سرگرمیوں کا جائزہ لیں۔
2. چٹاگونگ اسلحہ خانے پر حملے کی وجہ سے بنگال کے لوگوں پر کا کیا اثر پڑا؟
3. ہندوستان میں انقلابی تحریک کے زوال کے اسباب بیان کریں۔
4. انقلابی تحریک سے متعلق ابتدائی سرگرمیوں پر ایک مختصر نوٹ تحریر کریں۔
5. ہندوستان سوشلسٹ ریپبلکن ایسوسی ایشن کا تعارف پیش کیجیے۔

7.10.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. انقلابی تحریک کے ظہور کے اسباب بیان کیجیے۔
2. انقلابی تحریک کے اہم مراحل پر ایک تفصیلی مضمون تحریر کریں۔
3. شمالی ہند کی انقلابی تحریک میں نظریاتی پیشرفتوں پر بحث کیجیے۔

7.11 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Learning Resources)

1. Bandhopadhyay, Sekhar, *From Plassey to Partition: A History of Modern India*, Orient Longman Private Limited, 2004.
2. Banerjee-Dube, Ishita, *A History of Modern India*, Cambridge University Press, 2014.
3. Chandra, Bipan, *Nationalism and Colonialism in Modern India*, Orient Longman, New Delhi, 1979.
4. Chandra, Bipan et al, *India's Struggle for Independence*, Penguin, 2000.
5. Gaur, Ishwar Dayal, *Martyr as Bridegroom*: *A Folk Representation of Bhagat Singh*, Aakar, New Delhi, 2016.
6. Gohain, Hiren, *The Contribution of the Revolutionaries in India*'*s Freedom Struggle*, (trans. Amrit Jyoti Mahanta), National Book Trust, India, 2010.
7. Grover and Grover, *A New Look at Modern Indian History*, S Chand & Company Limited, 1983.
8. Heehs, Peter, *The Bomb in Bengal: The Rise of Revolutionary Terrorism in India 1900–1910*, Oxford University Press, New Delhi, 2004.
9. Heehs, Peter, *Nationalism*, *Terrorism*, *Communalism: Essays in Modern Indian History*, New Delhi: Oxford University Press, New Delhi, 2006.

10. Irfan Habib, S., *Th Make the Deaf Hear*: *Ideology and Programme of Bhagat Singh and His Comrades*, Three Essays Collective, New Delhi, 2007.
11. Juss, Satvinder Singh, *The Execution of Bhagat Singh*: *Legal Heresies of the Raj*, HarperCollins, Noida, 2021.
12. Metcalfe, Barbara D., *A Concise History of Modern India*, Cambridge University Press, New York, 2006.
13. Noorani, A.G., *The Trial of Bhagat Singh*: *Politics of Justice*, Oxford University Press, New Delhi, 2005, (first pub. in 1996).
14. Puri, Harish K., *Ghadar Movement*: *A Short History*, National Book Trust, 2012, India.
15. Sarkar, Sumit, *Modern India*, MacMillan, New Delhi, 1982.

اکائی 8۔ قوم پرستی اور ہندوستانی سرمایہ دار طبقہ

(Nationalism and the Indian Capitalist Class)

اکائی کے اجزا

8.0 تمہید

8.1 مقاصد

8.2 ہندوستانی سرمایہ دار طبقہ کے اوصاف

8.3 ہندوستانی سرمایہ دار طبقہ کا سیاسی رجحان: مختلف آراء

8.4 فکی (FICCI) کا قیام

8.5 ہندوستانی سرمایہ دار طبقہ اور قومی تحریک

8.5.1 کانگریس پر سرمایہ دار طبقے کے اثرات پر بحث

8.6 ہندوستانی سرمایہ دار طبقہ اور بائیں بازو کا ابھار

8.7 اکتسابی نتائج

8.8 کلیدی الفاظ

8.9 نمونہ امتحانی سوالات

8.9.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

8.9.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

8.9.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

8.10 تجویز کردہ اکتسابی مواد

8.0 تمہید (Introduction)

ملک کے مختلف طبقوں کے لوگوں کے ساتھ مل کر سرمایہ دار طبقہ کے بہت سے لوگوں نے قومی تحریک میں حصہ لیا تھا۔ان میں سے کئی ایک نے کانگریس کے اندر اپنی پہچان بنالی تھی۔وہ جیل گئے تھے اور دیگر کانگریسیوں کے ساتھ انہوں نے انگریزی حکومت کی سختیاں جھیلی تھیں۔اس سلسلہ میں جمنالال بجاج (Jamnalal Bajaj)، وڈی لال گاندھی(Vadilal Gandhi)،للو بھائی سامل داس مہتا (Lallubhai Samaldas Mehta)،سیموئل آرون(Samuel Aaron)لالہ شنکر لال (Lala Shankar Lal)وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔کچھ ایسے بھی سرمایہ دار تھے جو کانگریس میں شامل تو نہیں تھے مگر باہر رہ کر ذاتی طور سے کانگریس کی مالی امداد کرتے اور دوسرے طریقوں سے تعاون دیتے تھے۔اس گروپ میں گھن شیام داس بڑلا(Ghanshyam Das Birla)، امبالال سارابھائی (Ambalal Sarabhai) اور والچند ہیراچند(Walchand Hirachand) وغیرہ تھے۔ان کے علاوہ چھوٹے چھوٹے ساہوکار اور تاجر تھے جو یا تو غیر جانبدار تھے یا کانگریس اور قومی تحریک کی مخالفت میں سرگرم تھے۔اس اکائی میں ہم یہ نہیں دیکھیں گے کہ انفرادی طور پر کس سرمایہ دار کا قومی تحریک میں کتنا تعاون تھا اور بحیثیت سرمایہ دار اس سلسلہ میں اس نے کون سے کام کیے تھے بلکہ ہم اس بات کا تجزیہ کریں گے کہ ہندستانی سرمایہ داروں نے طبقاتی حیثیت سے قومی تحریک کے لیے کیا حکمت عملی اپنائی تھی۔

8.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- ہندوستانی سرمایہ دار طبقہ کی اہم خصوصیات سے واقف ہو سکیں گے۔
- ہندوستانی سرمایہ دار طبقہ کے سیاسی رجحانات پر مختلف نظریوں کا تجزیہ کر سکیں گے۔
- فکی(FICCI)کے قیام کے بارے میں جان سکیں گے۔
- ہندوستانی سرمایہ دار طبقے اور قومی تحریک میں ان کے کردار کا جائزہ لے سکیں گے۔
- کانگریس پر سرمایہ دار طبقے کے اثرات پر بحث کر سکیں گے۔
- بائیں بازو کے ابھار سے متعلق ہندوستانی سرمایہ دار طبقے کی پالیسی کو جان سکیں گے۔

8.2 ہندوستانی سرمایہ دار طبقہ کے اوصاف (Characteristics of the Indian Capitalist Class)

ہندوستان میں سرمایہ دار طبقے کے کچھ مخصوص اوصاف تھے۔نوآبادیاتی حکومت(Colonial Rule)کے دوران ہندستانی سرمایہ دار طبقہ کی ٹھوس معاشی ترقی ہوئی تھی،اور اس کی ترقی کی یہ شکل دوسرے نوآبادیاتی ملکوں کی مالی ترقی سے بالکل مختلف تھی،اور اسی غیر معمولی صورت حال کی وجہ سے سامراجیت (Imperialism) کے سامنے ہندستانی سرمایہ داری کی حالت کافی مختلف تھی۔ہندستانی سرمایہ داروں کی ترقی انیسویں صدی کے وسط سے شروع ہوگئی تھی اور آزادانہ طریقہ سے کم و بیش وہ اپنی پونجی کا استعمال کرتے تھے۔وہ غیر

ملکی سرمایہ کی بیساکھی پر کام نہیں کر رہے تھے اور نہ ہی وہ غیر ملکی سرمایہ داروں کے مقامی ایجنٹ کی حیثیت سے کام کرتے تھے۔ ہندستانی سرمایہ دار طبقہ نہ تو سیاسی اور نہ ہی مالی اعتبار سے برطانوی سامراج کا تابع تھا کہ وہ جاگیر دارانہ مفاد میں کام کرنے کے لیے مجبور کیا جا سکے۔ در حقیقت سرمایہ داروں نے 45-1944 میں اپنے بامبے پلان (Bombay Plan) میں زرعی سدھار، مشترکہ کھیتی، زر اور خرید و فروخت کو بڑے پیمانہ پر شامل کیا تھا۔ اس پلان پر جہانگیر رتن جی دادا بھائی ٹاٹا (Jehangir Ratanji Dadabhoy Tata)، پرشوتم داس ٹھاکرداس (Purshottamdas Thakurdas)، گھن شیام داس بڑلا (Ghanshyam Das Birla)، اردشیر دلال (Ardeshir Dalal)، لالا شری رام (Lala Shri Ram)، کستور بھائی لال بھائی (Kasturbhai Lalbhai)، اردشیر داراب شا شراف (Ardeshir Darabshaw Shroff) اور جان متھائی (John Mathai) کے دستخط تھے۔

1914 سے 1947 کے دوران ہندوستان کے سرمایہ دار طبقہ نے بڑی تیزی سے ترقی کی تھی۔ اس کی طاقت میں اضافہ ہوا تھا اور اس میں خود اعتمادی پیدا ہوئی تھی اور یہ سارے کام اس نے یورپی اجارہ داری کو توڑ کر اور غیر ملکی درآمد کی جگہ ملکی پیداوار کی حصے داری بڑھا کر کیے تھے۔ 1920 کی دہائی سے نئے علاقوں میں زیادہ تر سرمایہ کاری ہندستانی سرمایہ داروں نے کی تھی۔ ملک کو آزادی ملنے کے دنوں میں تو حالات یہ ہو گئے تھے کہ ملکی بازار پر 72، 73 فیصدی تک ہندستانی سرمایہ داروں کا ہی کنٹرول تھا۔ منظم بینکنگ (organised banking) شعبے کی کل جمع رقم کا 80 فیصد پیسہ انہیں کا ہوتا تھا کسی نوآبادیاتی ملک کے سرمایہ دار طبقہ کی غیر معمولی ترقی نوآبادیاتی حکومت کی وجہ سے نہیں ہوئی تھی جیسا کچھ لوگ تصور کرتے ہیں۔ یہ ترقی نوآبادیاتی حکومت سے بغیر سمجھوتہ کیے حاصل کی گئی تھی۔ ہندستانی سرمایہ دار نوآبادیاتی حکومت کے مفاد کے خلاف جدوجہد کرنے کا حمایتی ہی نہیں تھا بلکہ اس کے بازار پر بھی قبضہ کرنے کی جرات کر رہا تھا۔

بعض لوگوں کی سوچ کے برعکس ہندستانی سرمایہ داروں کے مالی مفاد یا طبقاتی حالت میں کوئی ایسی چیز نہیں تھی جو ان کو برطانوی سامراج کی مخالفت کرنے سے باز رکھے ہو؟ دراصل 1920 کی دہائی کے وسط تک ملکی سرمایہ دار اپنے طبقہ کے مفاد کے بارے میں سوچنے لگے تھے اور برطانوی سامراج مخالف مضبوط رجحان پروان چڑھ رہا تھا۔ اس معاملہ میں اس طبقہ نے جو تھوڑی بہت جھجک کھائی، وہ برطانوی سامراج کی مخالفت کے بارے میں نہیں بلکہ اس بات پر تھی کہ حکومت سے لڑنے کے لیے مختلف طریقوں میں سے کس طریقہ کو اختیار کیا جائے۔ سرمایہ داروں کو خدشہ یہ تھا کہ کیا ان کے ذریعہ اختیار کیا گیا طریقہ خود کش اور ان کے وجود کے لیے نقصان دہ تو نہیں ثابت ہوگا۔ سامراجیت اور سامراجیت مخالف تحریک کے تئیں سرمایہ دار طبقہ کے کردار پر تبصرہ کرنے سے پہلے ہم یہ غور کریں گے کہ اس طبقہ نے سیاست کے میدان میں اپنی پہچان کس طرح بنائی۔

8.3 ہندوستانی سرمایہ دار طبقہ کا سیاسی رجحان: مختلف آراء
(The Political Attitude of the Indian Capitalist Class: Different Views)

انیسویں صدی کے آخر سے، ہندوستانی سرمایہ دار طبقہ، خصوصاً ایک صنعتی بورژوازی (*bourgeoisie*)، آہستہ آہستہ سیاست

میں زیادہ ترقی یافتہ اور بااثر ہوتی جارہی تھی۔ پہلی جنگ عظیم کے خاتمے تک مختلف وجوہات کی بنا پر رجسٹرشدہ صنعتی اداروں کی تعداد میں مسلسل اضافہ ہورہا تھا، جب کہ جنگ کے دوران آنے والے اتار چڑھاؤ کی وجہ سے ان کی پوزیشن مزید مضبوط ہوگئی۔ معتدل ہندوستانی صنعتی ترقی میں رکاوٹ ڈالنے والی غیر ملکی نوآبادیاتی حکومت کے باوجود، بہت سے مددگار عوامل بھی تھے، جیسے اشیائے ضرورت کے ملکی متبادل کی طرف بڑھتا ہوا رجحان، گھریلو منڈیوں کی طرف توجہ، اندرونی تجارت میں اضافہ، تجارت، سودی کاروبار اور زمینی ملکیت کے ذریعے روایتی طور پر جمع شدہ سرمائے کی صنعتی سرمایہ کاری کی طرف منتقلی اور غیر ملکی سرمائے کے اخراج نے مقامی کاروباریوں کے لیے کافی جگہ پیدا کی۔ 1944 تک، تقریباً 62 فیصد بڑی صنعتی اکائیوں، جن میں ایک ہزار سے زیادہ مزدور کام کرتے تھے اور ان کی 58 فیصد مزدوری قوت پر ہندوستانی سرمایہ کا قبضہ ہوچکا تھا۔ صنعتی شعبے کے 95.3 فیصد پر مشتمل چھوٹے کارخانوں پر ہندوستانی سرمایے کا، آدتیہ مکھرجی کے لفظوں میں 'مکمل تسلط' تھا۔ یہ ترقی اس وقت ہوئی جب ہندوستانی سرمایہ، ان صنعتی میدانوں میں لگایا گیا جو ابھی تک غیر ملکی سرمائے کے ذریعہ ترقی یافتہ نہیں ہوسکے تھے، جیسے چینی، کاغذ، سیمنٹ، لوہا اور اسٹیل وغیرہ۔ ہندوستانی سرمایہ ایسے شعبوں میں بھی داخل ہوا جن پر طویل عرصے تک غیر ملکی سرمائے کا غلبہ تھا، جیسے فائنانس، انشورنس، جوٹ، کان کنی، اور باغان وغیرہ۔ ساتھ ہی اس نے اپنے آپ کو ان روایتی شعبوں جیسے کپاس وغیرہ میں بھی مضبوط کیا جو پہلے ہی اس کے تصرف میں تھے۔ درحقیقت، سب سے زیادہ شاندار کپاس کی صنعت کا عروج تھا، جو اب گھریلو صارفین کی ضروریات پوری کررہی تھی، اور جس نے 1919 تک مانچسٹر کی بازاری حصے داری (market share) کو 40 فیصد سے کم کردیا تھا۔

ہندوستانی صنعت کاری میں یہ ترقی نوآبادیاتی حکومت کی وجہ سے نہیں ہوئی، بلکہ اس کے مخالفانہ رویے کے باوجود ہوئی۔ ہندوستانی کاروباریوں کی پچھلی نسل، جو غیر ملکی سرمائے پر بری طرح منحصر تھی اور اس کے تسلط کو ساتھ ہی ایک بھید بھاؤ کرنے والی نوآبادیاتی ریاست کی حقیقت کو تسلیم کرنے کے لیے تیار تھی۔ تاہم، صنعت کاروں کی نئی نسل، جو ایک وسیع سماجی بنیاد سے آتی تھی، زیادہ ترقی یافتہ اور اپنے حقوق کو چھوڑنے کے لیے بہت کم ہی آمادہ ہوتی تھی۔ اپنی حیثیت کو مستحکم کرنے کے لیے انھوں نے خود کو منظم کرنا شروع کیا اور یوں 1887 میں 'Bengal National Chamber of Commerce' اور 1907 میں بمبئی میں 'Indian Merchants' Chamber'، وجود میں آئے۔

اب سوال یہ ہے کہ اس مرحلے پر ہندوستانی کاروباری برادری کا سامراج کے مقابلے میں قوم پرستی کی طرف سیاسی رویہ کیسا تھا؟ مورخین اس مسئلہ پر منقسم نظر آتے ہیں۔ ایک طرف بپن چندر (Bipan Chandra) کا خیال ہے کہ 'ہندوستانی سرمایہ دار طبقے نے سامراج کے ساتھ ایک طویل مدتی اختلاف رکھا تھا جب کہ اس کے ساتھ ہی قلیل مدتی انحصار اور رفاقت کا رشتہ بھی برقرار رکھا تھا۔' سرمایہ دار طویل مدت میں ہی سہی، سامراجی استحصال کے خاتمے اور ایک قومی ریاست کے قیام کی خواہش رکھتے تھے۔ لیکن اپنی ساختی کمزوریوں اور نوآبادیاتی حکومت پر انحصار کی وجہ سے انھوں نے دباؤ کو سمجھوتے کے ساتھ ملا کر ایک دانشمندانہ حکمت عملی وضع کی۔ انھوں نے محفوظ اور قابل قبول حدود کے اندر قوم پرست تحریک کو ترجیح دی، جس کی رہنمائی بائیں بازو کے انتہا پسندوں کے بجائے، دائیں بازو کے اعتدال پسندوں

کے قابل اعتماد ہاتھوں میں ہو۔

اسی نظریے کو آدتیہ مکھرجی (Aditya Mukherjee) نے مزید ترقی دی ہے، جو کہ سامراجیت کو اکھاڑ پھینکنے اور سرمایہ داری کو برقرار رکھنے کے لیے 'کثیر جہتی' سرمایہ دارانہ حکمت عملی کے بارے میں بات کرتے ہیں۔ سرمایہ دار بھلے ہی منظم محنت، بائیں بازو کی انتہا پسندی اور عوامی تحریک سے خوفزدہ تھے، لیکن ان کے خلاف حفاظت کے طور پر انہوں نے سامراجیت کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالے۔ انہوں نے قوم پرست تحریک کی آئین پرستی کے راستہ کی طرف رہنمائی، دائیں بازو والوں کی سرپرستی اور اس طرح 'بورژوا نظریاتی بالادستی' کے تحت رہنے والی ایک کانگریس کی پیروی کرنے کے لیے طبقاتی حکمت عملی تیار کی۔

اُس مارکسی نظریے کو، جو سرمایہ داروں کو ایک ترقی یافتہ طبقے کے طور پر دیکھتا ہے جس کے پاس ایک اچھی طرح سے متعین سامراج مخالف نظریہ ہے، دیگر مورخین شک و شبہ سے دیکھتے ہیں۔ مثال کے طور پر ان کے بارے میں باسودیو چٹرجی (Basudev Chatterji) زیادہ واضح 'سیاسی' فکر رکھتے ہیں۔ ان کے خیال میں، 'ہندوستانی کاروباری گروہ بہت زیادہ وفادار تھے۔' اے۔ ڈی۔ ڈی۔ گورڈن، (A.D.D. Gordon) بمبئی کے کاروباری گروپوں کا تجزیہ کرتے ہوئے تاجروں اور صنعت کاروں کے درمیان فرق واضح کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں پہلے والے زیادہ قوم پرست تھے جب کہ بعد والے 'حکومت کے روایتی اتحادی' تھے۔ کلاؤڈ مارکوورس (Claude Markovirs) نے بھی اسی طرح کے اختلافات کا مشاہدہ کیا ہے، لیکن ان کے مطابق اس کے ساتھ ہی ایک طویل عرصے کے دوران ہندوستانی کاروباریوں کے مختلف گروہوں کے سیاسی اطوار میں قوم پرستی اور کانگریس کو لے کر مصالحت اور تبدیلی بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔ جہاں تک نوآبادیاتی حکام کا تعلق ہے، رجت رے (Rajat Ray) نے مشاہدہ کیا ہے کہ، ہندوستانی کاروباری 'ایک ہی وقت میں تعاون کرنے والے اور مخالف' دونوں تھے۔ اس طرح ان کا یہ رویہ کسی بھی صاف صاف عام رائے دینے (clear-cut generalisation) کے راہ میں آڑے آتا ہے۔ مجموعی طور پر، دوجیندر ترپاٹھی (Dwijendra Tripathi) کا ماننا ہے کہ کسی کی بھی مخالفت یا اجنبی ہو جانے کے خوف سے، کانگریس یا حکومت میں سے کسی ایک کے حق میں جھکاؤ سے گریز اور مساوی دوری (equi-distance) کی پالیسی کو برقرار رکھ کر کسی بھی آنے والے مسئلے کے ضمن میں کاروباری سیاست کی رہنمائی ایک 'عملی نقطہ نظر' کے ذریعے کی جاتی تھی۔ ان کے خیال میں سرمایہ دارانہ 'عظیم حکمت عملی' کی بات کرنا مبالغہ آرائی ہے۔

ان بیانات سے جو بات ظاہر ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ بیسویں صدی کے پہلے نصف میں ہندوستانی کاروباری بمشکل اپنے لیے ایک طبقہ بنا سکے تھے۔ وہ متحد نہیں تھے اور منقسم مفادات، متصادم نظریات اور متضاد حکمت عملیاں رکھتے تھے۔ اس دور میں ان کی سیاست پر عمومی طور پر بات کرنا مشکل ہے۔ لہٰذا، ہم قوم پرستی یا سامراج کے لیے متحدہ سرمایہ دارانہ نظریے یا سیاسی پالیسی کی نشاندہی کرنے کی بجائے ان پیچیدگیوں کو سمجھنے کی کوشش کریں گے۔ پہلی جنگ عظیم اور اس کے فوراً بعد کا عرصہ ہندوستانی کاروباری طبقوں کے لیے ملا جلا سا تھا۔ جنگ کے دوران ہونے والی ترقی کی وجہ سے جہاں صنعتکار خوشحال ہوئے، وہیں تاجروں کو کرنسی کے اتار چڑھاؤ اور بڑے سمجھوتوں کی وجہ سے نقصان اٹھانا پڑا۔

دسمبر 1920 میں روپیہ گر گیا، جس سے ہندوستانی درآمد کنندگان(Indian importers) کو ان کے پچھلے معاہدوں پر تقریباً 30 فیصد تک کے ممکنہ نقصان کا خطرہ لاحق ہوا لیکن اس کے برعکس اس سے ہندوستانی برآمد کنندگان(Indian exporters) اور مل مالکان کا فائدہ ہوا۔ جنگ کے دور کے زیادہ محصول نے سب کو متاثر کیا، لیکن آمدنی محصول کے قانون(Income Tax Law) میں خصوصی تبدیلیوں نے مقامی مشترکہ خاندانی کاروباروں کو نقصان پہنچایا، کیونکہ ان کا حساب کتاب کا نظام(accounting system) نئے قانون کے تحت محصول گوشوارے جمع کرانے(filing tax returns) کی ضروریات کے مطابق نہیں تھا۔ حالانکہ مارواڑی اور گجراتی تاجر حکومت کی محصولات(taxation) اور نظام زر(currency) کی پالیسیوں سے ناراض تھے، لیکن صنعتکار اور بڑے تاجر کم فکر مند تھے، کیونکہ حکومت بھی ان کی حمایت خریدنے کی بھرپور کوشش کر رہی تھی۔

1919 میں مانٹیگو چیمسفوڈ اصلاحات(Montagu-Chelmsford Reforms) نے مفاد پر مبنی نمائندگی کا نظام (interest representation) متعارف کرایا اور اس طرح مرکزی اور صوبائی مقننہ میں مزدوروں کی نمائندگی کے ساتھ ساتھ ہندوستانی کاروباریوں کو بھی نمائندگی حاصل ہوئی۔ علاوہ ازیں، 1919 میں مالیاتی خود مختاری کنونشن (Fiscal Autonomy Convention)، اور 1922 کے بعد امتیازی تحفظ(discriminatory protection) کی پالیسی کے وعدے نے حفاظتی محصولات(protective tariffs) کی امید پیدا کی۔ لہذا، جب گاندھی جی کی آمد کے ساتھ بڑے پیمانے پر قوم پرست تحریک شروع ہوئی، تو اس کو ہندوستان کی کاروباری برادریوں سے ملا جلا ردعمل ملا۔ کچھ پکے مذہبی مارواڑی اور گجراتی تاجر اور نئے کاروباری افراد، گاندھی کی طرف متوجہ ہوئے کیونکہ وہ اس کے لیے جینی اور ویشنو فلسفے میں مشترک بنیاد پا سکتے تھے۔ عدم تشدد پر گاندھی کا زور کسی بھی قسم کی سیاسی انتہا پسندی کے خلاف یقین دہانی کر رہا تھا اور ان کے تولیت(trusteeship) کے نظریے نے دولت کو قانونی حیثیت دی۔ اس طرح اگرچہ گاندھیائی نظریہ سرمایہ دارانہ مفادات پر مبنی نہیں تھا، لیکن اس کے کچھ تصورات ان کے لیے پرکشش تھے۔ اس لیے انہوں نے خوشی خوشی گاندھی جی کے تعمیری منصوبوں میں حصہ ڈالا اور کچھ بڑے تاجر جیسے جی ڈی برلا یا جمنالال بجاج ان کے قریبی ساتھی بن گئے۔ تاہم کچھ سرمایہ دار اس سے ناخوش بھی تھے، خاص طور پر احمد آباد کے مل مالکان جیسے امبالال سارابھائی 1918 کی مزدور ہڑتال میں گاندھی کی قیادت کے طور طریقوں سے پوری طرح خوش نہیں تھے، حالانکہ گاندھی نے کسی نہ کسی طرح اس رکاوٹ پر قابو پالیا، کیونکہ ہندوستانی کاروباریوں نے اچھی طرح جان لیا تھا کہ صرف وہی ہیں جو کانگریس کو سرمایہ دار مخالف بننے سے روک سکتے ہیں۔

پھر بھی، 1919 میں جب رولٹ ستیہ گرہ شروع ہوا تو صنعت کاروں کو شک ہی رہا، حالانکہ بمبئی کے تاجروں نے اس کی بھرپور حمایت کی۔ جب اپریل میں گاندھی کو گرفتار کیا گیا تو بمبئی شہر میں مکمل کاروباری ہڑتال تھی اور جب عدم تعاون کی تحریک شروع ہوئی تو کپاس کے تاجروں نے دوبارہ بائیکاٹ تحریک کی حمایت کی اور تلک سوراج فنڈ میں دل کھول کر چندہ دیا۔ لیکن دوسری طرف بہت سے صنعت کار خاموش رہے یا انہوں نے عوامی تحریک کی کھلے عام مخالفت کی۔ پرشوتم داس ٹھاکر داس کی سرپرستی میں اور آر ڈی ٹاٹا کے پیسوں سے بمبئی میں ایک عدم تعاون مخالف انجمن(Anti-Non-cooperation Society) شروع کی گئی۔

کاروباری برادری میں تقسیم بمبئی سے زیادہ واضح طور پر کہیں اور نظر نہیں آتی تھی، جہاں 1920 اور 1921 میں انڈین مرچنٹس چیمبر میں صنعتکاروں کا غلبہ دو مرتبہ خطرے میں آیا تھا-پہلی بار کونسل کے بائیکاٹ کے معاملے پر اور پھر پرنس آف ویلز کے دورے کے وقت ہدیہ تشکر پیش کرنے پر جس کا کانگریس بائیکاٹ کرنا چاہتی تھی۔ واضح طور پر، تاجر کانگریس کے ساتھ تھے اور کانگریس کو بھی ان کی حمایت کی ضرورت تھی، کیونکہ ان کے بغیر بائیکاٹ تحریک کی کامیابی کے امکانات کم تھے۔

8.4 فکی کا قیام (Foundation of the FICCI)

1920 کی شروعات سے ہی گھن شیام داس برلا اور پرشوتم داس ٹھاکر جیسے کئی سرمایہ دار قومی سطح کی ایک ایسی تنظیم بنانے کی کوشش کر رہے تھے جو انگریزی حکومت کے سامنے اپنے مطالبات کو موثر طریقے سے پیش کر سکے۔ اس وقت ہندوستان میں یورپی مفاد کی نمائندگی منظم طریقے سے ہو رہی تھی اور ہندستانی سرمایہ دار اس کے مدمقابل اپنی تنظیم بنانا چاہتے تھے۔ ان کی کوششیں 1927 میں کامیاب ہو گئیں جب 'Federation of Indian Chambers of Commerce and Industry' یعنی فکی (FICCI) نام کی تنظیم وجود میں آئی اور بہت جلد اس نے خاصی قوت حاصل کر لی۔ یہ پورے ملک کے تاجروں کی نمائندگی کرتی تھی۔ چند دنوں میں ہی اسے انگریزی حکومت اور ہندستانی عوام کے ذریعہ منظوری بھی مل گئی اور اس کو ہندستانی سرمایہ داروں کی نمائندگی کرنے والی باقاعدہ تنظیم تسلیم کر لیا گیا۔

سرمایہ دار طبقہ کے افراد، فکی (FICCI) کو ہندستانی تجارت، صنعت و حرفت کا قومی سرپرست تصور کرنے لگے۔ انہوں نے اس کو نوآبادیاتی ہندوستان کے معاشی معاملوں میں قومی کردار نبھانے والی تنظیم بھی تسلیم کرنا شروع کر دیا۔ دھیرے دھیرے ہندستانی سرمایہ دار تمام معاشی معاملات میں حکومت کی پالیسیوں کی مخالفت کرنے لگے۔ یہاں تک کہ غیر مساوی پیداوار والے ملکوں کے درمیان تجارت کے بارے میں زرمبادلہ میں تفاوت (فرق) کی بات بھی اسی وقت اٹھائی گئی تھی۔ گھن شیام داس برلا اور ایس۔ پی۔ جین (S.P. Jain) نے بھی 1930 میں یہ مسئلہ اٹھایا تھا۔ مزید برآں کانگریسی نیتاؤں نے متعدد بار کئی قومی مسئلوں میں ان سرمایہ داروں کے تعاون کو بے حد قیمتی اور اہم بتایا، ساتھ ہی ملک کے معاشی معاملوں میں ان سے رائے مانگی اور ان کے مشوروں کی قدر کی۔ سرمایہ دار، فکی کو محض اپنے طبقہ کی بھلائی اور ملک کے مالی مفاد کے لیے جدوجہد کرنے والی منظم تجارتی تنظیم (organised trade union) ہی نہیں مانتے تھے بلکہ ان کے رہنماؤں کو اب یہ احساس ہو گیا تھا کہ اس کو سیاست میں داخل ہو کر سرگرم کردار نبھانا چاہیے۔ اسی لیے 1928 میں فکی کے دوسرے اجلاس میں اس کے صدر نے یہ اعلان کیا کہ 'ہم اب اپنی مالی پالیسی کو سیاست سے الگ نہیں رکھ سکتے... ہندستانی تجارت، صنعت اور حرفت، قومی تحریک سے منسلک ہیں۔ قومی تحریک جتنی مضبوط ہو گی اور جتنی ترقی کرے گی، اسی تناسب میں ہندستانی تجارت، صنعت و حرفت بڑھے گی اور ترقی کرے گی۔' اس کے بعد 1930 میں گھن شیام داس برلا نے کم و بیش وہی بات دوہرائی کہ 'موجودہ سیاسی حالات میں سرکار کو اپنی طرف موڑنا ممکن نہیں ہے، اب ایک ہی چارہ ہے کہ ہندوستان کے تجارت پیشہ لوگ ان لوگوں کا ہاتھ مضبوط کریں جو ملک کی آزادی کے لیے لڑ رہے ہیں۔'

8.5 ہندوستانی سرمایہ دار طبقہ اور قومی تحریک

(Indian Capitalist Class and the Indian National Movement)

بہر حال، جیسا پہلے کہا جا چکا ہے کہ حکومت کے خلاف کس طرح جنگ کی جائے، اس کے بارے میں سرمایہ دار طبقہ کا اپنا نظریہ تھا۔ یہ طبقہ عام نافرمانی کی عام تحریک کے بر خلاف آئین کے تحت رہ کر بات چیت کے ذریعہ معاملات کو سلجھانے کے حق میں تھا۔ اس نظریہ کے کئی اسباب تھے۔ پہلا سبب تو یہ تھا کہ سرمایہ داروں کو یہ خدشہ لاحق تھا کہ اگر عام نافرمانی تحریک لمبی کھنچ گئی تو یہ انقلابی شکل اختیار کر لے گی، پھر تو ان کی سرمایہ داری خطرہ میں پڑ جائے گی۔ لال جی نارائن جی (Lalji Narayanji) نے مارچ 1930 میں پرشوتم داس کو لکھا تھا کہ 'اس سے نجی دولت کو بھی خطرہ لاحق ہوگا اور اس کے نتائج بہت برے ہوں گے۔ مستقبل میں دیسی سرکاروں کو بھی اس خطرہ کا مقابلہ کرنا پڑ سکتا ہے۔' اس طرح سرمایہ داروں کو جب بھی یہ احساس ہوتا کہ قومی تحریک خطرناک رخ اختیار کر رہی ہے، تو وہ اس کو آئینی مزاحمت کی حد میں لانے کی ہر چند کوشش کرتے تھے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ سرمایہ دار طبقہ حکومت کے خلاف لمبی مدت تک تحریک کی حمایت کرنے سے گھبراتا تھا کیونکہ اس سے اس کی روزمرہ کی تجارتی سرگرمی متاثر ہوتی تھی اور اس کو محسوس ہوتا کہ تحریک کا یہ رخ اس کے طبقاتی وجود کے لیے خطرہ بن رہا ہے۔

حالانکہ سرمایہ داروں کے ذریعہ کی جارہی آئینی سرگرمیوں مثلاً اسمبلیوں اور کانفرنسوں میں شرکت یا وائسرائے کی انتظامیہ کمیٹی میں نمائندگی کا یہ مطلب نہیں تھا کہ ہندوستان کا سرمایہ دار طبقہ حکومت کا پٹھو بن گیا تھا یا کم اس کے سامنے ہتھیار ڈال چکا تھا۔ اس کے لیے قومی تحریک کے سارے طریقے حکومت کی مخالفت کرنے کے ذرائع تھے اور اس کے خیال سے ان ذرائع سے منہ پھیرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ برطانوی حکومت بے لگام ہو کر کام کرے گی جس کی وجہ سے ملک کی معیشت اور مقامی سرمایہ داروں کی مالی حالت بری طرح متاثر ہوگی۔ پھر بھی سرمایہ دار طبقہ نے کسی بھی آئینی سدھار کو بلا چون وچرا قبول نہیں کیا۔ کانفرنسوں اور اسمبلیوں میں بھی اس کی شراکت بلا شرط نہیں ہوتی تھی۔ اپنی شرطوں پر ہی یہ طبقہ ان سب میں حصہ لیتا تھا یا کسی اصلاحی پروگرام کو منظوری دیتا تھا۔ اپنے اصولوں سے اس نے کبھی سمجھوتہ نہیں کیا۔ جب بھی اس نے دیکھا کہ حکومت اس کو قومی مانگ سے بھی کم دے رہی ہے، اس نے اس کو منظور نہیں کیا۔ اسی وجہ سے فکی نے 1934 میں ہندوستان میں آئینی سدھار کے لیے 'Parliamentary Committee on Constitutional Reform' کی رپورٹ کو مسترد کر دیا تھا اور اس کو 'White Paper' کی تجاویز سے زیادہ دقیانوسی اور رجعت پسند بتایا تھا۔

آئینی جدوجہد کے تئیں سرمایہ دار طبقہ چاہے جتنا خواہشمند رہا ہو، وہ اسمبلیوں میں بلا شرط، شریک ہونے کو فضول سمجھتا تھا۔ 1934 میں فکی کے صدر نالنی رنجن سرکار (Nalini Ranjan Sarkar) نے کہا کہ اسمبلیوں میں شرکت تبھی فائدہ مند ہوگی جب پوری قوم اس میں حصہ لے۔ سرمایہ داروں نے شاید ہی کبھی بغیر کانگریس کی شرکت یا رضامندی کے مالی اور آئینی معاملوں میں بات چیت کی ہو، کسی سمجھوتہ یا تصفیے پر پہنچنا تو بہت دور کی بات تھی۔ 1930 میں فکی نے حریت پسندوں (Liberals) کی منشا کے بالکل برعکس اپنے

اراکین کو گول میز کانفرنس(Round Table Conference)میں حصہ لینے سے منع کیااور کہا کہ آئینی معاملہ میں کوئی بھی کانفرنس تب تک کامیاب نہیں ہوسکتی جب تک کہ گاندھی اس میں شرکت نہیں کرتے یا کم سے کم اس طرح کی کسی کانفرنس کے لیے ان سے منظوری نہیں لی جاتی ہے۔ سرمایہ دار طبقہ اچھی طرح جانتا تھا کہ صرف کانگریس ہی کچھ حاصل کر سکتی ہے۔ وہ یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ گول میز کانفرنس میں ہندوستان کی نمائندگی ٹکڑوں یا بنٹے ہوئے گروہوں میں ہو۔ نومبر 1929 میں امبالال سارابھائی نے کہا کہ 'کانگریس کی مدد کے بغیر حکومت آپ کی کوئی بات نہیں سنے گی۔'

حقیقت میں آئینی نظام کا قیام(Constitutionalism)سرمایہ دار طبقہ کا مقصد نہیں تھااور نہ وہ تھوڑا تھوڑا کرکے اس کو حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اگرایسی بات ہوتی تو وہ حریت پسندوں کے ساتھ ہوتااور اس کانگریس کے ساتھ نہ ہوتا جو بار بار جدوجہد کے نئے آئینی طریقے اپنارہی تھی اور اس میں عام نافرمانی تحریک بھی شامل تھی۔ جدوجہد کے دوسرے طریقے اپنانے کے امکانات سے بھی اس طبقہ نے کبھی انکار نہیں کیا۔ اس کے نزدیک آئینی حصہ داری صرف منزل کی طرف بڑھنے کا ایک قدم تھا۔ اس کے حصول کے لیے دوسرے اور اقدامات بھی ضروری ہو سکتے تھے۔ مثلاً 1937 میں گھن شیام داس برلا جنہوں نے حکومت میں شرکت کرنے کے لیے کانگریس کو راضی کرنے میں سخت محنت کی تھی اور لارڈ ہیلی فیکس(Lord Halifax)اور لارڈ لوتھین(Lord Lothian)کو خبردار کرتے ہوئے کہا تھا کہ کانگریس محض آئین پر عمل کرنے کے لیے سرکار میں شامل نہیں ہورہی ہے بلکہ اس کی آخری منزل، مقصد کے حصول کے لیے آگے قدم بڑھاتا ہے اور اگر گورنراور نوکر شاہ اس کام میں مخل ہوئے یا دو تین سالوں کے اندر کانگریس اس کے حصول کے لیے آگے نہ بڑھ سکی تو ہندوستان کو سیدھی لڑائی کے لیے مجبور ہونا پڑے گا۔ اس سے ان کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ پورے ملک میں پرامن عام نافرمانی تحریک چلادی جائے گی۔

اس طرح عام عام نافرمانی تحریک کے سلسلہ میں سرمایہ دار طبقہ کے پیچیدہ نظریہ کے بارے میں ہم کو معلومات حاصل ہوتی ہے۔ ایک طرف تو وہ اس کے لمبا کھنچنے پر خوفزدہ تھا اور دوسری طرف وہ یہ بھی سمجھتا تھا کہ اس سے ہی ملک اور اس کو کچھ اہم فائدے مل سکتے ہیں۔ جنوری 1931 میں گھن شیام داس برلا نے پرشوتم داس کو اس وقت چل رہی سول نافرمانی تحریک کے بارے میں لکھا تھا کہ 'بلاشبہ ہم کو اس وقت جو کچھ دیا جارہا ہے وہ گاندھی کی ہی وجہ سے ہے اور ہم جس چیز کو حاصل کرنے کے خواہشمند ہیں، اس کو حاصل کرکے لیے بروقت چل رہی تحریک کو کمزور نہیں ہونے دینا چاہیے۔

جب یہ تحریک بہت دنوں تک چلی تو سرمایہ دار اس کو واپس لینے اور کانگریس اور برطانوی حکومت کے درمیان سمجھوتہ کرانے کی کوشش کرنے لگے۔ یہ طبقہ دونوں کے درمیان ثالث بن کر اکثر مصالحت کرانا چاہتا تھا۔ اس کے ساتھ یہ بھی سوچتا تھا کہ یہ سمجھوتہ تبھی ممکن ہے جب حکومت کچھ ٹھوس رعایتیں دینے کے لیے راضی ہو۔ اس طرح کی سودے بازی کے لیے دوبارہ تحریک چلانے کی دھونس دینا بھی ضروری ہے مگر امن اور سمجھوتہ کے قیام کے لیے وہ حکومت سے ہار ماننے اور اپنے مطالبات میں کوئی کمی کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس

طرح سرمایہ دار طبقہ کا دوسرا مقصد تھا مصالحت تو ہو جائے اور مگر قومی تحریک بھی کمزور نہ پڑے۔اس منشا کے متعلق گھن شیام داس بڑلا نے کہا تھا کہ 'ہم کو دو باتیں ذہن میں رکھنی چاہیے۔ایک یہ کہ جب بھی مناسب وقت آجائے ہم کو ایسے سمجھوتہ کے لیے کوشش کرنی چاہیے اور دوسری بات یہ کہ ہم کو کوئی ایسا قدم نہیں اٹھانا چاہیے جس سے ان لوگوں کے ہاتھ کمزور ہوں جن کی کوشش سے ہم یہاں تک پہنچے ہیں۔

بہر حال سرمایہ دار طبقہ عام نافرمانی تحریک کا چاہے جتنا مخالف رہا ہو اس نے اس کے خلاف نوآبادیاتی حکومت کی مدد کبھی نہیں کی۔ اس کی ہمیشہ یہی کوشش رہی کہ تحریک سے جڑے لوگوں پر حکومت کوئی ظلم نہ کرنے پائے۔وہ برابر پریس اور کانگریس پر لگی پابندی کو ہٹانے اور سیاسی قیدیوں کو رہا کرنے کے لیے حکومت پر دباؤ ڈالتا رہا۔اس کا یہ رخ اس وقت بھی قائم رہا جب کانگریس کی غیر آئینی عام جدوجہد (Non-Constitutional Mass Struggle) اپنے عروج پر تھی۔حکومت کے ساتھ سمجھوتہ کرنے کی اس کی پہلی شرط یہی تھی کہ سیاسی قیدیوں کو رہا کیا جائے، پریس پر سے پابندی ہٹالی جائے اور ظالمانہ قانونوں کو واپس لیا جائے۔کانگریس کی انقلابی طاقت سے یہ طبقہ خوفزدہ تو ضرور تھا مگر اس نے کبھی بھی 1920 کے بعد حکومت کی حمایت نہیں کی اور نہ ہی کھلے طور پر کانگریس کی تنقید کی اور نہ ہی اس سے اپنا تعلق ختم کیا۔وقت کے ساتھ اس مسئلہ پر سرمایہ دار طبقے کے نظریے میں کافی تبدیلی آئی۔

سودیسی تحریک (1905-1908) کے دوران یہ طبقہ اس تحریک کا سخت مخالف تھا۔اس طبقہ کے ایک بڑے حصے نے 1920 میں چلائی گئی عدم تعاون تحریک کی بھی مخالفت کی تھی۔پرشوتم داس اور کچھ دوسرے سرمایہ دار خود کو عدم تعاون تحریک کا شدید مخالف سمجھتے تھے لیکن بڑی تعداد میں سرمایہ داروں نے چوتھی دہائی میں شروع کی گئی عام نافرمانی تحریک کی حمایت کی۔کیونکہ اب تک وہ بھی سمجھ چکے تھے کہ غیر ملکی حکمراں اس کے مفاد کے لیے کبھی کچھ نہیں کریں گے۔ستمبر 1930 میں وائسرائے نے سرمایہ دار طبقہ سے کانگریس کی تنقید کرنے کے لیے کہا اور بھروسہ دلایا کہ اس سلسلہ میں برطانوی حکومت ان کی حفاظت کا پورا انتظام کرے گی، مگر یہ طبقہ حکومت کے جھانسے میں نہیں آیا۔19 ستمبر 1940 میں پرشوتم داس نے محسوس کیا کہ انگریزوں کے سیاسی رجحان کو دیکھ کر اب کانگریس کے پاس عدم تعاون تحریک چلانے کے سوا کوئی دوسرا چارہ نہیں ہے۔ہندوستان چھوڑو تحریک کے شروع ہونے کے چار دنوں بعد 5 اگست 1942 کو پرشوتم داس، جے۔آر۔ڈی۔ٹاٹا اور گھن شیام داس بڑلا نے وائسرائے کو لکھا کہ 'موجودہ بحران سے نمٹنے کے لیے اور ایک دوسری عام نافرمانی تحریک سے بچنے کا واحد راستہ یہی ہے کہ جنگ عظیم کے دوران ہی ہندوستان کو سیاسی آزادی دے دی جائے۔

ایک بات یہ بھی سمجھ لینی چاہیے کہ تیسری دہائی کے آخر میں ہندستانی سرمایہ داروں کا بااثر طبقہ کانگریس کی حمایت ضرور کرنے لگا تھا مگر کانگریس پر اس کا کسی بھی طرح کوئی اثر بالکل نہیں تھا۔کانگریس کی قیادت، اس کی پالیسی اور فیصلوں میں اس کا کوئی دخل نہیں تھا اور کانگریس بھی اس طبقہ کی حمایت پر منحصر نہیں تھی۔کانگریس نے سرمایہ دار طبقہ کی مدد کی خواہش بھی نہیں کی تھی، بلکہ اس طبقہ نے بذات خود وقت کی نزاکت کو دیکھ اور سمجھ کر قومی تحریک کی حمایت کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔اس کے علاوہ سرمایہ دار طبقہ قوم پرست خیمہ میں ضرور تھا مگر قوم پرستی کے سلسلہ میں اس کا نظریہ رجعت پسندانہ تھا۔اسی وجہ سے وہ کسی بھی سطح پر قومی تحریک کو کوئی موڑ نہیں دے سکا۔

8.5.1 کانگریس پر سرمایہ دار طبقے کے اثرات پر بحث

(Debate on the Influence of the Capitalist Class on the Indian National Congress)

باوجود اس حقیقت کے آج بھی کچھ لوگ یہ دلیل دیتے ہیں کہ سرمایہ دار طبقہ نے دولت کی طاقت کی بنیاد پر کانگریس کے معاشی پالیسیوں کو متاثر کیا، مثلاً اس نے اسٹرلنگ کے تناسب میں روپیہ کی مصنوعی زیادہ قیمت کی مخالفت، بحری محصول اور فوج کے خرچہ میں کمی کرنے وغیرہ کے مطالبے کیے تھے جو سراسر سرمایہ دار طبقہ کے مفاد میں تھے۔ یہ بھی الزام لگایا جاتا ہے کہ کانگریس کی سیاسی سرگرمیاں سرمایہ دار طبقہ کے زیر اثر اور اس کے مشورے پر چلتی تھیں، مثلاً تحریک کب چلائی جائے؟ اس کو جاری رکھا جائے یا واپس لے لیا جائے؟ اس طرح کے تمام فیصلے اس کی صلاح پر کیے جاتے تھے۔ اس سلسلہ میں گاندھی اِروِن سمجھوتے کے ذریعہ 1931 میں عام نافرمانی تحریک کو روک دینے کا فیصلہ اور 1945 سے 1947 کے درمیان نئی تحریک نہ چھیڑنے کے فیصلے کو ثبوت کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ تیسرا الزام یہ تھا کہ کانگریس سرمایہ داروں اور تاجروں سے خاص کر آئینی دور (الیکشن) میں مالی تعاون لے رہی تھی۔

لیکن یہ ساری باتیں سچائی پر پردہ نہیں ڈال سکتی ہیں۔ پہلی بات یہ کہ سامراجیت کے سامنے، مال وزر کے لین دین کی آزادی اور بحری موصول میں کمی نیز اسی طرح کے دوسرے مطالبوں میں صرف سرمایہ دار طبقہ کا ہی فائدہ نہیں تھا بلکہ اس میں استحصال کی چکی میں پس رہے ملک کے سارے لوگوں کی بھلائی پوشیدہ تھی، یہاں تک کہ نہرو، سوشلسٹ اور کمیونسٹ جیسے بائیں بازو کے لوگ بھی سامراجیت کے خلاف کھڑے ہو گئے اور انہوں نے سرمایہ دار طبقے سمیت تمام لوگوں کے فائدے کے لیے جدوجہد کی۔ دوسری بات یہ کہ معاشی قوم پرستی (Economic Nationalism) کا نظریہ اس وقت سوچا گیا تھا جب سرمایہ دار ایک طبقہ کی حیثیت سے منظم بھی نہیں ہوئے تھے۔ ان کے منظم ہونے کے تقریباً نصف صدی پہلے ہی اس وقت کے قوم پرستوں نے معاشی قوم پرستی کا نظریہ مرتب پیش کر دیا تھا۔ اس لیے یہ کہنا غلط ہے کہ مالی مطالبات کو اٹھانے کے لیے سرمایہ دار طبقہ نے کانگریس پر دباؤ ڈالا تھا۔ کانگریس کے سرمایہ داروں اور تاجروں سے مالی مدد لینے کے الزام کا جواب یہ ہے کہ ہمیں اس طرح کی کوئی مثال نہیں ملتی کہ کانگریس نے پیسوں کے بدلے میں اپنے اصولوں سے ہٹ کر سرمایہ داروں سے سمجھوتہ کیا ہو یا اپنی پالیسی میں تبدیلی کی ہو۔

کانگریس کی ضرورتوں کی حقیقت کو خصوصاً ان دنوں جب کانگریس نے عوامی تحریک کی شکل لے لی تھی، توڑ مروڑ کر پیش کیا جاتا رہا۔ مارچ 1939 میں وائسرائے کے ایک سوال کے جواب میں سرکاری خفیہ شعبہ کے ایک ڈائرکٹر نے لکھا تھا کہ 'کانگریس کے پاس رقم اکٹھا کرنے کی باقاعدہ ایک متبادل (substitute) ہے۔ حب الوطنی کی ایک اپیل پر پیسے برسنے لگتے ہیں۔ اس کو اپنی سرگرمیوں اور الیکشن کے کاموں کے لیے حسب خواہش رقم مل جاتی ہے۔ گاندھی کے تئیں عقیدت رکھنے والی عوام کی طرف سے اتنا پیسہ مل جاتا ہے کہ سرمایہ داروں کی تجوری اس کے سامنے کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتی۔' انتخاب کے علاوہ دنوں میں کانگریس کے کارکن ملک کے چپہ چپہ پر گھوم گھوم کر رکنیت فیس (membership fee) اور معمولی چندے وصول کر اچھی خاصی رقم اکٹھا کرتے تھے۔

سرمایہ داروں کے تعاون کے بارے میں گاندھی کا نظریہ حقیقت کو اجاگر کرتا ہے۔ 1922 میں گاندھی نے سرمایہ داروں اور تاجروں کی حمایت کی تائید تو کی مگر اس کے ساتھ یہ بھی کہا کہ 'چاہے وہ حمایت کریں یا نہ کریں ملک کی آزادی کے لیے عوامی جدوجہد کسی خاص طبقہ کے رحم و کرم پر منحصر نہیں ہے۔ یہ تحریک ہے اور عوام اپنے مقصد کے حصول کے لیے تیزی سے آگے بڑھ رہے ہیں۔ اس کو باقاعدہ ، سرمایے کا سہارا ملے یا نہ ملے ، یہ قافلہ آگے بڑھتا ہی رہے گا۔ اس کو دولت پر منحصر نہیں ہونا چاہیے مگر اس کو دولت سے دوری بھی نہیں رکھنی چاہیے۔ اگر سرمایہ دار عوامی تحریک کی مالی امداد سے کرتے ہیں تو یہ اچھی بات ہوگی اور اس سے جلد از جلد مقصد کو حاصل کرنے میں مدد ملے گی ۔' بعد کے دنوں میں خصوصاً دوسری جنگ عظیم کے دوران سرمایہ داروں کے تئیں گاندھی کا رویہ کافی سخت ہو گیا تھا کیونکہ ان دنوں قومی تحریک بڑی مصیبت سے گزر رہی تھی۔ قحط سالی کی وجہ سے عوام بھوکوں مر رہے تھے مگر سرمایہ دار طبقہ نفع خوری میں لگا تھا۔

جہاں تک قومی تحریکوں پر سرمایہ دار طبقہ کے اثرات کا تعلق ہے اس کے ثبوت ہم کو نہیں ملتے، حالانکہ ان میں سے کئی ایک تحریکیں مخصوص علاقوں میں سوشلسٹوں اور کمیونسٹوں کے ذریعہ چلائی گئی تھیں یا ان تحریکوں کی ان کے ذریعہ حمایت کی گئی تھی۔ تحریک شروع کرنے اور ملتوی کرنے کا فیصلہ کانگریس کے سوچنے سمجھنے پر منحصر تھا۔ حالات کی نزاکت دیکھ کر ، حکومت کی طاقت کا اندازہ کر کے ، تنظیمی اور نظریاتی اعتبار سے لوگوں کی تیاری کو سمجھ کر اور ظلم و جبر برداشت کرنے کی ان کی قوت کو بھانپ کر ہی کانگریس کی قیادت تحریک چلانے کے مسئلہ پر کوئی فیصلہ لیا کرتی تھی۔ سرمایہ داروں کی ان پر کوئی زور وزبردستی نہیں تھی۔ کانگریس کے ذریعہ 1905 سے 1908 تک، 1920 سے 1922 تک اور 1930، 1932 اور 1942 میں جو بھی تحریکیں چلائی گئیں، ان میں سے کسی میں بھی سرمایہ دار طبقہ یا ان کے کسی اہم حصے کی منظوری نہیں لی گئی۔ تحریک شروع کرنے کے بعد سرمایہ دار طبقہ اپنے طور سے اس کے تئیں اپنا ردعمل ظاہر کرتا تھا اور یہی رد عمل ، جیسا ہم اوپر واضح کر چکے ہیں ، بدلتے وقت کے ساتھ تحریک کی حمایت کی شکل لے لیا کرتا تھا۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ہندستانی سرمایہ دار طبقہ نے کانگریس کو کبھی بھی اپنے طبقہ کی نمائندہ جماعت تصور نہیں کیا۔ وہ اس کو عوام کی رہنمائی کرنے والی ایک کھلی تنظیم مانتا تھا۔ انڈین مرچنٹس چیمبر کے سکریٹری جمشید کیخسرو مہتا (Jamshed Kaikhusro Mehta) نے کہا تھا کہ 'کانگریس ایک ایسی تنظیم ہے جس میں سبھی سیاسی و معاشی نظریے والے لوگوں کو جگہ مل سکتی ہے۔ اس لیے اس کو دائیں یا بائیں کسی بھی رجحان کی طرف موڑا جا سکتا ہے۔

8.6 ہندوستانی سرمایہ دار طبقہ اور بائیں بازو کا ابھار

(Indian Capitalist Class, and the Rise of the Left)

اصل صورت حال یہ تھی کہ چوتھی دہائی کے دوران کانگریس میں نہرو، سوشلسٹوں اور کمیونسٹوں کے بڑھتے ہوئے اثرات کو دیکھ کر سرمایہ دار طبقہ چوکنا ہو کر سیاست میں سرگرم ہو گیا۔ مزید برآں کانگریس کے انقلابی رجحان سے خوفزدہ ہو کر یہ طبقہ حکومت کی گود میں نہیں گیا، جبکہ اس وقت کے ترقی پسند حلقہ کے لوگ یہی سوچتے تھے کہ سرمایہ دار اب یا تب حکومت کے موافق ہو جائیں گے۔ اس طرح کے حالات میں دوسرے نوآبادیاتی ملکوں اور نیم نوآبادیاتی ملکوں میں یہی کچھ واقع ہوا تھا۔ البتہ بائیں بازو کے اثرات کو کم کرنے کے لیے انہوں نے

مختلف طرح کی حکمت عملی اختیار کی، مثلاً 1929 میں جب کچھ سرمایہ داروں نے مزدور تنظیموں میں کمیونسٹوں کے بڑھتے اثرات کو روکنے کے لیے ہندوستان اور یورپ کے سرمایہ دار رہنماؤں کے ساتھ مل کر ایک پارٹی بنانے کی کوشش کی، تب سرمایہ داروں کی اکثریت نے اس کی مخالفت کی جس سے ان کا ارادہ کامیاب نہ ہو سکا۔ اس سلسلہ میں گھن شیام داس بڑلا کا خیال تھا کہ 'ہندستانی سرمایہ دار کی فلاح، رجعت پسند (یعنی سامراجیت نواز) طاقتوں سے ہاتھ ملانے سے نہیں ہوگی بلکہ ان کی بھلائی تو اسی میں ہے کہ وہ ان لوگوں (یعنی دقیانوسی قوم پرستوں) کا ہاتھ مضبوط کریں جو آئینی طریقے سے آزادی کے حصول کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں۔' اس طرح 1928 میں جب حکومت نے کمیونسٹوں پر ظلم وجبر کرنے کے لیے عوامی حفاظت قانون (Public Safety Bill) تیار کیا تو سرمایہ داروں نے اس کی کھلم کھلا مخالفت کی۔ ان کا خیال تھا کہ حکومت، قومی تحریک کو کچلنے کے لیے اس قانون کا استعمال کرے گی۔ سرمایہ دار طبقہ نے کمیونسٹ اثرات کو روکنے کے لیے اس طرح کی کوئی بھی تدبیر اختیار کرنا پسند نہیں کیا۔ کمیونسٹوں سے نمٹنے کے لیے وہ اپنی کوئی طبقاتی تنظیم بھی نہیں بنانا چاہتا تھا۔ اس کے مطابق اس طرح کی کوئی بھی تنظیم عوام یا متوسط طبقہ کی ہمدردی حاصل نہیں کر سکتی ہے۔ بڑلا نے اپنے لفظوں میں واضح کر دیا تھا کہ 'میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ سرمایہ دار طبقہ اپنی تنظیم بنا کر کمیونسٹوں سے نہیں لڑ سکتا ہے۔' بعد میں جب اس طبقہ کو نہرو کے بائیں بازو کے رجحان کو دیکھ کر ڈر پیدا ہوا تب گھن شیام داس بڑلا نے 1936 میں مزید کہا کہ 'جن لوگوں نے اپنی ذاتی دولت قربان کر دی ہے ان کو وہ بات کہنے دیجیے جو آپ کہنا چاہتے ہیں۔ حکمت عملی یہ ہے کہ ایسے قوم پرستوں کے ہاتھ مضبوط کیے جائیں جن سے سرمایہ داری کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔'

وقت کے ساتھ ہندستانی سرمایہ داروں نے یہ بھی محسوس کیا کہ اگر بڑے پیمانے پر معاشرتی اتھل پتھل کو روکنا ہے تو متواتر اصلاحی منصوبوں کو لاگو کرنا ہوگا۔ 1943 میں فکّی کے صدر جے۔ کے۔ مہتا نے یہی بات کہی تھی اور انہیں اصلاحی پروگراموں کو لاگو کرنے کے مقصد سے سرمایہ داروں نے 1942 میں 'Post-War Economic Development Committee'، بنائی تھی۔ اس کمیٹی نے ہی مشہور بامبے پلان ('Bombay Plan') تیار کیا تھا۔ اس کا مقصد سوشلسٹ تحریک کے ان مطالبات کو منظور کرنا تھا جن سے سرمایہ داری پر کوئی آنچ نہیں آتی تھی۔ بامبے پلان نے فوری طور سے معاشی ترقی اور اسباب معیشت کی یکساں تقسیم کے مسئلہ کو بڑی سنجیدگی سے اپنایا تھا۔ قومیت کے جزوی حقوق دینے، زرعی اصلاحات کرنے اور فلاح وبہبود کی اسکیمیں چلانے کی بھی بات کہی گئی تھی۔ بہر حال منصوبہ بنانے والوں نے اس بات کی طرف اشارہ بھی کر دیا تھا کہ کوئی قومی سرکار ہی ان پروگراموں کو عملی جامہ پہنا سکے گی۔ اس طرح یہ بات ظاہر ہے کہ ہندستانی سرمایہ دار طبقہ سوشلسٹ اور مزدور عوام کے خلاف تو تھا مگر وہ سامراجیت کا حمایتی بھی نہیں تھا۔ ملک کے سرمایہ دار طبقہ میں کافی پختگی بھی آ گئی تھی۔ یہ طبقہ اپنے مفاد سے باخبر تھا۔ کانگریس کی طاقت اور ملک کے مختلف طبقوں کے ساتھ اس کے تعلقات کا اس کو پورا احساس تھا۔ کمیونسٹوں سے خوفزدہ ہونے اور حکومت کے لالچ دینے کے باوجود اس نے ہندستانی قومیت کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ اس نے اپنے مفاد کو عوام کے مفاد سے جوڑ کر اس کے حصول کے لیے آواز بلند کی۔ سرمایہ دار طبقہ کی انہیں خوبیوں کی وجہ سے ملک کو آزادی ملنے کے دن تک ہندستانی قومی تحریک پر عوام کی بھلائی کا نظریہ برابر قائم رہا جبکہ تحریک کے اندر متضاد نظریات مستقل کارفرما رہے تھے۔

8.7 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ کو معلوم ہوا کہ ہندوستان میں سرمایہ دارانہ نظام کی ترقی نوآبادیاتی دور میں ہوئی۔اس سے قبل بھی ہندوستان میں قدیم دور سے کاروباری طبقہ پایا جاتا تھا جو بڑے پیمانے پر اور لمبی دوری کی تجارت میں مصروف تھا۔ہندوستانی اور امریکی نوآبادیات کی دولت لوٹ کر انگلینڈ میں 18ویں صدی کے آخر میں صنعتی انقلاب آیا۔انسانی اور حیوانی محنت کی جگہ ایسی مشینوں نے لے لی جو بھاپ اور پھر بعد میں دیگر ایندھنوں سے چلنے لگیں۔اس صنعتی انقلاب کا اثر ہندوستان پر بھی پڑا۔کارل مارکس کے مطابق برطانیہ،جو پہلے ہندوستان سے مصنوعات درآمد کرتا تھا،اب ہندوستان سے اپنی صنعت کے لیے کچا مال منگانے لگا اور تیار شدہ سامان واپس ہندوستانی منڈیوں میں بھیجا جانے لگا۔ہندوستان سے کچا سامان خریدنے کے پیسے بھی ہندوستانی محصول سے ہی چکائے جاتے تھے۔کچھ عرصے بعد سستی محنت اور کم لاگت کے لالچ میں برطانوی صنعتکاروں نے ہندوستان میں بہت سی صنعتیں قائم کیں اور باغان لگائے۔انگریزوں نے اپنی سہولت کے لیے ہندوستان میں،ڈاک،تار اور ریلوے کا نظام بھی قائم کیا۔ہندوستانی مقامی لوگوں،مہاجنوں اور زمینداروں نے بھی ان نئے مواقع کا فائدہ اٹھایا اور اپنی خود کی ملیں اور صنعتیں قائم کیں۔اس طرح نوآبادیاتی غیر ملکی حکومت کی پیدا کی گئی رکاوٹوں کے باوجود،ہندوستانی سرمایہ دار طبقے کی ترقی ہوئی۔دو عالمی جنگوں کے درمیان جب انگلینڈ کی صنعتیں جنگی سامان بنانے میں مشغول ہو گئیں،ہندوستانی صنعتکاروں نے موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ہندوستانی بازار کے بڑے حصے پر قبضہ کر لیا جس سے انہیں کبھی بے دخل نہ کیا جا سکا۔

سرمایہ دار طبقہ،قومی تحریک کے تئیں کیا نظریات رکھتا تھا،یہ بحث کا موضوع ہے۔اول تو یہ ہی متفقہ طور پر تسلیم شدہ نہیں کہ وہاں کوئی متفق اور متحد سرمایہ دار طبقہ تھا بھی جو اپنے حقوق کو لے کر جدوجہد کر سکتا تھا۔کیونکہ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ سرمایہ دار طبقے میں متعدد گروہ تھے جو اپنے مفاد کے لیے سرگرم تھے اور ان کے مفاد ایک دوسرے سے الگ تھے۔مثلاً تاجر گاندھی کے ساتھ تھے اور مل مالکان ان کو پسند نہیں کرتے تھے۔وی ڈی برلا اور جمنالال بجاج گاندھی کے ساتھ تھے اور پروشوتم داس اور جے۔آر۔ڈی۔ٹاٹا ان کے خلاف۔اگر سرمایہ داروں کو ایک طبقہ تسلیم بھی کر لیا جائے جیسا کہ بپن چندر اور آدتیہ مکھرجی جیسے مارکسی مورخ مانتے ہیں تو ان کا رویہ سامراجیت کے خلاف اور قوم پرستی کی حمایت میں تھا اور آدتیہ مکھرجی کے حساب سے وہ لمبے دور میں سامراجیت کے خلاف اور قلیل مدت کے لیے ان سے سمجھوتہ کر کے چل رہے تھے۔وہ برطانوی سامراجیت کے مخالف تھے مگر اس سے کھلے عام مخالفت اور تشدد سے ڈرتے تھے۔وہ آئینی جدوجہد میں یقین رکھتے تھے۔جہاں تک قومی تحریک اور کانگریس سے ان کے تعلق کا سوال ہے وہ کانگریس کے بائیں بازو،نہرو،سوشلسٹوں اور کمیونسٹوں سے ڈرنے کے باوجود سامراجیت کے سامنے جھکے نہیں اور نہ ہی اس کی ہر دعوت کو بلا چون وچرا قبول کیا۔وہ کانگریس کو آئینی جدوجہد کے راستے پر اور انتہا پسندی سے دور لے جانا چاہتے تھے اور ایک ایسی کانگریس کا تصور کرتے تھے جس پر دائیں بازو اور عدم تشدد والے قوم پرست بورژوا طبقے کا غلبہ ہو۔جب کبھی کوئی عوامی تحریک لمبا کھنچتی تو وہ ثالث بن کر سمجھوتہ کرانے کی کوشش کرتے۔انہوں نے فکی،بنگال چیمبر آف کامرس،انڈین مرچنٹس چیمبر وغیرہ بنائے اور انہیں تسلیم کروایا۔وہ گاندھی کو کچھ خاص پسند نہیں کرتے تھے مگر یہ جانتے تھے کہ کانگریس اور عوامی تحریک کو عدم تشدد اور پر امن احتجاج کی طرف کوئی لے جا سکتا ہے اور عوام پر اپنا اثر رکھتا ہے تو وہ یہی شخص ہے۔اس طرح یہ واضح ہو گیا

کہ ہندوستانی سرمایہ دار یا سرمایہ دار طبقہ کی کوئی ایسی خاص عمومی پالیسی نہیں تھی۔ کانگریس پر ان کے نظریات یا سوچ کا کوئی خاص اثر نہیں تھا جیسا کہ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ کانگریس، سرمایہ داروں کے اشاروں پر ناچ رہی تھی۔ کانگریس کی اپنی ایک باضابطہ پالیسی تھی جس کے کچھ اجزا بھلے ہی سرمایہ داروں کے مفاد میں رہے ہوں، لیکن وہ پورے ہندوستانی سماج کے حق میں تھی۔ ساتھ ہی کانگریس کبھی بھی سرمایہ داروں کے رحم و کرم پر نہیں رہی کیونکہ گاندھی کے بقول اور برطانوی انٹیلی جنس کے مطابق کانگریسی کارکن جگہ جگہ گھوم کر ممبری فیس اور چندہ وصول کرتے تھے اور گاندھی کے ایک اشارے پر عوام اپنا سب کچھ خرچ کرنے کے لیے تیار ہو جاتے تھے۔

8.8 کلیدی الفاظ (Keywords)

سرمایہ دارانہ نظام : (Capitalism) ایک ایسا معاشی اور سیاسی نظام جس میں کسی ملک کی تجارت اور صنعت منافع کے لیے نجی مالکان کے زیر کنٹرول ہوتی ہے۔

بورژوازی : (*bourgeoisie*) متوسط طبقہ، عام طور پر مادی اقدار یا روایتی کردار کے حوالے سے۔

مانٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات: (Montagu-Chemsford Reforms) وہ اصلاحات جن کا خاکہ مانٹیگو چیمسفورڈ رپورٹ میں دیا گیا تھا، جو 1918 میں تیار کی گئی تھی اور گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1919 کی بنیاد بنی تھی۔

مفاد پر مبنی نمائندگی کا نظام: (interest representation) مختلف طبقات جیسے ہندو، مسلم، دلت، مزدور وغیرہ کو ان کے فائدے کے مطابق انتخابی نمائندگی دینے کا نظام

مالیاتی خود مختاری کنونشن: (Fiscal Autonomy Convention) مالیاتی خود مختاری سمجھوتہ، ہندوستان کی مالیاتی پالیسی کی تاریخ میں ایک سنگ میل تھا۔ سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا نے 1921 میں اس سمجھوتے کو قبول کیا۔ اس نے ہندوستانی صنعت کو باضابطہ تحفظاتی چنگی مہیا کرائی اور متنازعہ تلافی محصول (Countervailing Duty) کو ختم کر دیا۔ 1923 میں چنگی بورڈ (tariff board) قائم ہوا اور 1924 میں ہندوستان کی اسٹیل صنعت کو تحفظ دیا گیا۔

امتیازی تحفظ : (discriminatory protection) امتیازی تحفظ کی پالیسی جس میں ایک صنعت کے بدلے دوسری صنعت کو تحفظ دیا جائے۔

حفاظتی محصولات : (protective tariffs) جس میں ایک ملک کی صنعت کو دوسرے ملک کی صنعت سے بچانے کے لیے درآمدی محصول لگایا جاتا ہے۔

تولیت : (trusteeship) ایک گاندھیائی نظریہ ہے کہ امیر لوگوں کو اپنی جائیداد کو ایسا سمجھنا چاہیے کہ خدا نے غریبوں کے فائدے کے لئے انہیں اس کی ذمے داری یا تولیت بخشی ہے۔

8.9 نمونہ امتحانی سوالات (Model Exanimation Questions)

8.9.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. سامراجیت کا انگریزی متبادل کیا ہے؟
2. سرمایہ داری میں معاشی ذرائع کی ملکیت کس کے ہاتھ میں ہوتی ہے؟
3. بورژوازی سے آپ کیا سمجھتے ہیں؟
4. امتیازی تحفظ کسے کہتے ہیں؟
5. حفاظتی محصولات کسے کہتے ہیں؟
6. تولیت سے کیا مراد ہے؟
7. فکی کس طبقے کے لوگوں کی انجمن تھی؟
8. 'Indian Merchants' Chamber' کہاں قائم ہوا؟
9. 'Bengal National Chamber of Commerce' کب قائم کیا گیا؟
10. مفادپر مبنی نمائندگی کا نظام (interest representation) کس سال متعارف کرایا گیا؟

8.9.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. ہندوستانی سرمایہ دار طبقہ کے اوصاف بیان کیجیے۔
2. ہندوستانی سرمایہ دار طبقہ کی نوعیت پر مارکسوادی نقطہ نظر کا جائزہ لیجیے۔
3. ہندوستانی سرمایہ دار طبقہ کی نوعیت پر غیر مارکسوادی نقطہ نظر کا جائزہ لیجیے۔
4. فکی کے قیام پر نوٹ لکھیے۔
5. ہندوستانی سرمایہ دار طبقہ اور بائیں بازو کے ابھار کا تجزیہ کیجیے۔

8.9.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. ہندوستانی سرمایہ دار طبقہ کے سیاسی رجحانات کا تفصیلی اور تنقیدی تجزیہ کیجیے۔
2. ہندوستانی سرمایہ دار طبقہ اور قومی تحریک سے ان کے تعلق پر تفصیلی روشنی ڈالیے۔
3. کانگریس پر سرمایہ دار طبقے کے اثرات پر بحث کیجیے۔

8.10 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Learning Resources)

1. Bandyopadhyay, Sekhar, *From Plassey to Partition*: *A History of Modern India*, Orient BlackSwan, New Delhi, 2012 (first pub. in 2004).
2. Birla, Krishna Kumar, *Brushes with History*: *An Autobiography*, Penguin, Gurgaon, 2009 (first pub. in 2007).
3. Chandra, Bipan, *Nationalism and Colonialism in Modern India*, Orient Longman, New Delhi, 2004 (first pub. in 1979).
4. Chandra, Bipan, *Essays on Colonialism*, Orient BlackSwan, New Delhi, 2010 (first pub. in 1999).
5. Chandra, Bipan, *The Rise and Growth of Economic Nationalism in India*, Anamika Publishers, New Delhi, 2004 (first pub. in 1966).
6. Chandra, Bipan, *Essays on Indian Nationalism*, Har-Anand, New Delhi, 1993.
7. Desai, A.R., *Social Background of Indian Nationalism*, Popular Prakashan, Bombay, 1998 (first pub. in 1948).
8. Kripalani, J.B., *My Times*: *An Autobiography*, Rupa, New Delhi, 2004.
9. Sarkar, Sumit, *Modern Times*: *India, 1880s–1950s*, Permanent Black, Ranikhet, 2014.
10. Sarkar, Sumit, *Modern India, 1885–1947*, MacMillan, New Delhi, 1996 (first pub. in 1983).

اکائی 9۔ گاندھی کا عروج اور ہندوستانی قوم پرستی

(Rise of Gandhi, and Indian Nationalism)

اکائی کے اجزا

9.0	تمہید
9.1	مقاصد
9.2	موہن داس کرم چند گاندھی
9.3	گاندھی کی جنوبی افریقہ میں آمد
9.4	گاندھی کی سیاسی سرگرمیاں
9.5	جنوبی افریقہ میں گاندھی کی جدوجہد کا دوسرا دور
9.6	چمپارن ستیا گرہ
9.7	احمد آباد کے مل مزدوروں کے حقوق کے لیے مہم
9.8	سروینٹ آف انڈیا سوسائٹی
9.9	جلیاں والا باغ قتل عام
9.5	اکتسابی نتائج
9.6	کلیدی الفاظ
9.7	نمونہ امتحانی سوالات
9.8	تجویز کردہ اکتسابی مواد

9.0 تمہید (Introduction)

عزیز طلبہ آداب۔جدید دنیا میں لہو کی لہر بہ رہی ہے۔ایک قوم دوسری قوم پر زبردستی قبضہ کررہی ہے جس کو آپ نوآبادیاتی طاقتوں کے نام سے جانتے ہیں۔اس تاریخی پس منظر میں جہاں ایک طاقتور ہتھیار چلا کر کمزور کو غلام بنارہا تھا۔تلوار کی ٹپکتی ہوئی خون کی بوندوں کے ذریعے پورے انسانیت کی ہی بے عزتی کررہے تھے۔ایسے تناظر میں ایسا ایک دبلا پتلا آدمی ابھر آیا جس نے اپنی قوت نفس ، حق اور عدم تشدد سے مادی طاقتوں کا سامنا کیا۔ان کا دل جیتا اور اس کے ساتھ ساتھ نہ صرف کروڑوں ہندوستانیوں کے دل میں بلکہ پوری دنیا کے دبے کچلے انسانوں کے دلوں میں بھی جگہ بنائی۔ان کو ہم مہاتما گاندھی یا باپو کے نام سے جانتے ہیں۔آپ بخوبی جانتے ہیں ان کا اصل نام موہن داس کرم چند گاندھی ہے۔گاندھی ایک عظیم سیاسی قائد تھے۔انہوں نے ہندوستان کی آزادی میں عظیم کردار نبھایا۔گاندھی کے جنوبی افریقہ کے تجربات اور نسل پرستی کے خلاف ان کی جنگ کے طریقوں کو انہوں نے ہندوستان میں بھی آزمایا۔انہوں نے اہنسا یعنی عدم تشدد کا سہارا لیا اور ملک کو آزادی دلائی۔

9.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- موہن داس کرم چند گاندھی کے ابتدائی حالات کے بارے میں جانیں گے۔
- گاندھی کی سیاسی سفر کے بارے میں جانیں گے۔
- گاندھی کے ستیا گرہوں کے بارے میں جانیں گے۔
- گاندھی کے ہندوستانی قومی تحریک میں عروج سے واقف ہونگے۔

9.2 موہن داس کرم چند گاندھی (Mohandas Karamchand Gandhi)

موہن داس کرم چند گاندھی نے رولٹ ایکٹ کے خلاف مارچ 1919 میں ستیہ گرہ کا نعرہ بلند کیا تھا،اس وقت ان کی عمر پچاس سال تھی۔یہی وہ شخص ہے جو ہندوستان کی جنگ آزادی کی کمان سنبھالنے والا تھا اور جس کی رہنمائی میں جنگ آزادی کو اہم ادوار سے گذرنا تھا۔اس لئے یہ ضروری ہے کہ ہم اپنی کہانی پچیس سال پیچھے 1893 سے شروع کریں جب چوبیس سال کے ایک بیرسٹر نے جنوبی افریقہ میں ہندوستانیوں کے شہری حقوق کے تحفظ کے لئے نسلی امتیاز کے خلاف جدوجہد کرنا شروع کیا تھا۔یہی نوجوان بیرسٹر جو 1893 میں ایک گجراتی تاجر دادا عبداللہ کے مقدمہ کی پیروی میں ایک سال کے معاہدہ پر ڈربن پہنچا،روزی روٹی کمانے والا ایک معمولی سا آدمی اس وقت کا سب سے زیادہ تعلیم یافتہ پہلا ہندوستانی بیرسٹر تھا۔

جنوبی افریقہ میں ہندوستانیوں کا پہلا گروہ 1860 میں گیا تھا۔وہاں گنا کی کھیتی کرانے کے لئے اقرار نامہ کے تحت سفید فام لوگ

ہندوستانی مزدوروں کو لے گئے تھے۔ اس کے بعد ہندوستانیوں کا خاص طور سے جنوبی ہندوستان کے لوگوں کا جنوبی افریقہ میں بسنے کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ مزدوروں کے ساتھ تاجر بھی جن میں زیادہ تر میمن مسلمان تھے وہاں پہنچے۔ اقرار نامہ کے ختم ہونے کے بعد وہ لوگ وہیں آباد ہوگئے۔ اس طرح وہ اوران کے بچے جو وہیں پیدا ہوئے تھے جنوبی افریقہ میں آباد ہندوستانیوں کا تیسرا طبقہ تھا۔ ان میں زیادہ تر لوگ ان پڑھ تھے اور جو تھوڑا پڑھے لکھے تھے ان کو انگریزی بہت کم آتی تھی۔ دولت مند تاجر بھی صرف اتنی انگریزی لکھ پڑھ لیتے تھے جتنی ان کو کاروبار کرنے کے لئے ضروری تھی۔ ہندوستانیوں کے ساتھ یورپی بہت برا برتاؤ کرتے تھے۔ ان کے ظلم و ستم کو برداشت کرنا ہندوستانیوں کی زندگی کا روٹین بن چکا تھا۔ اگر وہ بُرا بھی مانتے، تو ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ اس کے خلاف کس طرح آواز اٹھائی جائے۔

مگر نوجوان موہن داس کرم چند گاندھی روزی روٹی کے خاطر یوں ہی بے عزتی برداشت کرنے والوں میں نہیں تھے۔ وہ ہندوستان کی ریاست کاٹھیاواڑ میں دیوان کے بیٹے تھے۔ مالی تنگی کے باوجود ان کے خاندان کو ان کے وطن کاٹھیاواڑ میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ وکالت پڑھنے میں ان کے تین سال لندن میں گذرے تھے، مگر نسلی فرق کا جو مظاہرہ وہاں ہو رہا تھا ویسا انہوں نے انگلینڈ یا ہندوستان میں کہیں نہیں دیکھا تھا۔

9.3 گاندھی کی جنوبی افریقہ میں آمد (The Arrival of Gandhi in South Africa)

افریقہ براعظم پر قدم رکھنے کے ایک ہفتہ بعد جب گاندھی ڈربن سے پریٹوریا (Pretoria) روانہ ہوئے تو راستے میں ان کو طرح طرح سے بے عزت کیا گیا۔ یہ مشہور واقعہ ہے کہ گاندھی کو ایک یورپی نے اول درجہ کے ڈبے سے جبراً اتار دیا تھا اور ان کو ٹھنڈک میں کانپتے ہوئے مسافر خانہ (waiting room) میں رات کاٹنی پڑی تھی۔ اس سے بھی زیادہ شرمناک واقعے اور بھی ہوئے تھے۔ ایک بار گاندھی نے ٹرین سے سفر کرنے کے لئے اول درجہ کا ٹکٹ خریدا۔ سفید فام لوگوں نے ان سے اول درجہ سے نکل کر ڈرائیور کے ساتھ بیٹھنے کے لئے کہا اور جب ڈرائیور کے ساتھ بھی بیٹھنے لائق نہیں سمجھا گیا تو ان سے پاؤدان پر بیٹھنے کے لئے کہا گیا۔ اس کی مخالفت کرنے پر ان کو مارا پیٹا گیا۔ جوہانس برگ (Johannesburg) اترنے کے بعد رات گذارنے کے لئے جب انہوں نے کمرہ لینا چاہا تو ان کو کوئی کمرہ خالی نہیں ملا۔ جوہانس برگ سے پریٹوریا جانے کے لئے بکنگ کلرک نے اول درجہ کا ٹکٹ دینے سے انکار کر دیا۔ تمام ریلوے قانونوں کا حوالہ دینے کے بعد ہی ان کو ٹکٹ مل سکا، لیکن پھر ان کو دھکا دے کر ڈبے سے نکالا جانے لگا۔ بہر حال ایک یورپی مسافر کی مداخلت سے ان کی آبرو بچ سکی۔

ایک مقدمہ کی پیروی کے سلسلہ میں وہ پریٹوریا گئے تھے۔ وہاں پہنچ کر انہوں نے ہندوستانیوں کی ایک میٹنگ بلائی۔ انہوں نے گوروں کے ظلم کی مخالفت کرنے کی لوگوں سے پُر زور اپیل کی۔ خواہشمند ہندوستانیوں کو انگریزی پڑھانے کی پیشکش کی۔ پریس کے ذریعہ انہوں نے خود اپنے غصہ کا اظہار کیا۔ نیٹال ایڈورٹائزر (*Natal Advertiser*) کو انہوں نے غصہ بھرا خط لکھا۔ انہوں نے تحریر کیا "کیا یہی عیسائیت ہے؟ کیا یہی انسانیت ہے؟ کیا یہی انصاف ہے؟ کیا اسی کو تہذیب کہتے ہیں؟ میں جواب کے لئے ٹھہرا ہوں" گاندھی کا پروگرام جنوبی افریقہ میں زیادہ دن ٹھہرنے کا نہیں تھا۔ پھر بھی انہوں نے پریٹوریا میں ہندوستانیوں کے اندر خودداری کے جذبات ابھارنے اور نسلی امتیاز

سے پیدا شدہ سبھی برائیوں سے نجات پانے کے لئے جدوجہد کی اپیل کی۔

مقدمہ کے خاتمہ پر گاندھی ہندوستان لوٹنے کی تیار کرنے لگے، لیکن جس روز وہ ڈربن سے روانہ ہونے والے تھے اسی کی پچھلی شام کو انہوں نے ہندوستان کو ووٹ دینے کے اختیار سے الگ رکھنے کی ایک بل کا معاملہ اٹھایا۔ وہ بل نیٹال اسمبلی میں پاس ہونے والا تھا۔ وہاں آباد ہندوستانیوں نے گاندھی سے اپیل کی کہ وہ ایک ماہ اور ٹھہر جائیں اور بل کی مخالفت کی قیادت کریں۔ ہندوستانیوں میں انگریزی زبان کی اتنی بھی صلاحیت نہیں تھی کہ وہ مسودہ تیار کر سکیں۔ گاندھی ایک ماہ ٹھہرنے کے لئے راضی ہو گئے مگر ٹھہر گئے پورے بیس سال۔ اس وقت ان کی عمر پچیس سال تھی اور جب وہ ہندوستان لوٹے، ان کی عمر پینتالیس سال ہو گئی تھی۔

جنوبی افریقہ میں گاندھی کے تجربے بڑے انوکھے تھے۔ انگلینڈ سے بیرسٹری کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد انہوں نے کئی باتوں کا بطور حق دعویٰ کیا مثلاً ٹرین سفر کرنے کے لئے پہلے درجہ کا ٹکٹ اور ہوٹل میں ٹھہرنے کے لئے کمرہ۔ ان سے پہلے جنوبی افریقہ میں کوئی بھی ہندوستانی اس طرح کی بات کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ ہندوستانیوں کے دل میں یہ بات گھر کر گئی تھی کہ وہ لوگ مہذب نہیں ہیں یعنی ان کا مغربی رہن سہن نہیں ہے۔ اسی وجہ سے ان کے ساتھ امتیاز برتا جا رہا ہے۔ گاندھی خود اپنے تجربات سے اور بقیہ ہندوستانی بھی سمجھ گئے تھے کہ نسلی امتیاز کی وجہ یہ ہے کہ گورے لوگ بہر صورت اپنا دبدبہ قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ اگر ایسی بات نہ ہوتی، تو گاندھی کے ساتھ ایسا بُرا سلوک کیوں کیا جاتا ہے جبکہ وہ مغربی تہذیب میں پالے پوسے گئے تھے۔

گاندھی کے بارے میں ایک انوکھی بات یہ بھی تھی کہ وہاں وہ اکیلے انگریزی تعلیم یافتہ ہندوستانی تھے۔ اسی لئے انہیں کے کندھوں پر نسلی امتیاز کے خلاف تحریک چلانے کی ذمہ داری آن پڑی تھی۔ ان کی عمر سے کہیں بڑے تجربہ کار اور امیر تاجروں نے ان کو اپنا لیڈر منتخب کیا تھا۔ وہی ایسے واحد ہندوستانی تھے جو حکمرانوں سے انہیں کی زبان میں بات کر سکتے تھے، وہی قانون اور حکومت کی باریکیوں کو اچھی طرح سمجھتے تھے، ان کی درخواستوں کے مسودے تیار کر سکتے تھے، تنظیمیں بنانے کی مہارت رکھتے تھے اور حکمرانوں کے سامنے ہندوستانیوں کی نمائندگی کر سکتے تھے۔ جنوبی افریقہ میں گاندھی کی زندگی کی تاریخ لمبی ہے۔ یہاں ہم اس کو بہت مختصر تحریر کرتے ہوئے ان کے وسیع تجربات پہ روشنی ڈالنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

9.4 گاندھی کی سیاسی سرگرمیاں (Political Activities of Gandhi, 1894-1906)

1894 سے 1906 کے دوران گاندھی کی سیاسی سرگرمیوں کو ہم جنوبی افریقہ میں آباد ہندوستانیوں کی اعتدال پسند تحریک کہہ سکتے ہیں۔ اس دوران گاندھی نے زیادہ تر اپنی توجہ جنوبی افریقہ کی اسمبلیوں، نوآبادیاتی ملکوں کا کام دیکھنے والے سکریٹری اور انگلینڈ کی پارلیمنٹ کو درخواست اور اپیلیں بھیجنے پر مرکوز کی۔ ان کا یہ خیال تھا کہ اس طرح کی کارروائیوں سے برطانوی حکومت کو حقیقت کا پتہ چل جائے گا، اس کا جذبۂ حق وانصاف بیدار ہوگا، اس کا دل پگھلے گا اور وہ ہندوستانیوں کی بھلائی میں کچھ کام ضرور کرے گی کیونکہ بہر حال ہندوستانی اسی کی سلطنت

کے تو باشندے ہیں۔ گاندھی ہندوستانیوں کے مختلف فرقوں کو متحد کرنے اور ان کی مانگوں کے پرچار کرنے کی برابر کوشش کرتے رہے۔ اس کے لئے انہوں نے نیٹال کانگریس بنائی اور انڈین اوپینین (*Indian Opinion*) نام کا اخبار نکالنا شروع کیا۔ اس دوران گاندھی کی ساری خوبیاں ایک کامیاب ناظم، صحافی، مشتہر اور فنڈ محصل کی حیثیت سے ابھر کر سامنے آگئیں۔ لیکن 1906 کے آتے آتے ان کو یہ یقین ہو گیا کہ جدوجہد کی معتدل طریقے بالکل ناکافی ہیں۔ ان سے کچھ ہونے والا نہیں ہے۔

9.5 جنوبی افریقہ میں گاندھی کی جدوجہد کا دوسرا دور

(Second Phase of Gandhi's Struggle in South Africa)

جنوبی افریقہ میں گاندھی کی جدوجہد کا دوسرا دور 1906 میں عام نافرمانی یا سول نافرمانی سے شروع ہوا جس کو انہوں نے ستیہ گرہ کے نام سے موسوم کیا۔ سب سے پہلے اس کا استعمال اس قانون کے خلاف کیا گیا جس کے تحت ہر ایک ہندوستانی کو رجسٹریشن سرٹیفکیٹ لینا ضروری تھا۔ اس سرٹیفکیٹ میں اس کے انگوٹھے کے نشانات ہوتے تھے۔ اس کو اسے ہر وقت ساتھ رکھنا پڑتا تھا۔ 11 ستمبر 1906 میں جوہانس برگ ایمپائر تھیٹر (Empire Theatre) میں ہندوستانیوں کا ایک عام جلسہ ہوا۔ انجام کی پرواہ کیے بغیر لوگوں نے ایک آواز سے اس قانون کی خلاف ورزی کرنے کا فیصلہ کیا۔ حکومت اور ہندوستانی دونوں اپنے فیصلے پر اٹل تھے۔ گاندھی نے اس قانون کی مخالفت کرنے کے لئے غیر متشدد مزاحمت تنظیم (Passive Resistance Association) بنائی۔ رجسٹریشن کی جو آخری تاریخ حکومت نے بتائی تھی اس کے گذر جانے پر اس نے گاندھی اور 26 دوسرے لوگوں کے خلاف قانونی کارروائی شروع کی۔ ان کو مجرم ٹھہرایا گیا اور ملک چھوڑنے کا حکم دیا گیا۔ حکم نہ ماننے پر ان سب کو جیل بھیج دیا گیا۔ اس کالے قانون کی مخالفت اور تیز ہو گئی اور جیل جانے والوں کی تعداد 155 تک پہنچ گئی۔ جیل کا خوف لوگوں کے دلوں سے بالکل نکل گیا اور لوگ جیل کو کنگ ایڈورڈ (King Edward) کا ہوٹل کہنے لگے۔

جنرل اسمٹس (General Smuts) نے گاندھی کو بات چیت کرنے کے لئے بلایا اور وعدہ کیا کہ اگر ہندوستانی خود سے اپنا رجسٹریشن کرا لیں تو یہ قانون واپس لے لیا جائے گا۔ وہ اس پر راضی ہو گئے اور سب سے پہلے انہوں نے ہی اپنا رجسٹریشن کرایا جنرل اسمٹس کی یہ چال تھی۔ اس نے یہ حکم جاری کیا کہ خود سے رجسٹریشن کرانے والوں کی قانوناً تصدیق کر دی جائے۔ اس کے جواب میں گاندھی کی قیادت و رہنمائی میں رجسٹریشن کرائے ہوئے سبھی لوگوں نے اپنے اپنے سرٹیفکیٹوں کو برسرِ عام جلا ڈالے۔

اسی دوران حکومت نے ایک دوسرا بل باہر کے لوگوں کی آمد کو روکنے کے لئے اسمبلی میں پیش کیا۔ اس کی مخالفت میں زوردار مہم چلائی گئی۔ اگست 1908 میں نئے قانون کی خلاف ورزی کرنے کی غرض سے نامور ہندوستان لیڈران سرحد (frontier) کو پار کر کے نیٹال سے ٹرانسوال (Transval) چلے آئے۔ ان سب کو گرفتار کر لیا گیا۔ ٹرانسوال کے تمام ہندوستانیوں نے اس قانون کی مخالفت کی اور لائسنس حاصل کئے بغیر خونچے لگانے لگے اور جن کے پاس لائسنس تھے انہوں نے دکھانے سے انکار کیا۔ ایسے سبھی لوگوں کو جیل میں ڈال دیا گیا۔ اکتوبر 1908 میں گاندھی کو بھی جیل ہو گئی۔ جیل میں ان کو دوسرے اور ہندوستانیوں کے ساتھ طرح طرح کی تکلیفیں دی گئیں۔ ان کو

سخت مشقت کرنے پر مجبور کیا گیا۔ مگر قید خانے کی تکلیفیں بھی ان کے حوصلے کو پست نہ کر سکیں بے بس ہو کر حکومت نے لوگوں کو خصوصاً غریب ہندوستانیوں کو ملک کے باہر نکالنا شروع کیا۔ تاجروں کو بھی مالی اعتبار سے نقصان پہنچانے کی دھمکیاں دی گئیں۔

اب تحریک پر مصیبت کے بادل منڈلانے لگے۔ پکا ارادہ والے ستیہ گرہی تو برابر جیل آتے جاتے رہے مگر عام طور سے ستیہ گرہی تھکے تھکے سے لگنے لگے۔ جدوجہد لمبی کھینچتی معلوم ہوتی تھی اور حکومت کے جھکنے کے آثار دور دور تک نظر نہیں آتے تھے۔ 1909 میں گاندھی انگریز افسروں سے ملنے لندن گئے۔ مگر اس کا بھی کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ ستیہ گرہ کرنے والے لوگوں کے بال بچوں کے کھانے پینے کے لئے جمع کی گئی رقم بھی دھیرے دھیرے ختم ہو رہی تھی۔ گاندھی وکالت بھی تحریک میں مکمل مصروف رہنے کے باعث بری طرح متاثر تھی۔ ایسے حالات میں گاندھی نے اپنے جرمن معمار دوست کالین باک (Kallen Back) کی فیاضانہ امداد سے ٹالسٹائے فارم قائم کیا۔ اس طرح ستیہ گرہ میں لگے لوگوں کے بال بچوں کے رہنے سہنے اور کھانے پینے کا مسئلہ انہوں نے حل کیا۔ یہی ٹالسٹائے فارم گاندھی کے ان آشرموں کے قیام کا پیش رو (precursor) تھا جو بعد میں قومی تحریک کے اہم مراکز بنے تھے۔ اس فارم کے انتظام کے لئے ہندوستان سے امدادی رقمیں بھیجی گئیں۔ سر رتن ٹاٹا نے پچیس ہزار روپے بھیجے تھے۔ کانگریس مسلم لیگ اور نظام حیدر آباد نے بھی مالی امداد دی تھی۔

1911 میں کنگ جارج (King George) کی تاج پوشی کے موقع پر ہندوستانیوں اور جنوبی افریقہ کی حکومت کے درمیان سمجھوتہ ہو گیا جو صرف 1912 کے آخر تک ہی قائم رہا۔ انہیں دنوں گوکھلے جنوبی افریقہ کے دورے پر گئے۔ ان کے ساتھ سرکاری مہمان کا سا سلوک کیا گیا۔ حکومت نے ان سے وعدہ کیا کہ امتیاز برتنے والے سارے قوانین ختم کر دیئے جائیں گے۔ مگر یہ وعدہ پورا نہ ہو سکا۔ اس لئے 1913 میں ستیہ گرہ پھر سے شروع کر دی گئی۔

اس بار ستیہ گرہ کا دائرہ کافی بڑا تھا۔ حکومت نے اقرار ناموں سے الگ مزدوروں پر بھی تین پونڈ کا ٹیکس تھوپ دیا تھا۔ ہندوستانی مزدوروں میں زیادہ تر لوگ غریب تھے۔ وہ بمشکل ایک ماہ میں دس شلنگ کما پاتے تھے۔ تین پونڈ ٹیکس ان کے لئے بہت زیادہ تھا۔ اس کے خلاف ستیہ گرہ شروع ہو گئی۔ قریب قریب سبھی ہندوستانی اس میں شامل ہو گئے۔ اور اس طرح اس نے صحیح معنی میں عوامی تحریک کی شکل اختیار کر لی تھی۔ اسی درمیان سپریم کورٹ کے فیصلہ نے آگ میں گھی کا کام کیا۔ عدالت نے ان ساری شادیوں کو جو عیسائی رسم و رواج سے نہیں ہوئی تھیں اور جن کا رجسٹریشن نہیں ہوا تھا' کو غیر قانونی قرار دیا اور ان سے پیدا ہوئی اولادیں ناجائز قرار پائیں۔ اس فیصلے سے ہندوستانی عورتوں کی بڑی بے آبروہوئی اور بہت ساری عورتیں ستیہ گرہ میں شامل ہو گئیں۔

گاندھی نے محسوس کیا کہ جدوجہد کا آخری وقت اب آن پہنچا ہے۔ اس لئے اس میں ساری توانائی جھونک دینی چاہیئے۔ 16 ستیہ گرہی جن میں کستوربا گاندھی بھی شامل تھیں قانون کی خلاف ورزی کر کے نیٹال کے فونیکس سیٹلمنٹ (Phoenix Settlement) سے ٹرانسوال پہنچ گئے۔ ان سب کو گرفتار کر لیا گیا۔ گیارہ عورتوں کا ایک گروہ بغیر پرمٹ کے ٹالسٹائے فورم سے چل کر نیٹال سرحد کو پار کر کے نیو کیسٹل (New Castle) جو کان کا قصبہ تھا پہنچ گیا۔ یہاں اس گروہ نے کان کے مزدوروں جن میں زیادہ تر تمل تھے سے بات

چیت کی اور ان کو ہڑتال کے لئے آمادہ کیا۔ بعد میں ان سب کو گرفتار کر لیا گیا۔

گاندھی فوراً نیو کیسٹل پہنچ گئے اور تحریک کی کمان سنبھال لی۔ کان مالکوں نے مزدوروں کے کوارٹر کی بجلی اور پانی کا کنکشن کاٹ دیا۔ اس طرح ان کو کوارٹر چھوڑنے پر مجبور کیا گیا۔ گاندھی دو ہزار سے زائد لوگوں کے ایک گروہ کو لے کر جن میں عورتیں اور بچے بھی تھے، ٹرانسوال کی جیل میں بھیجنے کے ارادہ سے حد پار کر کے چل پڑے۔ راستے میں ان کو دوبارہ گرفتار کر کے چھوڑ دیا گیا۔ مگر تیسری بار گرفتار کر کے ان کو ٹرین میں بٹھا کر نیٹال واپس بھیج دیا گیا۔ ان پر مقدمے چلے اور وہ جیل بھیجے گئے۔ جیل میں ان پر طرح طرح کے مظالم ڈھائے گئے۔ ان کو بھوکا پیاسا رکھا گیا۔ ان پر کوڑے برسائے جاتے اور پولیس کے گھیرے میں رکھ کر ان سے کانوں میں کام لیا جاتا۔ گاندھی سے پتھر کھدوایا گیا۔ ان کو جھاڑو لگانے پر مجبور کیا گیا۔ ان کو اندھیری کوٹھری میں رکھا جاتا اور ہتھکڑی بیڑی پہنا کر عدالت لایا جاتا۔

حکومت کے اس ظلم کو سن کر ہندوستانی سماج تلملا اٹھا۔ کان اور باغان مزدوروں نے ہڑتال کر دی۔ گوکھلے نے پورے ہندوستان کا دورہ کر کے اس ظلم کے خلاف رائے عامہ تیار کی۔ لارڈ ہارڈنگ (Lord Harding) تک نے اس کی مذمت کی۔ انہوں نے کہا "ایسا کوئی ملک جو خود کو مہذب کہتا ہے، اس طرح کے مظالم برداشت نہیں کرے گا"۔ انہوں نے ان مظالم کی غیر جانبدارانہ جانچ کرانے کی اپیل بھی کی۔ پورے ملک نے نہتوں پر ہوئے ایسے مظالم پر غم و غصہ کا اظہار کیا۔

لارڈ ہارڈنگ، گاندھی، سی ایف اینڈریوز (C.F. Andrews) اور جنرل اسمٹس سے کئی بار ہوئی لمبی بات چیت کے بعد جنوبی افریقہ کی سرکار نے ہندوستانیوں کی خاص خاص مانگوں کو منظور کر لیا۔ تین پونڈ کی چنگی اور رجسٹریشن سرٹیفکیٹ کی پابندی ختم کر دی گئی۔ ہندوستانیوں کو اپنے رسم و رواج کے مطابق شادی کرنے کے اختیار کو بحال کر دیا گیا۔ نیز ہندوستانی آبادی کی دوسری پریشانیوں کو دور کرنے کا اطمینان دلایا گیا۔ پُر امن عام نافرمانی تحریک بات چیت کے ذریعہ دشمن سے اپنی مانگ منوانے میں کامیاب ہوئی۔

جدوجہد کے گاندھیائی طریقہ کا ارتقاء ہو چکا تھا۔ گاندھی وطن واپسی کی تیاری کرنے لگے۔ اب ان کو اپنے طریقہ کی آزمائش بڑے پیمانہ پر یہیں کرنا تھا۔ جنوبی افریقہ کی جدوجہد نے ان کو کئی معنوں میں قومی تحریک کی قیادت کے لئے تیار کیا۔ غریب مزدوروں کی قیادت کرنے سے ان کو بڑے قیمتی تجربات ہوئے۔ ان غریبوں کی ہمت اور جانفروشی کے جذبات کو دیکھ کر ان کو پورا یقین ہو گیا تھا کہ اب ہندوستانی کسی بڑے کاز کے لئے ظلم کے خلاف سینہ سپر ہو کر ہر طرح کی قربانی دینے کے لئے تیار ہو جائیں گے۔

جنوبی افریقہ میں گاندھی کو ہر طبقہ اور مذہب و ملت کے لوگوں کی قیادت کرنے کا موقع ملا تھا۔ ہندو، مسلم، عیسائی اور پارسی سبھی لوگوں کی حمایت اور مدد ان کو حاصل تھی۔ وہ لوگ ملک کے مختلف حصوں اور علاقوں خصوصیت سے تمل ناڈو اور گجرات کے باشندے تھے سماج کے مختلف طبقوں سے ان کا تعلق تھا۔ ان کے ساتھ امیر تاجر، غریب مزدور، مرد عورت سبھی تھے۔

جنوبی افریقہ میں گاندھی کے تجربات کی اور بھی اہمیت تھی۔ وہاں انہوں نے اچھی طرح سمجھا کہ کسی تحریک کے لیڈر کو دوست و

دشمن دونوں کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ جنوبی افریقہ میں گاندھی کو دوبارہ جان کی بازی لگانی پڑی تھی۔ 1896 میں ڈربن میں ان کے خون کی پیاسی گوروں کی ایک بھیڑ نے سڑک پر ان کا پیچھا کیا۔ رہائش گاہ میں پناہ لینے پر بھیڑ نے ان کا مکان گھیر لیا۔ جلدی جلدی بھیس بدل کر بڑی مشکل سے انہوں نے اپنی جان بچائی دوسری بار ایک ہندوستانی پٹھان نے ان پر جان لیوا حملہ کیا۔ وہ ان سے اس لئے ناراض تھا کیونکہ انہوں نے گورنمنٹ سے ایک سمجھوتہ کرلیا تھا۔ یہ سمجھوتہ اس کی مرضی کے خلاف تھا۔ ان واقعات سے گاندھی نے یہ سبق لیا کہ قوم کے لیڈروں کو بارہا ایسے فیصلے لینے پڑتے ہیں جو ان کے ماننے والوں کو ناگوار ہوتے ہیں۔

جنوبی افریقہ میں گاندھی کو مخالف سیاسی فکروں سے صرف نظر کر کے ایک نئی سیاسی فکر، قیادت کا نیا انداز اور جدوجہد کے نئے طریقوں کی ارتقا کرنے اور ان کو محدود دائرہ میں آزمانے کا موقع ملا۔ انہوں نے تحریک کو اعتدالی دور (moderate phase) سے نکال کر گاندھیائی دور میں داخل کیا۔ وہ گاندھیائی طریقہ کے جزئیات مع اس کی کمیوں اور کمزوریوں سے اچھی طرح واقف تھے اور ان کو پورا یقین تھا کہ یہی طریقہ تحریکی جدوجہد کے لئے سب سے اچھا اور موثر ہے۔ بس ہندوستان میں اس پر عمل کرنا باقی ہے۔

جنوری 1915 میں گاندھی ہندوستان واپس آگئے۔ یہاں ان کا پُرجوش خیر مقدم ہوا۔ جنوبی افریقہ میں ان کے کارہائے نمایاں نے ان کو ملک میں بہت مقبول اور معروف کردیا تھا۔ تعلیم یافتہ لوگوں کے درمیان میں ہی وہ مشہور نہیں تھے بلکہ غیر تعلیم یافتہ دیہاتی بھی ان کے نام سے واقف ہوگئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب گاندھی کمبھ میلہ گئے تو لوگوں کا بھاری ہجوم ان کا درشن کرنے امڑ پڑا۔ گوکھلے اس سے قبل ہی ان کے بارے میں ان الفاظ میں کہہ چکے تھے "گاندھی میں شہیدوں اور بہادروں کی ساری خوبیاں پائی جاتی ہیں" ملک کے اس لیڈر کو ان کے اندر اس سے بھی زیادہ شاندار خوبی کا ادراک ہوا تھا۔ انہوں نے بتایا کہ "گاندھی میں لوگوں کو متاثر کرنے کی وہ روحانی طاقت ہے جو ہر اس معمولی آدمی کو بہادر، جاں باز اور جاں فروش بنادیتی ہے جو ان کی صحبت میں آتا ہے"۔

گاندھی کا خیال تھا کہ کسی بھی مسئلہ میں اس وقت تک دخل نہیں دینا چاہیئے جب تک پورے حالات کی معلومات نہ ہوجائے۔ گوکھلے کی بھی یہی رائے تھی۔ اس لئے گاندھی نے فیصلہ کیا کہ فی الحال وہ کسی سیاسی مسئلہ پر عالمی طور سے رد عمل نہیں کریں گے۔ اسی لئے حالات کا جائزہ لینے کی غرض سے وہ پورے ایک سال ملک بھر کا دورہ کرتے رہے اور احمد آباد میں اپنا آشرم جمانے کا کام کرتے رہے۔ یہاں پر گاندھی کے ساتھ جنوبی افریقہ سے آئے ہوئے پیروؤں کو بسانے اور آباد کرنے کا کام چل رہا تھا۔

دوسرے سال بھی گاندھی فعال (active) سیاست سے دور رہے۔ اس وقت ہوم رول تحریک زور و شور سے چل رہی تھی مگر وہ اس میں شریک نہیں ہوئے۔ اس وقت کے سارے سیاسی نظریات سے ان کے خیالات میل نہیں کھاتے تھے۔ معتدل (moderate) سیاست سے بہت پہلے ان کا اعتماد اٹھ چکا تھا۔ وہ ہوم رول تحریک کے لوگوں کی اس حکمت عملی کے خلاف تھے کہ انگریزوں پر آئی مصیبت ان کے لئے فال نیک ہے۔ اسی حکمت عملی کے تحت پہلی جنگ کے چھڑتے ہی ہوم رول تحریک چھیڑی گئی تھی۔ گاندھی اس نظریے کے بالکل خلاف تھے۔ اس کے علاوہ وہ اس وقت کی جدوجہد کے طریقوں سے بھی متفق نہیں تھے۔ ان کے نزدیک ستیہ گرہ ہی جدوجہد کا واحد طریقہ

تھا۔اس وقت کی تحریکوں میں گاندھی کی عدم شرکت کی وجہ انہیں کے الفاظ میں اس طرح ہے ''میں کسی تنظیم میں اسی وقت شامل ہو سکتا ہوں جب میں اس کی پالیسیوں کو متاثر کر سکوں، میں اس کی پالیسیوں سے خود متاثر ہونے کے لئے اس میں شامل نہیں ہوں گا۔اس کا مطلب یہ نہیں کہ نئی روشنی کو اپنانے کے لئے میرا دماغ کھلا ہوا نہیں ہے بلکہ میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ نئی روشنی اتنی موثر اور چکاچوندھ کرنے والی ہو کہ وہ مجھے موہ لے''

1917 کے دوران اور 1918 کے شروع سالوں میں گاندھی تین جگہوں پر بہار کے چمپارن اور گجرات کے احمد آباد و کھیڑا میں اپنی کوشش میں جٹ گئے۔ یہاں پر کی گئی ان کی تینوں کوششیں مقامی لوگوں کے مالی مسائل سے جڑی تھیں۔ چمپارن اور کھیڑا کی تحریکیں کسانوں سے متعلق تھیں اور احمد آباد میں چلائی گئی تحریک کارخانہ مزدوروں سے تعلق رکھتی تھی۔

9.6 چمپارن ستیا گرہ (Champaran Satyagraha)

چمپارن کی کہانی انیسویں صدی کی ابتدا سے ہی شروع ہوتی ہے۔یورپی باغان مالکوں نے کسانوں سے ایک معاہدہ کرا لیا تھا کہ کسانوں کو اپنی زمین کے 3/20 حصہ پر نیل کی کھیتی کرنا ضروری ہے۔اس کو تین کٹھیا سسٹم کہتے تھے۔انیسویں صدی کے خاتمہ تک جرمنی کے سنتھٹک رنگوں نے نیل کے دھندھے کو بہت نقصان پہنچایا۔ بازاروں میں اس کی مانگ ختم ہوگئی۔ چمپارن کے باغان مالک نیل کی کھیتی بند کرنے کے لئے مجبور ہوگئے۔ مجبوراً کسان بھی نیل کی کاشت سے نجات پانا چاہتے تھے۔یورپی باغان مالکوں نے کسانوں کی مجبوری سے فائدہ اٹھانا چاہا۔کسانوں کو اقرار ناموں سے آزاد کرنے کے لئے لگان اور دوسرے ابوابوں (dues) کی رقم کو من چاہی شرح سے بڑھادی۔ 1908 میں اس کے خلاف سخت احتجاج ہوا، مگر باغان مالکوں کی لوٹ کھسوٹ برابر جاری رہی۔ بہر حال 1917 میں چمپارن کے راج کمار شکلا نے گاندھی کو چمپارن بلانے کا ارادہ کیا۔وہ گاندھی کے پیچھے پیچھے اس وقت تک گھومتے رہے جب تک وہ اس بات پر راضی نہیں ہوگئے کہ وہ چمپارن آکر کسانوں کے مسائل کا جائزہ لیں گے۔ راج کمار شکلا کا گاندھی کو چمپارن بلانا اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ گاندھی غریب اور مظلوم کے حقوق کی طرفداری میں لڑنے کے لئے کس قدر مقبول ہو چکے تھے۔

گاندھی جوں ہی چمپارن پہنچے، کمشنر نے ان کو وہاں سے فوراً چلے جانے کا حکم دیا۔ گاندھی نے چمپارن چھوڑنے سے انکار کر دیا اور وہ اس کے لئے کوئی بھی سزا جھیلنے کے لئے تیار تھے۔لوگوں کے لئے یہ بڑی حیرت ناک بات تھی۔ تلک اور اینی بسنٹ کے نزدیک بھی یہ نئی چیز تھی کیونکہ جب بھی ان لوگوں کو اس طرح کا حکم دیا گیا، انہوں نے احتجاج کرتے ہوئے بھی اس پر عمل کیا۔کسی نامناسب حکم کی نافرمانی اور پُر امن طریقے سے اس کی مخالفت حقیقت میں نئی بات تھی۔ سرکار ہند اب تک گاندھی کو باغی نہیں مانتی تھی اور اس مسئلہ کو طول نہیں دینا چاہتی تھی۔اس لئے اس نے مقامی افسران کو حکم واپس لینے اور گاندھی کو چمپارن کے گاؤں میں جانے اور لوگوں سے پوچھ گچھ کرنے کی اجازت دے دی۔

اس طرح گاندھی کسانوں کی پریشانیوں اور دقتوں کی چھان بین میں پوری طرح مصروف ہو گئے۔ وہاں ان کے کام کا طریقہ بھی انوکھا تھا۔ وہ اپنے ساتھیوں برج کشور، راجندر پرشاد، مہادیو دیسائی، نرہر پارکھ، جے بی کرپلانی اور بہار کے دوسرے دانشوروں کے ساتھ صبح سویرے نکل جاتے اور گھوم گھوم کر شام تک کسانوں سے ملتے، ان سے پوری معلومات حاصل کرتے اور جب ان کو یہ یقین ہو جاتا کہ ان کا بیان صحیح ہے تو اسے درج کر لیتے۔ انہیں دنوں سرکار نے ان سارے معاملات کی جانچ کرنے کے لئے ایک کمیشن کا تقرر کیا اور گاندھی کو اس کا ممبر بنایا۔ گاندھی کو کمیشن کو یہ بات سمجھانے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی کہ ترکٹھیا سسٹم ختم ہونا چاہیئے اور یہ کہ کسانوں سے جو پیسہ غیر قانونی طریقے سے وصول کیا گیا ہے اس کے لئے ان کو ہرجانہ دیا جائے۔ اس کے ثبوت میں وہ 8000 کسانوں کے بیانات درج کر چکے تھے۔ گاندھی کے ساتھ کسی طرح کیے گیے ایک سمجھوتہ کے تحت باغان مالک غیر قانونی وصولی رقم کا 25 فیصدی واپس کرنے پر راضی ہو گئے۔ کچھ لوگوں نے اس کی تنقید کرتے ہوئے کہا کہ گاندھی نے سو فیصدی وصولی کی مانگ کیوں نہیں کی۔ اس بات پر گاندھی نے کہا کہ 25 فیصدی واپس کرنا ہی ان کی بے عزتی کا باعث ہے۔ دوسرے اور معاملوں کی طرح گاندھی کا اندازہ اس معاملہ میں بالکل صحیح تھا۔ دس سال کے اندر ہی باغان مالکوں نے چمپارن چھوڑ دیا۔

9.7 احمد آباد کے مل مزدوروں کے حقوق کے لیے مہم

(Campaign for the Rights of Ahmedabad Mill Workers)

اس کے بعد گاندھی کی توجہ احمد آباد کے مل مزدوروں کی طرف گئی۔ مزدوروں اور مل مالکوں کے درمیان پلیگ بونس کے سلسلہ میں بحث چل رہی تھی۔ طاعون کے ختم ہونے پر مل مالکان پلیگ بونس ختم کر دینا چاہتے تھے مگر مزدور اس کو برقرار رکھنے کی مانگ کر رہے تھے۔ مزدوروں کی دلیل یہ تھی کہ ان کو جو رقم بطور بونس مل رہی ہے وہ پہلی جنگ عظیم کی وجہ سے بڑھی ہوئی مہنگائی سے کافی کم ہے۔ اس لئے اس بھتے کو واپس نہیں لیا جانا چاہیئے۔ برطانوی کلکٹر نے یہ محسوس کیا کہ کہیں اس بات کو لے کر زور آزمائش نہ ہونے لگے۔ اس لئے اس نے گاندھی سے کہا کہ مل مالکوں پر دباؤ ڈال کر سمجھوتہ کرا دیں۔ مل مالکوں میں ایک صاحب امبالال سارا بھائی گاندھی کے دوست تھے۔ انہوں نے سابر متی آشرم کے لئے کافی پیسہ دیا تھا۔ گاندھی نے مزدوروں اور مالکوں کو سارے معاملے ایک ٹریبونل (Tribunal) کے سپرد کرنے پر راضی کر لیا۔ لیکن بعد میں مالکوں نے ہڑتال کا بہانہ بنا کر خود کو اس سے الگ کر لیا۔ انہوں نے بیس فیصدی بونس دینے کا اعلان کیا اور یہ بھی دھمکی دی کہ جو مزدور اس کو نہیں مانیں گے، ان کو نوکری سے نکال دیا جائے گا، ان کی وعدہ خلافی کو گاندھی نے بڑی سنجیدگی سے لیا اور مزدوروں کو ہڑتال پر جانے کی صلاح دی۔ پونجی، پیداوار، منافع اور مزدوروں کی روزی روٹی پر غور و خوض کر کے گاندھی نے مانگ کی کہ مزدوروں کی مزدوری میں 35 فیصدی کا اضافہ ہونا چاہیئے۔ مزدوروں کی ہڑتال شروع ہو گئی۔ سابر متی ندی کے ساحل پر گاندھی روزانہ مزدوروں کو خطاب کرتے تھے۔ وہ روزنامہ نیو بلیٹن (*New Bulletin*) اخبار نکالتے تھے۔ انہوں نے مزدوروں کو تشدد کا راستہ نہ اختیار کرنے کی صلاح دی۔ امبالال سارا بھائی کی بہن انسویا (Anasuya) ان کے ساتھ تھیں جبکہ ان کے بھائی مخالف خیمہ میں تھے۔ مزدور کچھ دنوں بعد تھکنے لگے۔ اور ان کی میٹنگوں میں ان کی حاضری کم ہونے لگی اور مالکوں کا رویہ سخت تر ہونے لگا۔ مزدوروں کا حوصلہ

بڑھانے اور جدوجہد کو تیز کرنے کے لئے گاندھی نے خود اپواس (Fast) رکھنے کا فیصلہ کیا۔ انہوں نے عہد کیا کہ اگر ہڑتال کی وجہ سے مزدور بھوکے مریں گے تو وہ خود بھوکے رہیں گے۔ مل مالکوں پر گاندھی کی اس کارروائی کا من چاہا اثر پڑا۔ وہ لوگ پورا معاملہ ٹریبونل (Tribunal) کو سپرد کرنے کے لئے راضی ہوگئے۔ اس طرح ہڑتال واپس لے لی گئی۔ بعد میں ٹریبونل نے مزدوروں کی منشا کے مطابق ان کی مزدوری میں 35 فیصدی کا اضافہ کردیا۔

9.8 سرونینٹس آف انڈیا سوسائٹی (Servants of India Society)

احمد آباد میں مزدوروں اور مالکوں کے درمیان کا جھگڑا ابھی ختم بھی نہیں ہوا تھا کہ گاندھی کو معلوم ہوا کہ کھیڑا ضلع کے کسان بڑی مصیبت میں ہیں۔ ان کی فصلیں برباد ہوگئی ہیں پھر بھی سرکار ان سے مال گذاری وصول رہی ہے۔ کسان مال گذاری کی معافی مانگ رہے ہیں مگر سرکار گونگی ہوگئی ہے۔ سروینٹ آف انڈیا سوسائٹی (‘Servants of India Society’) کے ممبر بٹھل بھائی پٹیل اور گاندھی معاملہ کی پوری تحقیق کرکے اس نتیجہ پر پہنچے کہ کسانوں کی مانگیں جائز ہیں اور اس لئے مال گذاری اصول (Revenue Rules) کے تحت زمین کا لگان معاف ہونا چاہیے۔ اس تحریک میں گجرات سبھا جس کے گاندھی صدر تھے نے اہم رول ادا کیا۔ درخواستوں اور اپیلوں کا جب کوئی اثر حکومت پر نہیں پڑا تب گاندھی نے لوگوں کو لگان بیباق نہ کرنے اور اس ظلم اور جبر کے خلاف مرتے دم تک جنگ کرنے کی صلاح دی۔ اور اس طرح سرکار کو یہ بھی واضح کردیا کہ عوام کی مرضی کے بغیر کوئی سرکار حکومت نہیں کرسکتی۔ کھیڑا ضلع کے نوجوان وکیل بلبھ بھائی پٹیل، اندولال یاگنک (Indu Lal Yagnik) اور دوسرے کئی نوجوانوں نے گاندھی کے ساتھ گاؤں کا دورہ شروع کیا اور کسانوں سے جدوجہد کرنے کی اپیل کی۔ سرکار نادہندہ کسانوں کی زمینیں قرق کررہی تھی اور ان کے مویشی ہانکنے لئے جارہی تھی۔ گاندھی نے کسانوں سے لگان نہ دینے کی قسم دلائی۔ جو لوگ لگان دینے کی حیثیت رکھتے تھے ان کو بھی منع کیا گیا کیونکہ ان کے لگان دینے کی صورت میں غریب کسانوں کو بھی ایسا کرنے کے لئے مجبور کیا جاتا۔ ایسی حالت میں یا تو وہ قرض لیتے یا پھر اپنی جائیدادیں فروخت کرتے۔ گاندھی نے حکومت سے کہا کہ اگر وہ غریب کسانوں کا لگان معاف کردیتی ہے تو جو لوگ لگان دینے کے لائق ہیں وہ خود اپنی مرضی سے پورا لگان دے دیں گے۔

کھیڑا کے کسان طاعون، مہنگائی اور قحط کی مار سے بدحال تھے۔ اس لئے ان کی جدوجہد کمزور پڑنے لگی۔ تبھی گاندھی کو معلوم ہوا کہ سرکار نے اپنے افسروں کو خفیہ ہدایتیں دی ہیں کہ مال گذاری صرف انہیں کسانوں سے وصولی جائے جو دینے کی استطاعت رکھتے ہیں۔ اس سلسلہ میں سرکار کی خفیہ ہدایتیں صرف اس وجہ سے تھیں کہ اس سے حکومت کے وقار پر آنچ آتی تھی۔ گاندھی کی منشا پوری ہورہی تھی اس لئے انہوں نے اپنی تحریک واپس لے لی۔ بعد میں گاندھی نے یہ بات ظاہر کی کہ اس وقت تک لوگ اپنی جدوجہد میں تھک چکے تھے۔ اس لئے تحریک روکنے کے لئے وہ کسی باعزت بہانہ کی تلاش میں تھے۔ چمپارن، احمد آباد اور کھیڑا میں گاندھی کو اپنے سیاسی طور طریقوں کے آزمانے کا بڑے پیمانہ پر موقع ملا۔ اس کے علاوہ وہ عوام کے قریب آئے اور ان کے مسائل سے واقف ہوئے۔ ان کو اس کی قوت اور کمزوریوں کا بھی علم ہوا۔ ان کی حکمت عملی کہاں تک کامیاب ہوسکتی ہے اس کی بھی معلومات ان کو ہوئی۔ بہت سارے سیاسی رضاکار خصوصاً نوجوان ان کو عقیدت

کی نظر سے دیکھنے لگے اور اس دوران انہوں نے ہندوستانی عوام کے درمیان اچھی خاصی پہچان بنالی۔

گاندھی کے تجربات اور ان کی نیک نامی نے ان کو بے انتہا حوصلہ مند بنا دیا تھا۔ اپنی بے پایاں ہمت، استقلال اور خود اعتمادی کے سہارے گاندھی نے 1919 میں رولٹ ایکٹ کے خلاف ملکی سطح پر تحریک چلانی شروع کی۔ انگریز، دہشت گردی کو کچلنے کا بہانہ بنا کر ہندوستانیوں کے بنیادی حقوق (Fundamental Rights) کو ختم کرنا چاہتے تھے۔ رولٹ کی صدارت میں ایک کمیٹی نے دو بل تیار کیئے جن کو رولٹ بل کا نام دیا گیا۔ ان دونوں بلوں کو کونسل میں پاس ہونے کے لئے پیش کیا گیا۔ ان میں سے ایک کو ہندوستانی ممبروں کی مخالفت کے باوجود جلدی جلدی پاس کر دیا گیا۔ ہندوستانی عوام اس قانون کو اپنی ہتک و توہین کا باعث مانتی تھی۔ یہ قانون ایسے وقت میں لائے گئے جب پہلی جنگ عظیم اپنے آخری مرحلہ میں تھی اور لوگ ملک میں اہم آئینی سدھاروں کے انتظار میں تھے۔ ان کو خاص رعایت پانے کی امید تھی۔ جب لوگوں کی مخالفت کا کوئی اثر حکومت پر نہیں پڑا تو گاندھی نے ستیہ گرہ شروع کرنے کا مشورہ دیا۔ اس کے لئے ستیہ گرہ سبھا کی تشکیل کی گئی۔ اس میں ہوم رول لیگ کے نوجوان ممبر تھے۔ وہ حکومت کے خلاف جدوجہد کرنے کے لیے بے تاب تھے۔ ہوم رول لیگ کی سبھی شاخوں اور ممبروں کے پتے نوٹ کرکے ان سے تعلق جوڑا گیا۔ پھر پرچار کرنے کا کام شروع ہوا۔ ملک بھر میں دعاؤں، روزوں اور ہڑتالوں کا دور چلنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی کچھ خاص خاص قانونوں کی خلاف ورزی کا بھی فیصلہ لیا گیا۔

ستیہ گرہ کی تاریخ چھ (6) اپریل طے کی گئی۔ لیکن تحریک نے غیر متوقع صورت اختیار کرلی۔ تاریخ کے بارے میں غلط فہمی پیدا ہوگئی۔ اور دہلی میں 30 مارچ کو ہی ہڑتال کر دی گئی۔ اس کے دوران دہلی کی سڑکوں پر تشدد کے بہت سے واقعات ہوئے۔ دوسری جگہوں پر بھی یہی ردعمل ہوا۔ پنجاب میں جہاں لوگ پہلی جنگ عظیم کے دوران فوج میں کی گئی جبریہ بھرتی نیز دوسری زیادتیوں اور بیماری کی تباہیوں سے سخت مصیبت میں تھے۔ انہوں نے ایسے حالات کو حکومت سے بدلہ لینے کا نادر موقع سمجھا۔ امرت سر اور پنجاب میں تو حالات قابو سے باہر ہوگئے۔ گاندھی پنجاب جاکر لوگوں کو سمجھانا چاہتے تھے مگر حکومت نے ان کو پنجاب میں داخل نہیں ہونے دیا اور ان کو بمبئی بھیج دیا۔ ان کا اپنا گجرات اور احمد آباد تشدد کی آگ میں جل رہا تھا اس لئے وہاں رک کر لوگوں کو پُرامن کرنا چاہتے تھے۔ بمبئی میں بھی یہی حالت تھی۔

9.9 جلیاں والا باغ (Jallianwala Bagh Massacre)

پنجاب میں واقعات بہت خطرناک موڑ پر تھے۔ امرت سر میں 10 اپریل کو سیف الدین کچلو اور ڈاکٹر ستیہ پال کی گرفتاری کے خلاف ٹاؤن ہال اور پوسٹ آفس پر حملے کئے گئے۔ ٹیلی گراف کے تار کاٹ دیئے گئے۔ یورپی لوگوں جن میں عورتیں بھی شامل تھیں پر حملے ہوئے۔ تشدد پر قابو پانے کے لئے فوج تک طلب کرلی گئی۔ پورا شہر جنرل ڈائر (Dyer) کے سپرد کر دیا گیا۔ اس نے میٹنگ کرنے پر پابندی عائد کردی۔ 13 اپریل کو بیساکھی کا دن تھا۔ جلیاں والا باغ میں بیساکھی کا جلسہ تھا۔ پاس پڑوس گاؤں اور قصبوں کے لوگ وہاں جمع تھے۔ جنرل ڈائر نے سمجھا کہ لوگ اس کے حکم کو نظر انداز کرکے جلسہ کرنے آئے ہیں۔ وہ جلسہ گاہ پر پہنچا اور لوگوں پر یکبارگی گولیاں برسانے کا حکم دیا۔ دس منٹ تک گولیاں برستی رہیں۔ ایسی درندگی کرنے کے پہلے اس نے لوگوں کو خبردار کرنا بھی مناسب نہیں سمجھا۔ جلسہ گاہ کے چاروں

طرف اونچی اونچی دیواریں تھیں۔ وہاں سے بھاگنا آسان نہیں تھا۔ سرکاری اندازہ کے مطابق 379 لوگ مارے گئے مگر مرنے والوں کی تعداد اس سے کہیں زیادہ تھی۔ جلیاں والا باغ میں جو بربریت کی گئی اس سے پورا ملک صدمہ میں ڈوب گیا۔ حکومت کے مظالم اب بھی جاری تھے۔ پنجاب میں مارشل لا نافذ کردیا گیا۔ امرت سر کے لوگوں پر طرح طرح کے مظالم ڈھائے گئے۔ لوگوں کو پیٹ کے بل رینگنے کے لئے مجبور کیا گیا۔ گاندھی سے تشدد کے واقعات نہ دیکھے ج اس کے۔ اس لئے انہوں نے 18 اپریل کو اپنی تحریک واپس لے لی۔ لیکن اس کا قطعی یہ مطلب نہیں کہ گاندھی کا پُرامن ستیہ گرہ سے عقیدہ اٹھ گیا تھا وہ ہندوستانی عوام سے ناامید ہو گئے تھے۔ ایک سال بعد انہوں نے ملکی سطح پر تحریک پھر شروع کی۔ اس کا دائرہ رولٹ ستیہ گرہ سے بھی زیادہ بڑا اور وسیع تھا۔ پنجاب کی وحشیانہ بربریت بھی اس تحریک کی ایک بنا تھی۔ مہاتما کا ہندوستانی تجربہ اب شروع ہو گیا تھا۔

9.10 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

ہندوستانی سیاست میں گاندھی کے عروج کے بارے میں واقف ہو چکے ہوں گے۔ انہوں عدم تشدد اور پر امن ستیہ گرہ کا راستہ اپنایا۔ جنوبی افریقہ سے آغاز کرتے ہوئے ہندوستان آکر انہوں نے ہندوستانی قومی تحریک کی قیادت سنبھالی۔ انڈین نیشنل کانگریس کو ایک عوامی تنظیم بنانے میں گاندھی کا اہم کردار رہا ہے۔

9.11 کلیدی الفاظ (Keywords)

ستیا گرہ	:	سچ اور عدم تشدد
اپار تھیلڈ	:	نسلی علاحدگی

9.12 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

9.12.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Very Short Answer Type Questions)

1. گاندھی نے کس ملک میں نسلی امتیاز کے خلاف جدوجہد کی؟
2. رولٹ ایکٹ کب نافذ ہوا؟
3. *Natal Advertiser* سے کیا مراد ہے؟
4. کنگ جارج کی تاج پوشی کب ہوئی؟
5. Passive Resistance Association کا قیام کب عمل میں آیا؟
6. گاندھی جنوبی افریقہ سے کس سال ہندوستان واپس آئے؟
7. تین کٹھیا سسٹم سے کیا مراد ہے؟

8. Phoenix Settlement کس علاقہ میں متعارف کیا گیا؟
9. روزنامہ نیو بلیٹن(*New Bulletin*) کہاں سے شائع ہوتا تھا؟
10. 'Servants of India Society' کا بانی کون ہے؟

9.12.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی کے بارے میں مختصر لکھیں۔
2. احمد آباد کے مل مزدوروں کے کیا مسائل تھے ان کو مختصر لکھیں۔
3. چمپارن ستیہ گرہ کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں۔
4. رولٹ ایکٹ کے بارے میں مختصر طور پر تحریر کیجیے؟
5. جلیاں والا باغ حادثہ کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں بیان کریں؟

9.12.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. گاندھی کی ابتدائی زندگی کے بارے میں تفصیلی جائزہ لیجیے۔
2. جنوبی افریقہ میں گاندھی کی جدو جہد کے بارے میں مفصل لکھیں۔
3. ہندوستان میں گاندھی کی ابتدائی تحریکوں کے بارے میں تفصیل سے لکھیں۔

9.13 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Learning Resources)

1. Bandyopadhyay, Sekhar, *From Plassey to Partition*, Orient Longman, New Delhi, 2004.
2. Bhana, Surendra, and Goolam Vahed, *The Making of a Political Reformer*: *Gandhi in South Africa, 1893–1914*, Manohar, New Delhi, 2005.
3. Chandra, Bipan, et. al., *India's Struggle for Independence*, 1857-1947, Penguin Books, New Delhi, 1989.
4. Gandhi, Rajmohan, *Mohandas*: *A True Story of a Man, His People and an Empire*, Penguin, New Delhi, 2006.
5. Guha, Ramachandra, *Gandhi*: *The Years that Changed the World, 1914–1948*, Penguin, Gurgaon, 2006.
6. Guha, Ramachandra, *Gandhi before India*, Penguin, Gurgaon, 2013.
7. Hardiman, David, *Gandhi: In His Times and Ours*, Permanent Black, Delhi, 2003.
8. Kripalani, J.B., *Gandhi*: *His Life and Thought*, Publications Division, Government of India, 2019 (first pub in 1970).
9. Lelyveld, Joseph, *Great Soul*: *Mahatma Gandhi and His Struggle with India*, HarperCollins, New Delhi, 2011.
10. Turner, Graham, *Catching Up with Gandhi*, Penguin, New Delhi, 2010.

اکائی 10۔ خلافت اور عدم تعاون تحریک

(Khilafat and Non-Cooperation Movements)

اکائی کے اجزا

10.0 تمہید
10.1 مقاصد
10.2 خلافت اور عدم تعاون تحریک کے ظہور کے اسباب
10.2.1 مسئلہ خلافت
10.2.2 کانگریس اور مسئلہ خلافت
10.3 عدم تعاون تحریک: کلکتہ سے ناگپور تک
10.3.1 عدم تعاون تحریک کے اہم مراحل
10.3.2 پہلا مرحلہ
10.3.3 دوسرا مرحلہ
10.3.4 تیسرا مرحلہ
10.3.5 تحریک سے متعلق عوامی رد عمل
10.3.6 برطانوی حکومت کا ظلم واستبداد
10.3.7 تحریک کا پھیلاؤ اور اس کے مقامی تغیرات
10.3.8 تحریک کا آخری مرحلہ
10.4 عدم تعاون تحریک کی معطلی کی وجوہات
10.5 تحریک کے اثرات
10.6 اکتسابی نتائج
10.7 کلیدی الفاظ
10.8 نمونہ امتحانی سوالات

10.9 تجویز کردہ اکتسابی مواد

10.0 تمہید (Introduction)

1920-21 کے دوران ہندوستانی قومی تحریک متحرک عوامی سیاست کے مرحلے میں داخل ہوئی تھی۔ برطانوی راج کی مخالفت خلافت اور عدم تعاون تحریک کے ذریعے کی گئی۔ اگرچہ ان دونوں تحریکوں کا پس منظر مختلف تھا، لیکن انہوں نے ایک مشترکہ لائحہ عمل اختیار کیا۔ اس تحریک میں ایم۔ کے۔ گاندھی نے عدم تشدد اور عدم تعاون پر مبنی جدوجہد کی تکنیک کا قومی سطح پر تجربہ کیا تھا۔ اس تحریک کو وائسرائے کے نام گاندھی کے بھیجے ہوئے 22 جون کے مراسلہ کے بعد یکم اگست 1920 کو شروع کیا گیا تھا۔ اس تحریک کے ذریعے گاندھی نے اس بات پر زور دیا تھا کہ 'کسی حکمران کے ساتھ تعاون سے انکار کرنا رعایا کا تسلیم شدہ حق ہے'۔ لہذا، یکم اگست 1920 کو کانگریس نے برطانوی حکومت ہند کے ساتھ عدم تعاون تحریک کا آغاز کیا، اور اسی دن بال گنگادھر تلک کی وفات کی وجہ سے اس تحریک کی قوت رفتار میں اضافہ ہوا۔

10.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- خلافت اور عدم تعاون کی تحریک کے اغراض و مقاصد کے بارے میں جان سکیں گے۔
- تحریک کی قیادت، عوامی رد عمل، علاقائی تغیرات اور ان تحریکوں کے اثرات کو سمجھ سکیں گے۔
- خلافت اور عدم تعاون کی تحریک میں گاندھی کے کردار سے واقف ہوں گے۔

10.2 خلافت اور عدم تعاون تحریکوں کے ظہور کے اسباب (Reasons for the Emergence of Khilafat and Non-Cooperation Movements)

بیسویں صدی کی دوسری دہائی کے آخر میں ہندوستانی رائے عامہ برطانوی راج کے خلاف تھی۔ رولٹ ایکٹ، جلیانوالہ باغ قتل عام، پنجاب میں مارشل قانون اور ترکی کے ساتھ ہوئی ناانصافیوں نے انگریزوں کے تمام فراخدلانہ وعدوں کو جھٹلایا۔ مونٹیگ و چیمسفورڈ اصلاحات (1919) کے ذریعے پیش کی گئی دو عملی حاکمیت (Dyarchy) کی اسکیم سے صرف چند لوگ مطمئن ہوئے۔ ہندوستانی مسلمان برطانوی راج سے اس وقت بد دل ہو گئے جب انہیں معلوم ہوا کہ جنگ کے بعد ترکی کے ساتھ فراخدلانہ سلوک کی یقین دہانیوں کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ دراصل یہ وہ وعدہ تھا جو کہ برطانوی سیاستدانوں کو پورا کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے تھے۔ ان وجوہات کو مندرجہ ذیل میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔

پہلی جنگ عظیم کے بعد روزمرہ استعمال کی اشیاء کی قیمتوں میں تیزی سے اضافہ ہوا جس کی وجہ عام لوگ سب سے زیادہ متاثر

ہوئے۔ درآمدات کا حجم، جو پہلی جنگ عظیم کے دوران کم ہوا تھا، جنگ ختم ہونے کے بعد دوبارہ بڑھ گیا۔ اس کے نتیجے میں ہندوستانی صنعتوں کو کافی نقصان ہوا، پیداوار میں کمی واقع ہوئی، متعدد کارخانے بند ہو گئے اور مزدوروں کی آمدنی پر برا اثر پڑا۔ کسان طبقہ بھی ٹیکسوں کے بھاری بوجھ تلے دب گیا۔ اس طرح، جنگ کے بعد ملک کی معاشی صورتحال تشویشناک ہو چکی تھی۔ مزید برآں، سیاسی میدان میں قوم پرست رہنما اس وقت مایوس ہو گئے جب انگریزوں نے عوام کے لیے جمہوریت اور خود ارادیت کا نیا دور لانے کا وعدہ پورا نہ کیا، جس سے ہندوستانیوں کے انگریز مخالف رویے کو تقویت مل گئی۔

دوسری اہم وجہ رولٹ قانون ہے۔ یہ قانون مارچ 1919 میں پاس کیا گیا۔ اس قانون نے حکومت کو یہ اختیار بخشا تھا کہ وہ عدالت میں بغیر مقدمہ چلائے کسی بھی شخص کو قید کر سکتی ہے۔ اس کا بنیادی مقصد قوم پرست رہنماؤں کو اپنے دفاع کا موقع دیے بغیر قید کرنا تھا۔ گاندھی نے ستیہ گرہ کے ذریعے اس کی مخالفت کرنے کا فیصلہ کیا۔ مارچ اور اپریل 1919 میں ہندوستان میں ایک غیر معمولی سیاسی بیداری وجود میں آ چکی تھی، اور رولٹ ایکٹ کے خلاف متعدد احتجاج اور مظاہرے شروع ہو گئے۔

اسی دور میں امرتسر کے جلیانوالہ باغ میں برطانوی سامراج نے اپنی بربریت کا مظاہرہ کیا۔ 13 اپریل 1919 کو جلیانوالہ باغ میں ایک غیر مسلح ہجوم اپنے مقبول رہنماؤں ڈاکٹر سیف الدین کچلو اور ڈاکٹر ستیہ پال کی گرفتاری کے خلاف احتجاج کرنے کے لیے جمع ہوا تھا۔ امرتسر کے فوجی کمانڈر جنرل ڈائر نے اپنے فوجیوں کو غیر مسلح ہجوم پر بغیر کسی انتباہ کے گولی چلانے کا حکم دیا۔ سینکڑوں مارے گئے اور ہزاروں کی تعداد میں لوگ زخمی ہوئے۔ اس سانحہ نے پوری دنیا کو چونکا دیا، اور مشہور شاعر رابندر ناتھ ٹیگور نے احتجاج کے طور پر اپنا نائٹ ہڈ (Knighthood Award) اعزاز لوٹا دیا۔ آئینی اصلاحات یعنی گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1919 نے بھی ہندوستان کے قوم پرستوں کو مزید مایوس کر دیا، کیونکہ یہ اصلاحات لوگوں کی بڑھتی ہوئی مانگیں جیسے حصول سوراجیہ وغیرہ، کو پورا کرنے میں ناکام رہیں۔ اکثر رہنماؤں نے ان اصلاحات کو مایوس کن اور غیر تسلی بخش قرار دیتے ہوئے اس کی مذمت کی۔

مسلمان ترکی کے خلیفہ کو اپنا روحانی سربراہ مانتے تھے۔ جب 1920 میں پہلی عالمی جنگ کے بعد ترکی کو مختلف اطراف میں اپنی وسیع اراضی سے محروم کیا گیا اور خلیفہ کو اپنی حیثیت سے دستبردار کیا گیا، ہندوستان کے مسلمانوں نے اس کی مذمت کی۔ انہوں نے اس مقدس ادارے کی بحالی کے لئے خلافت تحریک قائم کی۔ 1920 کے ابتدائی مہینوں میں خلافت رہنماؤں کو واضح طور پر کہا گیا تھا کہ انہیں مزید کسی چیز کی توقع نہیں رکھنی چاہیے، اور مئی 1920 میں ترکی کے ساتھ ہوئے سیورز معاہدے نے یہ واضح کر دیا تھا کہ ترک سلطنت کی عمل تقسیم مکمل ہو چکی ہے۔ اس دوران، کانگریس سیاسی پیش رفت سے متعلق آئینی اصول و ضوابط پر شک کرنے لگا تھا۔ اس کے علاوہ، کانگریس لیڈران پنجاب میں ہوئی بربریت کی تفتیش کرنے والی ہنٹر کمیٹی کے رپورٹ سے بھی مطمئن نہ تھے۔ متذکرۂ بالا واقعات کو مدّ نظر رکھتے ہوئے مئی 1920 میں کل ہند کانگریس کمیٹی کی نشست میں عدم تعاون کی تحریک پر اتفاق ہو گیا اور ستمبر میں ہنگامی اجلاس منعقد کرنے کا فیصلہ لیا گیا۔

اس صورتحال کا جائزہ لینے کے بعد ہندوؤں اور مسلمانوں نے مشترکہ سیاسی لائحہ عمل اپنانے کی کوشش کی۔ 1916 کے لکھنؤ معاہدہ نے کانگریس اور مسلم لیگ کے اتحاد کو پائیدار بنادیا، رولٹ قانون کے خلاف اعتراضات نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو متحد کر دیا۔ مولانا محمد علی، ابوالکلام آزاد اور حکیم اجمل خان جیسے قوم پرست مسلمان رہنما علی گڑھ کے قدامت پسند رہنماؤں سے زیادہ بااختیار ہو چکے تھے۔ سیاسی حالات نے برطانوی حکومت کے خلاف عوامی بغاوت کے لیے موثر فضا تیار کی۔ اس تحریک میں مسئلہ خلافت کی وجہ سے مسلمانوں کی حمایت حاصل کی گئی، اور گاندھی کی قیادت نے اسے حتمی شکل دے دی۔

10.2.1 مسئلہ خلافت (The Question of Khilafat)

پہلی جنگ عظیم کے دوران ترکی نے برطانیہ کے خلاف جرمنی اور آسٹریا کے ساتھ اتحاد کیا تھا۔ ہندوستانی مسلمان ترکی کے سلطان کو اپنا روحانی پیشوا یا خلیفہ مانتے تھے، اس لیے ظاہری طور پر ان کی ہمدردیاں ترکی کے ساتھ تھیں۔ یہ تحریک اس لئے خلافت تحریک کہلاتی تھی، کیونکہ اس کا بنیادی مقصد خلیفہ کے اقتدار کو برقرار رکھنا تھا۔ اسلامی عقیدہ یہ تھا کہ خلیفہ کو مومنوں کا دفاع کرنا چاہیے، اور پیغمبر محمدؐ کے حکم کے مطابق جزیرۃالعرب یعنی عرب، شام، عراق اور فلسطین، اور وہاں کے مقدّس مقامات خلیفہ کے کنٹرول میں رہیں۔ یہ مطالبات محمد علی نے 1920 میں پیرس میں مختلف ملکوں سے وابستہ سفارت کاروں کے سامنے پیش کیے تھے۔ اس کے برعکس، جنگ کے بعد برطانیہ نے ترکی میں خلیفہ کا اقتدار ختم کر دیا۔ گیل مینالٹ اور فرانسیس رابنسن کا استدلال ہے کہ خلافت کے رہنما مشرق وسطیٰ میں خلیفہ کی حیثیت سے فکر مند نہیں تھے، بلکہ ان کے لیے خلافت ایک ایسی علامت تھی جس نے ہندوستان کے مسلمانوں کو اتحاد بخشا، جو اب تک وسیع علاقائی، ثقافتی اور طبقاتی اختلافات کے ساتھ نبرد آزما رہے تھے۔ خلافت ایک ایسا ادارہ تھا جو عالمی سطح پر مسلمانوں کو متحرک کر سکتا تھا۔ اس لئے، مسلمانوں نے خلیفہ کی حیثیت کو بحال کرنے کے لیے ہندوستان میں تحریک خلافت شروع کی۔ اس تحریک کے بنیادی مطالبات یہ تھے:

- مسلمانوں کے مقدس مقامات پر خلیفہ کا کنٹرول برقرار رکھا جائے۔
- جنگ کے بعد خلیفہ کے پاس کافی علاقے چھوڑ دیے جائیں۔

1919 کے اوائل میں، علی برادران، مولانا آزاد، اجمل خان اور حسرت موہانی کی قیادت میں بمبئی میں ایک خلافت کمیٹی تشکیل دی گئی، تاکہ انگریزوں کو ترکی کے بارے میں اپنا رویہ بدلنے پر مجبور کیا جاسکے۔ یہ پہل مسلمان تاجروں نے کی تھی اور ان کے اقدامات خلیفہ کے حق میں ملاقاتوں، درخواستوں اور وفود تک محدود تھے۔ تاہم، جلد ہی اس تحریک کے اندر عسکریت پسندی کا رجحان پیدا ہوا۔ اس رجحان کے رہنما اعتدال پسند طرز عمل سے مطمئن نہیں تھے۔ اس لئے، انہوں نے ایک ملک گیر تحریک شروع کرنے کی تبلیغ کی۔ انہوں نے پہلی بار دہلی میں کل ہند خلافت کانفرنس (22-23 نومبر 1919) میں برطانوی حکومت کے ساتھ عدم تعاون کی وکالت کی۔ گاندھی، جو کافی عرصے سے خلافت کے رہنماؤں کے ساتھ قریبی رابطے میں تھے، انہوں نے بھی نومبر 1919 کی خلافت کانفرنس میں شرکت کی تھی۔ گاندھی خلافت رہنماؤں کے ساتھ ہمدردی رکھتے تھے، کیونکہ انہیں لگتا تھا کہ انگریزوں نے ان کے ساتھ وعدہ خلافی کی ہے۔ اسی کانفرنس میں حسرت موہانی نے برطانوی تیار شدہ اشیاء کے بائیکاٹ کی اپیل کی۔ خلافت رہنماؤں نے واضح طور پر کہا تھا کہ جنگ کے بعد امن کی شرائط مسلمانوں کے

لیے ناگوار ہونے کی صورت میں وہ حکومت کے ساتھ ہر طرح کا تعاون بند کریں گے۔ فروری 1920 میں، گاندھی نے خلافت کمیٹی کو تجویز دی کہ وہ حکومت کے رویے کے خلاف عدم تشدد پر مبنی عدم تعاون کا پروگرام اپنائے۔ اپریل 1920 میں، شوکت علی نے انگریزوں کو خبردار کیا کہ اگر حکومت ہندوستانی مسلمانوں کو مطمئن کرنے میں ناکام رہی تو ہم عدم تعاون کی مشترکہ ہندو مسلم تحریک شروع کریں گے۔ انہوں نے اس بات کا بھی تذکرہ کیا کہ یہ تحریک ایم۔ کے۔ گاندھی کی قیادت میں شروع ہوگی، جو ہندو اور مسلمانوں کی نظر میں ایک قابل احترام شخصیت ہے۔ 9 جون 1920 کو الہ آباد میں خلافت کمیٹی نے متفقہ طور پر عدم تعاون کی تجویز اور گاندھی کی قیادت کو قبول کیا گیا۔

خلافت کا مسئلہ ہندوستان کی سیاست سے براہ راست منسلک نہیں تھا لیکن خلافت کے رہنما ہندوؤں کی حمایت حاصل کرنے کے خواہشمند تھے۔ اس کے علاوہ، گاندھی کو اس تحریک کے ذریعے انگریزوں کے خلاف ہندو مسلم اتحاد قائم کرنے کا موقع مل گیا۔ لیکن کل ہند خلافت کمیٹی کے صدر ہونے کے باوجود گاندھی نے مئی 1920 تک ایک معتدل طرز عمل اپنایا تھا۔ لیکن سیورز معاہدے اور ہنٹر کمیٹی کی رپورٹ کی اشاعت نے ہندوستانیوں کو مشتعل کر دیا، اور اس لئے، گاندھی نے برطانوی حکومت کے خلاف عدم تعاون کا اعلان کیا۔ مرکزی خلافت کمیٹی کا اجلاس یکم سے 3 جون 1920 کو الہ آباد میں ہوا۔ اجلاس میں کانگریس اور خلافت کے کئی رہنماؤں نے شرکت کی، اور حکومت کے ساتھ عدم تعاون کے پروگرام کا اعلان کیا گیا۔ اس پروگرام میں مندرجہ ذیل نکات شامل تھے:

- حکومت کی طرف سے عطا کردہ اعزازات کا بائیکاٹ۔
- سول سروس، فوج، پولیس اور تمام سرکاری ملازمتوں کا بائیکاٹ۔
- حکومت کی طرف ٹیکس کی غیر ادائیگی۔

تحریک شروع کرنے کے لیے یکم اگست 1920 کی تاریخ مقرر کی گئی تھی۔ گاندھی نے اصرار کیا کہ جب تک پنجاب اور خلافت مسئلوں کو حل نہ کیا جائے، حکومت کے ساتھ عدم تعاون جاری رہے گا۔ خلافت رہنماؤں نے سول سروس، پولیس، فوج کا بائیکاٹ اور ٹیکسوں کی غیر ادائیگی کے ذریعے حکومت کے ساتھ عدم تعاون پروگرام کا آغاز کیا، اور کانگریس نے اس کی حمایت کی۔ اس کے پس منظر میں، گاندھی نے کلکتہ کے خصوصی اجلاس میں پنجاب سانحہ، خلافت اور سوراج جیسے مسائل پر زور دیا۔

10.2.2 کانگریس اور مسئلہ خلافت (Congress and the Question of Khilafat)

یہ بالکل واضح تھا کہ تحریک خلافت کی کامیابی کے لیے کانگریس کی حمایت ضروری تھی۔ اگرچہ گاندھی خلافت کے مسئلے پر حکومت کے خلاف ستیہ گرہ اور عدم تعاون شروع کرنے کے لئے تیار تھے، لیکن کانگریس اس سیاسی کاروائی پر متحد نہیں تھی۔ تلک مذہبی معاملے میں مسلم رہنماؤں کے ساتھ اتحاد کرنے کے مخالف تھے اور وہ سیاست میں ستیہ گرہ کے اصول پر بھی مشکوک تھے۔ پروفیسر روبندر کمار لکھتے ہیں کہ گاندھی نے تلک کو ستیہ گرہ کی خوبیوں اور مسئلہ خلافت کی مطابقت کے بارے میں سمجھایا۔ اس طرح، گاندھی نے خلافت تحریک کے موقع پر عدم تعاون کی سیاسی کاروائی کو اپنانے کے لیے کانگریس پر زور ڈالا، کیونکہ:

یہ محسوس کیا گیا کہ یہ ہندو مسلم اتحاد کو مضبوط کرنے اور مسلم عوام کو قومی تحریک میں شامل کرنے کا سنہری موقع ہے۔ لوگوں کے اندر یہ احساس جگانے کی کوشش کی گئی کہ اب سماج کے مختلف طبقات یعنی ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی، کسان، کاریگر، سرمایہ دار، قبائلی لوگ، خواتین، طالب علم، وغیرہ، اپنے حقوق کے لیے قومی تحریک میں آسکتے ہیں۔ پنجاب سانحہ اور ہنٹر کمیٹی کے متعصبانہ رپورٹ کے بعد کانگریس آئینی جدوجہد پر اعتماد کھو رہی تھی۔ اس کے علاوہ، کانگریس کو معلوم تھا کہ عوام اپنے عدم اطمینان کو ظاہر کرنے کے لیے بے تاب ہیں۔

10.3 عدم تعاون تحریک: کلکتہ سے ناگپور اجلاس تک

(Non-Cooperation Movement: From Calcutta to Nagpur Conference)

1920 کے اوائل میں، خلافت کے مسئلے پر شکایات کا ازالہ کرنے کے لیے ایک مشترکہ ہندو مسلم وفد برطانوی وائسرائے کے پاس بھیجا گیا، لیکن یہ مشن ناکام ثابت ہوا۔ فروری 1920 میں، گاندھی نے اعلان کیا کہ اگر امن معاہدے کے شرائط ہندوستانی مسلمانوں کو مطمئن کرنے میں ناکام رہیں، تو بہت جلد وہ عدم تعاون تحریک شروع کریں گے۔ مئی 1920 میں، سیورز معاہدے کے ذریعے ترکی کو مختلف ٹکڑوں میں تقسیم کیا گیا۔ مذکورۂ بالا پس منظر میں جون 1920 میں الہ آباد میں آل پارٹی کانفرنس منعقد ہوئی، جس میں اسکولوں، کالجوں اور عدالتوں کے بائیکاٹ کے پروگرام کی منظوری دی گئی اور گاندھی کو اس کی قیادت کرنے کے لئے منتخب کیا گیا۔ اس تحریک کو آگے بڑھانے کے لئے گاندھی نے عدم تعاون کا پروگرام پیش کیا، جس میں مندرجہ ذیل نکات شامل ہیں:

- برطانوی القابات اور اعزازات کو چھوڑ دیا جائے۔
- صوبائی اور مرکزی قانون ساز اسمبلی کے انتخابات کا بائیکاٹ کیا جائے۔
- غیر ملکی کپڑوں کا بائیکاٹ اور اس کے بجائے دیسی کھادی کا استعمال کیا جائے۔
- حکومت کے ذریعے تسلیم شدہ اسکولوں اور کالجوں کا بائیکاٹ کیا جائے۔
- عدالتوں کا بائیکاٹ اور اس کے بجائے پنچایتوں کے ذریعے انصاف کی فراہمی کی جائے۔ اس میں سرکاری ملازمت سے استعفیٰ اور ٹیکس کی غیر ادائیگی سمیت بڑے پیمانے پر عام نافرمانی بھی شامل تھی۔

مندرجہ بالا نکات کو حاصل کرنے کے لئے قومی اسکول اور کالج قائم کیے گئے، تنازعات کے حل کے لیے پنچایتیں قائم کی گئی، ہاتھ سے کپڑا کاتنے اور بُننے کی حوصلہ افزائی کی گئی، ہندو مسلم اتحاد کو ترجیح دی گئی اور اچھوت پن کو ترک کرنے کی کوشش کی گئی۔ گاندھی نے شرکاء کو یقین دلایا کہ اگر اس پروگرام کو مکمل طور پر عمل میں لایا جائے تو ایک سال کے اندر سوراجیہ حاصل کیا جاسکتا ہے۔ اگست اور دسمبر 1920 کے درمیان تحریک کا منظر تمثیلی انداز میں بدل گیا۔ موتی لال نہرو نے ستمبر 1920 میں کلکتہ میں کانگریس کے خصوصی اجلاس میں گاندھی کی حمایت کی، اور چترنجن داس، جنھوں نے دسمبر میں ناگپور میں ہونے والے کانگریس اجلاس کے لیے بنگال سے آنے والی مخالف وفد کی مالی معاونت کے لیے بہت بڑی رقم خرچ کی تھی، نے ایک قرارداد پاس کی جس نے عدم تشدد پر مبنی عدم تعاون کو قبول کیا۔ اس قرارداد میں

حکومت کے ساتھ رضاکارانہ وابستگی سے دستبرداری کے ساتھ ساتھ ٹیکسوں کی غیر ادائیگی بھی شامل تھی۔

اس طرح ناگپور اجلاس (دسمبر 1920) نے کانگریس کو بڑے پیمانے پر کارروائی کے پروگرام کا پابند بنایا۔ انقلابی تحریک کے بہت سے گروہ، جیسے بنگال انقلابی کارکنوں نے بھی تحریک کی حمایت کی۔ اپنے نئے عہد کو پورا کرنے کے لیے، کانگریس کے مختلف عقاید اور تنظیمی ڈھانچے میں بھی اہم تبدیلیاں کی گئیں۔ کانگریس کا مقصد آئینی اور قانونی طریقوں سے خود مختاری کے حصول کو پرامن اور جائز طریقوں سے سوراجیہ کے حصول میں بدل دیا گیا۔ کانگریس کے نئے آئین میں گاندھی نے دیگر اہم تبدیلیاں بھی متعارف کروائی۔ کانگریس نے اب اپنے روزمرہ کے امور کی دیکھ بھال کے لیے پندرہ ارکان کی ایک ورکنگ کمیٹی بنائی۔ اس تجویز کو پہلی بار تلک نے 1916 میں پیش کیا تھا، لیکن اعتدال پسند رہنماؤں نے اسے مسترد کر دیا۔ گاندھی بھی اسی نظریہ کے حامل تھے کہ کانگریس تب تک ایک پائیدار تحریک کی رہنمائی نہیں کر سکتی ہے جب تک کہ اس کے پاس ایک ایسی سرگرم تنظیم نہ ہو جو سال بھر کام کرے۔ اس کے علاوہ، صوبائی کانگریس کمیٹیوں کو اب لسانی بنیادوں پر منظم کیا گیا، تاکہ وہ مقامی زبان کا استعمال کرتے ہوئے لوگوں سے رابطے میں رہ کر کام کریں۔ کانگریس تنظیم کو گاؤں اور محلہ یا وارڈ کمیٹیوں کی تشکیل کے ذریعے گاؤں اور محلہ کی سطح تک پہنچایا گیا۔ غریب اور معاشی طور پر کمزور طبقے کو رکنیت بخشنے کے لئے داخلے کی فیس کو کم کر کے چار آنہ سالانہ مقرر کیا گیا، جس کی وجہ سے کانگریس کو آمدنی کا باقاعدہ ذریعہ بھی حاصل ہوا اور کانگریس میں عام لوگوں کی شمولیت کو یقینی بنایا گیا۔ اس کے علاوہ، دوسرے طریقوں سے بھی کانگریس کے تنظیمی ڈھانچے کو ہموار کرنے اور جمہوری بنانے کی کوشش کی گئی۔ کانگریس نے ہر ممکنہ صورت میں ہندی زبان کا استعمال کرنا شروع کیا۔ اس مرحلے پر کچھ رہنماؤں جیسے محمد علی جناح، اینی بیسنٹ، جی۔ ایس۔ کھرپڑے اور بی۔ سی۔ پال نے کانگریس کو چھوڑ دیا کیونکہ وہ آئینی اور قانونی جدوجہد میں یقین رکھتے تھے جبکہ سوریندر ناتھ بنرجی جیسے کچھ دوسرے لوگوں نے انڈین نیشنل لبرل فیڈریشن کی بنیاد ڈالی، اور اس کے بعد سے قومی سیاست میں غیر معمولی کردار ادا کیا۔

کانگریس کے سبھی کارکنوں کو اپنی سیاسی عمل کے پروگرام کو قبول کروانا گاندھی کے لیے کوئی آسان کام نہیں تھا۔ رویندر کمار لکھتے ہیں کہ گاندھی نے تلک کو ستیہ گرہ کی خوبیوں اور خلافت کے مسئلہ پر مسلم کمیونٹی کے ساتھ اتحاد کی ضرورت پر قائل کرنے کے لیے ہر ممکنہ کوشش کی۔ تلک ستیہ گرہ کے سیاسی طریق کار پر مشکوک تھے۔ وہ مذہبی مسئلے پر مسلم رہنماؤں کے ساتھ اتحاد کے حق میں بھی نہیں تھے۔ تلک مانتے تھے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان تعاون کی بنیاد لکھنؤ معاہدے (1916) کی طرح سیکولر ہونی چاہیے۔ یکم اگست 1920 کو تلک کا انتقال ہوا۔ اس کے بعد لالہ لاجپت رائے اور سی۔ آر۔ داس نے کونسل انتخابات کے بائیکاٹ کی شدید مخالفت کی۔ جواہر لال نہرو بھی اپنی سوانح عمری میں لکھتے ہیں کہ ''تقریباً کانگریس کے سبھی پرانے پاسبانوں نے گاندھی کی عدم تعاون قرارداد کی مخالفت کی۔''، لیکن گاندھی اپنے فیصلہ پر مضبوطی سے قائم رہے۔

اس کے بعد عدم تعاون اور بائیکاٹ کا پروگرام صوبائی کانگریس کمیٹیوں کے سامنے رکھا گیا۔ متحدہ صوبے (United Provinces) کی کانگریس کمیٹی نے طویل بحث کے بعد عدم تعاون، سرکاری اسکولوں، کالجوں، سرکاری دفاتر اور برطانوی اشیاء کے

بتدریج بائیکاٹ کو منظوری دے دی۔ بمبئی صوبائی کانگریس کمیٹی نے عدم تعاون کو احتجاج کا جائز طریقہ قرار دیا، لیکن اس نے کونسل کے بائیکاٹ پر اعتراض کیا اور پہلے مرحلے کے طور پر صرف برطانوی تیار شدہ اشیاء کے بائیکاٹ کی سفارش کی۔ بنگال صوبائی کانگریس کمیٹی نے بھی عدم تعاون کے اصول کو قبول کیا لیکن کونسل کے بائیکاٹ کی مخالفت کی۔ مدراس صوبائی کانگریس کمیٹی نے بھی عدم تعاون کی پالیسیوں کو قبول کیا، لیکن گاندھی کے پروگرام کے دیگر اصولوں کو مسترد کر دیا۔ اگرچہ گاندھی کے پروگرام کے بارے میں ہندوستانی سیاست کا روایتی رویہ یہی تھا، لیکن ہندوستانی سیاست میں نسبتاً غیر روایتی علاقوں جیسے گجرات اور بہار نے گاندھی کے پروگرام کی مکمل حمایت کی۔ آندھرا اور پنجاب صوبائی کانگریس کمیٹی نے عدم تعاون پروگرام کو منظوری دے دی، لیکن گاندھیائی پروگرام کے دیگر اصولوں کے بارے میں انہوں نے خصوصی اجلاس تک فیصلہ موخر کر دیا۔

انہی حالات میں ستمبر 1920 میں کلکتہ میں کل ہند کانگریس کمیٹی کا خصوصی اجلاس منعقد ہوا جس کے صدر لالہ لاج پت رائے منتخب کئے گئے تھے۔ اس اجلاس میں گاندھی کے پروگرام کی سخت مخالفت کی توقع کی جارہی تھی۔ لیکن اجلاس شروع ہونے سے پہلے زیادہ تر سیاسی رہنماؤں کے ارادوں کے برعکس، گاندھی ایک ہزار ووٹوں کی اکثریت سے اپنی تجاویز کو قبول کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ گاندھی کے حامیوں میں موتی لال نہرو، سیف الدین کچلو، جتیندر لال بنرجی، شوکت علی، یعقوب حسن اور ڈاکٹر مختار احمد انصاری شامل تھے۔ جبکہ ان کے مخالفین میں پنڈت مدن موہن مالویہ، اینی بیسنٹ، وغیرہ شامل تھے۔ گاندھی کی کامیابی بنیادی طور پر کاروباری گروہوں اور مسلمانوں کی حمایت کی وجہ سے ہوئی۔ اس طرح، کلکتہ کانگریس نے مندرجہ ذیل نکات پر مبنی پروگرام کو منظوری دے دی:

- برطانوی القابات اور اعزازات کو چھوڑ دیا جائے۔
- قانون ساز اسمبلی کے انتخابات کا بائیکاٹ کیا جائے۔
- سرکاری اسکولوں، عدالتوں اور غیر ملکی اشیاء کا بائیکاٹ اور دیسی کھادی کا استعمال کیا جائے۔
- قومی اسکولوں اور پنچایتوں کی حوصلہ افزائی کی جائے۔

اس طرح، کانگریس نے حکومت کے ساتھ گاندھیائی عدم تعاون کے منصوبے کی حمایت کی، اور پنجاب اور خلافت مسئلے کا حل اور سوراجیہ قائم ہونے تک اسے جاری رکھنے کا اعلان کیا گیا۔ پھر بھی حتمی فیصلہ دسمبر 1920 میں منعقد ہونے والے کانگریس کے ناگپور اجلاس کے لیے چھوڑ دیا گیا۔ مزید برآں، سوراجیہ کی قطعی نوعیت واضح نہیں کی گئی۔ حالانکہ گاندھی نے کہا تھا کہ یہ ہندوستان کے لوگوں کی خواہشات کے مطابق پارلیمانی سوراجیہ ہے۔ جواہر لعل نہرو نے اس کا اعتراف کیا اور بتایا کہ یہ ایک مبہم سوراجیہ ہے جس کے پیچھے کوئی واضح نظریہ نہیں ہے۔ اسی اثنا میں نومبر 1920 میں انتخابات کرائے گئے اور کانگریس کے تمام امیدواروں نے اس کا بائیکاٹ کیا۔ انتخابات کے بائیکاٹ کا اعلان کو مختلف ہندوستانی صوبوں میں خیر مقدم کیا گیا۔ برطانوی حکومت کے لیے یہ ایک خطرناک علامت تھی۔ شہری علاقوں میں صرف 27.3 فیصد ہندو ووٹرز اور 12.1 فیصد مسلم ووٹروں نے حصہ لیا۔ دیہی علاقوں میں 41.8 فیصد ہندو اور 28.3 فیصد مسلمانوں نے ووٹ ڈالا۔

گاندھیائی پروگرام پر بہت سارے تنازعات اور مباحثوں کے دوران کانگریس کا سالانہ اجلاس ناگپور میں 26 دسمبر 1920 سے شروع ہوا۔اس اجلاس میں سی۔آر۔داس کے سیاسی کردار میں تبدیلی آگئی؛اور عدم تعاون پروگرام کی قرارداد پاس کی گئی، جس میں حکومت کے ساتھ تمام رضاکارانہ وابستگی سے دستبرداری اور ٹیکسوں کی غیر ادائیگی کا فیصلہ کیا گیا۔اس کے علاوہ، اس پروگرام میں. کونسلوں سے استعفیٰ، قومی اسکولوں کا قیام، معاشی بائیکاٹ، قومی خدمت کے لیے کارکنوں کی تنظیم، قومی فنڈ کا قیام اور ہندو مسلم اتحاد بھی شامل تھے۔ ناگپور اجلاس نے کانگریس کی تنظیم نو میں بھی انقلابی تبدیلی لائی۔وہ تبدیلیاں مندرجہ ذیل سطور میں بیان کئے گئے ہیں:

- پندرہ ارکان پر مشتمل کانگریس ورکنگ کمیٹی کی تشکیل۔
- 350 اراکین پر مشتمل کل ہند کانگریس کمیٹی کی تشکیل۔
- شہر سے گاؤں کی سطح تک کانگریس کمیٹیوں کی تشکیل۔
- صوبائی کانگریس کمیٹیوں کی لسانی بنیادوں پر تشکیل نو۔
- 21 سال یا اس سے زیادہ عمر کے تمام مردوں اور عورتوں کو چار آنہ کی ادائیگی پر کانگریس کی سالانہ رکنیت کا آغاز۔

اس پروگرام کی وجہ سے کانگریس کو ایک عوامی سیاسی جماعت بننے کا شرف حاصل ہوا۔اس دور میں کانگریس کی سماجی ساخت کے ساتھ ساتھ اس کے نکتہ نظر اور پالیسیوں میں بھی بنیادی تبدیلی آگئی۔عدم تشدد اور ستیہ گرہ جیسے نئے ہتھیاروں کے ساتھ گاندھی کانگریس پارٹی میں ایک بڑے لیڈر ابھر کر سامنے آگئے۔مندرجہ بالا بحث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ تحریک عدم تعاون کے پروگرام کے دو اہم پہلو تھے:

- تعمیری۔
- تخریبی۔

تعمیری پروگرام میں مندرجہ ذیل نکات شامل ہیں:

- قومی تعلیم کا انعقاد۔
- مقامی اشیا کا فروغ۔
- چرخہ اور کھادی کی حوصلہ افزائی۔
- رضاکاروں کا اندراج۔

تخریبی پروگرام میں مندرجہ ذیل نکات کا بائیکاٹ شامل ہے:

- عدالت۔
- تعلیمی ادارے۔
- قانون ساز اسمبلی کے انتخابات۔

मौलाना आज़ाद नेशनल उर्दू यूनिवर्सिटी
Estd. 1998
MAULANA AZAD NATIONAL URDU UNIVERSITY

- سرکاری کام۔
- برطانوی اشیاکے ساتھ ساتھ ان کے عطا کردہ اعزازات۔

10.3.1 عدم تعاون تحریک کے اہم مراحل

(Important Stages of the Non-Cooperation Movement)

عدم تعاون تحریک کی مہم 1921 کے اوائل سے بڑے جوش و خروش کے ساتھ شروع ہوگئی۔ تاہم، ہمیں ایک مرحلے سے دوسرے مرحلے تک تحریک کی نوعیت میں کچھ تبدیلیاں نظر آتی ہیں۔اس تحریک کی سیاسی سرگرمیوں کو مندرجہ ذیل تین حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

10.3.2 پہلا مرحلہ (جنوری 1921 سے مارچ 1921 تک)

پہلے مرحلے میں بنیادی زور اسکولوں، کالجوں، عدالتوں کے بائیکاٹ پر تھا اور ملکی صنعت و حرفت کو فروغ دینے کے پیش نظر چرخہ کے استعمال پر زور دیا گیا۔ طلباء میں بڑے پیمانے پر بے چینی پھیل گئی اور سی۔ آر۔ داس اور موتی لال نہرو جیسے سرکردہ وکلاء نے اپنا پیشہ چھوڑ دیا۔ جنوری 1921 سے اس تحریک نے پورے ملک میں خاطر خواہ کامیابیاں حاصل کی۔ گاندھی نے علی برادران کے ساتھ ملک گیر دورہ کیا، سینکڑوں اجلاس منعقد کئے اور بڑی تعداد میں سیاسی کارکنوں سے ملاقات کی۔ پہلے مہینے میں ایک اندازے کے مطابق کوئی 90,000لوگوں نے اسکول اور کالج چھوڑدئے اور 800 سے زیادہ طلبہ نے قومی اسکولوں اور کالجوں میں داخلہ حاصل کیا۔اسکولوں کا بائیکاٹ خاص طور پر بنگال میں کامیاب رہا، جہاں طلباء نے انتظامیہ کو حکومت سے الگ ہونے پر مجبور کیا۔ سی آر داس نے تحریک کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا اور سبھاش چندر بوس کلکتہ میں انڈین نیشنل کانگریس کے سرکردہ رہنما بن گئے۔اس ملک گیر جدوجہد میں سودیشی جذبے کو نئے جوش کے ساتھ زندہ کیا گیا۔ بنگال کے بعد پنجاب میں بھی اسکولوں کا بائیکاٹ بڑے پیمانے پر کیا گیا۔ دیگر علاقوں میں بمبئی، یوپی، بہار، اڑیسہ اور آسام شامل تھے۔ وکلاء کی طرف سے عدالتوں کا بائیکاٹ اسکولوں کے بائیکاٹ کی طرح زیادہ کامیاب نہیں رہا۔ ملک کے کئی سرکردہ وکلاء، جیسے سی۔ آر۔ داس، موتی لال نہرو، ایم۔ آر۔ جیاکر، سیف الدین کچلو، ولبھ بھائی پٹیل، سی راجگوپالاچاری، ٹی۔ پرکاسم اور آصف علی نے اپنے وکالت کے منافع بخش پیشے کو چھوڑ دیا۔اس تحریک کی سب سے اہم خصوصیت غیر ملکی کپڑوں کا بائیکاٹ تھا۔ رضاکار گھر گھر جاکر غیر ملکی کپڑوں کو اکٹھا کرکے جلاتے تھے۔ پربھوداس گاندھی، جو 1921 کے ابتدا میں گاندھی کے ملک گیر دورے میں شامل تھے، لکھتے ہیں کہ کس طرح ریلوے اسٹیشنوں پر گاندھی کا استقبال کرنے والے لوگ موقعے پر ہی غیر ملکی کپڑوں سے بنی ہوئی ٹوپیوں، دوپٹوں اور پگڑیوں کو پھینک کر جلاتے تھے۔ غیر ملکی کپڑا فروخت کرنے والی دکانوں کے سامنے دھرنا بھی بائیکاٹ کی ایک اہم حصہ تھی۔اس کے نتیجے میں ہندوستان میں غیر ملکی کپڑوں کی برآمد 21-1920 میں 102 کروڑ روپے سے 22-1921 میں 57 کروڑ تک کم ہوگئی۔اس کے علاوہ، اس تحریک میں شراب کی دکانوں کے سامنے بھی دھرنا دیا گیا۔ الغرض، اس مرحلے میں حکومتی محصولات میں کافی کمی واقع ہوئی۔ یہ مرحلہ مارچ 1921 میں

ختم ہوااوراس کے بعد دوسرا مرحلہ اپریل 1921 سے شروع ہوا۔

10.3.3 دوسرا مرحلہ (اپریل 1921ء سے جولائی 1921 تک)

دوسرے مرحلے میں اگست 1921 تک تلک سوراج فنڈ کے لیے ایک کروڑ روپے جمع کرنے کا ہدف مقرر کیا گیا، کانگریس پارٹی میں ایک کروڑ ارکان کا اندراج اور 30 جون تک 20 لاکھ چرخے نصب کرنے کا عزم کیا گیا۔ کل ہند کانگریس کمیٹی نے مارچ 1921 کے وجے واڑہ اجلاس میں فنڈ کی وصولی، اراکین کے اندراج اور چرخوں کی تقسیم پر توجہ مرکوز کی۔ اگرچہ ایک کروڑ ممبران کا ہدف حاصل نہیں ہوا، لیکن پھر بھی کانگریس کی رکنیت تقریباً 50 لاکھ تک پہنچ گئی۔ تلک سوراج فنڈ نے ایک کروڑ روپے کے ہدف کو پار کر دیا۔ چرخوں کو بڑے پیمانے پر استعمال کیا گیا اور کھادی قومی تحریک کا مقبول لباس بن گیا۔ جب مدورائی میں طلبہ کی نشست میں یہ شکایت آگئی کہ کھادی کپڑا مہنگا ہے، تو گاندھی نے جواب دیا کہ ہمیں کم کپڑے پہننے چاہئے۔ اس دن سے انہوں نے اپنی دھوتی اور کُرتہ چھوڑ کر لنگوٹ پہننا شروع کیا۔

10.3.4 تیسرا مرحلہ (نومبر 1921ء سے فبروری 1922 تک)

تیسرے مرحلے میں غیر ملکی کپڑوں کے بائیکاٹ، 17 نومبر 1921 کو پرنس آف ویلز کے آنے والے دورے کا بائیکاٹ، چرخہ اور کھادی کو مقبول بنانے اور کانگریس کے رضاکاروں کے ذریعے جیل بھرو تحریک پر زور دیا گیا۔ 1921 کے آخر تک تمام اہم قوم پرست رہنماؤں کے ساتھ (سوائے گاندھی کے) 3000 دیگر کانگریس کے کارکنوں کو گرفتار کیا جا چکا تھا۔ جس دن پرنس آف ویلز بمبئی میں اترے اس دن ملک میں ہڑتال منایا گیا۔ اسے حکومت نے لوگوں اور شاہی ریاستوں کے اندر برطانوی راج سے متعلق وفاداری کی حوصلہ افزائی کرنے کے لیے ہندوستان بلایا گیا تھا۔ اسی اثنا میں گاندھی نے بمبئی میں امر شوبھانی کی ایلفنسٹون مل (Elphinstone Mill) کے احاطے میں ایک بڑے جلسے سے خطاب کیا، اور غیر ملکی کپڑے کے ایک بہت بڑا انبار کو جلا دیا۔ تاہم، بدقسمتی سے شہزادے کی استقبالیہ تقریب میں شرکت کرنے والے لوگوں اور گاندھی کے جلسے سے واپس آنے والے ہجوم کے درمیان جھڑپیں ہوئیں۔ اس کے بعد فسادات ہوئے، جس میں پارسی، اینگلو انڈین اور عیسائی برطانوی راج کے وفاداروں کے طور پر حملے کا ہدف بن گئے۔ تین دن تک جاری رہنے والے فسادات کے نتیجے میں پچانوے افراد ہلاک ہوئے۔ گاندھی کے تین دن تک بھوک ہڑتال پر رہنے کے بعد ہی دوبارہ امن بحال ہوا۔

پرنس آف ویلز کا استقبال خالی گلیوں اور بند دوکانوں سے کیا گیا۔ حکومت کی خلاف ورزی سے حوصلہ پا کر عدم تعاون کرنے والے روز بروز جارحانہ رخ اختیار کرنے لگے۔ کانگریس رضاکار طاقتور متوازی پولیس عملے کے طور پر وجود میں آگئے۔ کانگریس نے پہلے ہی صوبائی کمیٹیوں کو اجازت دے دی تھی کہ وہ جہاں موزون سمجھے لوگوں کو عام نافرمانی کی اجازت دے سکتی ہے۔ مثال کے طور پر ضلع مدناپور میں یونین بورڈ ٹیکس کے خلاف عام نافرمانی کی تحریک شروع کی گئی تھی، اور آندھرا کے ضلع گنٹور میں چرالا-پیرالا اور پدانندی پاڈو تعلقہ میں ٹیکسوں کی غیر ادائیگی کی تحریک پہلے سے ہی چل رہی تھی۔ تیسرے مرحلے میں، اس تحریک میں بنیاد پرستی اور انقلاب پسندی کے کئی عناصر ظاہر ہوئے۔ کانگریس کے رضاکاروں نے عوام کے ساتھ ریلیاں کیں اور ملک بغاوت کے دہانے پر کھڑا ہو گیا۔ دسمبر 1921 کے احمد

آباد اجلاس میں ایک قرارداد پاس کی گئی جس میں اس عزم کی تصدیق کی گئی ہے کہ پنجاب اور خلافت کی غلطیوں کا ازالہ اور سوراجیہ قائم ہونے تک، کانگریس عدم تشدد پر مبنی عدم تعاون کے پروگرام کو زیادہ زور وشور سے جاری رکھے گی۔ قرارداد میں تمام لوگوں خاص طور پر طلباء پر زور دیا گیا کہ وہ بغیر کسی مظاہرے کے رضاکار تنظیموں سے تعلق رکھتے ہوئے خود کو گرفتاری کے لیے پیش کریں۔ تمام ستیہ گرہیوں کو قول و فعل میں عدم تشدد پر قائم رہنے کی تلقین کی گئی۔ اس کے علاوہ، ستیہ گرہوں سے ہندوؤں، مسلمانوں، سکھوں، پارسیوں، عیسائیوں اور یہودیوں کے درمیان اتحاد کو فروغ دینے، سودیشی پر عمل کرنے اور کھادی پہننے کا عہد لیا گیا۔ ہندو رضاکاروں کو اچھوت پن ترک کرنے کو کہا گیا۔

گاندھی نے باردولی میں محصول کی غیر ادائیگی کی مہم شروع کرنے کا فیصلہ کیا، اور اس کے ساتھ ہی اظہار رائے، پریس اور انجمن سازی کی آزادی کے لیے بڑے پیمانے پر عام نافرمانی کی تحریک شروع کرنے کا ارادہ کیا۔ لیکن 5 فروری 1922 کو اتر پردیش کے گورکھپور ضلع میں چوری چورا کے مقام پر مشتعل کسانوں کے ایک مقامی تھانے پر حملے نے پوری صورتحال بدل دی۔ لوگوں کے بڑے جلوس نے پولیس پر حملہ کیا اور پولیس تھانے کو آگ لگا دی۔ فرار ہونے کی کوشش کرنے والے پولیس اہلکاروں کو جلتے ہوئے تھانے میں پھینک دیا گیا، جس کی وجہ سے بائیس پولیس اہلکاروں کو موت ہوئی۔ واقعہ کی اطلاع ملتے ہی گاندھی نے عدم تعاون تحریک ختم کرنے کا فیصلہ لیا۔ انہوں نے کانگریس ورکنگ کمیٹی کو بھی اپنے فیصلے کی توثیق کرنے پر آمادہ کیا اور اس طرح 12 فروری 1922 کو عدم تعاون تحریک اختتام کو پہنچ گئی۔

10.3.5 تحریک سے متعلق عوامی رد عمل (Public Response to the Movement)

ابتدائی دور میں اس تحریک کی قیادت متوسط طبقے کے ذریعے ہوئی۔ کلکتہ، بمبئی اور مدراس جیسی جگہوں پر اس تحریک سے متعلق اشراف طبقے سے وابستہ سیاست دانوں کا رد عمل بہت کم تھا۔ اس کے علاوہ، سرکاری ملازمت سے استعفیٰ دینے، سرکاری عہدوں سے دستبردار ہونے وغیرہ کے مطالبے پر بھی ان کا رد عمل دل شکستہ تھا۔ تاہم، ہندوستانی کاروباری گروہ اقتصادی بائیکاٹ کی حمایت کر رہا تھا، کیونکہ مقامی تیار شدہ اشیاء کے استعمال سے کپڑے کی صنعتوں کو فائدہ ملتا تھا۔ پھر بھی کاروباری پیشے سے وابستہ لوگوں کا ایک بہت بڑا حصہ عدم تعاون تحریک کی تنقید کر رہا تھا کیونکہ ان کا کاروبار عدم تعاون تحریک کی وجہ سے متاثر ہوتا تھا۔

اشرافیہ سیاست دانوں کے علاوہ، کئی سرگرم رہنماؤں نے اس تحریک میں اپنی دلچسپیوں اور خواہشات کا اظہار کیا۔ بہار میں راجندر پرشاد، گجرات میں سردار ولبھ بھائی پٹیل جیسے رہنماؤں نے اس تحریک کو ٹھوس مدد فراہم کی۔ برطانیہ مخالف جدوجہد کی مختلف قوتیں جیسے خلافت تحریک، کسان سبھا، کسان تحریک، وغیرہ عدم تعاون تحریک میں ضم ہوگئے۔ کیرالہ میں خلافت اور عدم تعاون تحریک کے پروپیگنڈے نے مسلم کسانوں کو ان کے جاگیرداروں کے خلاف بیدار کرنے میں مدد کی، لیکن بدقسمتی سے اس تحریک نے کیرالہ میں فرقہ وارانہ رنگ اختیار کر لیا۔ جس سے ہندو مسلم اتحاد کو کافی نقصان ہوا۔

اس تحریک میں کسانوں نے بھرپور شرکت کی۔ عام طور پر کسان زمینداروں اور تاجروں کے خلاف ہوگئے۔ اس تحریک نے محنت کش عوام کو انگریزوں کے علاوہ ہندوستانی جاگیرداروں اور تاجروں کے خلاف اپنے حقیقی جذبات اظہار کرنے کا موقع فراہم کیا۔ آسام میں

چائے کی کاشت کرنے والے مزدوروں نے ہڑتال کی۔ بنگالی قوم پرست رہنما جے۔ ایم۔ سین گپتا نے اس پیش رفت میں اہم کردار ادا کیا۔ آندھرا میں جنگل سے متعلق قوانین کی خلاف ورزی عام ہوگئی۔ راجستھان کے کچھ علاقوں میں کسانوں اور قبائلی لوگوں نے زندگی بہتر بنانے کے لیے تحریکیں شروع کی۔ پنجاب میں سکھوں نے گردواروں کے بداطوار پجاریوں کے کنٹرول کی جانچ کے لیے اکالی تحریک شروع کی، جو عدم تعاون تحریک کا حصہ بن گئی۔ عدم تعاون تحریک سے متعلق اس طرح کی کئی مثالیں تاریخ ہند میں موجود ہیں۔ لیکن بات یہ ہے کہ عدم تعاون تحریک کے نتیجے میں پیدا ہوئی خلاف ورزی کے جذبے نے ملک کے مختلف حصوں میں بہت سی مقامی تحریکوں کو جنم دیا۔ اس تحریک سے متعلق طلبہ اور خواتین کا ردعمل بہت موثر تھا۔ ہزاروں طلباء نے سرکاری اسکولوں اور کالجوں کو چھوڑ کر قومی سکولوں اور کالجوں میں داخلہ لیا۔ نئے قومی اداروں جیسے کاشی ودیاپیٹھ، گجرات ودیاپیٹھ اور جامعہ ملیہ اسلامیہ اور دیگر متعدد اداروں نے کئی طلباء کو داخلہ دیا۔ اس طرح طلبہ تحریک کے سرگرم رضاکار بن گئے، اور خواتین نے تلک فنڈ کے لیے اپنے زیورات پیش کیے جو قومی تحریک کے لئے انکی گراں قدر خدمت تھی۔ موپیلا بغاوت جیسے واقعات کے باوجود اس تحریک میں مسلمانوں کی شرکت اور فرقہ وارانہ اتحاد کو برقرار رکھنا ایک بڑی کامیابی تھی۔ متعدد جگہوں پر گرفتار ہونے والوں میں سے دو تہائی مسلمان تھے اور اس قسم کی شرکت ماضی میں کبھی نہیں دیکھی گئی تھی۔ گاندھی اور دیگر رہنماؤں نے مساجد میں مسلم عوام سے خطاب کیا، اور یہاں تک کہ گاندھی کو مسلم خواتین کے اجلاسوں میں خطاب کرنے کی اجازت دی گئی۔ اس کے علاوہ، آریہ سماج کے معروف رہنما سوامی شردھانند کو مسلمانوں نے دہلی کی جامع مسجد کے منبر سے تبلیغ کرنے کی اجازت دے دی، اور ڈاکٹر سیف الدین کچلو کو سکھوں کے عبادت گاہ گولڈن ٹیمپل کی چابیاں سونپی گئی۔ یہ قومی اتحاد کا مثالی نمونہ تھا۔

10.3.6 برطانوی حکومت کا ظلم واستبداد (Repression of the British Government)

مئی 1921 میں، گاندھی اور وائسرائے ریڈنگ کے درمیان مذاکرات ناکام ہوگئے کیونکہ حکومت چاہتی تھی کہ گاندھی علی برادران کو ترغیب دیں کہ وہ اپنی تقریروں میں تشدد کے استعمال کی تبلیغ سے گریز کریں۔ گاندھی نے محسوس کیا کہ حکومت ان کے اور خلافت رہنماؤں کے درمیان پھوٹ ڈالنے کی کوشش کررہی ہے۔ اس لئے انہوں نے اس جال میں پھنسنے سے انکار کردیا۔ دسمبر 1921 میں، حکومت نے مظاہرین کو منتشر کرنے کے لئے طاقت کا استعمال کیا۔ رضاکاروں کو غیر قانونی قرار دے دیا گیا، عوامی جلسوں اور پریس پر پابندی لگادی گئی اور متعدد رہنماؤں ماسوائے گاندھی کو گرفتار کرلیا گیا۔ گرفتار ہونے والے رہنماؤں میں سب سے پہلے سی۔ آر۔ داس تھے، اور ان کے بعد ان کی اہلیہ بسنتی دیبی تھی۔ بسنتی دیبی کی گرفتاری نے بنگال کے نوجوانوں کو اس قدر مشتعل کیا کہ ہزاروں لوگوں نے اپنے آپ کو گرفتاری کے لیے پیش کیا۔ اگلے دو مہینوں میں ملک بھر سے 30,000 سے زیادہ افراد کو گرفتار کیا گیا۔ اس طرح جبر کا سلسلہ جاری رہا، جلسے منعقد کرنے پر روک لگادی گئی، اخبارات پر پابندی عائد کی گئی، اور کانگریس اور خلافت کے دفاتر پر چھاپے ڈال کر لوگوں کی سرگرمیوں کو قابو کرنے کی کوشش کی گئی۔

10.3.7 تحریک کا پھیلاؤ اور اس کے مقامی رجحانات

(Spread of the Movement, and its Local Trends)

گاندھی نے علی برادران کے ساتھ ملک گیر دورہ کیا۔ ہزاروں طلباء نے سرکاری اسکولوں اور کالجوں کو چھوڑ کر قومی اسکولوں اور کالجوں میں داخلہ لیا۔ یہ تعلیمی ادارے آچاریہ نریندر دیو، سی آر داس، لالہ لاجپت رائے، ذاکر حسین، سبھاش بوس، (نیشنل کالج کلکتہ کے پرنسپل) کی قیادت میں قائم کیے گئے۔ بہت سے وکلاء جیسے موتی لال نہرو، جواہر لعل نہرو، سی آر داس، سی راجگوپالاچاری، سیف الدین کچلو، ولبھ بھائی پٹیل، آصف علی، ٹی۔ پرکاشم اور راجندر پرساد نے اپنا پیشہ چھوڑ دیا۔ غیر ملکی کپڑوں کے انباروں کو سرعام جلا دیا گیا اور ان کی درآمدات نصف تک گر گئی۔ کئی مقامات پر غیر ملکی شراب فروخت کرنے والے دکانوں کے سامنے دھرنا دیا گیا۔ جولائی 1921 میں علی برادران نے مسلمانوں کو انگریزی فوج سے استعفیٰ دینے کا مطالبہ کیا، جس کی وجہ سے ان کو ستمبر میں گرفتار کیا گیا۔ اس کے بعد کانگریس نے مقامی کانگریس کمیٹیوں کو عام نافرمانی شروع کرنے کی اجازت دی بشرطیکہ لوگ اس کے لیے تیار ہو۔ ہندوستان کے بڑے سرمایہ داروں نے شروع ہی سے عدم تعاون تحریک کی مخالفت کی تھی، تاہم چھوٹے تاجروں نے عدم تعاون پروگرام کی حمایت کی اور تلک سوراج فنڈ میں دل کھول کر عطیہ دیا۔ درحقیقت عدم تعاون تحریک کو بلاشبہ ہندوستان کے مختلف علاقوں میں زبردست حمایت ملی۔ سال 1921 اور 1922 میں برطانوی راج کے خلاف عوامی مظاہرے ہوئے، تاہم متعدد جگہوں پر مقامی حالات کے مطابق تحریک کی تشکیل ہوئی۔ دراصل یہ لوگوں کی مقامی شکایتیں تھیں جن کا اظہار اس تحریک کے ذریعے ہوا۔ اس تحریک کے حوالے سے مختلف علاقوں کا مختصر جائزہ مندرجہ ذیل ہے:

بنگال: بنگال میں گاندھیائی طریقوں کے مطابق احتجاج کرنے میں کم دلچسپی کا مظاہرہ کیا گیا۔ دراصل رابندر ناتھ ٹیگور نے عوام میں ایک نیا شعور لانے کے لیے گاندھی کی تعریف کی۔ لیکن انہوں نے ان کی تنگ نظری اور مبہم خیالات کی تنقید کی۔ کلکتہ کے اشرافیہ طبقہ بھی کچھ گاندھیائی طریقوں سے نالاں تھا۔ لیکن اس کے باوجود عدم تعاون تحریک نے شہری اور دیہی عوام میں منفرد فرقہ وارانہ اتحاد اور بیداری قائم کی۔ ہڑتالوں اور گرفتاریوں نے برطانوی حکومت کو اپنا رویہ بدلنے پر مجبور کیا۔ مدناپور ضلع کے دیہاتیوں نے یونین بورڈ اور ان کی طرف سے لگائے گئے ٹیکس کی مخالفت کی۔ لوگوں نے شمالی بنگال کے مضافاتی اضلاع میں سرکاری یا نجی زمینداروں کو ٹیکس دینے سے انکار کر دیا۔

بہار: بہار میں سرکاری زمین پر مویشیوں کو چرانے کا مقامی مسئلہ اور مقدس دھاگہ پہننے کے معاملے پر اونچی اور نچلی ذاتوں کے درمیان تناؤ بھی عدم تعاون تحریک میں ضم ہوگئے۔ گائے کے تحفظ اور کسانوں کے حقوق کے مسائل پر بھی توجہ دی گئی۔ مندرجہ بالا مسائل کی وجہ سے شمالی بہار، خاص طور پر چمپارن، سارن، مظفرپور اور پورنیہ نومبر 1921 تک تحریک کے مراکز بن گئے۔

متحدہ صوبے: متحدہ صوبے (United Provinces) گاندھیائی عدم تعاون تحریک کے بنیادی مراکز بن چکے تھے۔ یہ تحریک شہروں اور قصبوں میں زیادہ متحرک تھی اور دیہی علاقوں میں اس نے ایک مختلف شکل اختیار کی تھی۔ متحدہ صوبوں میں کسان تحریک بھی عدم تعاون تحریک میں ضم ہوگئی۔ کانگریس کی جانب سے عدم تشدد کی بار بار اپیل کے باوجود کسان نہ صرف تعلقداروں کے خلاف بلکہ تاجروں کے خلاف

بھی بغاوت پر آمادہ ہوگئے۔ جنوری اور مارچ 1921 کے درمیان، رائے بریلی، پرتاپ گڑھ، فیض آباد اور سلطان پور کے اضلاع میں بابا رام چندر کی قیادت میں بڑے پیمانے پر زرعی فسادات ہوئے۔ان کے اہم مطالبات میں مندرجہ ذیل شامل ہیں:

- کوئی نذرانہ ادا نہیں کیا جائے گا۔
- کسی کسان کو زمین سے بے دخل نہیں کیا جائے گا۔
- کسی فرد کو جبری مشقت (Forced Labour) کے لئے مجبور نہیں کیا جائے گا۔

پنجاب: پنجاب کے شہری علاقوں میں اس تحریک کا ردعمل زیادہ قابل ذکر نہیں تھا۔ لیکن یہاں گرودواروں کی اصلاح کے لیے قائم کی گئی اکالی تحریک بھی عدم تعاون تحریک میں ضم ہو گئی۔ جب گاندھی نے اس تحریک کو منظوری دے دی، تو اکالیوں نے عدم تعاون پروگرام کو مسلسل استعمال کیا۔انہوں نے سکھوں، مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان ایک قابل ذکر فرقہ وارانہ اتحاد پیدا کیا۔

مہاراشٹرا: مہاراشٹر میں عدم تعاون تحریک نسبتاً کمزور رہی کیونکہ تلک کے حامی گاندھی کے بارے میں پرجوش نہیں تھے،اور مہاراشٹر کے لوگوں نے محسوس کیا کہ کانگریس چتپاون برہمنوں کے زیر اثر کام کرتا ہے۔ اونچی ذات کے لوگوں نے پسماندہ طبقات کی حوصلہ افزائی اور عدم تعاون تحریک میں ان کی شرکت پر زور دینے کو ناپسند کیا۔ تاہم، اس علاقے میں مقامی اشتعال انگیزی کے کچھ واقعات بھی سامنے آگئے۔ ضلع ناسک کے مالگاؤں میں، کچھ مقامی رہنماؤں کی گرفتاری کے بعد چند پولس اہلکاروں کو جلا کر ہلاک کر دیا گیا۔ پونا کے علاقے میں، کچھ کسانوں نے ستیہ گرہ کے ذریعے اپنے حقوق کا دفاع کرنے کی کوشش کی۔

آسام: آسام میں عدم تعاون پروگرام کو بڑے پیمانے پر حمایت ملی۔ آسام کے چائے کاشتکاروں نے زیادہ اجرت اور کام کی حالت بہتر بنانے کے لیے "گاندھی مہاراج کی جئے" کے نعروں کے ساتھ بغاوت کی۔

راجستھان: راجستھان میں کسان تحریک نے عدم تعاون تحریک کو تقویت بخشی، جیسا کہ انہوں نے بہار اور متحدہ صوبوں میں کیا تھا۔ کسانوں نے ٹیکس ادا کرنے اور جبری مشقت (Forced Labour) کے خلاف احتجاج کیا۔ میواڑ میں بجولیا تحریک اور موتی لال تیجاوت کی بھیل تحریک نے عدم تعاون تحریک کو مزید قوت بخشی۔

آندھرا: آندھرا میں جنگلاتی قوانین کے خلاف قبائلی اور دیگر کسانوں کی شکایتیں عدم تعاون تحریک کے ساتھ جڑ گئی۔ انہوں نے ستمبر 1921 میں کڈپا میں گاندھی سے ملاقات کی تاکہ ان کے ٹیکسوں میں کمی اور جنگلات کے استعمال پر پابندیوں کو ہٹایا جاسکے۔ محکمہ جنگلات میں کام کرنے والے افسروں کا بائیکاٹ کیا گیا۔ اپنا حق جتانے کے لیے انہوں نے چرائی ادا کئے بغیر مویشیوں کو زبردستی جنگلوں میں بھیج دیا۔ پالند علاقے میں سوراجیہ کا اعلان کیا گیا اور پولیس اہلکاروں پر حملہ کیا گیا۔ مظاہرین کا خیال تھا کہ گاندھی راج آنے والا ہے۔ دسمبر 1921 اور فروری 1922 کے درمیان آندھرا میں محصول کی غیر ادائیگی سے متعلق ایک تحریک بھی شروع کی گئی۔ اسی دور میں الوری سیتارام راجو نے

آندھرامیں قبائلیوں کو منظم کیااوران کے مطالبات کو عدم تعاون تحریک کے ساتھ جوڑ دیا۔

کرناٹک: کرناٹک اس تحریک سے نسبتاً غیر متاثر رہااور مدراس پریزیڈنسی کے کئی علاقوں میں اعلیٰ اور متوسط طبقوں کا ابتدائی رد عمل محدود تھا۔682 میں سے صرف چھ لوگوں نے اپنے القاب چھوڑ دئے، اور صرف 36 وکلاء نے اپنا پیشہ ترک کیا۔ مذکورہ پریزیڈنسی میں 92 قومی اسکول قائم کیے گئے جن میں 5000 طالب علم زیر تعلیم تھے۔ جولائی سے اکتوبر 1921 تک، بکنگم (Buckingham) اور کرناٹک صنعتوں میں مزدوروں نے ہڑتال کی، اور مقامی عدم تعاون رہنماؤں نے ان کی حمایت کی۔ اسی طرح کارد عمل متعدد دوسرے خطوں میں دیکھا گیا۔ مثال کے طور پر اڑیسہ میں کانکاراج کے کسانوں نے ابواب ادا کرنے سے انکار کر دیا۔ لیکن، گجرات میں، یہ تحریک خالصتاً گاندھیائی طریق کار پر چلی۔

10.3.8 تحریک کا آخری مرحلہ (The Last Phase of the Movement)

آخری مرحلے میں حکومت نے سیاسی پیش رفتوں کا غور سے مشاہدہ کیااور صوبوں سے خفیہ رپورٹس حاصل کیں۔ جب لوگوں نے عدم تعاون پروگرام پر عمل کیا، تو حکومت نے جبر کا سہارا لینا شروع کیا۔ کانگریس اور خلافت رضاکاروں کو غیر قانونی قرار دیا گیا۔ جلسوں اور جلوسوں پر پابندی لگادی گئی۔ کئی مقامات پر پولیس نے ستیہ گرہیوں پر گولیاں چلائی۔ گرفتاریاں اور لاٹھی چارج ایک عام بات تھی۔ 1921 کے آخر تک گاندھی کے علاوہ تمام اہم رہنما قید کرلئے گئے تھے۔ ہندو مسلم اتحاد سے گھبرا کر حکومت نے کانگریس اور خلافت رہنماؤں کے درمیان پھوٹ پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اس طرح حکومت نے تحریک کو کچلنے کے لیے متعدد کوششیں کی۔

انگریزوں کے جبر نے ہندوستانیوں کے جوش وجذبہ کو مزید تقطیت بخشی۔ اوران کے عزائم کو مضبوط کیا۔ دریں اثناء وائسرائے نے مدن موہن مالویہ کے ذریعے کانگریس رہنماؤں سے بات چیت کرنے کی کوشش کی اور سیاسی قیدیوں کو رہا کرنے کی پیشکش کی۔ جنوری 1922 کے وسط میں، گاندھی نے آل پارٹی کانفرنس میں عدم تعاون تحریک کے موقف کی وضاحت کی۔ یکم فروری کو انہوں نے وائسرائے کو خبردار کہ اگر سیاسی قیدیوں کو رہانہ کیا گیااور جابرانہ اقدامات ترک نہ کیے گئے تو وہ باردولی (گجرات) سے بڑے پیانے پر عام نافرمانی شروع کی جائے گی۔ چونکہ پورا ملک عام نافرمانی کے لئے تیار نہیں تھااس لئے انہوں نے اسے 5 فروری کو شروع کرنے کا فیصلہ کیا۔ جب ضلع گورکھپور کے چوری چوراگاؤں میں کانگریس کے رضاکاروں پر پولس نے گولی چلائی، تو جوابی کارروائی میں مشتعل ہجوم نے 22 پولیس اہلکاروں کو ہلاک کر دیا۔ اس پر تشدد واقعے سے گاندھی کو صدمہ پہنچااور انہوں نے عدم تعاون تحریک کو معطل کر دیا، اور باردولی میں مجوزہ عام نافرمانی کو بھی ملتوی کر دیا۔ گاندھی کے اس فیصلے سے بہت سے کانگریسی مایوس ہوگئے۔ انہوں نے گاندھی کے خلاف شدید احتجاج کیا۔ سبھاس چندر بوس نے اس فیصلے کو "قومی آفت" قرار دیا۔ جواہر لعل نہرو نے اس فیصلے پر ''حیرت اور تشویش'' کا اظہار کیا۔ اپنے موقف کی وضاحت کرتے ہوئے، گاندھی نے جواہر لعل نہرو سے مخاطب ہو کر کہا کہ "تحریک غیر شعوری طور پر صحیح راستے سے ہٹ گئی تھی۔ ہم اپنے جگہوں پر واپس آکر دوبارہ سیدھے راستے پر آسکتے ہیں۔" گاندھی نے مزید کہا کہ نظم وضبط اور تحمل کے بغیر یہ تحریک بہت بڑی غلطی ثابت ہوئی۔ 12 فروری 1922 کو

باردولی میں کانگریس ورکنگ کمیٹی نے چوری چورا کے غیر انسانی طرز عمل کی مذمت کی۔اسی دن کفارہ کے طور پر گاندھی نے پانچ روزہ بھوک ہڑتال شروع کیا۔10 مارچ 1922 کو گاندھی کو گرفتار کیا گیا اور انہیں چھ سال قید کی سزا سنائی گئی۔گاندھی کی پالیسیوں سے غیر مطمئن ہو کر، سی۔آر۔داس اور موتی لال نہرو نے سوراج پارٹی کی بنیاد رکھی اور کونسل میں داخلے کے پروگرام کی وکالت کی۔ترکی میں کمال پاشا کے اقتدار میں آنے کی وجہ سے خلافت کے مسائل نے بھی اپنی افادیت کھودی۔ترکی کے سلطان سے تمام سیاسی طاقت چھین لی گئی۔کمال پاشا نے مذہب کو سیاست سے الگ کر کے ایک سیکولر ریاست قائم کی۔انہوں نے جدید تعلیم متعارف کروائی، خواتین کو حقوق دیے، یورپی ماڈل پر مبنی قانونی ضابطے قائم کئے، زراعت کی ترقی یقینی بنایا اور جدید صنعتوں کو متعارف کرانے کے لیے اقدامات اٹھائے۔

10.4 عدم تعاون تحریک سے دستبرداری کے وجوہات

(Reasons for the Withdrawal of the Non-Cooperation Movement)

عدم تعاون تحریک سے معطلی کے اسباب کی وضاحت کرتے ہوئے گاندھی نے کہا کہ چوری چورا واقعہ نے انہیں تحریک روکنے پر مجبور کیا۔اس واقعہ نے ثابت کر دیا ہے کہ لوگوں نے ابھی تک عدم تشدد کا سبق نہیں سیکھا ہے۔گاندھی کہتے ہیں کہ ''میں تحریک کو پر تشدد ہونے سے روکنے کے لیے ہر ذلت، اذیت، جلاوطنی اور موت برداشت کروں گا۔''چوری چورا کے تشدد کے جواب میں گاندھی کے تحریک واپس لینے کے فیصلے نے ایک تنازعہ کھڑا کر دیا جس کی گرمی اب بھی علمی سیمیناروں اور تاریخ کی کتابوں میں محسوس کی جاسکتی ہے۔موتی لال نہرو، سی آر داس، جواہر لعل نہرو، سبھاس بوس، اور بہت سے دوسرے لوگوں نے یہ خبر سن کر اپنی حیرانی کا اظہار کیا۔وہ سمجھ نہیں پا رہے تھے کہ ایک گاؤں کے کچھ لوگوں کے پاگل رویے کی قیمت پورے ملک کو کیوں چکانا پڑے۔ملک میں بہت سے لوگوں کا خیال تھا کہ گاندھی ایک رہنما کے طور پر بری طرح ناکام ہو گئے ہیں اور انکی شاندار قیادت کے دن ختم ہو گئے۔

India Today میں آر۔پی۔دت کی قائم کردہ روایت کی پیروی کرتے ہوئے بعد کے بہت سے دانشوروں اسکالروں نے گاندھی کے فیصلے کی مذمت کی اور اس میں گاندھی کے ہندوستانی سماج کے باوقار طبقوں کے لیے فکر مندی کا ثبوت ملتا ہے۔ان کا استدلال یہ ہے کہ گاندھی نے محض عدم تشدد کی ضرورت پر یقین رکھنے کی وجہ سے تحریک واپس نہیں لی تھی۔بلکہ اس لئے واپس لے لی کیونکہ چوری چورا کا واقعہ عوام کی بڑھتی ہوئی عسکریت پسندی اور بنیاد پرستی کی علامت تھا۔اس بنیاد پرست امکان کی حوصلہ شکنی کے لئے، تحریک ان کے ہاتھوں سے نکل کر بنیاد پرستوں کے ہاتھوں میں جانے سے روکنے کے لئے اور جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے مفادات کے تحفظ کے لیے، گاندھی نے یہ تحریک روک دی۔

جہاں تک کسانوں کا تعلق تھا، عدم تعاون تحریک رفتہ رفتہ زمینداروں کے خلاف محصول کی غیر ادائیگی کی تحریک میں تبدیل ہو رہی تھی۔لیکن کانگریس کو زمینداروں کے قانونی حقوق پر حملہ کرنے میں کسی بھی طرح کی دلچسپی نہیں تھی۔گاندھی کا مقصد ایک عوامی تحریک قائم کرنا تھا جس میں مختلف ہندوستانی طبقات شامل ہو سکیں، اس لیے وہ اس تحریک کے تسلسل کے خلاف تھے۔جسکا طبقاتی انقلاب

میں تبدیل ہونے کا خدشہ تھا انہوں نے واضح کیا کہ وہ اس مرحلے پر کسی بھی پر تشدد یا بنیاد پرست تحریک کے خلاف ہیں۔ اس کے علاوہ، اس وقت ہندوستان میں انقلابی صورتحال کے باوجود کوئی انقلابی قیادت موجود نہیں تھی۔ اگر تحریک کو معطل نہ کیا جاتا تو یہ افراتفری کا باعث بن سکتی تھی کیونکہ کانگریس قیادت کا مقامی تحریکوں پر گرفت کمزور ہوتی جارہی تھی۔

تحریک سے دستبرداری کے لیے گاندھی کو مندرجہ ذیل نکات پر تنقید کا نشانہ بنایا گیا۔ سب سے پہلے، یہ دلیل دی جاتی ہے کہ ایک دور دراز گاؤں میں تشدد اس فیصلے کے لیے کافی وجہ نہیں ہو سکتی ہے۔ گاندھی نے پہلے ہی اس بات کا ذکر کیا تھا کہ وہ باردولی میں بڑے پیمانے پر عام نافرمانی تحریک شروع کرنے والے ہیں۔ اس لئے ملک کے کسی دوسرے حصے میں کوئی عدم تشدد تحریک نہیں ہوگی۔ انہوں نے آندھرا صوبائی کانگریس کمیٹی سے وہ اجازت واپس لینے کے لئے کہا تھا جو انہوں نے عام نافرمانی شروع کرنے کے لئے ضلع کانگریس کمیٹیوں کو دی تھی۔ اس کی ایک بنیادی وجہ یہ تھی کہ کی ایسی صورت حال میں تحریک آسانی سے پر تشدد رخ اختیار کر سکتی ہے جیسا کہ پہلے بمبئی (نومبر 1921) میں اور اس کے بعد چوری چورا میں۔ علاوہ ازیں اگر کہیں بھی تشدد ظاہر ہوا تو حکومت پوری تحریک پر حملہ کرنے کا بہانہ بنا سکتی ہے۔

یہ ممکن ہے کہ باردولی میں بڑے پیمانے پر عام نافرمانی کی مہم چلانے کے امکان چوری چورا واقعہ کے بعد مزید کم ہو گیا۔ گاندھی یہ نہیں چاہتے تھے کہ عام نافرمانی تحریک شروع کرنے سے پہلے ہی حکومت ان کو اور دیگر کارکنوں کو حراست میں لے لے، جس کی وجہ سے تحریک متاثر ہوئی۔ اس لئے گاندھی نے عدم تعاون تحریک کا بوجھ اپنے اور ورکنگ کمیٹی کے کندھوں پر ڈال کر تحریک کو ممکنہ جبر اور لوگوں کو مایوسی سے بچایا۔ یہ سچ ہے کہ عدم تعاون کی تحریک معطل کرنے سے سرگرم سیاسی کارکنوں کے حوصلے پست ہو گئے، لیکن یہ بھی ممکن تھا کہ تحریک کو دبانے اور کچلنے سے جیسا کہ 1932 میں ہوا سیاسی کارکن زیادہ حوصلہ شکنی کے شکار ہو جاتے۔ یہ بھی یاد رکھنے کی ضرورت ہے کہ عدم تعاون تحریک انگریزوں کے خلاف کل ہند عوامی جدوجہد کی پہلی کوشش تھی، اور اس ابتدائی مرحلے میں تحریک کو دبانے سے ایک طویل مدت کے لئے لوگوں میں حوصلہ شکنی، مایوسی اور بے چینی پیدا ہو سکتی تھی۔

عدم تعاون تحریک سے دستبردار ہونے کے دیگر وجوہات میں بنیاد پرست قوتوں کے بڑھنے کا خوف تھا۔ لیکن چوری چورا کے ہجوم نے زمینداروں اور ان کے املاک پر حملہ کرنے کا کوئی ارادہ ظاہر نہیں کیا تھا۔ وہ محض پولیس والوں کے انتہا پسند رویے سے ناراض ہو کر ان پر حملہ کر کے اپنا غصہ نکالا۔ زیادہ تر اودھ اور مالا بار میں کسانوں کی بدامنی اس وقت ختم ہو چکی تھی۔ اودھ کے کچھ دیہی علاقوں میں بھی، جہاں ایکا تحریک چل رہی تھی، زمینداری نظام ختم کرنے کے کوئی آثار نظر نہیں آرہے تھے۔ یہ صرف زمینداروں کو محصول اور غیر قانونی ٹیکسوں میں اضافہ کرنے سے روکنا چاہتے تھے۔ در حقیقت، ایکا تحریک میں شامل ہونے والے کسانوں کی طرف سے یہ حلف لیا گیا تھا کہ وہ خریف اور ربیع پیداوار میں باقاعدگی سے محصول ادا کریں گے۔ گُنٹور میں ٹیکس کی غیر ادائیگی تحریک عدم تعاون تحریک کے نقش قدم پر چلی۔ یہ پر امن تحریک حکومت کے خلاف تھی، لیکن فروری 1922 سے پہلے ہی زوال کا شکار ہو گئی۔ لہذا، یہ بتانا مشکل ہے کہ بنیاد پرست رجحانات کے آثار کیسے غالب ہو رہے تھے۔

باردولی کی قرارداد جس نے تحریک سے دستبرداری کا اعلان کیا اس میں ایسی جملے بھی شامل تھے جن میں کسانوں کو ٹیکس ادا کرنے کے لیے کہا گیا تھا، اور زمینداروں کو یقین دلایا گیا تھا کہ کانگریس انہیں ان کے حقوق سے محروم کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی۔ کانگریس نے تحریک کے دوران کسی بھی مرحلے پر زمینداروں کے حقوق پر سوال نہیں اٹھایا۔ گاندھی کا فیصلہ اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ ملک کے بہت سے حصوں میں، 1921 کے دوسرے نصف میں تحریک کمزور ہوتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ طلباء نے اسکولوں اور کالجوں میں جانا شروع کر دیا، وکلاء نے عدالتوں کی طرف رخ کیا، تجارتی گروہوں نے غیر ملکی کپڑوں کو برآمد کرنا شروع کیا اور جلسوں اور ریلیوں میں حاضری کم ہو گئی۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ باردولی (گجرات) یا گنٹور (آندھرا) میں بھی عوام جدوجہد کو آگے بڑھانے کے لیے تیار نہیں تھی۔ لیکن وہ جوش و خروش جو 1921 کے پہلے حصے میں پورے ملک میں تھا، شاید، کم ہو چکا تھا۔

گاندھی کے ناقدین اکثر یہ تسلیم کرنے میں ناکام رہتے ہیں کہ عوامی تحریکوں میں ایک خاص اونچائی حاصل کرنے کے بعد زوال کا ایک فطرتی رجحان ہوتا ہے، کیونکہ عوام میں جبر، مصائب اور قربانیاں برداشت کرنے کی لامحدود صلاحیت نہیں ہوتی ہے۔ لہذا، ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب عوام کو آرام کرنے کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ جدوجہد کے اگلے دور کے لیے مضبوطی حاصل کی جائے۔ اس لیے، تحریک سے دستبرداری کے مرحلے میں منتقل ہونا حکمت عملی کا ایک حصہ ہے جس کی بنیاد عوام پر ہے۔ لہذا، دستبرداری غداری کے مترادف نہیں ہے بلکہ حکمت عملی کا ایک ناگزیر حصہ ہے۔

10.5 تحریک کے اثرات (Impact of the Movement)

عدم تعاون تحریک اپنی ناکامی کے باوجود تاریخ میں نہ صرف سیاسی میدانوں کے حوالے سے بلکہ سماجی پہلوؤں کے حوالے سے بھی بہت اہمیت رکھتی ہے۔ گاندھی نے ذات پات کی رکاوٹوں، فرقہ پرستی، اچھوت پن، وغیرہ جیسی برائیوں کو دور کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔ جلسوں اور جیلوں میں تمام ذاتوں اور برادریوں کے لوگ مل کر کام کرتے تھے اور ساتھ کھاتے تھے۔ اس نے اچھوت پن کو کمزور کیا اور سماجی نقل و حرکت اور اصلاح کی رفتار کو بڑھادیا۔ اس تحریک نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ایسا اتحاد قائم کیا کہ کئی جگہوں پر خلافت، عدم تعاون اور کسان سبھا کے اجلاس میں فرق کرنا مشکل ہوتا تھا۔ 22-1920 کا معاشی بائیکاٹ 08-1905 کے سودیشی تحریک سے زیادہ موثر تھا۔ 08-1905 میں درآمد کی گئی 1292 ملین کپاس گز کے مقابلے میں 22-1921 میں صرف 955 ملین گز درآمد کیے گئے۔ اس سے برطانوی سرمایہ دار قدرتی طور پر متاثر ہو گئے، جس کی وجہ سے ہندوستانی صنعتوں کو بہت فائدہ ہوا۔ چرخہ اور کرگھا (Kargha) کی مقبولیت عام ہو گئی۔ پنچایت کے ذریعے گاؤں کی تعمیر نو کے پروگرام سے اقتصادی بحالی ہوئی اور کپڑے کی پیداوار میں اضافہ ہوا۔

سیاسی میدان میں تمام طبقات پر مشتمل عدم تعاون اور خلافت تحریکوں نے قومی تحریک میں ایک نئی جہت کا اضافہ کیا۔ ایک نئی قومی بیداری پیدا ہوئی اور قومی تحریک زمین کے دور دراز کونوں تک پہنچ گئی۔ عام لوگ پہلی بار قومی تحریک کے مرکزی دھارے کا لازمی حصہ بنے۔ ہندوستانی لوگوں کی خود اعتمادی مضبوط ہوئی۔ اس نے لوگوں میں مایوسی اور بے بسی کی جگہ آزادی کا حقیقی احساس پیدا کیا۔ اس سے عوام

کے حوصلے اور قومی وقار بلند ہوا۔ سیاسی مرحلے میں مسلمانوں کی شرکت سے تحریک کو بہت سے علاقوں میں حقیقی عوامی کردار حاصل ہوا۔ بعض مقامات پر گرفتار ہونے والوں میں سے دو تہائی مسلمان تھے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان جو بھائی چارہ دیکھنے کو ملا وہ قابل دید تھا۔

10.6 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

عدم تعاون کی تحریک بلاشبہ ہندوستان کی تاریخ آزادی میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ رولٹ ایکٹ، مون ٹیگو اور چیامسفورڈ اصلاحات، جلیانوالہ باغ قتل عام اور خلافت کا مسئلہ عدم تعاون تحریک کو پس منظر فراہم کرتا ہے۔ گاندھی نے ان مسئلوں کو برطانوی حکومت کے خلاف متحدہ ہندو مسلم تحریک کے لیے استعمال کیا۔ ابتدائی اعتراضات کے باوجود، گاندھی نے متعدد رہنماؤں کو برطانوی راج کے خلاف خلافت اور عدم تعاون تحریک شروع کرنے پر آمادہ کیا۔ اس تحریک کے پروگرام میں حکومت اور تعلیمی اداروں کا بائیکاٹ، عدالتوں کا بائیکاٹ، چرخہ اور کھادی کا استعمال وغیرہ شامل تھے۔ اس تحریک کو ہندوستان کے مختلف گوشوں سے زبردست حمایت حاصل ہوئی، اور بڑے پیمانے پر عام لوگوں کی شرکت اس تحریک کی سب سے نمایاں خصوصیت تھی۔ آہستہ آہستہ 1921 کے آخر تک، یہ تحریک خاص طور پر دیہی علاقوں میں کانگریس قیادت کے کنٹرول سے باہر ہو گئی۔ آخر کار چوری چورا واقعہ کی وجہ سے یہ تحریک معطل کر دی گئی۔ یہ سچ ہے کہ تحریک اپنے بنیادی مقاصد یعنی خلافت کی بحالی اور سوراجیہ حاصل کرنے میں ناکام رہی۔ لیکن اس تحریک کی وجہ سے عوام میں سیاسی بیداری پیدا ہو گئی۔ گاندھی نے دعوی کیا کہ اس تحریک نے ایک سال میں وہ حاصل کر لیا جو پہلے کے طریقوں سے تیس سالوں میں حاصل نہ ہو سکا۔ لہذا، ان دو سالوں میں عدم تعاون تحریک نے ہندوستانی قوم پرستی کا ایک طوفانی دور تشکیل دیا، جس میں تقریباً پورا ہندوستان پہلی بار طاقتور برطانوی راج کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا۔

10.7 کلیدی الفاظ (Keywords)

کھادی : ہاتھ سے کاتا ہوا کپڑا۔

خلیفہ : زمین پر خدا کا نائب۔

عدم تعاون : انگریزوں کے ساتھ عدم تعاون کی پالیسی، جو تعلیمی اداروں، عدالتوں، کونسلوں وغیرہ کے بائیکاٹ کے ذریعے ظاہر ہوئی۔

پنچایت : ثالثی کی روایتی ہندوستانی عدالتیں۔

ستیہ گرہ : سچائی پر اصرار اور عدم تشدد کے فلسفے پر مبنی تحریک کا گاندھیائی طریقہ۔

سودیشی : مقامی۔

سوراجیہ : خود حکمرانی۔

اہنسا : دوسرے کو نقصان نہ پہنچانا۔

10.8 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

10.8.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Very Short Answer Type Questions)

1. باردولی قرارداد کب پاس کی گئی؟
2. خلافت، سے کیا مراد ہے؟
3. خلافت رہنماؤں کے اسمائے گرامی قلمبند کیجئے۔
4. 1920 میں انڈین نیشنل کانگریس کے اجلاس کی صدارت کس نے کی؟
5. عدم تعاون تحریک کب معطل ہوئی؟
6. کانگریس ورکنگ کمیٹی میں کتنے ارکان تھے؟
7. 1921 میں انڈین نیشنل کانگریس کے اجلاس کی صدارت کس نے کی؟
8. ابواب سے کیا مراد ہے؟
9. عدم تعاون تحریک کا بنیادی مقصد کیا تھا؟
10. سوراج پارٹی کی بنیاد کس نے ڈالی؟

10.8.2 مختصر جواب طلب سوالات (Short Answer Type Questions)

1. عدم تعاون تحریک سے متعلق کسانوں کا کیا ردعمل تھا؟
2. عدم تعاون کی تحریک کے اثرات بیان کریں۔
3. عدم تعاون تحریک کیوں معطل کی گئی؟
4. خلافت تحریک پر ایک مختصر نوٹ لکھیں۔
5. گاندھی کے ستیہ گرہ اور عدم تشدد کی خصوصیات کا جائزہ لیں۔

10.8.3 تفصیلی جواب طلب سوالات (Long Answer Type Questions)

1. خلافت اور عدم تعاون تحریک کے آغاز کے اسباب بیان کیجیے۔
2. کیا ہم کہہ سکتے ہیں کہ خلافت اور عدم تعاون کی تحریک ناکام ثابت ہوئی، کیونکہ یہ خلافت کی بحالی اور سوراج کے حصول میں ناکام رہی؟ بحث کریں۔
3. عدم تعاون کی تحریک کے تین مختلف مراحل پر روشنی ڈالیں۔

मौलाना आज़ाद नेशनल उर्दू यूनिवर्सिटी Estd. 1998 MAULANA AZAD NATIONAL URDU UNIVERSITY

10.9 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Learning Resources)

1. Amin, Shahid, *Event*, *Metaphor*, *Memory*: *Chauri Chaura*, 1922–1992, Penguin, New Delhi, 2006 (first pub. in 1995).
2. Bandhopadhyay, Sekhar, *From Plassey to Partition: A History of Modern India*, Orient Longman Private Limited, 2004.
3. Banerjee-Dube, Ishita, *A History of Modern India*, Cambridge University Press, 2014.
4. Brown, Judith, *Gandhi's Rise to Power: Indian Politics, 1915–1922*, Cambridge University Press, 1972.
5. Chandra, Bipan, *Nationalism and Colonialism in Modern India*, Orient Longman, New Delhi, 1979.
6. Chandra, Bipan et al., *India's Struggle for Independence*, Penguin, New Delhi, 2000.
7. Grover and Grover, *A New Look at Modern Indian History*, S. Chand & Company Limited, New Delhi, 1983.
8. Minault, Gail, *The Khilafat Movement: Religious Symbolism and Political Mobilization in India*, Oxford University Press, New Delhi, 1982.
9. Sarkar, Sumit, *Modern India*, MacMillan, New Delhi, 1982.
10. Shakir, Moin, *Khilafat to Partition*, New Delhi.

اکائی 11۔ عام نافرمانی اور ہندوستان چھوڑو تحریک

(Civil Disobedience and Quit India Movements)

اکائی کے اجزا

11.0 تمہید

11.1 مقاصد

11.2 تاریخی پس منظر

11.3 عام نافرمانی تحریک

11.4 تحریک سے متعلق عوامی رد عمل اور علاقائی رجحانات

11.5 گاندھی ارون معاہدہ سے لے کر دوسری گول میز کانفرنس کی ناکامی تک

11.6 1932 کے اوائل میں عام نافرمانی تحریک کی بازگیری

11.7 عام نافرمانی کی تحریک کا تنقیدی جائزہ

11.8 عام نافرمانی تحریک کے اختتام سے اگست 1942 کی قرارداد تک

11.9 ہندوستان چھوڑو تحریک

11.10 ہندوستان چھوڑو تحریک کے ظہور کے اسباب

11.11 ہندوستان چھوڑو تحریک کی نوعیت

11.12 دوسری عالمگیر جنگ اور ہندوستان چھوڑدو تحریک

11.13 1942 میں ہندوستان کی سیاسی صورتحال

11.14 تحریک کے علاقائی پہلو

11.15 اکتسابی نتائج

11.16 کلیدی الفاظ

11.17 نمونہ امتحانی سوالات

11.18 تجویز کردہ اکتسابی مواد

11.0 تمہید (Introduction)

اس اکائی میں عام نافرمانی تحریک (34-1930) اور ہندوستان چھوڑو تحریک (1942) کا تاریخی اور تنقیدی پہلو بیان کیا جائے گا۔ اس کے علاوہ، اس میں گاندھی کی قیادت میں مربوط سامراجیت مخالف تحریک کی اہمیت کا جائزہ لیا جائے گا۔ عام نافرمانی تحریک (-1930 34) نے عدم تعاون (22-1920) تحریک کے مقابلے سامراجیت مخالف جدوجہد کی سماجی رسائی کو وسیع کرنے میں ایک واضح پیش رفت کی۔ 1934 میں عام نافرمانی کی تحریک کے خاتمے کے نتیجے میں کانگریس کے اندر شدید اختلافات پیدا ہوئے۔ جب گاندھی نے عارضی طور پر فعال سیاست سے کنارہ کشی اختیار کی، تو متعدد سوشلسٹ اور دیگر بائیں بازو رہنماؤں جیسے جئے پرکاش نارائن، اچیوتا پٹوردھن، اشوک مہتا، اور مینو مسانی نے کانگریس سوشلسٹ پارٹی کی بنیاد ڈالی۔ 1937 کے انتخابات کے بعد، گاندھی نے عدم تشدد اور تعمیری پروگرام کی عمل آوری میں اپنا اعتماد ظاہر کیا۔ 1930 کی دہائی کے اواخر میں، کانگریس کے بائیں بازو رہنما جیسے بوس اور نہرو نے رجواڑہ ریاستوں میں زیادہ سے زیادہ مداخلت کی خواہش پر اصرار کیا، تاکہ انہیں برطانوی ہندوستان میں ہونے والی سیاسی پیش رفتوں کے برابر لایا جاسکے۔

ستمبر 1939 میں دوسری جنگ عظیم کے آغاز نے ہندوستانی سیاست میں نئے تغیرات پیدا کیے۔ بالآخر، لنلتھگو کے اگست تجاویز (1940) کے غیر متعینہ مستقبل میں ڈومینین اسٹیٹس (Dominion Status) کی پیشکش اور کرپس مشن (1942) کے دوسری عالمگیر جنگ کے اختتام پر ڈومینین اسٹیٹس کی پیشکش نے کانگریس کو اگست قرارداد پاس کرنے پر مجبور کیا۔ اس طرح، 8 اگست 1942 میں کل ہند کانگریس کمیٹی نے "ہندوستان چھوڑو" کی قرارداد پاس کی، جس میں یہ تجویز پیش کی گئی کہ اگر اقتدار فوری طور پر ہندوستانیوں کے حوالے نہ کیا گیا تو گاندھی کی ہدایات کے مطابق بڑے پیمانے پر عام نافرمانی شروع کی جائے گی۔ ہندوستان چھوڑو تحریک کو بجا طور پر سب سے بڑی سامراج مخالف جدوجہد کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔ اس تحریک نے 1942 کے بعد آنے والے پانچ سالوں میں ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں بے مثال اور ہنگامہ خیز واقعات پیدا کیے۔ ان واقعات میں بڑھتی ہوئی قوم پرستی، 1943 کے بنگال قحط کی وجہ سے متعدد اموات، برما اور ملایا میں جاپانی جارحیت کا ظہور، سبھاس چندر بوس کی آزاد ہند فوج کا قیام اور فرقہ وارانہ صورتحال شامل ہیں۔

11.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- عام نافرمانی اور ہندوستان چھوڑو تحریک کے ظہور کے اسباب جان سکیں گے۔
- ان تحریکوں پر عوامی ردعمل کا تجزیہ کر سکیں گے۔
- تحریک سے متعلق علاقائی رجحانات کا جائزہ لے سکیں گے۔
- تحریکوں کی نوعیت اور اثرات کا تجزیہ کر سکیں گے۔

11.3 تاریخی پس منظر (Historical Context)

1922 میں گاندھی کی طرف سے عدم تعاون تحریک کی معطلی کے فوراً بعد انڈین نیشنل کانگریس کی رکنیت میں زبردست کمی واقع ہوئی۔ کانگریس میں بہت سے لوگوں نے گاندھیائی حکمت عملی کی افادیت پر اعتماد کھو دیا اور نوجوانوں کے ایک حصے نے اپنے سیاسی مقاصد کے حصول کے لیے انقلابی تشدد کا راستہ اختیار کیا۔ مخالف تبدیلی (No-changers) گروہ نے دیہی علاقوں میں گاندھیائی تعمیری پروگرام پر توجہ مرکوز کی جبکہ حمایت تبدیلی (Pro-changers) گروہ (یعنی سوراج کے حامی) کونسل کی سیاست میں شامل ہو گئے۔ خلافت اور عدم تعاون تحریک کے زوال کی وجہ سے قلیل مدتی مسلم لیگ اور کانگریس اتحاد بھی خطرے میں پڑ گیا۔ شمال مغربی ہند کے سرحدی علاقے میں کوہاٹ (Kohat) کے مقام پر فرقہ وارانہ فسادات پھوٹ پڑے۔ 1923 میں، سی۔ آر۔ داس کا ہندو مسلم معاہدہ ٹوٹ گیا، جس کے نتیجے میں اپریل 1926 میں کلکتہ میں شدید فسادات واقع ہوئے۔ 1923 اور 1927 کے درمیان متحدہ صوبوں میں 88 فسادات ہوئے جس کے نتیجے میں ہندو مسلم تعلقات تقریباً مکمل طور پر ٹوٹ گئے۔ اس صورتحال میں اچھوت بھی مایوس ہو گئے کیونکہ ان کے حالات کو بہتر بنانے کی مہم نے پورے ہندوستان میں منفی رد عمل محسوس کیا گیا۔ اس کے برعکس، دوسرے پہلوؤں میں کچھ ایسی تبدیلیاں واقع ہوئیں جنھوں نے برطانوی راج کے خلاف عوامی تحریک کی بنیاد تیار کی۔ سب سے پہلے، برآمدات پر مبنی نوآبادیاتی معیشت 1920 کی دہائی کے اواخر میں ایک عظیم مالی بحران کا شکار ہو گئی۔ زرعی فصلوں کی قیمتوں میں تیزی سے کمی واقع ہوئی۔ اس طرح، سال 29-1928 میں، ہندوستان میں مزدوروں کی صورتحال بہت غمگین تھی، جس کی وجہ سے ملک کے اطراف واکناف میں احتجاج ہوا۔ اگرچہ مزدور طبقے نے خود مختاری کا مظاہرہ کیا، لیکن اس سرگرمی کے پیچھے ایک بڑا سبب کمیونسٹ ذہنیت کا اثر و رسوخ تھا۔ تاہم، 1930 تک، یہ کمیونسٹ اثر و رسوخ کم ہو گیا کیونکہ حکومت نے ان کے خلاف جابرانہ اقدامات اٹھائے۔

انتشار کی اس بے ترتیب صورتحال میں، 1927 کے اواخر سے ہندوستانی سیاست ایک بار پھر متحرک ہو گئی جب لندن کی ٹوری (Tory) حکومت نے ہندوستان میں آئینی نظام کا جائزہ لینے کے لیے سر جان سائمن کی قیادت میں ایک قانونی کمیشن مقرر کیا۔ کمیشن میں ہندوستانیوں کی عدم شمولیت نے ہندوستان کے تمام سیاسی گروہوں کی طرف سے احتجاج کو اکسایا اور اس کے نتیجے میں کانگریس اور مسلم لیگ دونوں نے ملک گیر بائیکاٹ میں حصہ لیا۔ 1928 کے اوائل میں جب سائمن کمیشن ملک میں آیا تو اس کا استقبال "سائمن واپس جاؤ" جیسے نعروں سے کیا گیا۔ اس تناظر میں موتی لال نہرو نے مشترکہ ہندو مسلم آئینی اسکیم کے لیے بات چیت شروع کی، اور اگست 1928 میں لکھنؤ میں ہونے والی آل پارٹیز کانفرنس میں نہرو رپورٹ پیش کیا۔ نہرو رپورٹ برطانوی ہندوستان میں آل پارٹیز کانفرنس کی اصلاحی تجویز تھی جس میں نئے ڈومینین اسٹیٹس (Dominion Status) اور وفاقی حکومت کے قیام کی اپیل کی گئی تھی۔ موتی لال چاہتے تھے کہ گاندھی اس اسکیم کی حمایت کریں، تاکہ کانگریس اسے آسانی سے قبول کرے۔ لیکن حصول سوراج کے لیے گاندھی کانگریس سے باہر عوام کو متحرک کرنا چاہتے تھے۔ اگر گاندھی کے لیے کانگریس کی زیر قیادت قوم پرست سیاست میں داخل ہونے کا ایک طریقہ نہرو رپورٹ تھا، تو دوسرا طریقہ 1928 کی باردولی ستیہ گرہ تھی۔ باردولی ستیہ گرہ کا آغاز 4 فروری 1928 کو گجرات کانگریس کمیٹی کے صدر ولبھ بھائی پٹیل نے کیا تھا۔

اگرچہ پٹیل نے مقامی ثالثوں کی مدد سے اس تحریک کو منظم کیا، لیکن یہ تحریک دراصل گاندھی کی تحریک تھی، کیونکہ انہوں نے پتی دار کسانوں اور کالی پراج قبائلیوں کو متحرک کرنے کے لیے گاندھی کا استعمال کیا۔ اس تحریک کو قومی پریس میں بڑے پیمانے پر پیش کیا گیا، کیونکہ یہ ولبھ بھائی پٹیل کی ایک شاندار کامیابی تھی۔ باردولی ستیہ گرہ کی کامیابی نے گاندھی کو ایک بار پھر روشنی میں لایا، اور اس تحریک نے ان کے نظریہ کو ثابت کیا کہ ستیہ گرہ آئینی طریقوں سے زیادہ موثر ہے۔

اس کے علاوہ، 33-1929 کے عالمی اقتصادی بحران نے بھی قومی تحریک پر دور رس اثرات مرتب کیے۔ برطانوی نوآبادیاتی حکومت سیاسی اور اقتصادی کشیدگی کی وجہ سے 1920 کی دہائی کے اواخر اور 1930 کی دہائی کے اوائل میں ابھرتے ہوئے ہندوستانی مفادات کو ترتیب دینے میں ناکام رہی۔ لنکے شائر (Lancashire) سے ٹیکسٹائل کی درآمدات نے مقامی صنعت کاروں کی پریشانی اور تشویش میں اضافہ کیا۔ مذکورۂ بالا صورتحال کو جواب دینے کے لئے کانگریس نے 1929 میں لاہور کے اجلاس میں ٹیکس کی عدم ادائیگی اور عام نافرمانی کے پروگرام کو مجاز ٹھرایا تھا۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ اگر برطانوی حکومت نے 1929 کے آخر تک نہرو رپورٹ کو قبول نہیں کیا، تو وہ آنے والے لاہور اجلاس میں عام نافرمانی کی مہم کا اعلان کریں گے۔ اگرچہ گاندھی کو مخصوص جگہ اور وقت پر تحریک شروع کرنے کا اختیار دیا گیا تھا، لیکن وہ شدت سے اس تحریک کے لئے ایک معیاری ضابطے کی تلاش میں تھے۔

11.4 عام نافرمانی تحریک (Civil Disobedience Movement)

فروری 1930 کے وسط میں، کانگریس ورکنگ کمیٹی نے سابرمتی آشرم کی نشست میں گاندھی کو مخصوص جگہ اور وقت پر تحریک شروع کرنے کا مکمل اختیار دیا گیا۔ عوامی جدوجہد کا تسلیم شدہ ماہر شدت سے اس تحریک کے لئے ایک معیاری ضابطے کی تلاش میں تھا۔ اس سلسلے میں گاندھی نے لارڑ ارون کے سامنے 31 جنوری 1930 تک گیارہ نکاتی پروگرام پر عمل آوری کی تجویز پیش کی۔ ان گیارہ نکات میں مندرجہ ذیل شامل ہیں:

1. نشہ آور اشیاء پر پابندی عائد کی جائے۔
2. روپیہ اور اسٹرلنگ کے درمیان تناسب کو تبدیل کریں۔
3. زرعی ٹیکس میں 50 فیصد کمی کی جائے۔
4. نمک ٹیکس اور حکومت کی نمک پر اجارہ داری کو ختم کیا جائے۔
5. فوجی اخراجات اور اعلیٰ درجے کے ملازموں کی تنخواہوں میں کمی کی جائے۔
6. سول انتظامیہ پر اخراجات کو کم کریں۔
7. غیر ملکی کپڑے پر محصول لگائیں۔
8. پوسٹل ریزرویشن بل (Postal Reservation Bill) کو قبول کیا جائے۔

9. سی۔آئی۔ڈی۔ڈیپارٹمنٹ کو ختم کردیں۔
10. تمام سیاسی قیدیوں کو رہا کیا جائے۔
11. اپنے تحفظ کے لیے شہریوں کو اسلحہ رکھنے کی سند اجرا کریں۔

گاندھی نے واضح کیا کہ اگر 11 نکاتی پروگرام کو نظرانداز کیا گیا تو کانگریس کے پاس عام نافرمانی کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں ہو گا۔جب لارڈ ارون نے گاندھی کے اس پروگرام کو نظرانداز کیا تو کانگریس نے عام نافرمانی تحریک شروع کرنے کی تیاری کی۔کانگریس کے مسلم ممبران، جیسے ڈاکٹر انصاری، ناخوش تھے، کیونکہ فرقہ وارانہ اتحاد عام نافرمانی تحریک کی کامیابی کے لیے ایک لازمی شرط تھا۔مسلم لیگ نے اس تحریک کو ہندو راج قائم کرنے کی سازش قرار دیا۔اسی طرح سکھوں کی حمایت بھی کانگریس سے دور ہوتی دکھائی دے رہی تھی۔مدراس میں ہندو مہاسبھا اور جسٹس پارٹی (Justice Party) کی طرح غیر کانگریسی ہندوؤں نے عام نافرمانی کی مخالفت کا اعلان کیا۔کاروباری گروہ لاہور کی قرارداد کے غیر یقینی امکانات کے بارے میں خوفزدہ تھے، جب کہ نوجوان کانگریسی مزید عسکریت پسندانہ کارروائی کے لیے دباؤ ڈال رہے تھے۔ان حالات میں، 26 جنوری 1930 کو "یوم آزادی" کے جشن نے پنجاب، متحدہ صوبوں، دہلی اور بمبئی کے لوگوں میں کافی جوش و خروش پیدا کیا۔بہار میں جشن منانے کے نتیجے میں پولیس اور کانگریس کے رضاکاروں کے درمیان پر تشدد جھڑپیں ہوئیں۔

سمت سرکار کی درجہ بندی کے مطابق، گاندھی کا گیارہ نکاتی پروگرام ایک سمجھوتا تھا، جس میں چھ عام دلچسپی کے مسائل، تین مخصوص متوسط طبقے کے مفادات اور دو کسانوں کے مطالبات شامل تھے۔یہ ایسے مطالبات تھے جن کے ذریعے ہندوستانیوں کو ایک بار پھر اعلیٰ سیاسی قیادت میں متحد کرنے کی کوشش کی گئی۔اس طرح گاندھی نے آزادی کے تجریدی تصور کو مخصوص مطالبات سے جوڑ دیا۔لیکن تمام مطالبات میں سے، نمک ٹیکس بہت سی وجوہات کی بنا پر سب سے اہم معلوم ہوتا تھا۔اس نے آبادی کے تمام طبقوں کو متاثر کیا تھا۔اس سے حکومتی مالیات یا کسی کے ذاتی مفادات کو کوئی خطرہ نہیں تھا اور نہ ہی یہ حکومتی جبر کو اکسا دیتا۔

فروری 1930 میں گاندھی نے نمک کے بارے میں کہا کہ 'پانی کے علاوہ نمک جیسی کوئی شئے نہیں ہے جس پر ٹیکس لگا کر حکومت لاکھوں بھوکے، بیمار، معذور اور بے بس لوگوں تک پہنچ سکتی ہے۔اس لیے یہ محصول غیر انسانی اور غیر واجب تھا۔انہوں نے وائسرائے ارون کو مطلع کیا کہ 11 مارچ کو وہ سابرمتی آشرم سے اپنے ساتھیوں کے ہمراہ نمک کے قانون کی خلاف ورزی کرنے کے لیے آگے بڑھیں گے۔یہ ایک شاندار تصوراتی منصوبہ تھا حالانکہ اس وقت چند لوگ ہی اس کی اہمیت کو سمجھ سکتے تھے۔گاندھی نے 78 ارکان کے ساتھ، جن میں ہندوستان کے تقریباً ہر علاقے اور مذہب سے تعلق رکھنے والے لوگ شامل تھے، احمد آباد سے ڈانڈی تک گجرات کے دیہاتوں سے ہوتے ہوئے تقریباً 240 میل تک مارچ کریں گے۔انہوں نے اعلان کیا کہ ڈانڈی کے ساحل پر پہنچ کر وہ نمک کے قانون کو توڑ دیں گے۔جب لوگ سابرمتی آشرم میں ہزاروں کی تعداد میں جمع ہوئے، گاندھی نے اپنے منصوبوں کی وضاحت کی، مستقبل کے اقدامات کے لیے ہدایات پیش کیے، لوگوں کو عدم تشدد کی ضرورت کے بارے میں خبردار کیا اور انہیں حکومت کے ردعمل کے لیے تیار کیا۔گاندھی نے لوگوں سے کہا کہ جہاں بھی ممکن ہو، نمک کے قانون کی عام نافرمانی شروع کردی جائے، شراب اور غیر ملکی کپڑوں کی دکانوں پر دھرنا دیا جائے، اگر لوگوں

کے پاس مطلوبہ طاقت ہے تو وہ ٹیکس ادا کرنے سے انکار کریں، وکلاء اپنا پیشہ چھوڑ دیں، عوام قانونی عدالتوں کا بائیکاٹ کریں اور سرکاری ملازمین اپنے عہدوں سے استعفیٰ دے دیں۔ میں صرف ایک ہی شرط پیش کرتا ہوں۔۔۔۔اور وہ یہ ہے کہ حصول سوراج کے لئے سچائی اور عدم تشدد کے عہدوں کو وفاداری سے برقرار رکھا جائے۔

عام نافرمانی تحریک میں نمک کے مسئلے کو مرکزی بنانے کی تجویز کافی فیصلہ کن ثابت ہوئی۔ ارون نے بھی گاندھی سے مخاطب ہو کر کہا کہ 'آپ نے نمک کے معاملے میں ایک عمدہ حکمت عملی کی منصوبہ بندی پیش کی ہے'۔ گاندھی نے 12 مارچ کو سابرمتی آشرم سے مارچ شروع کیا اور 6 اپریل 1930 کو ڈانڈی پہنچ گئے۔ گاندھی کے ذریعہ نمک کے قانون کو توڑنے کا مطلب حکومت کے تئیں عوام کی وفاداری کے دعوے کو مسترد کرنا تھا۔ مزید برآں، ساحلی علاقوں میں نمک کی غیر قانونی پیداوار سے لوگوں کو بھی معمولی آمدنی حاصل ہو سکتی ہے۔ ڈانڈی مارچ اور ملک کے متعدد علاقوں میں نمک کے قانون کی خلاف ورزی نے ایک غیر متشدد عوامی جدوجہد کی طاقت کا مظاہرہ کیا۔ جب گاندھی ڈانڈی کی طرف مارچ کر رہے تھے تو ان کے ساتھیوں نے لوگوں میں قوم پرستی کا پیغام پھیلانے، فنڈ اکٹھا کرنے اور شہروں اور دیہاتوں کا دورہ کرنے کا مشکل کام انجام دیا۔

کانگریس ورکنگ کمیٹی نے اس طرح ایک ایسا پروگرام تیار کیا، جس کا ہندوستانی سماج انقسامی اثرات سے محفوظ رہا۔ لیکن اپریل کے اواخر دنوں میں ہندوستان کے مختلف حصوں میں پر تشدد سرگرمیاں اور غیر منظم عوامی بغاوت شروع ہو گئی۔ ان میں سب سے اہم چٹاگانگ (بنگال) میں اسلحہ خانے پر حملہ تھا، جس کے بعد پورے صوبے میں پر تشدد سرگرمیوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ پشاور میں مقامی رہنما بادشاہ خان کی گرفتاری کے بعد عوام بے قابو ہو گئی، اور اس کے بعد مئی کے وسط میں گاندھی کو بھی گرفتار کیا گیا۔ اس کے بعد شولاپور میں ٹیکسٹائل کی ایک بے ساختہ ہڑتال ہوئی، جہاں مزدوروں نے شہر کی سرکاری عمارتوں اور دیگر سرکاری املاک کو گھیرے میں لیا۔ اس کے نتیجے میں ہندوستان کے تقریباً تمام حصوں میں اس عوامی تحریک کی حوصلہ افزائی ہوئی جس میں نہ صرف غیر ملکی حکومت کے ساتھ عدم تعاون عملایا گیا بلکہ مکمل آزادی حاصل کرنے کے لیے تحریک کے اصولوں کی حقیقی خلاف ورزی بھی شامل تھی۔ یہاں تک کہ تین مختلف علاقوں میں حکومتی عملے کے خلاف تشدد کا استعمال کیا گیا۔ اس لحاظ سے، سومت سرکار کے مطابق عام نافرمانی تحریک عدم تعاون تحریک کے مقابلے میں بنیاد پرست تھی۔

11.5 تحریک سے متعلق عوامی رد عمل اور علاقائی رجحانات

(Public Response to the Movement, and the Regional Trends)

جب ڈانڈی میں گاندھی کی غیر معمولی سیاسی سرگرمی سے عام نافرمانی کا آغاز ہوا، تو پورے ملک میں نمک کے قوانین کی خلاف ورزی شروع ہو گئی۔ ستیہ گرہیوں نے آسام، بنگال اور مدراس، سندھ، اڑیسہ اور بہت سے دوسرے مقامات پر جلوس نکالے۔ تمل ناڈو میں، سی راجگوپال چاری نے تروچیراپلی سے ویدارنیم تک مارچ کی قیادت کی۔ مالابار میں، کے۔ کیلاپن نے کالی کٹ سے پیانور تک مارچ کی قیادت کی۔ اڑیسہ کے سمندری ساحل پر مشہور گاندھیائی رہنما گوپابندھو چودھری نے کٹک سے انچوڈی تک ستیہ گرہیوں کی قیادت کی۔ آسام میں ستیہ

گرہیوں نے نمک کی پیداوار کے لیے سلہٹ (Sylhet) سے نوکھالی (بنگال) تک پیدل سفر کیا۔ آندھرا میں، نمک ستیہ گرہیوں کے ہیڈکوارٹر کے طور پر مختلف اضلاع میں متعدد سیبیرام (کیمپ) قائم کئے گئے۔

اس عرصے میں ایک نئی قسم کی محصول کی عدم ادائیگی مہم وجود میں آگئی جس میں چوکیداری ٹیکس ادا کرنے سے انکار کیا گیا۔ چوکیداروں اور دیہی پولیس کے چھوٹے دستے کی تنخواہ کو دیہاتوں پر لگائے جانے والے ٹیکسوں سے ادا کیا جاتا تھا۔ چوکیداروں کو اکثر حکومت کے حق میں کام کرنے والے جاسوس اور مقامی جاگیرداروں کے پاسبانوں کے طور پر سمجھا جاتا تھا۔ یہ تحریک چوکیداروں کو اپنے کام سے استعفیٰ کا مطالبہ کرتی تھی۔ اس طرح، مونگھیر، سارن اور بھاگلپور اضلاع میں ٹیکس ادا کرنے سے انکار کیا گیا، چوکیداروں کو استعفیٰ دینے پر آمادہ کیا گیا، اور مزاحمت کرنے والوں کے خلاف سماجی بائیکاٹ کیا گیا۔ حکومت نے چند روپے ٹیکس کے عوض سینکڑوں اور ہزاروں روپیوں کی املاک اور جائیداد ضبط کر کے اور مار پیٹ اور تشدد سے بدلہ لیا۔ 31 مئی کو بھاگلپور کے بیہ پور (Bihpur) میں صورتحال اس وقت خراب ہوگئی جب پولیس نے کانگریس کے آشرم پر قبضہ کر لیا جو علاقے میں قوم پرست سرگرمیوں کا ہیڈکوارٹر تھا۔

جب برسات کی وجہ سے بنگال میں نمک کی پیداوار مشکل ہوگئی، تب لوگوں نے چوکیداری مخالف اور یونین بورڈ مخالف احتجاج کی طرف دھیان دیا۔ دیگر جگہوں کی طرح، بنگال کے دیہاتیوں نے بہادری کا مظاہرہ کیا، ریاستی جبر کا مقابلہ کیا اور ضبطی اور تباہی سے ہزاروں روپے کی املاک کھودی۔ چوکیداری ٹیکس کی عدم ادائیگی اور اس کے خاتمے کے مطالبے نے اڑیسہ کے ساحلی اضلاع میں برسات کے آغاز پر (بالخصوص بالاسور میں) ایک نئی بلندی حاصل کی۔ احتجاج کی اجتماعی شکلیں اور پولیس پر حملہ اس وقت منظر عام پر آیا جب عام نافرمانی تحریک کے دوران حکام نے چوکیداری ٹیکس ادا کرنے سے انکار کرنے والے لوگوں کی جائیدادیں ضبط کرنے کی کوشش کی۔

محصول کی عدم ادائیگی کی تحریک ضلع سورت کے باردولی تعلقہ میں، بروچ میں اور جمبوسر میں بھی قائم ہوئی۔ اس خطے میں ہزاروں لوگوں نے اپنے مال مویشیوں کے ساتھ برطانوی ہندوستان سے شاہی ریاست (بروڈا) میں ہجرت کی، جہاں انہوں نے کھلے میدانوں میں مہینوں تک ڈیرے ڈالے۔ دوسری طرف برطانوی حکام نے جوابی کارروائی کرتے ہوئے ان کے گھروں کو توڑا، ان کا سامان تباہ کردیا اور ان کی زمینیں ضبط کرلی۔ پولیس نے ولبھ بھائی پٹیل کی اسّی سالہ ماں کو بھی نہیں بخشا، جو کرمساد (Karmasad) میں اپنے گھر میں کھانا پکا رہی تھی۔ ان کے برتنوں کو باہر پھینکا گیا اور کھانے کی اشیاء کو برباد کیا گیا۔ جب مارچ 1931 میں گاندھی ارون سمجھوتا ہوا، اس کے بعد وہ کسان اپنے آبائی وطن کی طرف رخصت ہوگئے۔

مہاراشٹرا، کرناٹک، مرکزی صوبوں اور دیگر قبائلی علاقوں میں بڑے پیمانے پر جنگل سے متعلق قوانین کی خلاف ورزی کی گئی۔ کچھ جگہوں پر، جنگل سے متعلق قوانین کو توڑنے والے ہجوم کی تعداد 70,000 یا اس سے بھی زیادہ تھی۔ اس کے علاوہ، کنن گھم فرمان (Cunningham Circular) کے جواب میں آسام کے طلباء نے زبردست احتجاج کیا۔ اس فرمان کے ذریعے طلباء اور ان کے سرپرستوں کو نوآبادیاتی حکومت کے ساتھ اچھے برتاؤ کی یقین دہانی پیش کرنے پر مجبور کیا گیا تھا۔ دسمبر 1929 میں جواہر لعل نہرو کے لاہور

قرارداد نے ملک بھر کے عوامی ردعمل کو پرجوش بنایا۔ نہرو نے اپنے ہم وطنوں کو یاد دلایا کہ "یہ جھنڈا لہرایا گیا ہے، اور اسے اس وقت تک نہیں گرایا جانا چاہیے جب تک ہندوستان میں کوئی ایک بھی ہندوستانی، مرد، عورت یا بچہ زندہ ہے"۔ شدید مظالم کا سامنا کرتے ہوئے قومی پرچم کی عزت کا دفاع انتہائی بہادری سے کیا گیا۔ ٹوٹا نارسیانائیڈو کی مثالی ہمت نے اپنے ہاتھوں سے قومی پرچم کو چھوڑنے کے بجائے پندرہ رکنی پولیس فورس کے ہاتھوں بے ہوش ہونے کو ترجیح دی۔ اس کے بعد کالی کٹ میں مقیم ایک قوم پرست پی۔ کرشنا پلائی نے بھی اسی طرح کے عزم کا مظاہرہ کیا۔ ہاتھوں سے قومی پرچم چھیننے کی کوششوں کو ناکام کرنے کے لئے، سورت میں بچوں کے ایک گروہ کو قومی پرچم کے تین رنگوں میں کھادی کے ملبوسات پہنائے گئے۔

ابتدائی مہینوں میں، عام نافرمانی تحریک نے متحدہ صوبوں میں غیر معمولی ردعمل کا اظہار کیا، لیکن برطانوی جبر کے بڑھنے کے ساتھ ہی وہ خاموش ہو گیا۔ اس کے بعد اس تحریک میں محصول (Revenue) کی عدم ادائیگی اور لگان (Rent) کی عدم ادائیگی شامل کی گئی۔ محصول کی عدم ادائیگی زمینداروں کے لئے حکومت کو محصول ادا کرنے سے انکار کرنے کی ہدایت تھی، اور لگان کی عدم ادائیگی کسانوں کے لئے لگان ادا نہ کرنے کا مشورہ تھا۔ چونکہ زمیندار بہت حد تک حکومت کے وفادار تھے، اس لئے بہت جلد یہ تحریک محصول عدم ادائیگی کی جدوجہد بن گئی۔

عام نافرمانی تحریک نے نوآبادیاتی مخالف سیاست کی قوم پرست شکلوں کو متحرک کیا اور مقبول بنایا۔ مثال کے طور پر، رضاکار دستوں کی تشکیل کی گئی؛ سوراج کے پیغام کو عام کرنے کے لیے شہروں اور دیہاتوں میں گھومنے کے لیے سنکرتن جلوسوں کی تنظیم کی گئی، جس میں دیہاتوں اور قصبوں میں خواتین اور بچوں سمیت لوگ صبح کے وقت قوم پرست گیت گاتے ہوئے گھومتے تھے؛ دیہی اور شہری علاقوں میں عوامی جلسوں کا انعقاد کیا گیا؛ جادوئی لالٹینوں کی نمائش کا انعقاد کیا گیا؛ قوم پرستانہ خیالات کو لوگوں تک پہنچانے کے لیے دیہاتوں میں قوم پرست ادب پر مشتمل کتابچوں کی تشہیر کی گئی؛ اور زیر زمین کانگریس کے آشرموں کا قیام قوم پرست سرگرمیوں کا مانوس طریقہ بن گیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ دیہی بازار، مندر اور گاندھیائی آشرم قوم پرستی کے سرگرم مقامات بن گئے۔ اس کے علاوہ، بچوں نے رضاکارانہ طور پر اپنے آپ کو وانر سینا (monkey squads) یا بندر دستوں میں منظم کیا اور ایک جگہ پہ لڑکیوں نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنی الگ منجری سینا یا بلی فوج بنانا چاہتے ہیں۔

اپریل 1930 میں نمک کے قانون کی خلاف ورزی پر نہرو کی گرفتاری نے مدراس، کلکتہ اور کراچی میں زبردست مظاہروں کو جنم دیا۔ گاندھی کی گرفتاری 4 مئی 1930 کو ہوئی جب انہوں نے اعلان کیا تھا کہ وہ مغربی ساحل پر دھرشانہ نمک کارخانے پر عام نافرمانی کی قیادت کریں گے۔ گاندھی کی گرفتاری کے بعد بمبئی، دہلی، کلکتہ اور شولا پور میں زبردست احتجاجی مظاہرے ہوئے۔ ان کی گرفتاری کے بعد، کانگریس ورکنگ کمیٹی نے تین اہم اقدامات کی منظوری دی، جن میں درج ذیل شامل تھے:

- رعیتواری علاقوں (Ryotwari Areas) میں محصول کی عدم ادائیگی۔
- زمینداری علاقوں (Permanent Settlement Areas) میں چوکیداری ٹیکس کی عدم ادائیگی۔

- مرکزی صوبوں میں جنگل کے قوانین(Forest Laws)کی خلاف ورزی۔

سماجی بائیکاٹ کے تحت متعدد نچلے درجے کے سرکاری افسران بشمول پولیس اہلکار اپنی خدمات سے مستعفی ہو گئے۔ جیسے ہی تحریک مشتعل ہونے لگی، حکومت نے انتقامی کارروائی کو بڑھانا شروع کیا جیسا کہ امریکی صحافی ویب ملر نے مشاہدہ کیا ہے۔اس طرح، ریاستی جبر اور ظلم کی وجہ سے تحریک نے سرگرم اور فعال کردار اختیار کیا۔ جب نمک ستیہ گرہ نے عروج حاصل کیا تو تین اہم تبدیلیاں وجود میں آگئ جو گاندھیائی عام نافرمانی کی حدود سے باہر نکل گئیں۔سب سے پہلے، بنگال میں انقلابی قوم پرستی نے برطانوی جبر کے مواقع کو فروغ دیا۔(اکائی نمبر 7 ملاحظہ کیجئے)دوسری بات یہ کہ 23اپریل 1930 کو پشاور میں خان عبدالغفار خان کی گرفتاری نے ایک زبردست بغاوت کو جنم دیا جب ہندو سپاہیوں نے حب الوطنی، فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور عدم تشدد کی عمدہ مثال میں ایک مسلمان ہجوم پر گولی چلانے سے انکار کر دیا۔ تیسرا، شولا پور میں ٹیکسٹائل مزدوروں کی ہڑتال کے نتیجے میں شراب کی دکانوں، پولیس چوکیوں اور سرکاری عمارتوں پر حملے ہوئے، جس نے مئی کے شروع میں کچھ دنوں کے لیے متوازی حکومت جیسی چیز کو جنم دیا۔

عام نافرمانی کی تحریک کی ایک اہم خصوصیت یہ تھی کہ اسے بڑے پیمانے پر کاروباری طبقے کی حمایت حاصل تھی۔انہوں نے ابتدائی دور میں دو اہم طریقوں سے حصہ لیا۔انہوں نے تحریک کو مالی امداد فراہم کی اور غیر ملکی کپڑوں کے بائیکاٹ کی حمایت کی۔ درآمدات (کپڑے) کی قیمت 1929 میں 26 ملین پاؤنڈ سے کم ہو کر 1930 میں 13.7 ملین پاؤنڈ تک گر گئی۔ جزوی طور پر اس زوال کے لئے عالمی اقتصادی بحران ذمہ دار تھا، بلکہ خاص طور پر یہ زوال غیر ملکی کپڑے کے بائکاٹ کی وجہ سے ہی وقوع پذیر ہوا۔ عام نافرمانی کی تحریک کی دوسری سب سے اہم خصوصیت خواتین کی بڑے پیمانے پر شرکت تھی۔ڈانڈی مارچ کے دوران تقریباً ہر وقفے پر خواتین گاندھی کو سننے کے لیے ہزاروں کی تعداد میں جمع ہوتی تھی۔

تاہم، 1930 کے آس پاس گاندھیائی قوم پرستی کی حمایت عدم تعاون کی تحریک کے مقابلے میں کم تھی۔ صرف چند وکلاء نے اپنا پیشہ چھوڑ دیا اور چند طلباء نے سرکاری اسکولوں کے بجائے 'قومی اسکولوں' میں شمولیت اختیار کی۔ انقلابی قوم پرستی نے بنگال میں پڑھے لکھے نوجوانوں کو زیادہ اپنی طرف راغب کیا، اور ایک مختصر عرصے کے لیے بھگت سنگھ شمالی ہندوستان کے قصبوں میں گاندھی سے زیادہ مقبول ہو گئے۔اس تحریک میں جیل جانے والوں کی تعداد 23-1922 کے اعداد و شمار سے تین گنا زیادہ تھی۔اس مرحلے پر جی۔ڈی۔ برلا کی سربراہی میں کلکتہ کے مارواڑیوں نے قوم پرست تحریک کے ساتھ یکجہتی کا اظہار کیا۔ بائکاٹ اور عالمی بحران کے مجموعی اثرات کی وجہ سے برطانوی کپڑوں کی درآمدات 30-1929 میں 1248 ملین گز سے کم ہو کر 31-1930 میں صرف 523 ملین گز رہ گئیں۔

11.6 گاندھی ارون معاہدہ سے لے کر دوسری گول میز کانفرنس کی ناکامی تک

(From Gandhi-Irwin Pact to the Failure of the 2nd Round Table Conference)

عام نافرمانی تحریک 1930 کے آخری چند مہینوں میں متضاد مرحلے پر پہنچ گئی تھی۔ اگرچہ کسانوں اور قبائلی عسکریت پسندی کے

واقعات میں اضافہ ہوا، لیکن سرکاری رپورٹوں کے مطابق شہری تاجروں میں جوش و خروش اور حمایت میں واضح کمی آ گئی۔ بہت سے لوگوں نے غیر ملکی اشیاء کو دھوکہ دہی سے فروخت کرنا شروع کر دیا۔ صنعت کاروں نے صبر کے حدود توڑ دیئے، جبکہ ہومی مودی نے بار بار تجارت اور صنعتیں متاثر ہونے کی شکایت کی۔ حکومت کی طرف سے عوامی املاک پر قبضوں نے امیر کسانوں کے قومی جذبے کو کم کر دیا۔ اس کے پس منظر میں گاندھی کو اپنے سیاسی منصوبوں سے پیچھے ہٹنا پڑا، اور 5 مارچ 1931 کو ارون کے ساتھ بات چیت کرنی پڑی۔ اس سمجھوتے کے تحت عام نافرمانی تحریک کو ختم کیا گیا؛ برطانوی سامان کے بائیکاٹ کا خاتمہ کیا گیا؛ قیدیوں کی رہائی یقینی بنائی گئی؛ اور سمندر کے کنارے رہنے والے لوگوں کو نمک بنانے کی اجازت دی گئی۔ ہر طرف ناخوشی کا احساس قائم تھا۔ یہ ناخوشی اور رنجیدگی اس وقت بڑھ گئی، جب گاندھی کی تین انقلاب پسندوں کی معافی کی درخواست کو نظر انداز کیا گیا، اور 23 مارچ 1931 کو بھگت سنگھ، سکھ دیو اور راج گرو کو پھانسی دے دی گئی۔ نہرو لکھتے ہیں کہ عام نافرمانی دھماکے سے نہیں بلکہ سرگوشی سے مر گئی۔

گاندھی ارون معاہدہ کچھ مورخین کے درمیان بحث کا موضوع رہا ہے۔ آر۔ جے۔ مور نے سب سے پہلے اس بات کی نشاندہی کی کہ سمجھوتے کے پیچھے متوسط طبقے کا دباؤ ایک اہم عنصر تھا۔ سومت سرکار نے استدلال کیا کہ ہندوستانی بورژوا طبقے نے تحریک کی ابتدائی کامیابی اور دستبرداری میں متوسط طبقے نے اہم کردار ادا کیا۔ اس موقف کو دوسرے مورخین جیسے جوڈتھ براؤن، کلاڈ مارکووِض اور باسودیو چٹرجی نے بھی قبول کیا ہے۔ یہ دلیل بھی پیش کی جاتی ہے کہ ابتداء سے ہی کانگریس اور سرمایہ داروں کے درمیان کچھ خاص اتحاد نہیں تھا اور مسلسل عوامی تحریک نے کاروباری طبقوں کے مفادات کو متاثر کیا۔ اس لئے، وہ قیام امن کو موقع دینا چاہتے تھے۔ لہٰذا، گاندھی پر آئینی سیاست میں واپس آنے کا دباؤ تھا جس کا نتیجہ گاندھی ارون معاہدے کی صورت میں سامنے آگیا۔ لیکن مسئلہ یہ بھی ہے کہ 1931 میں کاروباری گروہوں نے مشکل سے یکساں طبقے کی نمائندگی کی۔ اے۔ ڈی۔ ڈی۔ گورڈن کہتے ہیں کہ صنعت کاروں کا جوش عالمی بحران، بائیکاٹ اور ہڑتالوں کی وجہ سے ماند پڑ گیا تھا، اور وہ یا تو عام نافرمانی کو ختم کرنا چاہتے تھے یا پھر کانگریس اور حکومت کے درمیان امن قائم کرنا چاہتے تھے۔ اگرچہ کاروباری برادری نے تحریک کی حمایت کی، اور اس کی ابتدائی کامیابی کا سہرا حاصل کیا، لیکن وہ کبھی گاندھی پر تحریک کو واپس لینے کے لیے دباؤ ڈالنے کی حیثیت میں نہیں تھے۔ گاندھیائی کانگریس خود کو ایک چھتری تنظیم کے طور پر کام کر رہی تھی، جس میں تمام مختلف طبقات اور برادریوں کو شامل کیا جاتا تھا۔ لہٰذا، اس بات کا کوئی امکان نہیں کہ گاندھی صرف ایک مخصوص طبقے کے مفادات کو پورا کرنے کے لیے اتنا اہم فیصلہ لیں گے۔

تاہم، یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ تحریک سے دستبرداری کی سب سے بڑی وجہ کچھ نچلے طبقوں کے درمیان بنیاد پرستی اور تشدد کا ظہور تھا جنہوں نے مقامی کانگریس رہنماؤں کے کنٹرول میں رہنے سے انکار کر دیا۔ مزید برآں، تحریک بے راہ روی کی طرف بڑھ رہی تھی، عدم تشدد کے عقیدے کے خلاف جا رہی تھی اور قومی اتحاد کو پارہ پارہ کر رہی تھی۔ چنانچہ انہوں نے تحریک سے دستبرداری کا اعلان کیا اور دوسری گول میز کانفرنس میں شمولیت کے لیے انگریزوں سے سمجھوتہ کیا۔ دوسری گول میز کانفرنس (ستمبر سے دسمبر 1931 تک) ناکام ثابت ہوئی جس میں گاندھی نے امبیڈکر اور مسلم رہنماؤں کے ساتھ علیحدہ انتخابی حلقوں کے مطالبے پر تکرار کیا۔

11.7 1932 کے اوائل میں عام نافرمانی تحریک کی بازگیری

(Resumption of the Civil Disobedience Movement in Early 1932)

جب دوسری گول میز کانفرنس میں حکومت کے ساتھ مذاکرات ناکام ہوئے تو گاندھی لندن سے خالی ہاتھ واپس آ گئے۔ کانگریس نے کانفرنس کے پہلے اجلاس کا بائیکاٹ کیا تھا۔ دوسرا سیشن اقلیتوں کے معاملے پر تعطل کا شکار ہو گیا، جیسا کہ نہ صرف مسلمانوں نے بلکہ دیگر تمام اقلیتوں، جیسے اچھوت، اینگلوانڈینز، ہندوستانی عیسائیوں اور یورپیوں نے علیحدہ انتخابی حلقوں کا مطالبہ کیا، جسے گاندھی تسلیم نہ کرنے پر اٹل تھے۔ جب وہ ہندوستان پہنچ گئے، تو انہوں نے عام نافرمانی تحریک کو بحال کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس طرح، دوسری گول میز کانفرنس کی ناکامی کے نتیجے میں 1932 کے اوائل میں عام نافرمانی کی تحریک دوبارہ شروع ہوئی۔ برطانوی حکومت نے اس تحریک کو کچلنے کے لیے کئی سخت جابرانہ اقدامات اختیار کیے۔ یہ تحریک تقریباً ڈیڑھ سال تک جاری رہی۔ اپریل 1932 میں، اس تحریک کے سلسلے میں لارڈ ویلنگڈن نے بنگال اور بمبئی کو 'دوسیاہ دھبوں' کے طور پر پیش کیا۔ بنگال میں زرعی بدامنی کے ساتھ ساتھ عسکریت پسندوں کی سرگرمیاں زور و شور سے قائم تھیں۔ اس طرح، 1932-34 کے مرحلے میں جبر اور رہنماؤں کی گرفتاریوں کے باوجود کانگریس نے جدوجہد کو آگے بڑھانے کے لیے لوگوں کو حوصلہ دیا۔ اس مرحلے میں پولیس کے خلاف مزاحمت، گرفتار ستیہ گرہیوں کی رہائی، ضبط شدہ کانگریس کے آشرموں کی بحالی اور عدالت کے احاطے میں ممنوعہ نمک فروخت کرنے پر توجہ مرکوز کیا گیا۔ لیکن 1933 تک، یہ تحریک اس حد تک کمزور ہو چکی تھی کہ گاندھی کے مخلص حامی (گجراتی اور مارواڑی) بھی حوصلہ کھو چکے تھے۔ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ تاجروں اور مزدوروں نے اس تحریک سے کنارہ کشی اختیار کی۔ مسلم عوام اکثر اس تحریک کے مخالف رہے۔ شدید سرکاری جبر کے نتیجے میں کانگریس کے ہزاروں رضاکاروں کو قید کیا گیا۔ ان حالات میں، گاندھی نے مئی 1933 میں تحریک کو عارضی طور پر معطل کرنے کا فیصلہ کیا۔ اپریل 1934 میں یہ تحریک رسمی طور پر ختم کی گئی۔

11.8 عام نافرمانی تحریک کا تنقیدی جائزہ

(An Appraisal of Civil Disobedience Movement)

کانگریس کے لیے عام نافرمانی تحریک کسی بھی طرح ناکام نہیں تھی۔ 1934 تک، کانگریس نے زبردست سیاسی حمایت کو متحرک کیا، جو 1937 میں ایک زبردست انتخابی فتح میں بدل گیا۔ اگرچہ کانگریس کو تحریک واپس لینے پر مجبور کیا گیا، پھر بھی عوام میں اس کا وقار بلند رہا۔ درحقیقت، کانگریس کی عمودی اور افقی رسائی 1920 کی دہائی کے اوائل کے مقابلے میں 1930 کی دہائی میں مضبوط ہو چکی تھی۔

بعض دانشوروں کا خیال ہے کہ گاندھی اروِن معاہدے کے تحت عام نافرمانی تحریک کو معطل کرنے کا گاندھی کا فیصلہ پیچھے ہٹنا تھا، لیکن حقیقت میں ایسا نہیں تھا۔ کچھ عملی وجوہات کی بنا پر ان اقدام کی تصدیق کی گئی۔ سب سے پہلے، یہ سمجھنا ضروری ہے کہ عوامی تحریکیں لازمی طور پر قلیل المدت ہوتی ہیں اور کارکنوں کے مقابلے میں عوام کی قربانی دینے کی صلاحیت محدود ہوتی ہے۔ دوسری بات یہ کہ ستمبر 1930 کے بعد دکانداروں اور تاجروں میں تھکان کے واضح آثار نمایاں تھے۔ گاندھی نے محسوس کیا تھا کہ لوگوں کی توانائی کے وسیع ذخائر ختم

ہو گئے ہیں۔ حالانکہ، اس میں کوئی دورائے نہیں ہے کہ نوآبادیاتی حکومت نے 1932 میں ہی اس تحریک کو بے رحمی سے دبادیا تھا۔ یہ بھی سچ ہے کہ کانگریس کے بہت سے حامی خاص طور پر نوجوان کافی مایوس تھے۔ گجرات کے کسان مایوس تھے کیونکہ ان کی زمینیں فوری طور پر بحال نہیں کی گئی۔ (انہیں صوبے میں کانگریس کی وزارت کے دور میں اپنی زمینیں واپس مل گئی)۔ لیکن عوام کی بڑی تعداد بلاشبہ اس بات پر خوش تھی کہ برطانوی حکومت کو ان کی تحریک اور ان کے رہنما کو اپنے برابر سمجھنا پڑا، اس لئے، انہیں گاندھی کے ساتھ معاہدہ کرنا پڑا۔

درحقیقت، عام نافرمانی تحریک ہندوستان کی تحریک آزادی میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کا آغاز 1930 میں مہاتما گاندھی کے ڈانڈی مارچ کے ساتھ ہوا۔ اس کے بعد یہ تحریک فوری طور پر ملک کے بیشتر حصوں میں پھیل گئی۔ نوآبادیاتی حکومت نے سخت پولیس کارروائی سے مظاہرین کو منتشر کیا۔ لیکن وہ تحریک کو دبانے میں ناکام رہے۔ گاندھی اروِن معاہدے کے بعد یہ تحریک عارضی طور پر ختم کی گئی۔ تاہم 1932 میں دوسری گول میز کانفرنس کی ناکامی کے بعد تحریک کو دوبارہ شروع کیا گیا۔ آخرکار، اسے 1934 میں مکمل طور پر ختم کیا گیا۔

11.9 عام نافرمانی تحریک کے اختتام سے اگست 1942 کی قرارداد تک

(From Civil Disobedience to the August 1942 Resolution)

1934 کے آس پاس عام نافرمانی کی تحریک کے خاتمے کے نتیجے میں کانگریس کے اندر شدید اختلاف پیدا ہوا، جیسا کہ عدم تعاون تحریک سے دستبرداری کے بعد ہوا تھا۔ 1934 میں گاندھی نے عارضی طور پر فعال سیاست سے کنارہ کشی اختیار کی، اور متعدد سوشلسٹ اور دیگر بائیں بازو رہنماؤں جیسے جے پرکاش نارائن، اچیوتا پٹوردھن، اشوک مہتا، یوسف مہرالی، نریندر دیو اور منو مسانی نے کانگریس سوشلسٹ پارٹی تشکیل دی۔ سوشلزم کے لیے ان کی ہمدردی کے باوجود، نہرو نے کبھی بھی باضابطہ طور پر اس گروہ میں شمولیت اختیار نہیں کی۔ تاہم، جلد ہی کانگریس کے اندر تضاد دو مسائل پر مرکوز ہو گئی؛ ایک کونسل میں داخلہ اور دوسرا دفتر کی منظوری۔ 1937 کے انتخابات کے نتائج، جن کے لیے دائیں اور بائیں بازو نے مشترکہ طور پر مہم چلائی، کانگریس کے لیے شاندار تھے۔ کانگریس نے 1937 میں نئے حق رائے دہندوں کو استعمال کر کے الیکشن جیت لیا۔ نئے حق رائے دہندوں میں صنعتی مزدور، کسان اور کچھ دلت بھی شامل تھے۔

کسانوں کے محاذ پر ان تمام پیش رفتوں کی وجہ سے اپریل 1936 میں کانگریس کے لکھنؤ اجلاس میں آل انڈیا کسان سبھا کا قیام ہوا۔ سجانند سرسوتی کو اس تنظیم کا پہلا صدر منتخب کیا گیا۔ کانگریس سوشلسٹ پارٹی کے ممبران کی وجہ سے آل انڈیا کسان سبھا کانگریس کا حصہ رہا اور انہوں نے صوبائی کانگریس کمیٹیوں کے ساتھ قریبی تعلقات برقرار رکھے۔

اسی دور کا ایک اور اہم پہلو جہاں کانگریس کی قیادت غالب کردار ادا کرنا چاہتی تھی وہ شاہی ریاستیں تھیں۔ 1920 اور 1930 کی دہائیوں کے دوران، کانگریس نے اپنی رعایا پر روایتی حکمرانوں کے حقوق کا احترام کرتے ہوئے، شاہی ریاستوں کے معاملات میں مداخلت نہ کرنے کا انتخاب کیا تھا۔ ریاستوں کے مقامی لوگوں نے خود کو پرجامنڈلوں میں منظم کیا، آئینی تبدیلیوں اور جمہوریت کے لیے اعتدال پسند

مطالبات اٹھائے اور بعد میں 1927 میں کل ہند اسٹیٹ پیپلز کانفرنس (AISPC) کے نام سے ایک تنظیم قائم کی۔ 1930 کی دہائی کے اواخر میں، کانگریس کے بائیں بازو رہنما جیسے بوس اور نہرو نے شاہی ریاستوں میں زیادہ سے زیادہ مداخلت کی خواہش پر اصرار کیا، تاکہ انہیں برطانوی ہندوستان میں ہونے والی سیاسی پیش رفتوں کے برابر لایا جاسکے۔ دائیں بازو رہنماؤں نے بھی اب ممکنہ طور پر، جیسا کہ ایان کوپلینڈ (1999) نے کہا ہے، مجوزہ وفاقی مرکز میں اقتدار کا خواب دیکھنا شروع کر دیا۔ اس کے لیے انہوں نے شہزادوں کو پر جا منڈلوں میں اپنے قریبی لوگوں کو نامزد کرنے کا مطالبہ کیا۔ خیالات اور عزائم کے اس سنگم کے نتیجے میں 1938 میں ہاری پورہ کانگریس اجلاس میں پالیسی میں تبدیلی آئی، جہاں ریاستوں میں عوامی تحریکوں کی حمایت کے لیے ایک قرارداد منظور کی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ فروری 1939 میں، نہرو نے AISPC کی صدارت قبول کی۔ اس کے نتیجے میں، 1938 کے اواخر اور 1939 کے اوائل میں کئی شاہی ریاستوں میں عوامی تحریکیں وجود میں آگئیں۔

ستمبر 1939 میں دوسری جنگ عظیم کے آغاز کی وجہ سے ہندوستانی سیاست میں نئے تغیرات سامنے آگئے۔ جنگ نے برطانوی پالیسیوں اور کانگریس کی حکمت عملیوں میں بھی تبدیلیاں لائی۔ وائسرائے لن لتھگو نے ہندوستان کو جرمنی کے خلاف جنگ میں شامل کرنے کا اعلان کیا۔ کانگریس ورکنگ کمیٹی نے واضح کیا کہ وہ برطانیہ کی حمایت صرف اس صورت میں کریں گے، جب وہ جنگ کے بعد آزادی کا وعدہ اور مرکز میں فوری قومی حکومت مہیا کریں گے۔ لیکن 14 اکتوبر کو لنلتھگو نے جو پیشکش کی وہ کانگریس کی امیدوں سے بہت کم تھی۔ احتجاج میں کانگریس وزراء نے 29 اور 30 اکتوبر 1939 کے درمیان استعفی دے دیا۔ جناح اور مسلم لیگ نے اس دن کو "یوم نجات" کے طور پر منایا۔ اس مرحلے پر جنگ ابھی ہندوستانی اراضی سے کافی دور تھی، پھر بھی متعدد کانگریس رہنماؤں نے فاشزم کی مزاحمت کی، اور برطانوی جنگی کوششوں کی حمایت کرنے کے خواہشمند تھے، بشرطیکہ کچھ آئینی رعایتوں کا وعدہ کیا جائے۔

لہٰذا، اگست 1940 میں لن لتھگو نے غیر متعینہ مستقبل میں ڈومینین اسٹیٹس (Dominion Status) کی پیشکش، جنگ کے بعد ایک آئینی مشاورتی ادارہ، وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کی توسیع اور جنگی مشاورتی کونسل کی فراہمی کانگریس کی توقعات سے بہت کم تھی۔ اسی دوران، دسمبر 1941 سے جاپانی فتوحات نے جنگ کو ہندوستان کے قریب لایا۔ دسمبر 1941 سے مارچ 1942 کے درمیان ہانگ کانگ، بورنیو، منیلا، سنگاپور، جاوا، رنگون، ساترا اور انڈمان اور نکوبار جزائر جاپان کے قبضے میں آگئے۔ اس لئے، جنگی کوششوں کو آگے بڑھانے اور ہندوستانی حمایت حاصل کرنے کے لیے بات چیت کی فوری ضرورت پڑھ گئی۔ اس پس منظر میں، مارچ 1942 میں کرپس مشن ہندوستان بھیجا گیا۔ کرپس مشن کا مقصد یہ تھا کہ جنگ ختم ہونے کے بعد انتخابات اور مکمل خود مختاری (ڈومینین اسٹیٹس) کے وعدے کے عوض برطانوی جنگی کوششوں کے لئے ہندوستان کی وفاداری حاصل کی جائے۔

11.10 ہندوستان چھوڑو تحریک (The Quit India Movement)

سال کے وسط تک ہندوستان میں یہ خیال عام ہو گیا تھا کہ برطانوی اقتدار عنقریب ختم ہونے والا ہے اور اس لیے یہ ایک مناسب لمحہ

تھا کہ اس کے خاتمے کی جنگ لڑی جائے اور ہندوستان کو تقریباً دو سو سال کی نو آبادیاتی حکومت سے آزاد کیا جائے۔ گاندھی بھی عسکریت پسندی کے اس مقبول مزاج کو محسوس کرنے میں سست نہیں رہے اور انہیں احساس ہوا کہ برطانوی راج کے ساتھ ان کی آخری مصروفیت کا لمحہ آ پہنچا ہے۔ گاندھی نے مئی 1942 میں کہا کہ "ہندوستان کو خدا پر چھوڑ دو۔" اگر یہ زیادہ ہے تو اسے انتشار اور سیاسی افراتفری کے لئے چھوڑ دو۔ اگر مکمل لاقانونیت ہوئی تو میں اس کا خطرہ مول لوں گا۔ جولائی میں، کانگریس ورکنگ کمیٹی نے بڑے پیمانے پر عام نافرمانی کی قرارداد پاس کی۔ 8 اگست 1942 کو بمبئی میں کل ہند کانگریس کمیٹی کی طرف سے منظور کردہ "ہندوستان چھوڑو" کی قرارداد میں تجویز کیا گیا تھا کہ اگر اقتدار فوری طور پر ہندوستانیوں کے حوالے نہ کیا گیا تو گاندھی کی ہدایات کے مطابق بڑے پیمانے پر عام نافرمانی شروع کر دی جائے گی۔ اس موقع پر، گاندھی نے اپنی تقریر میں مشہور نعرہ "کرو یا مرو" پیش کیا۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ ہندوستانیوں کو آزادی حاصل کرنے کے لئے اپنی جان کی قربانی دینی ہوگی۔ گیانیندر پانڈے لکھتے ہیں کہ گاندھی نے لوگوں کو "نفسیاتی وقفہ" فراہم کیا۔ انہوں نے اس بات پر زور دیتے ہوئے کہا کہ اب سے ہر شخص کو اپنے آپ کو "آزاد" سمجھنا چاہیے، اور اگر رہنماؤں کو گرفتار کر لیا گیا تو لوگ اپنی کارروائی کا خود انتخاب کریں۔ ان کا خوف صحیح ثابت ہوا، کیونکہ گاندھی سمیت کانگریس کے تمام صف اول کے لیڈروں کو 9 اگست کی صبح کو گرفتار کر لیا گیا۔ اس کے بعد بے مثال عوامی غصہ نمودار ہوا جسے قوم پرست افسانوں میں "اگست انقلاب" کے نام سے جانا جاتا ہے۔ تحریک کی غیر معمولی شدت نے سب کو حیران کر دیا۔ وائسرائے لنلتھگو نے اسے "1857 کے بعد سے اب تک کی سب سے سنگین بغاوت کے طور پر بیان کیا۔ یہ تحریک شروع سے ہی پر تشدد اور مکمل طور پر بے قابو تھی، کیونکہ کانگریس کی قیادت کا پورا اعلیٰ طبقہ شروع ہونے سے پہلے ہی گرفتار کیا گیا۔ اور اس طرح ایک "بے ساختہ انقلاب" واقع ہوا۔

11.11 ہندوستان چھوڑو تحریک کے ظہور کے اسباب

(Reasons for Starting the Quit India Movement)

ہندوستان چھوڑو تحریک کے ظہور کے مندرجہ ذیل وجوہات تھے:

- آئینی تعطل کو حل کرنے میں کرپس مشن کی ناکامی نے ہندوستان میں آئینی پیش رفت پر برطانیہ کے رویے کو بے نقاب کیا۔
- بڑھتی ہوئی قیمتوں اور چاول، نمک، وغیرہ کی قلت کی وجہ سے عوام میں عدم اطمینان پیدا ہو گیا۔
- جنوب مشرقی ایشیا میں انگریزوں کی شکست کی خبروں اور ممکنہ برطانوی راج کے زوال نے ہندوستان میں عوامی عدم اطمینان کا اظہار کرنے کی خواہش کو بڑھا دیا۔
- جنوب مشرقی ایشیا میں جاپان کی متعدد فتوحات سے ہندوستانی رعایا کے عزائم کی حوصلہ افزائی ہوئی۔

11.12 ہندوستان چھوڑو تحریک کی نوعیت (Nature of the Quit India Movement)

اس تحریک کو ابتدائی طور پر 1942 کی عوامی عام نافرمانی کی تحریک کے طور پر پیش کیا گیا تھا۔ قوم پرست تاریخ نگاری میں اسے

انگریزوں کے خلاف 'تیسری عظیم لہر' کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔ یہ تحریک گاندھی کی طرف سے شروع کی گئی دیگر تحریکوں سے یکسر مختلف تھی۔ 22-1920 کی عدم تعاون تحریک اور 34-1930 کی عام نافرمانی تحریک کو ہندوستان میں برطانوی راج کے خلاف پرامن مزاحمت کے طور پر تصور کیا جاتا ہے۔ تاہم، 1942 کی تحریک انگریزوں کو ہندوستان سے مکمل طور پر دستبردار ہونے پر مجبور کرنے کی ایک زبردست بغاوت تھی۔ اس تحریک میں روایتی ستیہ گرہ پر نہیں بلکہ "لڑائی ختم کرنے" پر زور دیا گیا۔ اس لیے یہ ریاستی مشینری کے لیے ایک چیلنج کی نمائندگی کرتا ہے۔ مزید یہ کہ گاندھی اب فسادات اور تشدد کے لیے بھی تیار تھے۔ ان کی تیاری عوام کے مزاج کو سمجھنے پر مبنی تھی۔ 1942 کی تحریک اپنے اعلان کردہ مقاصد میں مبہم نہیں تھی۔ اس کا آغاز ہندوستان سے برطانوی اقتدار کے مکمل انخلاء کو یقینی بنانے کے لیے کیا گیا تھا۔

اس تحریک کی چار اہم خصوصیات مندرجہ ذیل ہیں:

- یہ تحریک ریاست کے خلاف تشدد کے لیے موزون تھی۔
- اس کا مقصد ہندوستان میں برطانوی راج کو ختم کرنا تھا۔
- اگر کانگریس کے لیڈروں کو گرفتار کیا جائے تو طلباء پر زور دیا گیا کہ وہ تحریک میں نمایاں کردار ادا کریں، اور اس کی قیادت کریں۔
- یہ تحریک مکمل طور پر حکومتی عملداری کے خلاف تھی۔

سرکاری اور غیر سرکاری تاریخ نویسی میں، زیادہ تر بحث تحریک کی بے ساختگی بمقابلہ تنظیم سازی اور تشدد بمقابلہ عدم تشدد کے ارد گرد گومتی ہے۔ حکومت بغاوت کی منصوبہ بندی کے الزام میں گاندھی کی مذمت کرنے کی خواہشمند تھی۔ انٹیلی جنس رپورٹوں نے کانگریس اور کانگریس سوشلسٹ پارٹی کی منصوبہ بندی کے بارے میں حکومت کو خبردار کیا ہے۔ درحقیقت، سرکاری ذرائع نے اطلاع دی تھی کہ کانگریس سوشلسٹ پارٹی کے کارکنوں نے فروری 1942 میں ایک بنیاد پرستانہ کارروائی کا عہد کیا ہے۔ اس کاروائی کو جئے پرکاش نارائن کے دیولی پلان کے نام سے جانا جاتا ہے۔ جئے پرکاش نے دیولی جیل میں یہ استدلال کیا تھا کہ اگر گاندھی ستیہ گرہ کے بجائے بنیاد پرستانہ طرز عمل کی منصوبہ بندی کریں تو قوم پرست اتحاد کو بحال کیا جا سکتا ہے۔ یہ کاغذات حکومت کے قبضے میں آ گئے اور انہیں کانگریس سوشلسٹ پارٹی کی انقلابی سازش کے ثبوت کے طور پر استعمال کیا گیا۔

استعماری تاریخ نویسوں نے کانگریس پر برطانوی حکومت کی موجودہ شکل کو مفلوج کرنے کا الزام لگایا۔ دوسری طرف قوم پرست مورخین نے بغاوت کی مرکزی سمت اور تنظیم کو نمایاں کرنے اور کانگریس کے عروج کو ظاہر کرنے کے لیے ان الزامات کی تشریح کی۔ ایک بار جب 8 اگست 1942 کو تحریک کا باقاعدہ آغاز ہوا اور مرکزی رہنما گرفتار ہو گئے تو حکومت نے اپنی توجہ بنیاد پرست پہلوؤں کی طرف مبذول کی۔ سرکاری مباحثوں میں اس تحریک کا تصور سب سے زیادہ 'غیر گاندھیائی' کے طور پر کیا گیا۔ فرانسس ہچنز (Francis Hutchins) اس تحریک کی نمائندگی 'نامکمل انقلاب' کی 'بے ساختگی' کے طور پر کرتے ہیں۔ اسے ہندوستان میں قومی تحریک کی تاریخ میں اب تک کا سب سے بڑا طوفان اور ایک پیچیدہ واقعہ کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔

دانشوروں نے 1942 کی تحریک پر توجہ مرکوز کی ہے تاکہ ملک کے مختلف حصوں میں کانگریس کی قیادت کے بارے میں سوال کیا

جا سکے۔ قوم پرست مصنفین نے یہ ثابت کیا ہے کہ 1942 میں قوم اپنے لیڈروں کے ساتھ متحد تھی۔ حالیہ دنوں میں، اسکالرز نے اس تحریک پر تحقیق کی اور ثابت کیا کہ اس نے نچلی سطح پر بھی ترقی کی۔ پال گرینو (Paul Greenough) نے مشاہدہ کیا کہ یہ تحریک ان مسائل، موضوعات اور علامتوں سے ہٹ کر تھے جو گاندھی نے بیان کیے تھے جس نے ہندوستان چھوڑو تحریک کو ایک مخصوص کردار فراہم کیا اور اس میں اندرونی تناؤ پیدا کیا۔ تاہم، گیانیندر پانڈے لکھتے ہیں کہ عوامی غصے اور عمل کو محض گاندھیائی اصولوں کے انحراف سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔

11.13 دوسری عالمگیر جنگ اور ہندوستان چھوڑ دو تحریک

(Second World War and the Quit India Movement)

40-1939 میں، سامراجی ریاست نے جنگی کوششوں کو تیز کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔ اس کے ساتھ ساتھ اتحادی طاقتوں کو جاپانی فوج کے ہاتھوں درپیش فوجی شکستوں نے اشارہ دیا کہ جاپان کے کامیاب حملے کی صورت میں برما اور ہندوستان جیسے ممالک کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا جائے گا۔ یہ احساس اس وقت مضبوط ہوا جب جاپانی افواج نے برما پر قبضہ کیا اور مشرقی بنگال میں چٹاگانگ کی سرحد سے متصل علاقے اکیاب پر پچیس بار چھاپہ مارا۔ برطانوی فوج اور بحریہ جاپانیوں کا مقابلہ کرنے میں ناکام رہی۔ 1942 کے دوران خلیج بنگال پر جاپانی فضائی اور بحری برتری نے کلکتہ، چٹاگانگ، مدراس اور ویزاگ کی مشرقی ساحلی بندرگاہوں کو بڑی حد تک ناقابل استعمال بنا دیا۔ اس طرح، ہندوستان اپنی مشرقی زمینی سرحد پر اور مشرقی سمندری حدود پر اس وقت خطرہ محسوس کر رہا تھا، جب جرمنی مغرب میں پیش قدمی کر رہا تھا۔ جنوب اور جنوب مشرقی ایشیا میں جاپانی فتوحات نے برطانوی فوجی نظام کو بے چین کر دیا تھا۔ شمال مشرقی ہندوستان کی دفاع اور جاپانیوں کی آمد کی حوصلہ شکنی کے لئے بجلی گھروں، تیل تنصیبات، وائرلیس اور ٹیلی گراف اسٹیشنوں کو تباہ کیا گیا۔ بنگال میں انکار کی پالیسی (Denial Policy)، جس میں جاپانی مداخلت کو روکنے کے لیے ملک سے چاول اور دیگر ضروری اشیاء، کشتیوں اور سائیکلوں کو نکالا گیا۔ 1940 کے بعد جنگ کی وجہ سے پٹ سن اور اناج کی قیمتوں میں بھی اضافہ ہوا۔ بنگال کے چاول اگانے والے علاقوں میں آبادی کے بڑے حصوں کی نقل و حرکت متاثر ہوئی اور کھانے پینے کی اشیاء کی فراہمی میں مزید کمی آ گئی۔ اس سے انتہائی عدم تحفظ کی صورت حال وجود میں آ گئی، اور قیاس آرائیوں اور ضروری اشیاء کی بڑے پیمانے پر ذخیرہ اندوزی کی۔ ماچس، نمک، مٹی کا تیل، سرسوں کا تیل، چینی اور چاول جیسی چیزیں گاؤں کے بازاروں سے غائب ہو گئی۔ اتحادی افواج کی ایک بڑی تعداد کے آنے کے ساتھ بڑھتی ہوئی قیمتوں اور غذائی قلت میں اضافہ ہوا۔ اس طرح فوج کو کھانا کھلانے کے لیے ملک کے غذائی ذخائر ختم ہونے کا خدشہ بے بنیاد نہیں تھا۔

11.14 1942 میں ہندوستان کی سیاسی صورتحال (Political Situation in India in 1942)

ہندوستان چھوڑو تحریک کے آغاز سے پہلے مختلف اوقات میں اور ملک کے مختلف حصوں میں کانگریس کے بہت سے رہنماؤں کے بیانات میں متضاد لہجے تھے۔ کرپس کی ناکامی کے تناظر میں گاندھی کی زبان واضح طور پر زیادہ شدت پسند تھی۔ مئی 1942 میں انہوں نے کہا

کہ "میں نے انتظار کیا اور اس وقت تک انتظار کیا جب تک کہ ملک غیر ملکی جوئے کو اتارنے کے لیے ضروری عدم تشدد کی طاقت کو تیار نہ کر لے۔ لیکن اب میرا رویہ بدل گیا ہے۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ اب میں انتظار کرنے کا متحمل نہیں ہوں...اسی لیے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ بعض خطرات کے باوجود، میں لوگوں سے کہتا ہوں کہ وہ غلامی کی مزاحمت کرے۔''

اگست 1942 کے اوائل تک تحریک شروع کرنے کی خاطر خواہ تیاریاں کی جا چکی تھیں۔ لندن نے گاندھی کے ساتھ مذاکرات شروع کرنے کا مشورہ اس وقت دیا جب اسٹافورڈ کرپس ہندوستان سے واپس چلے گئے تھے۔ تاہم، گاندھی اس مرحلے پر مذاکرات کے لیے تیار نہیں تھے۔ سیاسی بدامنی، جنگی صورتحال اور جنگ کے دوران حکومت میں کانگریس کی شمولیت سے انگریزوں کے انکار نے گاندھی کو مزید عسکریت پسند بننے پر مجبور کیا۔ اس سلسلے میں مئی 1942 میں، گاندھی نے ایک تقریر کی جس میں انہوں نے برطانیہ سے کہا کہ وہ "بھارت کو خدا پر چھوڑ دیں"۔ اگر یہ زیادہ ہے، تو اسے انتشار اور سیاسی افراتفری کے لئے چھوڑ دو۔ اگر مکمل لا قانونیت ہوئی تو میں اس کا خطرہ مول لوں گا۔ 14 جولائی کو، کل ہند کانگریس کمیٹی نے ایک قرارداد منظور کی جس میں کانگریس کے مطالبات تسلیم نہ ہونے پر عام نافرمانی کا پروگرام تجویز کیا گیا۔ اس انتباہ (ultimatum) کے ایک ماہ بعد کل ہند کانگریس کمیٹی کا اجلاس 7 اگست 1942 کو بمبئی کے گووالیا ٹینک میدان میں شروع ہوا۔ جنگ کی غیر یقینی صورتحال کی وجہ سے پیدا ہونے والے خدشات نے گاندھی کو اپنی تقریر میں یہ کہنے پر مجبور کیا کہ انہیں یقین نہیں تھا کہ برطانیہ ہار جائے گا، لیکن اگر وہ شکست کھا گئے تو وہ ہندوستان میں زرعی پیداوار اور املاک کو تباہ کر دیں گے، جیسا کہ انہوں نے برما اور ملایا میں کیا تھا۔ 8 اگست 1942 کو 'ہندوستان چھوڑو' قرارداد کو بالآخر منظور کر لیا گیا۔ گاندھی نے اپنی تقریر کے آخر میں کہا:

> یہ ایک مختصر منتر ہے، جو میں آپ کو دیتا ہوں۔ آپ اسے اپنے دلوں پر چھاپ لیں، اور اپنی ہر سانس میں اس کا اظہار کریں۔ منتر یہ ہے: 'کرو یا مرو'۔۔۔۔۔ ہم یا تو ہندوستان کو آزاد کریں گے یا اس کوشش میں اپنی جان قربان کریں گے۔ ہم اپنی غلامی کے دوام کو دیکھنے کے لیے زندہ نہیں رہیں گے۔ ہر سچا کانگریسی ملک کو غلامی میں دیکھنے کے لیے زندہ نہ رہنے کے اٹل عزم کے ساتھ جدوجہد میں شامل ہوگا۔ آپ خدا اور اپنے ضمیر کو گواہ بنا کر عہد کریں کہ آپ آزادی حاصل کرنے تک آرام نہیں کریں گے اور اس کے حصول کی کوشش میں اپنی جانیں قربان کرنے کے لیے تیار رہیں گے۔ جو اپنی جان کھو دے گا، وہ اسے حاصل کر لے گا۔ جو اسے بچانے کی کوشش کرے گا، وہ اسے کھو دے گا۔

برطانوی حکومت ہند کانگریس کی قیادت کو بے اثر کرنے کے لیے پر عزم تھی۔ اس طرح، 8 اگست 1942 کو 'ہندوستان چھوڑو' قرارداد کی منظوری کے چند گھنٹوں اندر کانگریس ورکنگ کمیٹی کی پوری قیادت کو گرفتار کر کے مختلف جیلوں میں لے جایا گیا۔ اگلے دن، گاندھی، نہرو اور انڈین نیشنل کانگریس کے بہت سے دوسرے رہنماؤں کو برطانوی حکومت نے گرفتار کر لیا۔ اس سے ملک کے مختلف حصوں میں تحریک کے پھیلاؤ کا آغاز ہوا۔

9 اگست کو دیگر لیڈروں کے ساتھ گاندھی کو گرفتار کر لیا گیا۔ لیکن ابھی بھی کچھ کانگریسی جیسے مولانا آزاد، صادق علی، دھیا بائی پٹیل، پیارے لال نائر، رام موہر لوہیا، اچیوت پٹوردھن اور سچیتا کرپلانی آزاد تھے۔ ان افراد نے بمبئی میں ایک بارہ نکاتی پروگرام تشکیل دیا۔ کہا جاتا

ہے کہ یہ بارہ نکاتی پروگرام کانگریس لیڈروں نے گاندھی کی ہدایات کے تحت 9 اگست سے پہلے تیار کیا تھا۔اس کا آغاز ہڑتال کی کال کے ساتھ ہوا اور اس میں عدم تشدد، عدم تعاون اور عام نافرمانی کے تمام طریقوں کو شامل کیا گیا۔مزید برآں،اس میں نمک کے قانون کی خلاف ورزی، غیر ملکی کپڑوں کا بائکاٹ، شراب کی دکانوں کے سامنے دھرنا دینا،مزروروں کا ہڑتال، ٹیکس کی عدم ادائیگی اور متوازی حکومت کا قیام شامل ہیں۔یہ نکات کانگریس لیڈروں کی گرفتاری کے فوراًبعد 9 سے 11 اگست کے درمیان لوگوں میں پھیلا دیۓ گئے۔

11.15 تحریک کے علاقائی پہلو (Regional Aspects of the Movement)

ہندوستان چھوڑو تحریک کے دو اہم مراحل تھے۔ایک ابتدائی عوامی تحریک کا مرحلہ جو اگست سے ستمبر تک جاری رہا،اور دوسرا طویل نیم گوریلا بغاوت کا مرحلہ۔ بمبئی میں 14-9 اگست تک اور کلکتہ میں 17-10 اگست تک ہڑتال جاری رہی۔کانپور، لکھنؤ اور ناگپور میں ہڑتالیں ہوئی اور دہلی میں مزدوروں کے ساتھ پر تشدد جھڑپیں ہوئیں۔پٹنہ میں، 11 اگست کو سکریٹریٹ کے سامنے جھڑپوں کے بعد پولیس دو دن تک شہر پر تقریباً مکمل طور پر کنٹرول کھو بیٹھی۔اس کے بعد، آزاد اور سرگرم کارکن شہروں سے نکل کر دیہی علاقوں میں بغاوت میں شامل ہو گئے۔اشتعال انگیز زیر زمین اشاعتوں کی وجہ سے لوگوں کی شرکت میں اضافہ ہوا۔جب کانگریس کی پوری قیادت کو قید کیا گیا اور ان کے دفاتر، اثاثے اور پرنٹنگ پریس ضبط کر لیے گئے؛ اس وقت ہندوستان کی متعدد زیر زمین اشاعتوں جیسے *Bombay Provincial Bulletin*، *Free India*، *War of India Bulletin*، *Do or Die News-sheet*، *Free State of India Gazette*، اور *Congress Gazette* نے تحریک کو مقبولیت بخشنے میں اہم کردار ادا کیا۔

9 اگست 1942 کے بعد زیادہ تر جگہوں پر تحریک دو سے چار ہفتوں میں زوال پذیر ہوگئی، کیونکہ فوج اور پولیس نے جبر کے ذریعے ان سرگرمیوں کو کچل دیا تھا۔اس کے نتیجے میں تحریک کی رہنمائی کرنے والے قائدین لوگوں میں بغاوت کے جذبے کو مستحکم کرنے میں ناکام رہے۔ لیکن تحریک کے پھیلاؤ اور شدت نے برطانوی حکومت کو حیران کر دیا۔ حکومت کی انٹیلی جنس مشینری حکام کو تحریک کی ممکنہ حد کے بارے میں خبردار کرنے میں ناکام رہی تھی۔ اس طرح بغاوت کے پہلے دو ہفتوں کے دوران متحدہ صوبوں، بہار، بنگال، اڑیسہ، مرکزی صوبوں، مہاراشٹر اور مدراس پریزیڈنسی کے کچھ حصوں میں حکومت عملی طور پر ناکام ہو گئی۔

مغربی ہندوستان میں اگست 1942 میں یہ تحریک آہستہ آہستہ پھیل رہی تھی۔ لیکن جوں جوں اس نے زور پکڑ لیا، یہ تحریک 1943 تک جاری رہی۔ مشرقی خاندیش، ستارا، بروچ اور سورت جیسے اضلاع میں کسانوں کی بڑی تعداد نے گوریلا طرز سے سرکاری املاک، مواصلاتی نظام اور برطانوی حکومت کے ہمدردوں پر حملے کیے۔ پونے، احمد نگر اور احمد آباد جیسے شہروں میں بھی قابل ذکر احتجاج ہوا۔ مغربی ہندوستان نے بھی بم دھماکوں اور تخریب کاری کی سرگرمیوں میں پیش قدمی کی۔ اگست 1942 سے جنوری 1944 تک ہندوستان میں ریکارڈ کیے گئے 664 بم دھماکوں میں سے تقریباً 76 فیصد بمبئی پریزیڈنسی میں ہوئے تھے۔ احمد آباد، بڑوڈا، سورت، کھیڑا اور جمبوسر کانگریس کے مضبوط اڈے تھے۔ تحریک کے نقطہ نظر سے گجرات ویایم پرچارک منڈل (Gujarat Society For the

(Propagation of Physical Training)ایک اہم گروہ تھا۔ اس کے لیڈر، چھوٹو بھائی پرانی کا تعلق انتہا پسند قوم پرست تنظیموں سے تھا۔ بعد میں وہ گاندھیائی کانگریس کے ایک سرگرم رکن بن گئے تھے۔ لیکن انہوں نے کبھی بھی عدم تشدد کے اصول کو مکمل طور پر قبول نہیں کیا تھا۔ انہوں نے پورے گجرات میں جمنازیم کا ایک نیٹ ورک قائم کیا تھا جس میں نوجوانوں کو سکھایا گیا کہ وہ انگریزوں سے لڑنے کے لیے اپنے جسم اور دماغ کو تیار کریں۔ یہ نوجوان زیادہ تر برہمن، بنیا، پتی دار، متوسط اور خوشحال دیہی گھرانوں سے وابستہ تھے۔ گاندھی نے ان سرگرمیوں کی جزوی طور پر منظوری دے دی کیونکہ چھوٹو بھائی پرانی نے اپنے جمنازیم میں دائیں بازو کے ہندو اور مسلم مخالف جذبات کی حوصلہ شکنی کی۔ 1942 میں گجرات میں نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد موجود تھی جو ذہنی اور جسمانی طور پر انگریزوں کے خلاف پر تشدد جدوجہد کے لیے تیار تھے۔ اسی اشتعال انگیز ماحول میں کانگریس لیڈروں نے ہندوستان چھوڑدو تحریک کا آغاز کیا جس میں ولبھ بھائی جیسے رہنما نے لوگوں کے پر تشدد مزاج کی حمایت کی، جبکہ مورار جی دیسائی نے زیادہ محتاط رویہ اختیار کیا کیونکہ ان کا ماننا تھا کہ گاندھی کے عدم تشدد فلسفے کو ختم کر دیا جائے گا اگر عوامی تشدد کی حوصلہ افزائی کی گئی۔

ملک کے تقریباً تمام بڑے شہروں کی ایک جیسی کہانی تھی۔ جیسے ہی گاندھی کی گرفتاری کی خبر پھیل جاتی تھی، مزدور اپنے اوزار گرا دیتے تھے، تاجر اپنی دکانیں بند کرتے تھے، طلباء اپنے اسکول اور کالج چھوڑ کر چلے جاتے تھے، اور بڑی بھیڑ سڑکوں پہ جمع ہو جاتی تھی۔ احمد آباد میں، ہجوم نے پولیس اہلکاروں اور نوآبادیاتی ثقافت کی علامت والی شمسی ٹوپی (solar hat) پہننے والے ہر شخص کو نشانہ بنایا۔ 10 اگست کو تقریباً 2000 طلباء نے جلوس نکالا۔ جب پولیس نے لاٹھی چارج سے اسے توڑنے کی کوشش کی تو طلباء نے جوابی کاروائی میں پولیس پر اینٹیں پھینکی۔ اسی طرح، پولیس کے ساتھ مظاہرے اور جھڑپیں مزید دو ہفتوں تک ایک اونچی سطح پر جاری رہیں۔

کھیڑا میں 11 سے 19 اگست کے درمیان پولیس کے ہاتھوں کل دس افراد مارے گئے۔ کھلے عام جھڑپوں کے علاوہ ٹیلی گراف تاروں کی کٹائی اور عوامی املاک پر توڑ پھوڑ کی گئی۔ روجر لوملی (بمبئی کے گورنر 43-1937) کے مطابق، اگست کے دوران کھیڑا بمبئی پریذیڈنسی کا سب سے زیادہ پریشان کن ضلع رہا۔ ریاست بڑودہ میں، 17 اگست تک اعتدال پسند پرجامنڈل کے رہنماؤں کو عوامی دباؤ کے ذریعے مجبور کیا گیا کہ وہ ہندوستان چھوڑو تحریک کی حمایت کا اعلان کریں۔ 18 اگست کو جب تنظیم پر پابندی لگائی گئی اور رہنماؤں کو گرفتار کیا گیا تو ہنگامہ خیز مظاہرے ہوئے۔ ان مظاہروں میں مسلمان غیر حاضر رہے، جو احمد آباد کی آبادی کا بیس فیصد اور بڑودہ کی آبادی کا پندرہ فیصد حصہ تھا۔ 1937 سے یہاں مسلم لیگ کی شاخوں کے قیام کے بعد سے مسلمانوں کے کافی طبقات کی سیاسی وفاداریوں میں ایک واضح تبدیلی آگئی تھی۔

گجرات میں ہندوستان چھوڑدو تحریک سماجی طور پر زیادہ بنیاد پرست نہیں تھی۔ اس کے باوجود احمد آباد میں ایک ہی کامیاب متوازی حکومت (آزاد حکومت) قائم ہوئی۔ اس نے موجودہ انتظامی مشینری کو ہر میونسپل وارڈ کے زیرزمین رہنما تک پہنچانے کی کوشش کی۔ اس نے احتجاجی مظاہروں کا اہتمام کیا، ٹیکس لگائے، رسالوں میں معلومات جاری کی، جاسوسوں کے نیٹ ورک کو منظم کیا اور متعدد پولیس والوں کو سزا دی۔ اس متوازی حکومت نے شہر کے ہندو متوسط طبقے سے اپنی قانونی حیثیت حاصل کی۔ دیہی علاقوں میں ایسی حکومتیں قائم کرنے کی کوئی

کوشش نہیں کی گئی۔ڈیوڈ ہارڈیمن کے مطابق، صرف جنوبی گجرات کے آدیواسی علاقوں میں بنیاد پرست تحریک کے اشارے مل رہے ہیں، کیونکہ وہاں جدوجہد کا رخ بنیادی طور پر ساہوکاروں، پارسی زمینداروں اور شراب فروشوں کے خلاف تھا۔اس طرح، ہندوستان چھوڑو تحریک نے گجرات پر گاندھیائی کانگریس کی گرفت مضبوط کی۔ 1944 میں کانگریس نے اسی سال گجرات کے مقامی انتخابات میں بھاری اکثریت سے کامیابی حاصل کی۔

دیگر جگہوں کی طرح بہار اور مشرقی متحدہ صوبوں میں، 1942 کے فسادات سب سے پہلے شہروں میں واقع ہوئے۔ جیسا کہ میکس ہارکورٹ کہتے ہیں کہ 8 سے 10 اگست کے درمیان متعدد شہروں میں شدید فسادات ہوئے،اس کے بعد یہ سلسلہ دیہی علاقوں میں بھی شروع ہوا۔ مسلح دیہاتیوں کا بڑا ہجوم ضلع اور تحصیل کی سطح کے انتظامی مراکز، پولیس چوکیوں اور مقامی عدالتوں پر حملہ کرتے تھے۔ دکانوں، گوداموں اور رہائش گاہوں کو لوٹنے کے واقعات بھی پیش آئے۔ مشرقی متحدہ صوبوں کے گاؤں بھومیہار برہمن کسانوں یا راجپوت برہمن کسانوں کے قبضے میں تھے، جنہوں نے 1942 کی تحریک میں اہم کردار ادا کیا تھا۔

بہار میں زیر زمین تحریک بہت مضبوط ہوئی، جس نے 44-1942 تک برطانیہ کے لیے امن وامان کے مسائل پیدا کیے تھے۔ سخت جبر کے باوجود 1943 تک بہار کے مختلف حصوں میں کئی انقلابی تنظیمیں قائم ہوگئی۔ان میں سے بہت سے گروہوں کا تعلق کانگریس سوشلسٹ پارٹی سے تھا۔انہوں نے چھوٹے سوشلسٹ "آزاد دستے" قائم کئے، اور کانگریس کے نام پر سرگرمیاں انجام دیں۔ ونیتا دامودرن نے ان ڈاکو گروہوں کو ایرک ہوبسبوم کے 'سماجی ڈاکوؤں' سے تشبیہ دی اور مشاہدہ کیا کہ وہ گاؤں کی آبادی کے تعاون سے دیہی علاقوں میں گھومتے رہے، اور 1942 سے 1944 کے درمیان سیاسی خلا کو پر کیا۔

بنیادی طور پر غذا کی قلت کو پورا کرنے کے لئے ڈکیتیوں میں اضافہ ہوا۔ لیکن ڈاکخانوں، سرکاری خزانوں اور گولہ بارود کے ڈپو کو بھی لوٹنے کی کوشش کی گئی۔ یہ حرکتیں اکثر 'گاندھی کی جے' کے نعروں کے ساتھ ہوتی تھیں۔ دربھنگہ میں، مقامی زمیندار کے دفتر پر حملے کا اہتمام کانگریس سوشلسٹ پارٹی کے رہنما سورج نارائن سنگھ نے کیا تھا جس نے نیپال میں مسلح سرگرمیوں کی تربیت حاصل کی تھی۔ بھاگلپور میں، سیتارام سنگھ کی قیادت میں ڈاکو گروہوں کو دیہاتیوں کے ہاتھوں وسیع حمایت ملی۔ جے پرکاش نارائن نومبر 1942 میں نیپال کی جیل سے فرار ہوگئے، اور ایک اور رام منوہر لوہیا کی مدد سے نیپال کی سرحد پر ایک متوازی حکومت قائم کی، جو 1944 تک قائم رہی۔

مشرقی بنگال میں یہ تحریک قصبوں اور شہروں تک محدود تھی۔ یہاں قوم پرستی کا پروپیگنڈہ کافی شدید تھا۔ ٹرین سفر کے خلاف وارننگ 'ریل بھرمان بپاد جانک' (ٹرین کا سفر خطرناک ہے) جیسے کتابچوں کی تشہیر کی گئی، جس نے روزمرہ کے مواصلات کو متاثر کیا۔ دیگر کتابچے جیسے "ہم جنگ میں غیر جانبدار کیوں ہیں؟" دوسری جنگ عظیم میں کانگریس کی پوزیشن کی وضاحت کرتے ہیں۔ میمن سنگھ کے پرچوں نے یہ پروپیگنڈا عام کیا کہ راش بہاری بوس کی سربراہی میں ہندوستانی سپاہیوں نے امپھال پر قبضہ کرلیا ہے اور سبھاش چندر بوس برما میں ہیں اس لمحے کا انتظار کررہے ہیں کہ وہ 10,000 کی فوج کے ساتھ بنگال پر حملہ کریں۔

بنگال کے مدینی پور میں عدم تعاون کی تحریک کے دنوں سے کانگریس کی جڑیں مضبوط تھی۔ 1942 میں بڑھتی ہوئی کشیدگی کے درمیان، مدینی پور میں سب سے اہم پیش رفت ایک متوازی حکومت کی تشکیل تھی جس کا نام "مہابھارت یوکتاراشٹر: تمرالیپتا جاتیہ سرکار" تھا۔ یہ حکومت 1944 تک کام کرتی رہی۔ اس کے بعد ہونے والے جبر نے اسّی سالہ سیاسی کارکن متنگینی ہزارا کی جان لے لی، جو 29 ستمبر 1942 کو لاٹھی چارج میں ماری گئی۔ ستارا انیسویں صدی کے اواخر میں مصلح جیوتیبا پھولے کے ذریعہ قائم کردہ ستیہ شودھک سماج نے ہندوستان چھوڑو تحریک کو اہم طاقت فراہم کی۔ یہاں کے کسان 1930 کی دہائی میں قوم پرست تحریک میں شامل ہو چکے تھے جس کا کانگریس یا بائیں بازو سے شاید ہی کوئی تعلق تھا۔ پھر بھی گاندھی، گیل اومیڈٹ کے مطابق، سب کے لیے ایک اہم علامت تھے۔

11.16 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

اس اکائی میں عام نافرمانی تحریک (34-1930) اور ہندوستان چھوڑو تحریک (1942) کا تاریخی اور تنقیدی پہلو بیان کیا جائے گا۔ اس کے علاوہ، اس میں گاندھی کی قیادت میں مربوط سامراجیت مخالف تحریک کی اہمیت کا جائزہ لیا جائے گا۔ عام نافرمانی تحریک (-1930 34) نے عدم تعاون (22-1920) تحریک کے مقابلے سامراجیت مخالف جدوجہد کی سماجی رسائی کو وسیع کرنے میں ایک واضح پیش رفت کی۔ 1934 میں عام نافرمانی کی تحریک کے خاتمے کے نتیجے میں کانگریس کے اندر شدید اختلافات پیدا ہوئے۔ جب گاندھی نے عارضی طور پر فعال سیاست سے کنارہ کشی کی، جس کی وجہ سے کانگریس سوشلزم سے متاثر ہونے لگا۔ 1937 کے انتخابات کے بعد، گاندھی نے عدم تشدد اور تعمیری پروگرام کی عمل آوری میں اپنا اعتماد ظاہر کیا۔ 1930 کی دہائی کے اواخر میں، رجواڑہ ریاستوں میں مداخلت کی گئی، تاکہ انہیں برطانوی ہندوستان میں ہونے والی سیاسی پیش رفتوں کے برابر لایا جا سکے۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران اگست تجاویز (1940) اور کرپس مشن (1942) نے کانگریس کی امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ اس تناظر میں اگست قرارداد پاس ہوئی، اور ہندوستان چھوڑو تحریک شروع کی گئی۔

ہندوستان چھوڑو تحریک کو بجا طور پر سب سے بڑی سامراجیت مخالف جدوجہد کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔ اس تحریک نے 1942 کے بعد آنے والے پانچ سالوں میں ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں بے مثال اور ہنگامہ خیز واقعات پیدا کیے۔ حالیہ تحقیق نے دلیل پیش کی ہے کہ ہندوستان چھوڑو تحریک کو بنیادی طور پر اس لیے نظر انداز کیا گیا ہے کیونکہ اس میں کسی بھی بڑی سیاسی پارٹی نے مرکزی کردار ادا نہیں کیا۔ یہ بنیادی طور پر ذیلی طبقات کی تحریک تھی۔ اگر اس تحریک میں اشراف طبقے کے کردار کا غلبہ ہوتا، تو یہ تحریک قدامت پسندی سے متاثر ہوتی۔ متعدد حوالوں کے مطابق اس تحریک میں روایتی قیادت کی غیر موجودگی میں پسماندہ طبقوں نے اپنی قابلیت کا ثبوت دیا۔

ہندوستان چھوڑو تحریک ہندوستان میں برطانوی راج کو ختم کرنے میں ناکام رہی۔ اس کے باوجود، یہ ایک ایسی تحریک تھی جس نے سامراجی حکام کی زبردستی کا مقابلہ کرنے کے لیے ہندوستانیوں کی متنوع برادریوں کی خواہش کا مظاہرہ کیا۔ ہندوستان چھوڑو تحریک اس جذبے اور جوش کے لحاظ سے پہلے کی تحریکوں سے الگ تھی کیونکہ اس نے دیسی اداروں کی حمایت کے لیے عام لوگوں کو استعمال کیا۔ اس کے علاوہ، متوازی حکومتوں کا قیام اس تحریک اور دیگر تحریکوں میں فرق کی نشاندہی کرتی ہیں۔ عدم تعاون تحریک شہری بنیادوں پر کھڑی تھی اور اس کی

حمایت زیادہ تر امیر کسان گروہوں نے کی۔ اس کے مقابلے میں عام نافرمانی تحریک زیادہ وسیع تھی۔ اس میں بہت سے غریب کسانوں سے شمولیت اختیار کی، لیکن یہ تحریک مالی بحران کی وجہ سے بنیاد پرست بن گئی۔ ہندوستان چھوڑو تحریک، جیسا کہ گزشتہ بحث سے ظاہر ہوتا ہے، ان تحریکوں میں سب سے زیادہ بنیاد پرست اور پر تشدد تحریک تھی۔ اس کی حمایت غریب اور مزدور طبقے نے کی، جو جنگ کے وقت مہنگائی اور خوراک کی قلت سے متاثر ہوئے تھے۔

11.17 کلیدی الفاظ (Keywords)

Dominion	:	ڈومینین برطانوی سلطنت کی کئی خود مختار ریاستوں میں سے کوئی ایک تھی۔ برطانوی سلطنت کے کامن ویلتھ آف نیشنز میں ارتقاء کے ساتھ ہی یہ ڈومینین آزاد ریاستیں بن گئی۔
مزاحمت	:	(Resistance) ایسی صورتحال جس میں لوگ یا تنظیمیں کسی چیز کے خلاف لڑتی ہیں یا کسی چیز کو قبول کرنے یا تبدیل کرنے سے انکار کرتی ہیں۔
تنظیم	:	(Organisation) لوگوں کا ایک گروہ جو مشترکہ مقاصد کے لیے منظم طریقوں سے مل کر کام کرتے ہیں۔
سوراج	:	سوراج کا مطلب خود حکمرانی ہے۔ یہ ایک سیاسی نقطہ نظر تھا جو عویدار قوم پرستوں نے اپنایا تھا۔
عام نافرمانی	:	عام نافرمانی کا مطلب پرامن طریقے سے کسی قانون، ضابطے یا کسی طاقت کو ماننے سے انکار کرنا ہے۔

11.18 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

11.18.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Very Short Answer Type Questions)

1. گیارہ نکاتی پروگرام کس نے پیش کیا گیا؟
2. ڈانڈی مارچ کس تاریخ پہ شروع ہوا؟
3. کانگریس سوشلسٹ پارٹی کب قائم کی گئی؟
4. کانگریس سوشلسٹ پارٹی کے معروف رہنماؤں کے نام بتایئے؟
5. 1929 میں انڈین نیشنل کانگریس کے اجلاس کی صدارت کس نے کی؟
6. دوسری عالمگیر جنگ کب شروع ہوئی؟
7. اگست قرارداد کب پاس کی گئی؟
8. کرپس مشن (Cripps Mission) کب ہندوستان میں آ گیا؟
9. پرتی سرکار (Prati Sarkar) سے آپ کیا سمجھتے ہیں؟

MAULANA AZAD NATIONAL URDU UNIVERSITY

.10 آزاد ہند فوج کا قیام کب عمل میں آیا؟

11.18.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

.1 عام نافرمانی اور ہندوستان چھوڑدو تحریک کی کامیابیوں اور ناکامیوں کا تجزیہ کریں۔

.2 عام نافرمانی تحریک کے تاریخی پس منظر پر روشنی ڈالئے۔

.3 عام نافرمانی تحریک کے آغاز کے ذمہ دار عوامل بیان کیجیے۔

.4 ہندوستان چھوڑو تحریک کی نوعیت پر بحث کیجیے۔

.5 سنہ 1942 میں ہندوستان کی سیاسی صورتحال پر تبصرہ کیجیے۔

11.18.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

.1 عام نافرمانی تحریک سے متعلق عوامی ردعمل اور علاقائی رجحانات پر بحث کیجیے۔

.2 ہندوستان چھوڑو تحریک کے علاقائی پھیلاؤ کی وضاحت کریں۔

.3 وہ کون سے فوری عوامل تھے جن کی وجہ سے ہندوستان چھوڑو تحریک شروع ہوئی؟

11.19 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Learning Resources)

1. Bandhopadhyay, Sekhar, *From Plassey to Partition: A History of Modern India*, Orient Longman Private Limited, 2004.
2. Banerjee-Dube, Ishita, *A History of Modern India*, Cambridge University Press, 2014.
3. Brown, Judith, *Gandhi's Rise to Power: Indian Politics, 1915–1922*, Cambridge University Press, 1972.
4. Chandra, Bipan et al., *India's Struggle for Independence*, Penguin, New Delhi, 2000.
5. Gandhi, Rajmohan, *Mohandas: A True Story of a Man, His People and an Empire*, Penguin, New Delhi, 2006.
6. Gordon, L.A., *Bengal: The Nationalist Movement 1876–1940*, Columbia University Press, New York, 1974.
7. Grover and Grover, *A New Look at Modern Indian History*, S Chand & Company Limited, New Delhi, 1983.
8. Guha, Ramachandra, *Gandhi: The Years that Changed the World, 1914–1948*, Penguin, Gurgaon, 2006.
9. Hardiman, David, *Gandhi: In His Times and Ours*, Permanent Black, Delhi, 2003.
10. Lelyveld, Joseph, *Great Soul: Mahatma Gandhi and His Struggle with India*, HarperCollins, New Delhi, 2011.
11. Metcalfe, Barbara D., *A Concise History of Modern India*, Cambridge University Press, New York, 2006.
12. Sarkar, Sumit, *Modern India, 1885–1947*, Macmillan, New Delhi, 1982.

اکائی 12۔امبیڈکراوردلت تحریکیں

(Ambedkar and Dalit Movements)

اکائی کے اجزا

12.0 تمہید
12.1 مقاصد
12.2 ابتدائی زندگی
12.3 تعلیم
12.4 چھوا چھوت کے خلاف جدوجہد
12.4.1 منواسمرتی نذرآتش کرنا
12.4.2 کالارام مندرستیہ گرہ
12.5 مذہب کی تبدیلی کا اعلان
12.5.1 بدھ مت میں تبدیلی مذہب
12.6 پونا معاہدہ
12.7 گاندھی کے ساتھ تعلقات اور نظریاتی اختلاف
12.8 سیاسی زندگی
12.8.1 امبیڈکراورہندوستان کی جدوجہد آزادی
12.8.2 آئین سازی
12.8.3 دفعہ 370 کی مخالفت
12.8.4 یکساں سول کوڈ کی حمایت
12.8.5 اقتصادی منصوبہ بندی
12.9 امبیڈکر کی صحافت
12.10 امبیڈکر کا ادب

12.11 علالت، دوسری شادی اور انتقال
12.12 اکتسابی نتائج
12.13 کلیدی الفاظ
12.14 نمونہ امتحانی سوالات
12.8 تجویز کردہ اکتسابی مواد

12.0 تمہید (Introduction)

عزیز طلباء! آداب۔ چاہے آپ ہندوستان میں کسی شہر سے تعلق رکھتے ہوں یا دیہات سے، آپ کو اپنی زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پر یا شاید ہر روز ایک ایسے شخص کا مجسمہ نظر آتا ہوگا جو مغربی سوٹ میں ملبوس ایک ستون پر کھڑا ہے۔ وہ بائیں ہاتھ میں کتاب پکڑے ہوئے ہے اور اس کی شہادت کی انگلی عوام کی طرف اٹھی ہوئی ہے۔ شاید آپ جانتے ہوں گے کہ یہ ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر کی تصویر ہے، جنہیں پیار سے بابا صاحب امبیڈکر کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ آج، ان کے مجسمے ہر جگہ اور دلتوں کی کالونیوں میں پائے جاتے ہیں، جن کے لیے خاص طور پر انہوں نے ساری زندگی ذات پات کی قدامت پسند طاقتوں سے جنگ جاری رکھی۔ ایک اندازے کے مطابق، اب تک ان کی مجسمے تعداد میں مہاتما گاندھی کی تصویروں سے کہیں زیادہ ہو چکے ہیں۔ آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ آج کوئی بھی شخص، خصوصاً مختلف سیاسی جماعتیں اور سیاسی و سماجی تنظیمیں انہیں، ان کے پیغام اور ان کے ذریعے چلائی گئی تحریک کو نظر انداز کرنے کی جرأت نہیں کر سکتیں۔ وہ نہ صرف ہندوستان میں بلکہ بیرونی ممالک میں بھی عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی انہیں غیر متزلزل مزاحمت اور انسانی وقار کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ انہیں جدید ہندوستان میں پیدا ہونے والے قد آور اور بااثر دانشوروں میں سے ایک کا درجہ دیا گیا ہے۔ کیا آپ نے غور کیا کہ کیوں وہ نہ صرف اپنی زندگی میں بلکہ اپنی موت کے اتنے سالوں بعد بھی اس قدر اہمیت کے حامل ہیں اور آئندہ بھی رہیں گے؟ انہوں نے ایسا کیا کارنامہ انجام دیا کہ لاکھوں لوگ انہیں بابا صاحب (معزز باپ) کے نام سے یاد کر رہے ہیں؟ یہ اکائی آپ کو ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں اور ان کی کثیر جہتی حصولیابیوں کو جاننے میں مدد کرے گی۔

بھیم راؤ رام جی امبیڈکر (14 اپریل 1891 – 6 دسمبر 1951)، جو ڈاکٹر بابا صاحب امبیڈکر کے نام سے مشہور ہیں، ایک عظیم ہندوستانی ماہر اقتصادیات، سیاست دان اور سماجی مصلح تھے۔ انہوں نے 'دلت بدھ تحریک' کو متاثر کیا اور اچھوتوں (دلتوں) سے سماجی بھید بھاؤ کے خلاف مہم چلائی۔ مزید برآں انہوں نے مزدوروں، کسانوں اور خواتین کے حقوق کے لیے بھی آواز بلند کی۔ وہ آزاد ہندوستان کے پہلے 'وزیر برائے قانون و انصاف' اور ہندوستانی آئین کے موسس اور جمہوریہ ہند کے معماروں میں سے ایک تھے۔ امبیڈکر بے پناہ صلاحیتوں کے حامل طالب علم تھے۔ انہوں نے کولمبیا یونیورسٹی (Columbia University) اور لندن اسکول آف اکنامکس (London School of Economics) دونوں سے معاشیات میں ڈاکٹریٹ کی ڈگریاں حاصل کیں اور قانون، معاشیات اور سیاسیات میں بھی

تحقیقی کام انجام دیے۔اپنی پیشہ ورانہ زندگی کے ابتدائی حصے میں وہ معاشیات کے پروفیسر رہے اور کچھ دن وکالت کی بھی مشق کی اور بعد کی زندگی کا زیادہ تر حصہ سیاسی سرگرمیوں میں گزارا۔ بعد ازاں امبیڈکر ہندوستان کی آزادی کی مہم اور اس سے متعلق مباحثوں میں شامل ہو گئے اور رسالے شائع کر کے دلتوں کے سیاسی حقوق اور سماجی آزادی کی وکالت کی۔ ہندوستان کی تعمیر میں ان کا نمایاں حصہ تھا۔ہندو فرقے میں رائج بری رسموں اور چھوا چھوت کے رواج سے تنگ آکر انہوں نے 1951 میں بدھ مذہب اختیار کر لیا۔1990 میں، انہیں بعد از مرگ بھارت رتن سے نوازا گیا، جو ہندوستان کا سب سے بڑا شہری اعزاز ہے۔ان کا یوم پیدائش 14 اپریل کو ہندوستان سمیت دنیا بھر میں امبیڈکر جینتی کے طور پر منایا جاتا ہے۔

12.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- امبیڈکر کی ابتدائی زندگی اور تعلیم و تربیت کے بارے میں جانیں گے۔
- امبیڈکر کی چھوا چھوت اور ذات پات کی تفریق کے خلاف جدوجہد سے واقف ہوں گے۔
- امبیڈکر کی تبدیلی مذہب اور بدھ مذہب میں داخلے کے اسباب و نتائج سے واقف ہو سکیں گے۔
- امبیڈکر کی سیاسی زندگی، پونا معاہدے اور گاندھی سے تعلقات اور اختلافات کا تجزیہ کر سکیں گے۔
- امبیڈکر کی صحافت اور ان کے ادب کی جانکاری حاصل کر سکیں گے۔

12.2 ابتدائی زندگی (Early Life)

امبیڈکر 14 اپریل 1891 کو برطانوی ہندوستان میں مرکزی صوبجات (مدھیہ پردیش) میں واقع مہو (Mhow) شہر کی فوجی چھاؤنی میں پیدا ہوئے۔ وہ رام جی مالوجی سکپال اور بھیما بائی کے 14 ویں اور آخری بیٹے تھے۔1896 میں جب امبیڈکر پانچ سال کے تھے، ان کی والدہ کا انتقال ہو گیا، اس لیے ان کی پھوپھی میرا بائی نے ان کی نگہداشت کی۔میرا بائی کے کہنے پر رام جی نے جیجا بائی سے دوسری شادی کی تاکہ کمسن بھیم راؤ کو ماں کا پیار مل سکے۔ ان کا خاندان، کبیر فرقے کو ماننے والا مراٹھی نژاد تھا اور موجودہ مہاراشٹر کے رتناگیری ضلع میں آمباواڑے (Ambavade) گاؤں کا رہنے والا تھا۔ان کا تعلق ہندو مہار ذات سے تھا، جو اس وقت اچھوت سمجھی جاتی تھی اور اس لیے انہیں سماجی اور معاشی طور پر گہرا امتیازی سلوک برداشت کرنا پڑتا تھا۔ بھیم راؤ امبیڈکر کے آباؤ اجداد طویل عرصے سے برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کی فوج میں ملازم تھے اور ان کے والد رام جی سکپال ہندوستانی فوج کی مہو چھاؤنی میں خدمات انجام دے رہے تھے اور یہاں کام کرتے ہوئے وہ صوبیدار کے عہدے تک پہنچ گئے تھے۔امبیڈکر نے مراٹھی اور انگریزی میں باقاعدہ تعلیم حاصل کی۔نو عمر بھیم راؤ کو اپنی ذات کی وجہ سے سماجی تفریق کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ایک اچھے طالب علم ہونے کے باوجود، اسکول میں بھیم راؤ کو اچھوت ہونے کی وجہ سے بہت کچھ سہنا پڑتا تھا۔7 نومبر 1900 کو رام جی سکپال نے اپنے بیٹے بھیم راؤ کا داخلہ ستارہ کے گورنمنٹ ہائی اسکول میں بھیوا رام جی آمبڈویکر کے نام سے

کرایا۔ان کا بچپن کا نام 'بھیوا' تھا۔امبیڈکر کا آبائی نام سکپال کے بجائے ان کے آمبڈوے گاؤں کے نام پر آمبڈویکر لکھا گیا تھا، چونکہ صوبہ کونکن کے لوگ گاؤں کے نام کو اپنے نام سے ملاتے تھے۔بعد میں ایک 'دیورکھے برہمن' استاد کرشنا کیشو آمبیڈکر، جو ان سے خصوصی لگاؤ رکھتے تھے، نے ان کے نام سے 'آمبڈویکر' ہٹا کر اپنا سادہ آبائی نام 'آمبیڈکر' جوڑ دیا۔تب سے آج تک وہ امبیڈکر کے نام سے جانے جاتے ہیں۔رام جی سکپال اپنے خاندان کے ساتھ بمبئی چلے گئے۔اپریل 1906 میں، جب بھیم راؤ کی عمر تقریباً 15 سال تھی،ان کی شادی نو سال کی لڑکی رما بائی سے کر دی گئی۔تب وہ انگریزی میڈیم کی پانچویں کلاس میں پڑھ رہے تھے۔ان دنوں ہندوستان میں 'بچپن کی شادی' کا رواج تھا۔

12.3 تعلیم (Education)

12.3.1 ابتدائی تعلیم (Primary Education)

امبیڈکر نے 7 نومبر 1900 کو ستارہ شہر کے راجواڑا چوک پر واقع گورنمنٹ ہائی اسکول (اب پرتاپ سنگھ ہائی اسکول) میں انگریزی کی پہلی کلاس میں داخلہ لیا۔ان کی تعلیمی زندگی اسی دن سے شروع ہوئی، اسی لیے 7 نومبر مہاراشٹر میں یوم طلبہ کے طور پر منایا جاتا ہے۔اس وقت انہیں 'بھیوا' کہا جاتا تھا۔اس وقت اسکول میں ان کا نام 'بھیوا رام جی امبیڈکر' حاضری رجسٹر میں نمبر 1914 پر درج تھا۔جب انہوں نے چوتھی نگریزی جماعت کا امتحان پاس کر لیا تو بھیم راؤ کی کامیابی کو اچھوتوں میں عوامی جشن کے طور پر منایا گیا، کیونکہ یہ غیر معمولی بات تھی اور ان کے خاندان کے دوست اور مصنف دادا کیلوسکر کی لکھی ہوئی 'بدھ کی سوانح حیات' انہیں انعام بطور دی گئی۔اسے پڑھنے کے بعد انہیں پہلی بار گوتم بدھ اور بدھ مت کے بارے میں علم ہوا اور وہ ان کی تعلیمات سے بہت متاثر ہوئے۔1897 میں، امبیڈکر کا خاندان ممبئی چلا گیا جہاں انہوں نے ایلفنسٹن روڈ پر واقع گورنمنٹ ہائی اسکول میں آگے کی تعلیم حاصل کی۔

12.3.2 بامبے یونیورسٹی میں گریجویشن کی تعلیم (Graduate Studies at Bombay University)

1907 میں انہوں نے میٹرک کا امتحان پاس کیا اور اگلے ہی سال وہ ایلفنسٹن کالج میں داخل ہوئے، جو بمبئی یونیورسٹی سے منسلک تھا۔1912 تک، انہوں نے بمبئی یونیورسٹی سے معاشیات (Economics) اور سیاسیات (Political Science) میں بیچلر آف آرٹس (B.A.) کی ڈگری حاصل کی۔چونکہ ان کی تعلیم کا خرچہ بڑودہ ریاست نے اٹھایا تھا اس لیے انہوں نے بڑودہ ریاست میں اپنے کیریر کا آغاز کیا۔ان کے اہل خانہ بھی بڑودہ آ گئے۔کچھ عرصے بعد انہیں اپنے بیمار والد کو دیکھنے کے لیے ممبئی واپس آنا پڑا، جن کا انتقال 2 فروری 1913 کو ہو گیا۔

12.3.3 کولمبیا یونیورسٹی میں پوسٹ گریجویٹ تعلیم

(Postgraduate Studies at Columbia University)

1913 میں 22 سال کی عمر میں امبیڈکر ریاست ہائے متحدہ امریکہ چلے گئے، جہاں انہیں سیاجی راؤ گائیکواڈ سوم کے ذریعے ایک اسکیم کے تحت نیویارک شہر کی کولمبیا یونیورسٹی میں پوسٹ گریجویٹ تعلیم کا موقع فراہم کرنے کے لیے تین سال کے لیے ماہانہ 11.50 ڈالر

کار یاستی وظیفہ دیا گیا۔ وہاں پہنچنے کے فوراً بعد وہ اپنے پارسی دوست نول بھاتینا کے ساتھ لیونگسٹن ہال میں قیام پذیر ہو گئے۔ جون 1915 میں انہوں نے ماسٹر آف آرٹس (M.A.) کا امتحان پاس کیا، جس میں ان کا بنیادی مضمون معاشیات تھا اور سماجیات، تاریخ، فلسفہ اور بشریات ثانوی مضامین تھے۔ انہوں نے پوسٹ گریجویشن کے لیے 'Ancient Indian Commerce' (قدیم ہندوستانی تجارت) کے موضوع پر تحقیقی کام پیش کیا۔ امبیڈکر 'جان ڈیوی' اور 'جمہوریت' پر ان کے کام سے متاثر تھے۔

1916 میں، انہیں ان کے دوسرے تحقیقی کام، *National Dividend of India–A Historical and Analytical Study* (ہندوستانی قومی حصص- ایک تاریخی اور تجزیاتی مطالعہ) کے لیے دوسرے ماسٹر آف آرٹس سے نوازا گیا۔ انہوں نے تین سال کی مدت کے لیے حاصل کردہ وظیفے کا استعمال کرتے ہوئے صرف دو سال میں امریکہ میں کورس مکمل کیا اور 1916 میں وہ لندن چلے گئے۔ 1926 میں، انہوں نے اپنے تیسرے تحقیقی کام *Evolution of Provincial Finance in British India* (برطانوی ہندوستان میں صوبائی مالیات کا ارتقا) کے لیے معاشیات میں پی ایچ ڈی (Ph.D.) کی ڈگری حاصل کی۔ اپنے تحقیقی کام کی اشاعت کے بعد انہیں 1927 میں باضابطہ طور پر پی ایچ ڈی سے نوازا گیا۔ 9 مئی کو، انہوں نے ماہر بشریات الیگزینڈر گولڈن ویزر (Alexander Goldenweiser) کے ذریعہ منعقدہ ایک سیمینار میں *Castes in India: Their System, Origin and Development* (ہندوستان میں ذاتیں: ان کا نظام، ابتدا اور ارتقا) کے عنوان سے ایک تحقیقی مقالہ پیش کیا جو ان کا پہلا شائع شدہ مقالہ بنا۔

12.3.4 لندن اسکول آف اکنامکس میں ڈاکٹریٹ کی تعلیم
(Doctoral Studies at the London School of Economics)

اکتوبر 1916 میں، وہ لندن چلے گئے اور بیرسٹر کورس (قانونی مطالعہ) کے لیے گریز ان (Gray's Inn) میں داخلہ لے لیا۔ ساتھ ہی لندن اسکول آف اکنامکس میں بھی داخلہ لیا جہاں انہوں نے معاشیات میں اپنے ڈاکٹریٹ کے مقالے پر کام شروع کیا۔ جون 1917 میں، وہ اپنی تعلیم کو عارضی طور پر ترک کر کے ہندوستان واپس آنے پر مجبور ہو گئے کیونکہ ریاست بڑودہ سے ان کی اسکالرشپ ختم ہو گئی تھی۔ واپسی پر ان کی کتابوں کا مجموعہ ایک علیحدہ جہاز پر بھیجا گیا جسے جرمن آبدوز (submarine) کے تارپیڈو نے ڈبو دیا تھا۔ یہ پہلی جنگ عظیم کا دور تھا، جس وجہ سے انہیں چار سال کے اندر اپنے مقالے کے لیے لندن واپس آنے کی اجازت مل گئی۔ ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر بڑودہ ریاست کے فوجی سکریٹری کی حیثیت سے خدمات انجام دیتے ہوئے اچانک اپنی زندگی میں دوبارہ کیے جانے والے امتیازی سلوک سے دلبرداشتہ ہو گئے اور اپنی ملازمت چھوڑ کر نجی معلم (tutor) اور محاسب (accountant) کے طور پر کام کرنے لگے۔ یہاں تک کہ انہوں نے اپنا مشاورتی کاروبار (counselling business) بھی شروع کیا جو ان کی سماجی حیثیت کی وجہ سے ناکام ہو گیا۔ اپنے ایک انگریز شناسا اور ممبئی کے سابق گورنر لارڈ سڈنم (Lord Sydenham) کی بدولت انہیں سڈنم کالج آف کامرس اینڈ اکنامکس، ممبئی میں

پولیٹیکل اکانومی کے پروفیسر کی نوکری مل گئی۔ 1920 میں، کولہاپور کے شاہو مہاراج اور اپنے پارسی دوست کی مدد اور کچھ ذاتی بچت سے وہ ایک بار پھر انگلینڈ واپس آنے میں کامیاب ہوئے اور 1921 میں ماسٹر آف سائنس (M.Sc.) مکمل کیا، جس کے لیے انہوں نے Provincial Decentralisation of Imperial Finance in British India (برطانوی ہندوستان میں شاہی معیشت کی صوبائی لامرکزیت) کے عنوان سے تحقیقی مقالہ پیش کیا۔ 1922 میں انہیں 'گریز ان' کی طرف سے بیرسٹر ایٹ لا (Barrister-at-Law) کی ڈگری سے نوازا گیا اور برطانوی بار میں بطور بیرسٹر داخل کر لیا گیا۔ 1923 میں، انہوں نے معاشیات میں ڈی ایس سی (D.Sc.) کی ڈگری حاصل کی، جس کے لیے ان کے مقالے کا مضمون *The Problem of the Rupee: Its Origin and its Solution* (روپے کا مسئلہ: اس کی ابتدا اور اس کا حل) تھا۔ لندن میں اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد ہندوستان واپس آتے ہوئے امبیڈکر تین مہینے جرمنی میں رہے، جہاں انہوں نے بون یونیورسٹی (University of Bonn) میں معاشیات میں اپنی تعلیم جاری رکھی، لیکن وقت کی کمی کی وجہ سے وہ یونیورسٹی میں زیادہ مدت تک نہ ٹھہر سکے۔ ان کی تیسری اور چوتھی ڈاکٹریٹ، کولمبیا یونیورسٹی سے 1952 میں ایل۔ ایل۔ ڈی (L.L.D.) اور عثمانیہ یونیورسٹی سے 1953 میں ڈی۔ لٹ (D.Litt.,) اعزازی ڈگریاں تھیں۔

12.4 چھوا چھوت کے خلاف جدوجہد (Struggle against Untouchability)

امبیڈکر نے کہا تھا، 'چھوا چھوت غلامی سے بھی بدتر ہے۔' امبیڈکر کو بڑودہ کی شاہی ریاست نے تعلیم دی تھی، اس لیے وہ اس کی خدمت کرنے کے پابند تھے۔ انہیں گائیکواڑ مہاراجہ کا فوجی سکریٹری مقرر کیا گیا تھا، لیکن ذات پات کے امتیاز کی وجہ سے انہیں کچھ ہی عرصے میں یہ نوکری چھوڑنی پڑی۔ اس واقعے کو انہوں نے اپنی سوانح عمری *Waiting for a Visa* (ایک ویزا کا انتظار) میں بیان کیا ہے۔ اس کے بعد انہوں نے اپنے بڑھتے ہوئے خاندان کے لیے ذریعہ معاش تلاش کرنے کی کئی کوششیں کیں، جس کے لیے انہوں نے ایک محاسب، ایک نجی معلم اور سرمایہ کاری سے متعلق مشیر کے طور پر بھی کام کیا۔ لیکن یہ تمام کوششیں اس وقت ناکام ہوئیں جب ان کے مؤکلوں کو معلوم ہوا کہ وہ اچھوت ہیں۔ 1918 میں، وہ ممبئی کے سڈنہم کالج آف کامرس اینڈ اکنامکس میں پروفیسر بن گئے۔ اگرچہ وہ طلباء کے ساتھ کامیاب رہے لیکن دوسرے پروفیسروں نے ان کے ساتھ پینے کے برتن بانٹنے پر اعتراض کیا۔

امبیڈکر کو ہندوستان کے ایک سرکردہ دانشور کے طور پر، ساؤتھ برو کمیٹی (Southborough Committee) کے سامنے حقائق پیش کرنے کے لیے مدعو کیا گیا جو گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1919 کا مسودہ تیار کر رہی تھی۔ اس سماعت کے دوران امبیڈکر نے دلتوں اور دیگر مذہبی برادریوں کے لیے علاحدہ حلقہ انتخاب اور ریزرویشن کی وکالت کی۔ 1920 میں بمبئی سے، انہوں نے مراٹھی ہفتہ وار 'موک نایک' (*Mooknayak*) شائع کرنا شروع کیا۔ یہ اشاعت جلد ہی قارئین میں مقبول ہو گئی اور امبیڈکر نے اسے قدامت پسند ہندو سیاست دانوں اور ذات پات کے امتیاز سے لڑنے میں ہندوستانی سیاسی برادری کی ہچکچاہٹ پر تنقید کرنے کے لیے استعمال کیا۔ دلت طبقے

کی ایک کانفرنس کے دوران ان کی تقریر نے کولہاپور ریاست کے مقامی حکمران شاہو چہارم کو بہت متاثر کیا، جس کے امبیڈکر کے ساتھ کھانے نے قدامت پسند معاشرے میں ہلچل مچادی۔

بامبے ہائی کورٹ میں قانون کی پریکٹس کرتے ہوئے انہوں نے اچھوتوں کی تعلیم اور ترقی کے لیے کوششیں کیں۔ان کی پہلی منظم کوشش مرکزی ادارہ 'بہشکرت ہتکارنی سبھا' ('Bahishkrit Hitkarini Sabha') کا قیام تھا، جس کا مقصد تعلیم اور سماجی و اقتصادی اصلاحات کے ساتھ ساتھ ان 'بہشکرتوں' کی فلاح و بہبود کو فروغ دینا تھا، جنہیں پسماندہ طبقات کہا جاتا ہے۔دلتوں کے حقوق کے تحفظ کے لیے انہوں نے پانچ میگزین نکالے جیسے موک نائک، بہشکرت بھارت، سمتا، پربدھ بھارت اور جنتا۔

1925 میں، انہیں بمبئی پریذیڈنسی کمیٹی میں تمام یورپی اراکین والے سائمن کمیشن کے ساتھ کام کرنے کے لیے مقرر کیا گیا۔اس کمیشن کے خلاف ہندوستان بھر میں مظاہرے ہوئے۔ جہاں اس کمیشن کی رپورٹ کو زیادہ تر ہندوستانیوں نے نظرانداز کیا، امبیڈکر نے الگ سے مستقبل کی آئینی اصلاحات کے لیے سفارشات لکھ کر بھیجیں۔دوسری اینگلو-مراٹھا جنگ کے تحت 1 جنوری 1818 کو کورے گاؤں کی لڑائی کے دوران مارے گئے ہندوستانی مہار فوجیوں کے اعزاز میں امبیڈکر نے 1 جنوری 1927 کو 'کورے گاؤں یادگار فتح (جے ستمبھ) میں ایک تقریب کا اہتمام کیا۔ یہاں مہار برادری سے تعلق رکھنے والے فوجیوں کے نام سنگ مرمر کے کتبے پر کندہ کیے گئے تھے اور کورے گاؤں کو دلتوں کی عزت نفس کی علامت قرار دیا گیا۔1927 تک، ڈاکٹر امبیڈکر نے چھوا چھوت کے خلاف ایک وسیع اور فعال تحریک شروع کرنے کا فیصلہ کیا۔عوامی تحریکوں، ستیہ گرہ اور جلوسوں کے ذریعے انہوں نے سماج کے تمام طبقوں کے لیے پینے کے پانی کے عوامی وسائل کھلوانے کے ساتھ ساتھ ہندو مندروں میں اچھوتوں کے داخلے کے حق کے لیے بھی جدوجہد کی۔انہوں نے مہاد (Mahad) شہر کے چاودر تالاب سے اچھوت طبقے کو پانی نکالنے کا حق دلانے کے لیے ایک ستیہ گرہ کی قیادت بھی کی۔

12.4.1 منواسمرتی نذرآتش کرنا (Burning the *Manusmriti*)

1927 کے اواخر میں ہونے والی کانفرنس میں امبیڈکر نے ذات پات کی تفریق اور چھوا چھوت کو نظریاتی طور پر درست قرار دینے والے قدیم برہمنی متن 'منوسمرتی' نے عوامی طور پر مذمت کی، جس کے کئی اقتباس کھلے عام ذات پات کی تفریق اور ذات کے نظام کی حمایت کرتے ہیں۔انہوں رسمی طور پر اس قدیم متن کی کئی کاپیاں جلائیں۔25 دسمبر 1927 کو، انہوں نے ہزاروں پیروکاروں کی قیادت میں منو اسمرتی کی متعدد کاپیاں جلائیں۔اس کی یاد میں، ہر سال 25 دسمبر کو امبیڈکر کے ماننے والوں اور ہندو دلتوں کے ذریعے اس دن کو 'منوسمرتی دہن دیوس' کے طور پر منایا جاتا ہے۔

12.4.2 کالارام مندر ستیہ گرہ (Kalaram Temple Satyagraha)

کالارام مندر ستیہ گرہ ایک تحریک تھی جو بھیم راؤ امبیڈکر نے 2 مارچ 1936 کو اچھوتوں کے مندروں میں داخلے کے لیے شروع کی تھی۔یہ ستیہ گرہ ناسک کے کالارام مندر میں ہوا تھا۔کیونکہ ہندوستان میں ہندوؤں میں اونچی ذات کو پیدائشی طور پر مندر میں داخلے کا حق

تھا لیکن ہندو دلتوں کو یہ حق حاصل نہیں تھا۔اس ستیہ گرہ میں تقریباً 15 ہزار دلت لوگوں نے حصہ لیا، جن میں سے زیادہ تر کا تعلق مہار برادری سے تھا اور دیگر مانگ اور چمار تھے۔اور اس میں خواتین کی بڑی تعداد موجود تھی۔یہ ستیہ گرہ 5 سال، 11 مہینے اور 7 دن تک چلا۔اپنے ستیہ گرہ اور ناسک کے کالارام مندر میں داخلے کی جدوجہد کے دوران انہوں نے پوچھا، 'اگر خدا سب کا ہے تو پھر صرف چند لوگوں کو ہی اس کے مندر میں داخلے کی اجازت کیوں ہے؟' اس تحریک میں امبیڈکر کے ساتھ، دادا صاحب گائیکواڑ، سہستر ابدھے، دیوراؤ نائک، ڈی وی پردھان، بالا صاحب کھرے اور سوامی آنند تھے۔تب ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر نے کہا تھا–'ہندوؤں کو بھی غور کرنا چاہیئے کہ کیا مندر میں داخلہ ہندو سماج میں دلتوں کی سماجی حیثیت کو بڑھانے کا حتمی مقصد ہے؟ یا یہ ان کے عروج کی طرف پہلا قدم ہے؟ اگر یہ پہلا قدم ہے تو حتمی مقصد کیا ہے؟ اگر مندر میں داخلہ ہی حتمی مقصد ہے، تو اعلیٰ طبقے کے لوگ کبھی بھی اس کی حمایت نہیں کریں گے۔دلتوں کا آخری مقصد اقتدار میں حصہ لینا ہے۔'

اس ستیہ گرہ میں حصہ لینے کے لیے پورے مہاراشٹر سے لوگ ناسک شہر آئے۔امبیڈکر کی صدارت میں 2 مارچ 1930 کو ایک میٹنگ ہوئی۔اس میٹنگ میں ستیہ گرہ کو انجام دینے کے بارے میں فیصلے کئے گئے۔سب کو اطلاع دی گئی کہ ستیہ گرہ عدم تشدد کے ذریعے کیا جائے گا۔اگلے دن 3 مارچ 1930 کو ستیہ گرہیوں کے چار دستے بنائے گئے جو مندر کے چار دروازوں پر تعینات ہوگئے۔پولیس اور مندر کے پجاریوں نے ستیہ گرہیوں کے مطالبے کی مخالفت کرتے ہوئے مندر کے تمام دروازے بند رکھے۔پولیس نے بھی پورے مندر کی گھیرا بندی کر رکھی تھی تاکہ کوئی اچھوت مندر میں داخل نہ ہوسکے۔شہر کی اونچی ذات کے ہندوؤں نے ان ستیہ گرہیوں پر حملہ کیا، پتھر برسائے اور لاٹھیوں سے مارا۔اس میں امبیڈکر بھی زخمی ہوئے۔اونچی ذات کے ہندوؤں کے مقابلے تعداد میں کئی گنا زیادہ ہونے کے باوجود، دلتوں نے اونچی ذات پر حملہ نہیں کیا اور تشدد کا سہارا نہیں لیا کیونکہ 'ستیہ گرہ عدم تشدد کے ذریعے کرنا ہے۔' امبیڈکر کے اس حکم پر تمام دلت عمل پیرا تھے۔یہ تقریباً 6 سال تک جاری رہا لیکن رام کے مندر کا دروازہ دلتوں کے لیے نہیں کھلا۔اس کے بعد ہندو مذہب میں کوئی بدلاؤ نہ ہوتا دیکھ کر امبیڈکر نے ہندو مذہب ترک کرنے کا اعلان کیا۔

امبیڈکر نے اپنی کتاب *Who Were the Shudras? How They Came to be the Fourth Varna in the Indo-Aryan Society?* کے ذریعے ہندو ذات کے نظام کی درجہ بندی میں سب سے نچلی ذات شودروں کے وجود کی وضاحت کی۔انہوں نے اس بات پر بھی زور دیا کہ کس طرح 'اتی شودر' (اچھوت) شودروں سے الگ ہیں۔1948 میں *Who Were the Shudras?* کے جواب میں لکھی گئی کتاب *The Untouchables: A Thesis on the Origin of Untouchability* میں امبیڈکر نے ہندو مذہب پر جم کر نشانہ سادھا۔

> ہندو تہذیب .... جو انسانیت کو غلام بنانے اور دبانے کا ایک ظالمانہ آلہ ہے اور اس کا مناسب نام بدنامی ہوگا۔اس تہذیب کے بارے میں اور کیا کہا جاسکتا ہے جس نے لوگوں کا ایک بہت بڑا طبقہ تیار کیا جو انسان سے کمتر سمجھا جاتا تھا اور جن کا محض لمس ہی آلودگی پھیلانے کے لیے کافی تھا۔

امبیڈکر جنوبی ایشیا میں اسلام کے طریقوں کے بھی بڑے ناقد تھے۔ انہوں نے تقسیم ہند کی حمایت کی لیکن مسلمانوں میں بچپن کی شادی اور خواتین کے ساتھ ناروا سلوک کی شدید مذمت کی۔ انہوں نے کہا؛

> تعدد ازدواج اور داشتائیں رکھنے کے برے اثرات کو الفاظ میں بیان نہیں کیا جاسکتا جو خاص طور پر ایک مسلمان عورت کے دکھ کا سبب ہیں۔ ذات پات کے نظام کو ہی لے لیں، ہر کوئی کہتا ہے کہ اسلام، غلامی اور ذات پات سے آزاد ہونا چاہیے، جبکہ غلامی موجود ہے اور اسے اسلام اور اسلامی ممالک سے کی حمایت حاصل ہے۔ اگرچہ قرآن میں غلاموں کے ساتھ انصاف اور انسانی سلوک کے بارے میں نبی کی احادیث قابل تعریف ہیں، لیکن اسلام میں ایسی کوئی چیز نہیں جو اس لعنت کے خاتمے کی حمایت کرتی ہو۔ غلامی ختم ہو جائے تب بھی مسلمانوں میں ذات پات کا نظام باقی رہے گا۔

انہوں نے لکھا کہ ہندو سماج سے زیادہ سماجی برائیاں مسلم سماج میں ہیں اور مسلمان انہیں 'بھائی چارہ' جیسے نرم الفاظ استعمال کرکے چھپاتے ہیں۔ انہوں نے مسلمانوں کی طرف سے ارزل (نچلاترین) طبقات کے خلاف امتیازی سلوک پر بھی تنقید کی، جنہیں 'کمتر درجے' کا سمجھا جاتا تھا، نیز مسلم سماج میں خواتین پر ظلم کی جابرانہ رسم پردے پر بھی تنقید کی۔ ان کا کہنا تھا کہ پردہ ہندوؤں میں بھی دیکھا جاتا ہے لیکن اسے مذہبی منظوری صرف مسلمانوں نے دی ہے۔ انہوں نے اسلام میں کٹرپن کو تنقید کا نشانہ بنایا جس کی وجہ سے اسلام کے اصولوں پر لفظ بلفظ عمل کے لازمی ہونے کی وجہ سے معاشرہ بہت کٹر ہو چکا ہے اور اسے بدلنا بہت مشکل ہو گیا ہے۔ انہوں نے مزید لکھا کہ ہندوستانی مسلمان اپنے سماج کی اصلاح کرنے میں ناکام رہے ہیں جبکہ اس کے برعکس ترکی جیسے ممالک نے خود کو بہت بدل لیا ہے۔

'فرقہ واریت کے شکار ہندو اور مسلمان دونوں گروہوں نے سماجی انصاف کے مطالبے کو نظرانداز کر دیا ہے۔'

12.5 مذہب کی تبدیلی کا اعلان (The Declaration of Change of Religion)

10-12 سال تک ہندو مذہب کے تحت رہتے ہوئے، باباصاحب امبیڈکر نے ہندو مذہب اور ہندو سماج کی اصلاح، مساوات اور احترام کے حصول کے لیے تمام کوششیں کیں، لیکن اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کے دل میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ اس کے برعکس ان کی مذمت کی گئی اور ہندو مذہب کو تباہ کرنے والا بھی کہا گیا۔ اس کے بعد انہوں نے کہا تھا، 'ہم نے ہندو سماج میں برابری کی سطح کو حاصل کرنے کے لیے ہر طرح کی کوششیں اور ستیہ گرہ کیے، لیکن سب بے سود ثابت ہوا۔ ہندو سماج میں برابری کی کوئی جگہ نہیں ہے۔' ہندو سماج کہتا تھا کہ 'انسان مذہب کے لیے ہے' جبکہ امبیڈکر کا ماننا تھا کہ 'مذہب انسان کے لیے ہے۔' امبیڈکر نے کہا کہ کسی مذہب کا کوئی فائدہ نہیں جس میں انسانیت کی کوئی قدر نہ ہو۔ اس مذہب میں رہنے کا کوئی فائدہ نہیں جو اپنے ہی مذہب کے ماننے والوں (اچھوتوں) کو مذہبی تعلیم حاصل کرنے کی اجازت نہیں دیتا، انہیں نوکریوں کے حصول میں روکتا ہے، ہر گفتگو میں ان کی توہین کرتا ہے اور انہیں پانی تک نہیں ملنے دیتا، ایسے مذہب میں رہنے کا کوئی مطلب نہیں۔ امبیڈکر نے ہندو مذہب کو ترک کرنے کا اعلان کسی بھی قسم کی دشمنی اور ہندو مذہب کی تباہی کے لیے نہیں کیا تھا، بلکہ انہوں نے یہ فیصلہ کچھ بنیادی اصولوں کو مدنظر رکھتے ہوئے کیا تھا جو ہندو مذہب سے بالکل مطابقت نہیں رکھتے تھے۔ 13 اکتوبر 1935 کو

ناسک کے قریب 'یبولا' میں ایک کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے، امبیڈکر نے اپنے مذہب کی تبدیلی کا اعلان کیا،

'اگرچہ میں ایک اچھوت ہندو پیدا ہوا ہوں، لیکن میں ہندو بن کر کبھی نہیں مروں گا۔'

انہوں نے اپنے پیروکاروں سے ہندو مت چھوڑ کر کوئی بھی مذہب اختیار کرنے کی اپیل کی۔ امبیڈکر ایک ایسے مذہب کا انتخاب کرنا چاہتے تھے جس کا مرکز انسانیت اور اخلاق ہو، جس میں آزادی، مساوات اور بھائی چارہ ہو۔ وہ کسی بھی حالت میں ایسے مذہب میں رہنا نہیں چاہتے تھے جس میں ذات پات کی تفریق اور چھوا چھوت کی بیماری ہو اور نہ ہی وہ کسی ایسے مذہب کا انتخاب کرنا چاہتے تھے جو توہم پرستی اور منافقت سے بھرا ہو۔ 21 مارچ 1936 کے ہریجن میں گاندھی نے لکھا، 'جب سے ڈاکٹر امبیڈکر نے مذہبی تبدیلی کی دھمکی کا بم ہندو سماج میں پھینکا ہے، انہیں اپنے عزم سے باز رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی جارہی ہے۔' گاندھی مزید ایک جگہ لکھتے ہیں، 'ہاں، ایسے وقت میں (اونچی ذات کے) مصلحین کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے دلوں کو ٹٹولیں۔ انہیں سوچنا چاہیے کہ کیا وہ میرے یا میرے پڑوسیوں کے رویے سے ناخوش ہو کر تو ایسا نہیں کیا جارہا ہے۔۔۔۔ یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ ہندوؤں کی ایک بڑی تعداد جو خود کو سناتنی کہتی ہے، کا رویہ ایسا ہے کہ اس سے ملک بھر میں ہریجنوں کو بے حد تکلیف اور چڑچڑا پن ہوتا ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ اتنے ہی ہندوؤں نے ہندو مذہب کیوں چھوڑا اور دوسروں نے کیوں نہیں چھوڑا۔ یہ تو ان کی قابل ستائش وفاداری یا ہندو مذہب کی یا برتری ہے کہ اسی مذہب کے نام پر اتنے ظلم و ستم کے باوجود لاکھوں ہریجن اس میں رہتے ہیں۔'

امبیڈکر نے اپنی مذہبی تبدیلی کے اعلان کے بعد 21 سالوں تک دنیا کے تمام بڑے مذاہب کا گہرائی سے مطالعہ کیا۔ ان کے اتنا وقت لینے کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ وہ چاہتے تھے کہ جب وہ مذہب تبدیل کریں تو ان کے ساتھ ان کے زیادہ سے زیادہ پیروکار مذہب تبدیل کرلیں۔ امبیڈکر نے بدھ مت کا انتخاب کیا کیونکہ یہ تین اصولوں کی ایک مربوط شکل فراہم کرتا ہے جو کسی دوسرے مذہب میں نہیں ملتا۔ اسلام بھی برصغیر میں آکر اپنی ابتدائی سادہ شکل کھو چکا تھا اور اس میں بھی ذات پات کی تفریق اور بری رسومات پیدا ہو گئیں تھیں۔ بدھ مت 'پرگیا' (توہم پرستی اور مافوق الفطرت کی بجائے ذہانت کا استعمال)، 'کرونا' (محبت) اور 'سمتا' (مساوات) کی تعلیم دیتا ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ انسان انہی چیزوں کو پاکیزہ اور خوشگوار زندگی کے لیے چاہتا ہے۔ دیوتا اور روح معاشرے کو نہیں بچا سکتے۔ امبیڈکر کے مطابق، سچا مذہب وہ ہے جس کا مرکز انسان اور اخلاقیات ہو، جس کی بنیاد سائنس یا فکری عنصر ہو نہ کہ مذہب کا مرکز خدا، روح کی آزادی اور نجات ہو۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ مذہب کا کام دنیا کی تشکیل نو کرنا ہے نہ کہ اس کی ابتدا اور انجام کو بیان کرنا۔ وہ ایک جمہوری سماجی نظام کے حق میں تھے، کیونکہ ان کا خیال تھا کہ ایسی صورت حال میں مذہب انسانی زندگی کا رہنما بن سکتا ہے۔ انہوں نے یہ سب چیزیں صرف بدھ مت میں پائی۔

12.5.1 بدھ مت میں تبدیلی مذہب (Conversion to Buddhism)

1950 کی دہائی میں، بھیم راؤ امبیڈکر بدھ مت کی طرف راغب ہوئے اور بدھ راہبوں اور علماء کی ایک کانفرنس میں شرکت کے لیے سری لنکا (اس وقت سیلون) گئے۔ پونے کے قریب ایک نئی بدھ خانقاہ کو وقف کرتے ہوئے، ڈاکٹر امبیڈکر نے اعلان کیا کہ وہ بدھ مت

پر ایک کتاب لکھ رہے ہیں اور جیسے ہی یہ مکمل ہو جائے گی وہ رسمی طور پر بدھ مت اختیار کر لیں گے۔ 1954 میں امبیڈکر نے دو بار میانمار کا دورہ کیا، دوسری بار وہ تیسری 'ورلڈ بدھسٹ فیلوشپ کانفرنس' میں شرکت کے لیے رنگون گئے۔ 1955 میں انہوں نے 'بھارتیہ بدھسٹ مہاسبھا' (Buddhist Society of India) کی بنیاد رکھی، انہوں نے 1956 میں اپنا آخری مشہور مقالہ *The Buddha and His Dhamma* مکمل کیا۔ یہ ان کی وفات کے بعد 1957 میں شائع ہوا۔ اس کتاب کے دیباچے میں امبیڈکر نے لکھا ہے۔

> 'میں بھگوان بدھ اور ان کے اصل مذہب کی پناہ میں جا رہا ہوں۔ میں مروجہ بدھ فرقوں سے غیر جانبدار ہوں۔ میں جس بدھ مت کو قبول کر رہا ہوں وہ نو بدھ مت یا 'نویان' ہے۔

14 اکتوبر 1956 کو، ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر نے ناگپور شہر میں اپنے اور اپنے حامیوں کے لیے ایک رسمی عوامی تبدیلی مذہب کی تقریب کا اہتمام کیا۔ پہلے ڈاکٹر امبیڈکر نے اپنی اہلیہ سویتا اور کچھ ساتھیوں کے ساتھ بھکشو مہاستھویر چندر منی کے ذریعے روایتی طریقے سے 'تری رتن' اور 'پنچ شیل' کو اپنا کر بدھ مت قبول کیا۔ اس کے بعد انہوں نے اپنے 5,00,000 پیروکاروں کو تری رتن، پنچ شیل اور 22 وعدے کراتے ہوئے نویان بدھ مت میں داخل کیا۔ ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر جی اور ان کا خاندان سنت کبیر کے نظریے سے بہت متاثر ہوا اور اپنی زندگی کبیر کی تعلیمات کے مطابق گزارتے تھے۔

وہ دیوتاؤں کے جال کو توڑ کر ایک ایسے آزاد انسان کا تصور کر رہا تھا جو مذہبی تو ہو لیکن عدم مساوات کو قدر زندگی تسلیم نہ کرے۔ ہندو مت کے طوق کو مکمل طور پر الگ کرنے کے لیے، امبیڈکر نے خود اپنے بدھ مت کے پیروکاروں کے لیے بائیس واجبات یا عزیمتیں رکھے، جو بدھ مت کے فلسفے کا ہی نچوڑ تھا۔ ان واجبات میں ہندو مت کی تثلیث میں عدم اعتماد، اوتار واد کا انکار، شرادھ پر روک، پنڈدان کا ترک کرنا، بدھ کے اصولوں اور تعلیمات پر یقین، کسی بھی برہمنی تقریب میں عدم شرکت، انسان کی برابری پر یقین، مہاتما بدھ کے آٹھوں اصولوں پر عمل آوری، جانداروں کے ساتھ حسن سلوک، چوری نہ کرنا، جھوٹ نہ بولنا، شراب نہ پینا، عدم مساوات پر مبنی ہندو مذہب کو ترک کرنا اور بدھ مت کو اپنانا شامل تھا۔

نویان کو اپنا کر امبیڈکر اور ان کے حامیوں نے واضح طور پر ہندو مذہب اور ہندو فلسفے کی مذمت کی اور اسے چھوڑ دیا۔ اگلے دن 15 اکتوبر کو امبیڈکر نے دوبارہ اپنے 2 سے 3 لاکھ پیروکاروں کو بدھ مت میں شامل کیا۔ یہ وہ پیروکار تھے جو 14 اکتوبر کو تقریب میں نہیں پہنچ سکے تھے یا دیر سے پہنچے تھے۔ امبیڈکر نے ناگپور میں تقریباً 8 لاکھ لوگوں کو بدھ مت میں داخل کیا، اس لیے یہ سرزمین 'دیکشا بھومی' کے نام سے مشہور ہوئی۔ تیسرے دن، 16 اکتوبر کو امبیڈکر چندر پور گئے اور وہاں بھی انہوں نے تقریباً 3 لاکھ پیروکاروں کو بدھ مت میں داخل کیا۔ اس طرح صرف تین دن میں خود امبیڈکر نے 11 لاکھ سے زیادہ لوگوں کو بدھ مذہب میں داخل کر کے دنیا میں بدھ مت کے پیروکاروں کی تعداد میں 11 لاکھ کا اضافہ کیا اور ہندوستان میں بدھ مت کو زندہ کیا۔ اس واقعہ پر بہت سے لوگوں اور بودھ ممالک سے مبارکبادیں موصول ہوئیں۔ اس کے بعد وہ نیپال میں ہونے والی چوتھی عالمی بدھ کانفرنس میں شرکت کے لیے کاٹھمنڈو گئے۔ وہاں وہ کاٹھمنڈ شہر کی دلت بستیوں میں گئے

تھے۔نیپال کی امبیڈکر وادی تحریک کی قیادت دلت رہنما کرتے ہیں اور نیپال کے زیادہ تر دلت رہنماؤں کا ماننا ہے کہ صرف 'امبیڈکر کا فلسفہ' ہی ذات پات کے امتیاز کو ختم کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔امبیڈکر نے اپنا آخری نسخہ 'بدھ اور کارل مارکس' 2 دسمبر 1956 کو مکمل کیا۔

12.6 پونا معاہدہ (The Poona Pact)

اب تک بھیم راؤ امبیڈکر ہمعصر دور کی سب سے بڑی اچھوت سیاسی شخصیت بن چکے تھے۔انہوں نے ذات پات کے نظام کے خاتمے کے تئیں مبینہ بے حسی پر مرکزی دھارے کی سیاسی جماعتوں پر سخت تنقید کی۔امبیڈکر نے انڈین نیشنل کانگریس اور اس کے رہنما مہاتما گاندھی کو بھی تنقید کا نشانہ بنایا اور ان پر الزام لگایا کہ وہ اچھوت برادری کو ایک قابل رحم چیز کے طور پر پیش کرتے ہیں۔امبیڈکر ذات پات کی تفریق مٹانے میں برطانوی حکمرانی کی ناکامیوں کی وجہ سے بھی غیر مطمئن تھے۔انہوں نے اچھوت برادری کے لیے ایک الگ سیاسی شناخت کی وکالت کی جس میں کانگریس یا انگریزوں کا کوئی عمل دخل نہ ہو۔پہلی گول میز کانفرنس کے دوران 8 اگست 1930 کو لندن میں ایک استحصال شدہ طبقے کی کانفرنس میں، امبیڈکر نے اپنا سیاسی نظریہ دنیا کے سامنے پیش کیا، جس کے مطابق استحصال شدہ طبقے کا تحفظ حکومت اور کانگریس دونوں سے آزاد ہونے میں مضمر ہے۔

> ہمیں اپنا راستہ خود بنانا ہے... سیاسی طاقت مظلوموں کے مسائل حل نہیں کر سکتی، ان کی نجات معاشرے میں ان کا جائز مقام حاصل کرنے میں مضمر ہے۔انہیں اپنے برے طرز زندگی کو بدلنا ہوگا... انہیں تعلیم یافتہ ہونا چاہیے... ایک بہت بڑی ضرورت ہے کہ ان کے احساسِ کمتری کو ختم کر دیا جائے اور ان میں وہ الوہی عدم اطمینان پیدا کیا جائے جو تمام تر بلندیوں کا سرچشمہ ہے۔

امبیڈکر نے کانگریس اور گاندھی کے ذریعہ شروع کیے گئے نمک ستیہ گرہ پر تنقید کی۔اچھوت طبقے میں ان کی بڑھتی ہوئی مقبولیت اور عوامی حمایت کی وجہ سے انہیں 1931 میں لندن میں منعقد ہونے والی دوسری گول میز کانفرنس میں بھی شرکت کی دعوت دی گئی۔وہاں ان کی گاندھی کے ساتھ اچھوتوں کو علیحدہ انتخابی حلقے دینے کے معاملے پر تیکھی بحث ہوئی اور انگریزوں نے ڈاکٹر امبیڈکر کے خیالات سے اتفاق کیا۔مذہب اور ذات پات کی بنیاد پر الگ حلقہ انتخاب دینے کے سخت مخالف گاندھی نے خدشہ ظاہر کیا کہ اچھوتوں کو علیحدہ انتخابی حلقے دینے سے ہندو سماج تقسیم ہو جائے گا۔گاندھی کو لگتا تھا کہ اعلیٰ ذاتوں (سورن) کو اچھوت پن کو بھلانے اور ذہنیت تبدیل کرنے کے لیے چند سال کا وقت دیا جانا چاہیے تاکہ، لیکن یہ دلیل اس وقت غلط ثابت ہوئی جب پونا معاہدے کے کئی دہائیوں بعد بھی اعلیٰ ذات کے ہندو اچھوتوں پر پابندی لگاتے رہے۔

1932 میں جب انگریزوں نے امبیڈکر کے نظریات سے اتفاق کیا اور اچھوتوں کو علیحدہ انتخابی حلقے دینے کا اعلان کیا۔فرقہ وارانہ اوارڈ (The Communal Award) کا اعلان گول میز کانفرنس میں ہونے والی بات چیت کا نتیجہ تھا۔اس معاہدے کے تحت امبیڈکر کے ذریعہ اٹھائے گئے سیاسی نمائندگی کے مطالبے کو قبول کرتے ہوئے، دلت طبقے کو علیحدہ حلقہ انتخاب میں دو ووٹوں کا حق دیا گیا۔اس کے تحت دلت ایک ووٹ سے اپنا نمائندہ منتخب کر سکتے تھے اور دوسرے ووٹ سے عام زمرے کے نمائندے کو منتخب کرنے کی آزادی تھی۔

اس طرح دلتوں کا نمائندہ صرف دلتوں کے ووٹوں سے منتخب ہوتا تھا۔اس دفعہ کے ساتھ اب دلت نمائندے کے انتخاب میں عام طبقے کا کوئی دخل نہیں تھا۔ لیکن دلت طبقہ اپنے دوسرے ووٹ کا استعمال کر کے عام طبقے کا نمائندہ منتخب کر کے اپنا کردار ادا کر سکتا ہے۔ایسے میں دلتوں کے ذریعہ منتخب ہونے والا دلت امیدوار دلتوں کے مسائل کا بخوبی اظہار کر سکتا تھا لیکن غیر دلت امیدوار کے لیے یہ ضروری نہیں تھا کہ وہ ان کے مسائل کو حل کرنے کی کوشش بھی کرے۔

گاندھی اس وقت پونے کی یرودا جیل میں تھے۔ جیسے ہی کمیونل ایوارڈ کا اعلان ہوا، گاندھی نے سب سے پہلے وزیر اعظم کو خط لکھا جس میں اسے تبدیل کرنے کا مطالبہ کیا۔ لیکن جب انہیں لگا کہ ان کے مطالبے پر عمل نہیں ہو رہا تو انہوں نے مرن برت (موت تک روزہ) کا اعلان کر دیا۔اس کے بعد امبیڈکر نے کہا کہ 'اچھا ہوتا اگر گاندھی یہ روزہ ملک کی آزادی کے لیے رکھتے لیکن انہوں نے یہ روزہ دلت لوگوں کے خلاف احتجاج میں رکھا ہے جو کہ انتہائی افسوسناک ہے۔جب کہ ہندوستانی عیسائیوں، مسلمانوں اور سکھوں کو ملے اسی حق (علیحدہ حلقہ انتخاب) کے بارے میں گاندھی کی طرف سے کوئی اعتراض نہیں آیا۔' انہوں نے یہ بھی کہا کہ گاندھی ایک لافانی شخص نہیں ہیں۔ کون جانے ایسے کتنے لوگ ہندوستان میں پیدا ہوئے اور چل بسے۔امبیڈکر نے کہا کہ وہ گاندھی کی جان بچانے کے لیے دلتوں کے مفادات کی قربانی نہیں دے سکتے۔اب گاندھی کی صحت ان کے مرن برت کی وجہ سے مسلسل بگڑ رہی تھی۔ گاندھی کی جان کو شدید خطرہ لاحق ہو گیا اور پورا ہندو سماج امبیڈکر کے خلاف ہو گیا۔

ملک میں بڑھتے ہوئے دباؤ کو دیکھ کر امبیڈکر 24 ستمبر 1932 کو شام 5 بجے یرودا جیل پہنچے۔ یہاں گاندھی اور امبیڈکر کے درمیان ایک معاہدہ طے پایا جو بعد میں پونا معاہدہ (Poona Pact) کے نام سے مشہور ہوا۔اس معاہدے میں امبیڈکر نے فرقہ وارانہ ایوارڈ میں دلتوں کو دیے گئے علاحدہ حلقہ انتخاب کے حق کو چھوڑنے کا اعلان کیا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی فرقہ وارانہ ایوارڈ کے ذریعے حاصل ہونے والی 78 مخصوص نشستوں کے بجائے پونا معاہدہ میں مخصوص نشستوں کی تعداد بڑھا کر 148 کر دی گئی۔اس کے ساتھ ہی انہوں نے اچھوت لوگوں کے لیے ہر صوبے میں تعلیمی گرانٹ میں مناسب رقم مقرر کرائی اور دلت طبقے کے لوگوں کی سرکاری ملازمتوں میں بلا امتیاز بھرتی کو یقینی بنایا اور اس طرح امبیڈکر نے مہاتما گاندھی کی جان بچائی۔امبیڈکر اس معاہدے سے مطمئن نہیں تھے، انہوں نے گاندھی کے مرن برت کو گاندھی کی طرف سے اچھوتوں کو ان کے سیاسی حقوق سے محروم کرنے اور ان پر اپنے مطالبات سے دستبردار ہونے کا دباؤ ڈالنے کا ڈرامہ قرار دیا۔1942 میں امبیڈکر نے اس معاہدے کی مذمت کی اور پونا معاہدے کے حوالے سے اپنی ناراضگی کا اظہار اپنی کتاب '*State of Minority*' میں کیا۔

12.7 گاندھی کے ساتھ تعلقات اور نظریاتی اختلاف

(Relations, and Ideological Differences with Gandhi)

1920 کی دہائی میں، امبیڈکر بیرون ملک اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد ہندوستان واپس آئے اور سماجی میدان میں کام کرنا شروع

کیا۔اس وقت کانگریس پارٹی نے مہاتما گاندھی کی قیادت میں تحریک آزادی شروع کرر کھی تھی۔14 اگست 1931 کوامبیڈ کر اور گاندھی کی پہلی بار بمبئی کے منی بھون میں ملاقات ہوئی۔اس وقت تک گاندھی نہیں جانتے تھے کہ امبیڈ کر خود ایک مبینہ 'اچھوت' ہیں۔وہ انہیں اپنی ہی طرح کا ایک سماجی مصلح، سورن یا برہمن رہنما سمجھتے تھے۔گاندھی کو یہی بتایا گیا کہ امبیڈ کر نے بیرون ملک تعلیم حاصل کر کے اعلیٰ ڈگریاں حاصل کی تھیں اور وہ پی ایچ ڈی ہیں۔وہ دلتوں کی حالت سدھارنے کے لیے کوشاں ہیں اور ہمیشہ گاندھی اور کانگریس پر تنقید کرتے ہیں۔پہلی گول میز کانفرنس میں امبیڈ کر کے دلائل کے بارے میں جاننے کے بعد، گاندھی کو مکمل یقین ہو گیا کہ وہ مغربی تعلیم اور سوچ میں پوری طرح ڈوبے ہوئے جدیدیت پسند نوجوان ہیں، جو ہندوستانی سماج کو بھی یورپی نقطہ نظر سے دیکھ رہے ہیں۔

جب گاندھی کو قتل کیا گیا تو امبیڈ کر پہلے شخص تھے جو موقع پر پہنچے اور عینی شاہدین کے مطابق وہ کافی دیر تک وہاں رہے۔1935 میں، جب امبیڈ کر نے ہندو مذہب چھوڑنے اور اجتماعی تبدیلی کا اعلان کیا، تو جمنالال بجاج نے 4 مارچ 1936 کو گجرات کے ساولی گاؤں میں ایک پروگرام میں اس پر گاندھی کی رائے پوچھی۔گاندھی نے کہا-'اگر ڈاکٹر امبیڈ کر کی جگہ میں ہوتا تو مجھے بھی اتنا ہی غصہ ہوتا۔اس حالت میں رہ کر شاید میں ایک غیر متشدد انسان نہ بن پاتا۔ڈاکٹر امبیڈ کر جو کچھ بھی کرتے ہیں، ہمیں اسے عاجزی کے ساتھ برداشت کرنا چاہیے۔صرف یہی نہیں بلکہ ہریجنوں کی خدمت اسی میں ہے۔یہاں تک کہ اگر وہ واقعی ہمیں جوتے مارتے ہیں، تو بھی ہمیں اسے برداشت کرنا ہو گا۔لیکن ان سے ڈرنا نہیں چاہیے۔ڈاکٹر امبیڈ کر کو منا کر انہیں قائل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔یہ صحیح نہیں ہو گا۔اگر وہ یا دوسرے ہریجن جو ہندو مذہب کو نہیں مانتے ہیں، مذہب تبدیل کرتے ہیں، تو یہ بھی ہماری پاکیزگی کا سبب ہو گا۔ہم اس طرح کے سلوک کے مستحق ہیں۔'

گاندھی امبیڈ کر کے لیے 'ڈاکٹر' کا خطاب استعمال کرتے تھے اور امبیڈ کر گاندھی کو 'مسٹر گاندھی' کہتے تھے۔امبیڈ کر نے 1930 اور 1940 کی دہائیوں میں گاندھی پر سخت تنقید کی۔ان کا خیال تھا کہ صفائی کارکنوں کی ترقی کا گاندھیائی راستہ حقارت آمیز اور توہین آمیز تھا۔گاندھی اچھوت کے داغ کو مٹا کر ہندو مذہب کو پاک کرنا چاہتے تھے۔دوسری طرف امبیڈ کر نے خود ہندو مذہب کو ہی مسترد کر دیا تھا۔ان کا خیال تھا کہ اگر دلتوں کو مساوی شہری کا درجہ حاصل کرنا ہے تو انہیں کوئی اور عقیدہ اپنانا ہو گا۔امبیڈ کر ناراض تھے کہ کانگریس نے دلتوں کے لیے کچھ نہیں کیا۔اس کے لیے سب سے زیادہ ذمہ دار گاندھی تھے، کیونکہ اپنے آخری ایام سے پہلے وہ ورن نظام اور ذات پات کے نظام کی مخالفت کرنے کے لیے تیار نہیں تھے، لیکن اپنے سناتنی ہندو ہونے پر مطمئن تھے۔اگرچہ گاندھی اور امبیڈ کر اپنی زندگی بھر سیاسی حریف رہے، لیکن دونوں نے توہین آمیز سماجی نظام کو کمزور کرنے میں ایک دوسرے کے معاون کا کردار ادا کیا۔قانوناً اچھوت کا خاتمہ ہو گیا ہے، لیکن ہندوستان کے کئی حصوں میں اب بھی دلتوں کے ساتھ امتیاز برتا جاتا ہے۔

26 فروری 1955 کو امبیڈ کر نے بی بی سی کو دیے گئے ایک انٹرویو میں مہاتما گاندھی کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔امبیڈ کر نے کہا کہ وہ ہمیشہ گاندھی سے حریف کے طور پر ملتے تھے۔اس لیے وہ گاندھی کو دوسروں سے بہتر جانتے تھے۔امبیڈ کر کے مطابق، 'گاندھی ہندوستان کی تاریخ میں ایک حادثہ تھے، وہ کبھی بھی ایک عہد ساز نہیں تھے....' انہوں نے گاندھی پر ہر وقت دوہرا کردار ادا کرنے کا

الزام بھی لگایا۔ گاندھی نے دو اخبارات نکالے، پہلا ہریجن انگریزی اخبار جس میں گاندھی نے خود کو ذات پات کے نظام اور چھوا چھوت کا مخالف بتایا۔ دوسرے ایک اور گجراتی اخبار میں وہ زیادہ قدامت پسند شخص کے طور پر نظر آتے ہیں، جس میں وہ ذات پات کے نظام، ورنا شرم دھرم یا تمام قدامت پسند اصولوں کے حامی تھے۔ امبیڈکر نے برابری پر زور دیا۔ چھوا چھوت کے خاتمے کے ساتھ ساتھ مساوی مواقع اور وقار پر زور دیا اور دعویٰ کیا کہ گاندھی اس کے مخالف تھے۔ ان کے مطابق گاندھی چھوا چھوت کی بات صرف اچھوتوں کو کانگریس سے جوڑنے کے لیے کرتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ اچھوت، سوراج کے ان کے تصور کی مخالفت نہ کریں۔ گاندھی ایک پر عزم مصلح نہیں تھے اور انہوں نے جیوتی راؤ پھولے یا امبیڈکر کی طرح ذات پات کے نظام کو ختم کرنے کی کوشش نہیں کی۔

امبیڈکر اور ان کے حامیوں نے گاندھی کے دلتوں کو 'ہریجن' کہنے کی مخالفت کی اور دلتوں نے اسے گالی کے مترادف سمجھا۔ گاندھی کی طرف سے شروع کیے گئے 'ہریجن سیوک سنگھ' کو بھی دلتوں نے ناپسند کیا کیونکہ 'وہ ایک اعلیٰ ذات کی مدد سے دلتوں کی ترقی کے خیال کی عکاسی کرتا ہے، نہ کہ دلتوں کی زندگیوں پر ان کے اپنے اختیار کی۔

گاندھی اور امبیڈکر بہت سے مسائل پر ایک جیسے خیالات رکھتے تھے، جب کہ بہت سے مسائل پر ان کے خیالات بالکل مختلف یا مخالف تھے۔ دیہی ہندوستان، ذات پات کے نظام اور اچھوت کے مسائل پر دونوں کے خیالات ایک دوسرے کے مخالف تھے۔ تاہم، دونوں نے ملک میں سماجی انصاف اور اتحاد قائم کرنے کی کوشش کی اور دونوں نے ان مقاصد کے لیے مختلف راستے دکھائے۔ گاندھی کے مطابق اگر ہندو ذات کے نظام سے چھوا چھوت کو ختم کر دیا جائے تو پورا نظام سماج کے مفاد میں کام کر سکتا ہے۔ اس کے منطقی تصور کے لیے، گاندھی نے گاؤں کو ایک مکمل معاشرہ قرار دیا اور اسے ترقی اور افزائش کے مرکز میں رکھا۔ گاندھی کے برعکس، امبیڈکر نے ذات پات کے نظام کو مکمل طور پر ختم کرنے کا خیال پیش کیا۔ امبیڈکر کے مطابق، جب تک سماج میں ذات پات کا نظام موجود ہے، چھوا چھوت سماج میں نئی شکلوں میں پروان چڑھتا رہے گا۔ گاندھی نے لوگوں کو گاؤں میں منتقل ہونے کی تلقین کی، جب کہ امبیڈکر نے لوگوں سے گاؤں چھوڑ کر شہروں میں جانے کی اپیل کی۔ گاندھی اور امبیڈکر گاؤں اور شہر کے بارے میں کچھ مختلف خیالات رکھتے تھے۔ گاندھی ستیہ گرہ میں یقین رکھتے تھے۔ امبیڈکر کے مطابق، اونچی ذات کے ہندوؤں کے دل ستیہ گرہ کے ذریعے نہیں بدلے جا سکتے کیونکہ وہ ذات پات کے نظام سے مادی فوائد حاصل کرتے ہیں۔ گاندھی ریاست کو زیادہ اختیارات دینے کے خلاف تھے۔ ان کی کوشش یہ تھی کہ زیادہ سے زیادہ اختیارات معاشرے میں منحصر کیے جائیں اور اس کے لیے وہ گاؤں کو اقتدار کی مرکزی اکائی بنانے کے حق میں تھے۔ اس کے برعکس، امبیڈکر نے سماج کے بجائے آئین کو زیادہ سے زیادہ طاقتور بنانے کی وکالت کی۔

12.8 سیاسی زندگی (Political Life)

امبیڈکر کی سیاسی زندگی کا آغاز 1926 میں ہوا اور وہ 1956 تک میدان سیاست میں مختلف عہدوں پر فائز رہے۔ دسمبر 1926 میں، بامبے کے گورنر نے انہیں بامبے قانون ساز کونسل کا رکن نامزد کیا۔ انہوں نے اپنے فرائض کو سنجیدگی سے لیا اور اکثر اقتصادی معاملات پر

تقریریں کیں۔ وہ 1936 تک بمبئی قانون ساز کونسل کے رکن رہے۔ 13 اکتوبر 1935 کو امبیڈکر کو گورنمنٹ لاء کالج کا پرنسپل مقرر کیا گیا اور دو سال تک اس عہدے پر فائز رہے۔ انہوں نے دہلی یونیورسٹی کے رام جس کالج کے بانی شری رائے کیدار ناتھ کی موت کے بعد اس کالج کی گورننگ باڈی (مجلس انتظامی) کے صدر کے طور پر بھی خدمات انجام دیں۔ امبیڈکر اب بمبئی (موجودہ ممبئی) میں بس گئے۔ انہوں نے یہاں ایک بڑا تین منزلہ مکان 'راج گرہ' بنایا، جس میں ان کی ذاتی لائبریری میں 50,000 سے زیادہ کتابیں تھیں، جو کہ دنیا کی سب سے بڑی نجی لائبریری تھی۔ اسی سال 27 مئی 1935 کو ان کی اہلیہ رمابائی طویل علالت کے بعد انتقال کر گئیں۔ اپنی موت سے پہلے رمابائی تیرتھ یاترا کے لیے پندھارپور جانا چاہتی تھی لیکن امبیڈکر نے انہیں ایسا کرنے کی اجازت نہیں دی۔ امبیڈکر نے کہا کہ اس ہندو تیرتھ استھل پر جہاں انہیں اچھوت سمجھا جاتا ہے، جانے کا کوئی جواز نہیں۔ اس کے بجائے انہوں نے ان کے لیے ایک نیا پندھارپور بنانے کی بات کہی۔

1936 میں، امبیڈکر نے 'انڈپنڈنٹ لیبر پارٹی' کی بنیاد رکھی، جس نے 1937 میں مرکزی اسمبلی کے انتخابات میں 13 نشستیں حاصل کیں۔ امبیڈکر بامبے ودھان سبھا (مجلس قانون ساز) کے ایم ایل اے کے طور پر منتخب ہوئے۔ وہ 1942 تک ودھان سبھا کے رکن رہے اور اس دوران انہوں نے بامبے ودھان سبھا میں اپوزیشن لیڈر کے طور پر بھی خدمات انجام دیں۔ اسی سال، امبیڈکر نے 15 مئی 1936 کو اپنی کتاب *Annihilation of Caste* (ذات کے نظام کا خاتمہ) شائع کی، جو نیویارک میں ان کے لکھے گئے ایک تحقیقی مقالے پر مبنی تھی۔ اس کتاب میں امبیڈکر نے ہندو مذہبی رہنماؤں اور ذات پات کے نظام پر کڑی تنقید کی۔ انہوں نے اچھوت طبقے کے لوگوں کو گاندھی کے ذریعے وضع کردہ اصطلاح ہریجن پکارنے کے کانگریس کے فیصلے کی شدید مذمت کی۔ بعد میں 1955 میں بی بی سی (BBC) کو دیے انٹرویو میں انہوں نے گاندھی پر ان کے گجراتی زبان کے خطوط میں ذات کے نظام کی حمایت کرنے اور انگریزی زبان کے خطوط میں ذات پات کے نظام کی مخالفت کرنے کا الزام لگایا۔ آل انڈیا شیڈیولڈ کاسٹ فیڈریشن (All India Scheduled Caste Federation) ایک سماجی وسیاسی تنظیم تھی جسے امبیڈکر نے 1942 میں دلت برادری کے حقوق کی مہم چلانے کے لیے قائم کیا تھا۔ سال 1942 سے 1946 کے دوران، امبیڈکر نے دفاعی مشاورتی کمیٹی اور وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل میں وزیر محنت کے طور پر خدمات انجام دیں۔

12.8.1 امبیڈکر اور ہندوستان کی جدوجہد آزادی (Ambedkar and India's Freedom Struggle)

پاکستان کا مطالبہ کرنے والی مسلم لیگ کی لاہور قرارداد (1940) کے بعد امبیڈکر نے 400 صفحات پر مشتمل ایک کتاب لکھی جس کا عنوان تھا *Thoughts on Pakistan* (پاکستان کے بارے میں نظریات)، جس میں پاکستان کے تصور کا اس کے تمام پہلوؤں کے ساتھ تجزیہ کیا گیا تھا۔ اس میں انہوں نے مسلم لیگ کی مسلمانوں کے لیے علیحدہ مملکت 'پاکستان' کے مطالبے پر تنقید کی۔ ساتھ ہی انہوں نے یہ دلیل بھی دی کہ ہندوؤں کو مسلمانوں کے لیے پاکستان تسلیم کرنا چاہیے۔ انہوں نے تجویز پیش کی کہ مسلم اور غیر مسلم اکثریت والے حصوں کو الگ کرنے کے لیے بنگال اور پنجاب کی صوبائی سرحدوں کو از سر نو کھینچنا چاہیے۔ ان کا خیال تھا کہ مسلمانوں کو صوبائی سرحدوں کو دوبارہ بنانے میں کوئی اعتراض نہیں ہوگا اور اگر انہیں اعتراض ہے تو وہ 'اپنے مطالبے کی نوعیت کو نہیں سمجھ پائے۔' دانشور وینکٹ دھولی پل نے کہا کہ ''تھاٹس آن پاکستان' نے ایک دہائی تک ہندوستانی سیاست کو روک دیا۔' انہوں نے مسلم لیگ اور ہندوستانی قومی کانگریس کے

درمیان بات چیت کا ایسا راستہ طے کیا جو تقسیم ہند کے لیے راہ ہموار کر رہا تھا۔ اگرچہ وہ محمد علی جناح اور مسلم لیگ کی باعث تفریق فرقہ وارانہ سیاست کے سخت ناقد تھے، لیکن انہوں نے دلیل دی کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو الگ کر دینا چاہیے اور پاکستان بنایا جائے کیونکہ ایک ہی ملک کی قیادت کرنے سے نسلی قوم پرستی ملک کے اندر مزید تشدد کو بڑھاوا دے گی۔

انہوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان فرقہ وارانہ تقسیم کے بارے میں اپنے نقطہ نظر کی تائید کے لیے سلطنت عثمانیہ کے خاتمے اور چیکوسلواکیہ کی تحلیل جیسے تاریخی واقعات کا حوالہ دیا۔ انہوں نے سوال کیا کہ کیا قیام پاکستان کی خاطر خواہ وجوہات موجود ہیں؟ اور تجویز پیش کی کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اختلافات کو کم سخت اقدام سے بھی ختم کرنا ممکن ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ پاکستان اپنے وجود کا جواز پیش کرے۔ کینیڈا جیسے ممالک میں بھی فرقہ وارانہ مسائل ہمیشہ سے رہے ہیں لیکن آج بھی انگریز اور فرانسیسی ایک ساتھ رہتے ہیں تو کیا ہندو اور مسلمان بھی ایک ساتھ نہیں رہ سکتے؟ انہوں نے خبردار کیا کہ دو ممالک بنانے کے حل پر عمل درآمد انتہائی مشکل ہوگا۔ بڑی آبادی کی منتقلی کے ساتھ سرحدی تنازع کا مسئلہ بھی پیدا ہوگا۔ ہندوستان کی آزادی کے بعد ہونے والے تشدد کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ پیشین گوئی درست تھی۔

What Congress and Gandhi Have Done to the Untouchables? (کانگریس اور گاندھی نے اچھوتوں کے لیے کیا کیا؟)، اس کتاب کے ساتھ امبیڈکر نے گاندھی اور کانگریس دونوں پر منافقت کا الزام لگاتے ہوئے اپنے حملوں کو تیز کیا۔ امبیڈکر نے اپنی سیاسی جماعت کو 'آل انڈیا شیڈیولڈ کاسٹ فیڈریشن' میں تبدیل ہوتے دیکھا، حالانکہ اس پارٹی نے 1946 میں ہونے والے ہندوستان کی دستور ساز اسمبلی کے انتخابات میں خراب کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔ بعد میں وہ بنگال سے، جہاں مسلم لیگ اقتدار میں تھی، آئین ساز اسمبلی کے لیے منتخب ہوئے۔

امبیڈکر نے 1952 کی پہلی ہندوستانی لوک سبھا کا انتخاب بامبے نارتھ سے لڑا، لیکن وہ اپنے سابق معاون اور کانگریس پارٹی کے امیدوار نارائن کاجولکر سے ہار گئے۔ اس الیکشن میں امبیڈکر کو 123,576 ووٹ ملے اور نارائن سدوبا کاجولکر کو 138,137 ووٹ ملے۔ امبیڈکر 1952 میں راجیہ سبھا کے رکن بنے۔ انہوں نے بھنڈارا سے 1954 کے ضمنی انتخاب کے ذریعے دوبارہ لوک سبھا میں داخل ہونے کی کوشش کی، لیکن وہ تیسرے نمبر پر رہے، جب کہ کانگریسی امیدوار کو کامیابی حاصل ہوئی۔ 1957 میں دوسرے عام انتخابات کے وقت تک امبیڈکر کا انتقال ہو چکا تھا۔

امبیڈکر دو بار ہندوستانی پارلیمنٹ کے ایوان بالا راجیہ سبھا میں مہاراشٹر کی نمائندگی کرتے ہوئے پارلیمنٹ کے ممبر بنے۔ راجیہ سبھا کے رکن کے طور پر ان کی پہلی میعاد 3 اپریل 1952 سے 2 اپریل 1956 تک تھی اور ان کی دوسری میعاد 3 اپریل 1956 سے 2 اپریل 1962 تک ہونی تھی لیکن مدت ختم ہونے سے قبل ہی 6 دسمبر 1956 کو ان کا انتقال ہو گیا۔ 30 ستمبر 1956 کو، امبیڈکر نے 'شیڈیولڈ کاسٹ فیڈریشن' کو مسترد کرتے ہوئے 'ریپبلکن پارٹی آف انڈیا' (Republican Party of India) کے قیام کا اعلان کیا، لیکن

پارٹی کے بننے سے پہلے ہی 6 دسمبر 1956 کو ان کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد ان کے پیروکاروں اور کارکنوں نے اس پارٹی کو بنانے کا منصوبہ بنایا۔ پارٹی کے قیام کے لیے یکم اکتوبر 1957 کو ناگپور میں صدارتی اجلاس ہوا۔ اس میٹنگ میں این شیوراج، یشونت امبیڈکر، پی ٹی بورالے، اے جی پوار، دتا کٹی، ڈی اے روپ وتے موجود تھے۔ 3 اکتوبر 1957 کو ریپبلکن پارٹی آف انڈیا کا قیام عمل میں آیا اور این شیوراج کو پارٹی کا صدر منتخب کیا گیا۔

12.8.2 آئین سازی (Making of the Constitution)

گاندھی اور کانگریس کی سخت تنقید کے باوجود، امبیڈکر ایک غیر معمولی دانشور اور ماہر قانون کے طور پر شہرت رکھتے تھے، جس کی وجہ سے جب 15 اگست 1947 کو ہندوستان کی آزادی کے بعد کانگریس کی قیادت میں نئی حکومت وجود میں آئی تو انہوں نے امبیڈکر کو ملک کے پہلے وزیر قانون وانصاف کے طور پر کام کرنے کی دعوت دی جسے انہوں نے قبول کر لیا۔ 29 اگست 1947 کو امبیڈکر کو آزاد ہندوستان کے لیے ایک نئے آئین کا مسودہ تیار کرنے کے لیے آئین کی مسودہ ساز کمیٹی (Drafting Committee) کا چیئرمین مقرر کیا گیا۔ امبیڈکر ایک ذہین ماہر آئین تھے۔ انہوں نے تقریباً 60 ممالک کے آئین کا مطالعہ کیا تھا۔ امبیڈکر کو 'آئین ہند کے باپ' کے طور پر تسلیم کیا جاتا ہے۔ دستور ساز اسمبلی میں مسودہ ساز کمیٹی کے رکن ٹی ٹی کرشناماچاری نے کہا:

> اسپیکر صاحب، میں ایوان میں موجود ان لوگوں میں سے ہوں جنہوں نے ڈاکٹر امبیڈکر کو بہت توجہ سے سنا ہے۔ میں اس آئین کے مسودے میں ان کے کام اور جوش و خروش سے واقف ہوں۔ اسی کے ساتھ ہی میں محسوس کرتا ہوں کہ آئین کے مسودے کی تیاری کے لیے اس وقت جتنی توجہ کی ضرورت تھی وہ ڈرافٹنگ کمیٹی نے نہیں دی تھی۔ ایوان شاید سات ارکان سے واقف ہے۔ آپ کے ایک نامزد نے ایوان سے استعفیٰ دے دیا تھا اور اسے بدل دیا گیا تھا۔ ایک مر گیا تھا اور اس کی جگہ کسی کو نہیں لیا گیا تھا۔ ایک امریکہ میں تھا اور اس کا عہدہ نہیں بھرا گیا اور ایک دوسرا شخص ریاستی امور میں مصروف تھا اور ایک حد تک صفر تھا۔ ایک یا دو لوگ دہلی سے بہت دور تھے اور شاید صحت کی وجوہات نے انہیں شرکت کی اجازت نہیں دی۔ تو آخر کار وہی ہوا کہ اس آئین کو تیار کرنے کا سارا بوجھ ڈاکٹر امبیڈکر پر پڑا اور مجھے اس میں کوئی شک نہیں کہ ہم ان کے شکر گزار ہیں۔ اس کام کو پورا کرنے کے بعد، مجھے یقین ہے کہ یہ بلاشبہ قابل ستائش ہے۔

ہندوستانی آئین کے محقق امریکی مورخ گرینولے آسٹن (Granville Austin) نے امبیڈکر کے تیار کردہ ہندوستانی آئین کا 'پہلی اور سب سے اہم سماجی دستاویز' کے طور پر ذکر کیا ہے۔ 'ہندوستان کی زیادہ تر آئینی دفعات یا تو براہ راست سماجی انقلاب کے مقصد کو آگے بڑھانے کے لیے یا اس کے حصول کے لیے ضروری حالات قائم کر کے اس انقلاب کو بڑھاوا دینے کی کوشش میں بنائی گئی ہیں۔' امبیڈکر کے ذریعہ تیار کردہ آئین کا متن انفرادی شہریوں کے لیے وسیع پیمانے پر شہری آزادیوں کے لیے آئینی ضمانتیں اور تحفظات فراہم کرتا ہے جس میں مذہب کی آزادی، چھوت چھوت کا خاتمہ، اور ہر قسم کے امتیازی سلوک کی ممانعت شامل ہے۔ امبیڈکر نے خواتین کے لیے وسیع تر معاشی اور سماجی حقوق کے لیے دلیلیں دیں اور درج فہرست ذاتوں (SC)، درج فہرست قبائل (ST) اور دیگر پسماندہ طبقات (OBCs) کے

لیے سول سروسز، اسکولوں اور کالجوں میں ملازمتوں میں ریزرویشن کا نظام شروع کرنے کے لیے اسمبلی کی حمایت حاصل کی جو کہ مثبت کاروائی تھی۔ ہندوستانی پارلیمنٹ کے اراکین نے ان اقدامات کے ذریعے ہندوستان کے پسماندہ طبقوں کے لیے سماجی و اقتصادی تفاوت کو ختم کرنے اور مواقع کی کمی کو دور کرنے کی امید ظاہر کی۔

At the house of C. Rajagopalachari, the last governor-general of India, 28 July 1948.

Holidaying in Mussoorie, during the last week of June 1949.

Handing over the draft of the Constitution of India to the chairman of the Constituent Assembly, Dr Rajendra Prasad, at the Central Hall of Parliament, 25 November 1949.

In Haridwar for a holiday, June 1949. Brahmachari (Prabhu Datt) is also in the picture.

(Source: Savita Ambedkar, *Babasaheb*: *My Life with Dr. Ambedkar*, Penguin Random House, New Delhi, 2022.)

ہندوستانی آئین کو دستور ساز اسمبلی نے 26 نومبر 1949 کو اپنایا۔ اپنا کام مکمل کرنے کے بعد خطاب کرتے ہوئے امبیڈکر نے کہا:

میں محسوس کرتا ہوں کہ آئین قابل عمل ہے، یہ لچکدار ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ اتنا مضبوط بھی ہے کہ ملک کو امن اور جنگ کے وقت جوڑ کر رکھ سکے۔ درحقیقت میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ اگر کبھی کچھ غلط ہوا ہے تو اس کی وجہ یہ نہیں ہوگی کہ ہمارا آئین خراب تھا بلکہ اس لیے ہوگا کہ اسے استعمال کرنے والا برا تھا۔

12.8.3 دفعہ 370 کی مخالفت (Opposition to Article 370)

امبیڈکر نے آئین ہند کے دفعہ 370 کی مخالفت کی، جس نے ریاست جموں وکشمیر کو خصوصی درجہ دیا تھا، اور جسے ان کی خواہش کے خلاف آئین میں شامل کیا گیا تھا۔ بلراج مادھوک نے کہا کہ امبیڈکر نے واضح طور پر کشمیری رہنما شیخ عبداللہ سے کہا تھا کہ 'آپ چاہتے ہیں کہ ہندوستان آپ کی سرحدوں کی حفاظت کرے، وہ آپ کے علاقے میں سڑکیں بنائے، وہ آپ کو اناج فراہم کرے اور کشمیر کو ہندوستان کے برابر درجہ دیا جائے لیکن حکومت ہند کے پاس صرف محدود اختیارات ہونے چاہیے اور ہندوستانی عوام کو کشمیر میں کوئی حقوق نہیں ہونے چاہئیں۔ اس کو منظور کرتے ہوئے میں ہندوستان کا وزیر قانون ہونے کے ناطے ہندوستان کے مفادات کے خلاف غداری کا کام کروں گا جو کہ میں کبھی نہیں کروں گا۔' اس کے بعد شیخ عبداللہ نے نہرو سے رابطہ کیا، جنھوں نے انہیں گوپال سوامی آئینگر کے پاس بھیج دیا۔ آئنگر نے بدلے میں ولبھ بھائی پٹیل سے رابطہ کیا اور کہا کہ نہرو نے کشمیر کو خصوصی درجہ دینے کا وعدہ کیا تھا۔ پٹیل کے ذریعے اس دفعہ 370 کو پاس کیا گیا جب کہ نہرو اس وقت غیر ملکی دورے پر تھے۔ جس دن یہ دفعہ بحث کے لیے آئی، امبیڈکر نے اس پر سوالات کا جواب نہیں دیا بلکہ دوسری دفعات پر گفتگو کی۔ تمام دلیلیں کرشنا سوامی آئینگر کے ذریعے پیش کی گئیں۔

12.8.4 یکساں سول کوڈ کی حمایت (In Support of Uniform Civil Code)

امبیڈکر دراصل یکساں سول کوڈ کے حق میں تھے اور کشمیر کے معاملے میں دفعہ 370 کی مخالفت کرتے تھے۔ امبیڈکر کا ہندوستان جدید، سائنسی سوچ اور عقلی نظریات کا ملک ہوتا، جہاں پرسنل لاء کی کوئی جگہ نہیں ہوتی۔ آئین ساز اسمبلی میں بحث کے دوران امبیڈکر نے یکساں سول کوڈ کو اپنانے کی سفارش کرتے ہوئے ہندوستانی معاشرے کی اصلاح کی خواہش کا اظہار کیا۔ انہوں نے کہا:

مجھے ذاتی طور پر سمجھ نہیں آتی کہ مذہب کو اتنا بڑا اور وسیع دائرہ اختیار کیوں دیا جائے کہ وہ ساری زندگی کا احاطہ کرے اور مقننہ کو اس علاقے میں تجاوزات سے روکے۔ آخر ہم اس آزادی کے لیے کیا کر رہے ہیں؟ یہ آزادی ہمیں اپنے سماجی نظام کو بہتر کرنے کے لیے مل رہی ہے، جو کہ عدم مساوات، امتیازی سلوک اور دیگر چیزوں سے بھری ہوئی ہے جو ہمارے بنیادی حقوق سے متصادم ہیں۔

1951 میں امبیڈکر نے کابینہ سے استعفیٰ دے دیا جب ان کے ہندو کوڈ بل (The Hindu Code Bill) کے مسودے کو پارلیمنٹ میں روک دیا گیا۔ ہندو کوڈ بل کے بارے میں کہا گیا تھا کہ وہ ہندوستانی خواتین کو بہت سے حقوق فراہم کرتا ہے۔ اس مسودے میں

وراثت، شادی اور معیشت کے قوانین میں صنفی مساوات کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ اگرچہ وزیر اعظم نہرو، کابینہ اور کچھ دوسرے کانگریسی لیڈروں نے اس کی حمایت کی، لیکن صدر راجندر پرساد اور ولبھ بھائی پٹیل سمیت ممبران پارلیمنٹ کی ایک بڑی تعداد اس کے خلاف تھی۔

12.8.5 اقتصادی منصوبہ بندی (Economic Planning)

امبیڈکر پہلے ہندوستانی تھے جنہوں نے بیرون ملک سے معاشیات میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ انہوں نے دلیل دی کہ صنعت کاری اور زرعی ترقی ہندوستانی معیشت میں ترقی کا باعث بن سکتی ہے۔ انہوں نے ہندوستان میں بنیادی صنعت کے طور پر زراعت میں سرمایہ کاری پر زور دیا۔ شرد پوار کے مطابق، امبیڈکر کے فلسفے نے حکومت کو غذائی تحفظ کے اہداف حاصل کرنے میں مدد کی۔ امبیڈکر نے قومی اقتصادی اور سماجی ترقی کی وکالت کی۔ تعلیم، عوامی صفائی، معاشرتی صحت، رہائشی سہولیات کو بنیادی سہولیات کے طور پر اہمیت دی۔ انہوں نے برطانوی حکومت کی وجہ سے ملکی ترقی میں نقصان کا حساب لگایا۔

12.9 امبیڈکر کی صحافت (Ambedkar's Journalism)

امبیڈکر ایک کامیاب صحافی اور موثر ایڈیٹر تھے۔ ان کا خیال تھا کہ معاشرہ اخبارات کے ذریعے ترقی کرے گا۔ وہ اخبار کو تحریک میں بہت اہم سمجھتے تھے۔ انہوں نے استحصال شدہ اور دلت سماج میں بیداری لانے کے لیے کئی اخبارات اور پانچ رسالوں کو شائع اور ایڈٹ کیا۔ اس سے ان کی دلت تحریک کو آگے بڑھانے میں کافی مدد ملی۔ انہوں نے کہا کہ 'کسی بھی تحریک کو کامیاب کرنے کے لیے اخبار کی ضرورت ہوتی ہے، اگر تحریک کے پاس اخبار نہ ہو تو اس تحریک کی حالت اس پرندے کی سی ہے جس کے پر ٹوٹے ہوئے ہوں۔' ڈاکٹر امبیڈکر دلت صحافت کے ستون تھے کیونکہ وہی دلت صحافت کے پہلے ایڈیٹر، بانی اور پبلشر تھے۔ ڈاکٹر امبیڈکر نے اپنے تمام خطوط مراٹھی زبان میں شائع کیے کیونکہ ان کا میدان عمل مہاراشٹر کا علاقہ تھا اور وہاں کی مقبول زبان مراٹھی تھی۔ اس وقت تک مہاراشٹر کے استحصال شدہ اور دلت لوگ زیادہ پڑھے لکھے نہیں تھے، وہ صرف مراٹھی ہی سمجھ سکتے تھے۔ کئی دہائیوں تک، انہوں نے پانچ مراٹھی میگزینوں کی تدوین کی، جن میں موکنائک (1920)، جنتا (1930)، بہشکرت بھارت (1927)، سمتا (1928) اور پربدھ بھارت (1956) شامل تھیں۔ ان پانچ رسالوں میں امبیڈکر ملک کے سماجی، سیاسی اور معاشی مسائل پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے تھے۔ ادیب اور مفکر گنگادھر پانتاو نے 1987 میں ہندوستان میں پہلی بار امبیڈکر کی صحافت پر پی ایچ ڈی کے لیے مقالہ لکھا۔ اس میں پانتاو نے امبیڈکر کے بارے میں لکھا ہے کہ 'یہ موک نائک'، 'بہشکرت بھارت' کے لوگوں کو 'پربدھ بھارت' میں لے آیا۔ باباصاحب ایک عظیم صحافی تھے۔'

موک نائک (*Mooknayak*)

31 جنوری 1920 کو، باباصاحب نے اچھوتوں پر ہونے والے مظالم کو بے نقاب کرنے کے لیے اپنا پہلا مراٹھی پندرہ روزہ اخبار 'موک نائک' شروع کیا۔ امبیڈکر اور پنڈورام نندرام بھٹ کر اس کے ایڈیٹر تھے۔ اس اخبار کے اوپری حصے پر سنت تکارام کے کلمات تھے۔ اس کے لیے کولہاپور کے چھترپتی شاہو مہاراج سے 25000 روپے کی مالی مدد بھی حاصل ہوئی۔ ہر اعتبار سے موک نائک، خاموش دلتوں کی

ہی آواز تھی، جس میں ان کے دکھوں کا اظہار کیا گیا تھا۔اس اخبار نے دلتوں میں ایک نیا شعور بیدار کیا اور انہیں اپنے حقوق کے لیے تحریک چلانے پر اکسایا۔امبیڈکر بیرون ملک تعلیم حاصل کرنے گئے اور مالی مجبوریوں کی وجہ سے یہ اخبار 1923 میں بند کر دیا گیا، لیکن یہ شعور کی لہر پھیلانے کے اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا۔

بہشکرت بھارت (*Bahishkrit Bharat*)

موک نائک کی بند ہونے کے بعد، تھوڑے ہی عرصے میں امبیڈکر نے 3 اپریل 1924 کو دوسرا مراٹھی ہفتہ وار 'بہشکرت بھارت' نکالا۔ڈاکٹر امبیڈکر خود اس کی تدوین کرتے تھے۔یہ اخبار بامبے سے شائع ہوتا تھا۔اس کے ذریعے وہ اچھوت سماج کے مسائل اور شکایات کو سامنے لاتے تھے اور ساتھ ہی اپنے ناقدین کو جواب بھی دیتے تھے۔اس مقالے کے ایک اداریہ میں انہوں نے لکھا کہ اگر بال گنگادھر تلک اچھوتوں میں پیدا ہوئے ہوتے تو وہ یہ نعرہ نہ لگاتے کہ 'سوراج میرا پیدائشی حق ہے' بلکہ وہ کہتے 'چھوا چھوت کا خاتمہ میرا پیدائشی حق ہے۔' اس اخبار نے بھی دلتوں کو بیدار کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔اس اخبار کے اوپری حصوں پر سنت گیانیشور کے اقوال تھے۔اس پندرہ روزہ کے کل 34 شمارے شائع ہوئے۔مالی مشکلات کی وجہ سے یہ نومبر 1929 میں بند ہو گیا۔

سمتا (*Samata*)

29 جون 1928 کو امبیڈکر نے اخبار 'سمتا' (مساوات) شروع کیا گیا۔یہ اخبار، ڈاکٹر امبیڈکر کے ذریعہ سماجی اصلاح کے لیے قائم کردہ تنظیم 'سماج سمتا سنگھ' کا ترجمان تھا۔امبیڈکر نے دیوراؤ وشنو نائک کو اس کا ایڈیٹر مقرر کیا تھا۔

جنتا (*Janata*)

سمتا اخبار کے بند ہونے کے بعد، امبیڈکر نے اسے 'جنتا' (عوام) کے نام سے دوبارہ شائع کیا۔اس پندرہ روزہ کا پہلا شمارہ 24 فروری 1930 کو شائع ہوا۔ 31 اکتوبر 1930 کو یہ ہفتہ وار بن گیا۔ 1944 میں، اس میں امبیڈکر نے ایک مشہور مضمون لکھا جس کا عنوان تھا 'آمھی شاسن کرتی جمات بن نار' (ہم حکمران طبقہ بنیں گے)۔اس اخبار کے ذریعے امبیڈکر نے دلتوں کے مسائل کو اٹھانے کا کام بحسن وخوبی انجام دیا۔یہ اخبار فروری 1956 تک یعنی کل 26 سال تک جاری رہا۔

پربدھ بھارت (*Prabuddha Bharat*)

امبیڈکر نے پانچویں بار 4 فروری 1956 کو پربدھ بھارت کا آغاز کیا۔انہوں نے 'جنتا' اخبار کا نام بدل کر 'پربدھ بھارت' (روشن خیال ہندوستان) رکھ دیا۔اس اخبار کے صفحہ اول پر 'آل انڈیا دلت فیڈریشن' کا ترجمان چھپتا تھا۔یہ پندرہ روزہ امبیڈکر کے انتقال کے بعد بند ہو گیا۔ 11 اپریل 2017 کو، مہاتما جیوتبا پھولے کے یوم پیدائش کے موقع پر، باباصاحب کے پوتے پرکاش امبیڈکر نے 'پربدھ بھارت' کو دوبارہ شروع کرنے کا اعلان کیا اور 10 مئی 2017 کو اس کا پہلا شمارہ شائع ہوا اور پھر یہ سلسلہ چل نکلا۔ان اخبارات کے ذریعے امبیڈکر نے

اپنے خیالات سے اچھوتوں کو بیدار کیا جس کی وجہ سے دلتوں کی سوچ اور زندگی میں تبدیلی آئی۔

12.10 امبیڈکر کا ادب (Ambedkar's Literature)

کتابیں (Books)

1. *Administration and Finances of the East India Company* (M.A. Thesis)
2. *The Evolution of Provincial Finances in British India* (PhD thesis, 1917, published 1925)
3. *The Problem of the Rupee: Its Origin and Its Solution* (D.S.C. thesis, published in 1923)
4. *Annihilation of Caste* (May 1936)
5. *Witch's Way to Emancipation* (May 1936)
6. *Federation Versus Freedom* (1936)
7. *Pakistan and the Partition of India/Thoughts on Pakistan* (1940)
8. *Ranade, Gandhi and Jinnah* (1943)
9. *Mr. Gandhi and the Emancipation of the Untouchables* (September 1945)
10. *What Congress and Gandhi have done to the Untouchables?* (June 1945)
11. *Communal Deadlock and a Way to Solve It* (May 1946)
12. *Who Were the Shudras? How They Came to be the Fourth Varna in the Indo-Aryan Society*? (October 1946)
13. *A Critique of the Cabinet Mission's Proposals for Changes in the Indian Constitution with reference to their Impact on the Scheduled Tribes (Untouchables)* (1946)
14. *The Cabinet Mission and the Untouchables* (1946)
15. *States and Minorities* (1947)
16. *Maharashtra as a Linguistic Province State* (1948)
17. *The Untouchables*: *Who They Are Why They Became Untouchables* (October 1948)
18. *Thoughts on Linguistic States*: *A Critique of the Proposals of the States Reorganization Commission* (Published 1955)
19. *The Buddha and His Dhamma* (Lord Buddha and His Dhamma) (1957)
20. *Riddles in Hinduism*
21. *Dictionary of Pali Language* (Pali-English)
22. *The Untouchables and the Children of India's Ghettos*
23. *What the Brahmins Have Done to the Untouchables*?
24. *India and Communism* (1936)
25. *Revolutions and Counter-Revolutions in Ancient India*
26. *The Buddha and Karl Marx*
27. *Constitution and Constitutionalism*

یادداشت، شواہد اور بیانات (Memorandum, Evidences and Lectures)

1. On Franchise and Framing Constituencies (1919)
2. Statement of Evidence to the Royal Commission of Indian Currency (1926)
3. Protection of the Interests of the Depressed Classes (29 May, 1928)
4. State of Education of the Depressed Classes in the Bombay Presidency (1928)
5. Constitution of the Government of Bombay Presidency (17 May, 1929)
6. A Scheme of Political Safeguards for the protection of the Depressed in the Future Constitution of a Self- governing India (1930)

7. The Claims of the Depressed Classes for Special Representation (1931)
8. Franchise and Tests of Untouchability (1932)
9. The Cripps Proposals on Constitutional Advancement (18 July, 1942)
10. Grievances of the Schedule Castes (29 October, 1942)

12.11 علالت، دوسری شادی اور انتقال (Illness, Second Marriage, and Death)

امبیڈکر کی پہلی بیوی رمابائی کا انتقال 1935 میں طویل علالت کے بعد ہوا۔ 1940 کی دہائی کے آخر میں ہندوستانی آئین کے مسودے کو مکمل کرنے کے بعد، وہ نیند کی کمی کا شکار تھے، ان کی ٹانگوں میں نیوروپیتھک درد تھا اور وہ انسولین اور ہومیوپیتھک ادویات لے رہے تھے۔ ڈاکٹروں نے ایک ایسے شریک حیات کی جوان کے لیے سفارش کی جو ان کے لیے بہتر کھانا پکا سکے اور ان کی دیکھ بھال کے لیے طبّی علم رکھتا ہو۔ وہ علاج کے لیے بمبئی گئے، اور وہاں ڈاکٹر شاردا کبیر سے ملاقات ہوئی، جن سے انہوں نے 15 اپریل 1948 کو دہلی میں اپنے گھر پر شادی کی۔

Dr Ambedkar with Ramabai, his first wife, at Rajgraha, his residence in Mumbai. From left to right: Yeshwant (son), Dr Ambedkar, Ramabai (wife), Laxmibai (wife of his elder brother, Anand), Mukundrao (nephew) and Tobby (their dog).

Dr Ambedkar and Savita Ambedkar photographed on the day of their wedding, 15 April 1948.

(Source: Savita Ambedkar, *Babasaheb: My Life with Dr. Ambedkar*, Penguin Random House, New Delhi, 2022.)

1948 سے امبیڈکر ذیابیطس (Diabetese) کے مرض میں مبتلا تھے۔ وہ جون سے اکتوبر 1954 تک بہت بیمار رہے، اس دوران وہ کمزور ہوتی بینائی کا شکار تھے۔ سیاسی مسائل سے پریشان، امبیڈکر کی صحت بد سے بدتر ہوتی چلی گئی اور 1955 کے دوران کیے گئے مسلسل کام نے انہیں توڑ کر رکھ دیا تھا۔ اپنے آخری نسخے، *Buddha and His Dhamma* کو مکمل کرنے کے تین دن بعد امبیڈکر 6 دسمبر 1956 کو دہلی میں اپنے گھر میں سوتے ہوئے انتقال کر گئے، تب ان کی عمر 64 سال 7 ماہ تھی۔ ان کے جسد خاکی کو دہلی سے خصوصی پرواز کے ذریعے ممبئی میں ان کے گھر راج گرہ لایا گیا۔ 7 دسمبر کو، ممبئی میں دادر چوپاٹی ساحل سمندر پر بودھ طرز میں ان کی آخری رسومات

ادا کی گئیں، جس میں ان کے لاکھوں حامیوں، کارکنوں اور مداحوں نے شرکت کی۔

Dr Ambedkar delivering the historic address 'The Buddha and Karl Marx' during the World Buddhist Conference in Kathmandu, Nepal, 20 November 1956. Seen here: Dr Ambedkar (at the mic), Maisaheb Ambedkar (behind him) and Mai's brother, Balu, to her left. Sitting: Bhante Chandramani and the King of Nepal, Mahamahendra Vikramdev.

Babasaheb's body laid out at 26 Alipore Road, New Delhi, 6 December 1956.

Yeshwant and Mai meeting after a long gap at the house of Mai's brother-in-law, Bhuleskar, in Shivaji Park, through the efforts of Bawiskar (1970–71).

Protest against the effort to delete 'Riddles in Hinduism' from Volume 4 of *Babasaheb Ambedkar's Writings and Speeches*, due to be published by the then Government of Maharashtra. The picture is of 5 February 1988. Seen in the picture: Maisaheb Ambedkar, Prakash Ambedkar (to her left), Namdeo Dhasal, R.S. Gavai, Ramdas Athavale, Avinash Mahatekar, Arjun Dangale and others.

(Source: Savita Ambedkar, *Babasaheb: My Life with Dr. Ambedkar*, Penguin Random House, New Delhi, 2022.)

ان کے جنازے کے وقت ان کے 10,00,000 سے زیادہ پیروکاروں نے بھدنت آنند کوسلیاین کے ذریعے ان کے جسد خاکی کو گواہ رکھ کر بدھ مت کی دیکشالی، کیونکہ امبیڈکر نے 16 دسمبر 1956 کو ممبئی میں بدھ مت کی تبدیلی کا ایک پروگرام رکھا تھا۔ان کی موت کے بعد ان کی دوسری بیوی سویتا امبیڈکر رہ گئیں، جو دلت بدھ تحریک میں امبیڈکر کے بعد بدھ مذہب اختیار کرنے والی پہلی شخصیت تھیں۔

بدھ مت کے پیروکار ڈاکٹر سویتا امبیڈکر جنھیں 'مائی' یا 'مائی صاحب' کے نام سے جانا جاتا ہے، کا 29 مئی 2003 کو 94 سال کی عمر میں مہرولی ، نئی دہلی میں انتقال ہوا۔ امبیڈکر کے پوتے پرکاش امبیڈکر، بھاریپا بہوجن مہاسنگھ کی قیادت کرتے ہیں اور ہندوستانی پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں کے رکن رہ چکے ہیں۔ دہلی میں 26 علی پور روڈ پر امبیڈکر کے گھر پر ایک یادگار قائم کی گئی ہے۔ امبیڈکر جینتی پر عام تعطیل ہوتی ہے۔ 1990 میں، انہیں بعد از مرگ بھارت رتن سے نوازا گیا، جو بھارت کا سب سے بڑا شہری اعزاز ہے۔

ہندوستان کے پہلے وزیر اعظم جواہر لعل نہرو نے کہا تھا کہ 'ڈاکٹر باباصاحب امبیڈکر ہندو سماج کے تمام جابرانہ طریقوں کے خلاف بغاوت کی علامت تھے۔' اقتصادیات میں ان کے کردار کی وجہ سے، ایک مشہور ہندوستانی ماہر اقتصادیات، نریندر جادھو نے کہا ہے کہ، 'امبیڈکر اب تک کے سب سے زیادہ تعلیم یافتہ ہندوستانی ماہر معاشیات تھے۔' 2007 میں دیے گئے ایک لیکچر میں معاشیات کے میدان میں امبیڈکر کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے، اقتصادیات میں نوبل انعام جیتنے والے ماہر معاشیات امرتیہ سین نے کہا، 'امبیڈکر معاشیات میں میرے والد ہیں۔ وہ دلتوں اور استحصال شدہ لوگوں کے سچے اور جانے پہچانے عظیم ہیرو ہیں۔ انہیں آج تک جتنی عزت اور احترام ملا ہے وہ اس سے بڑھ کر کے مستحق ہیں۔ وہ ہندوستان میں انتہائی متنازعہ شخصیت ہیں۔ حالانکہ ان کی زندگی اور شخصیت میں کوئی قابل تنازعہ کچھ نہیں ہے۔ ان کی تنقید میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ حقیقت سے بالکل پرے ہے۔ معاشیات کے میدان میں ان کا تعاون بہت شاندار ہے۔' امریکی صدر براک اوباما نے 2010 میں ہندوستانی پارلیمنٹ سے خطاب کرتے ہوئے دلت رہنما ڈاکٹر بی۔ آر۔ امبیڈکر کو انسانی حقوق کے ایک عظیم اور قابل احترام علمبردار اور ہندوستان کے آئین کے مرکزی مصنف کے طور پر یاد کیا تھا۔

12.12 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

ڈاکٹر باباصاحب امبیڈکر ایک عظیم ہندوستانی ماہر اقتصادیات، سیاست دان اور سماجی مصلح تھے۔ انہوں نے 'دلت بدھ تحریک' کو متاثر کیا اور اچھوتوں (دلتوں) سے سماجی بھید بھاؤ کے خلاف مہم چلائی۔ مزید برآں انہوں نے مزدوروں، کسانوں اور خواتین کے حقوق کے لیے بھی آواز بلند کی۔ وہ آزاد ہندوستان کے پہلے 'وزیر برائے قانون وانصاف' اور ہندوستانی آئین کے موسس اور جمہوریہ ہند کے معماروں میں سے ایک تھے۔ امبیڈکر بے پناہ صلاحیتوں کے حامل طالب علم تھے۔ انہوں نے کولمبیا یونیورسٹی اور لندن اسکول آف اکنامکس دونوں سے معاشیات میں ڈاکٹریٹ کی ڈگریاں حاصل کیں اور قانون، معاشیات اور سیاسیات میں بھی تحقیقی کام انجام دیے۔ اپنی پیشہ ورانہ زندگی کے ابتدائی حصے میں وہ معاشیات کے پروفیسر رہے اور کچھ دن وکالت کی بھی مشق کی اور بعد کی زندگی کا زیادہ تر حصہ سیاسی سرگرمیوں میں گزارا۔ بعد ازاں امبیڈکر ہندوستان کی آزادی کی مہم اور اس سے متعلق مباحثوں میں شامل ہو گئے اور رسالے شائع کر کے دلتوں کے سیاسی حقوق اور سماجی آزادی کی وکالت کی۔ ہندوستان کی تعمیر میں ان کا نمایاں حصہ تھا۔ ہندو فرقے میں رائج بری رسموں اور چھوا چھوت کے رواج سے تنگ آکر انہوں نے 1951 میں بدھ مذہب اختیار کر لیا۔ 1990 میں، انہیں بعد از مرگ بھارت رتن سے نوازا گیا، جو ہندوستان کا سب سے بڑا شہری اعزاز ہے۔ ان کا یوم پیدائش 14 اپریل کو ہندوستان سمیت دنیا بھر میں امبیڈکر جینتی کے طور پر منایا جاتا ہے۔

12.13 کلیدی الفاظ (Keywords)

دلت بدھ تحریک	:	امبیڈکر کے ذریعے چلائی گئی ایک تحریک جس میں دلتوں نے ہندو مذہب کی پابندیوں سے تنگ آکر نو یان بدھ مت میں پناہ لی۔
مہو(Mhow)شہر	:	ڈاکٹرامبیڈکر نگر، جس کا سابقہ نام مہو تھا،ہندوستان کے مدھیہ پردیش کے اندور ضلع میں واقع ایک شہر ہے۔ یہاں ڈاکٹر بھیم راؤامبیڈکر کی پیدائش ہوئی اور یہ ایک تاریخی چھاونی بھی ہے۔
دیورکھے برہمن	:	دیورکھے برہمن مہاراشٹری برہمنوں کی پانچ ذیلی ذاتوں میں سے ایک ہیں۔
تیرتھ یاترا	:	مذہبی مقامات کا سفر

12.14 نمونہ امتحانی سوالات (Model Exanimation Questions)

12.14.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. آزادہندوستان کے پہلے 'وزیر برائے قانون وانصاف' تھے؟
2. امبیڈکر کہاں پیدا ہوئے؟
3. امبیڈکر کی والدہ کا نام کیا تھا؟
4. دیورکھے برہمن کون ہیں؟
5. امبیڈکر کو کس ریاست سے اعلی تعلیم کے لیے وظیفہ ملا؟
6. کس سال امبیڈکر لندن گئے؟
7. 1927 میں امبیڈکر نے کس برہمنی متن کی عوامی طور پر مذمت کی؟
8. ان کی پی ایچ ڈی کا موضوع کیا تھا؟
9. مہاد شہر میں ستیہ گرہ کیوں کیا گیا؟
10. مرن برت رکھنے کا اعلان کس نے کیا؟

12.14.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. امبیڈکر کی تعلیم پر ایک نوٹ لکھیے۔
2. منواسمرتی نذرآتش کرنے پر ایک نوٹ لکھیے۔
3. کالارام مندر ستیہ گرہ پر ایک نوٹ لکھیے۔
4. پونا معاہدہ پر ایک نوٹ لکھیے۔

5. امبیڈکر اور ہندوستان کی جدوجہد آزادی پر ایک نوٹ لکھیے۔

12.14.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. امبیڈکر کی چھوا چھوت کے خلاف جدوجہد پر ایک تفصیلی مضمون لکھیے۔
2. امبیڈکر کے مذہب کی تبدیلی کا اعلان پر تفصیلی تبصرہ کیجیے۔
3. امبیڈکر کی سیاسی زندگی پر ایک تفصیلی مضمون لکھیے۔

12.15 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Learning Resources)

1. Ambedkar, Savita, *Babasaheb*: *My Life with Dr. Ambedkar* (trans. Nadeem Khan), Penguin/Vintage, Gurugram, 2022.
2. Gopal, Ashok, *A Part Apart*: *The Life and Thought of B.R. Ambedkar*, Navayana, New Delhi, 2023.
3. Jaffrelot, Christophe, *Analysing and Fighting* Caste: Dr. *Ambedkar and Untouchability*, Permanent Black, Ranikhet, 2005.
4. Mani, Braj Ranjan, *De-brahmanising History*: *Dominance and Resistance in Indian Society*, Manohar, New Delhi, 2005.
5. Michael, S.M. ed., *Dalits in Modern India*: *Visions and Values*, Sage, New Delhi, 2007 (first pub. in 1999).
6. Omvedt, Gail, *Ambedkar*: *Towards an Enlightened India*, Penguin Books, New Delhi, 2008 (first pub. in 2004).
7. Omvedt, Gail, *Dalit Visions*: *The Anti-Caste Movement and the Construction of an Indian Identity*, Orient Longman, New Delhi, 2006 (first pub. in 1995).
8. Omvedt, Gail, *Dalits and the Democratic Revolution*: *Dr. Ambedkar and the Dalit Movement in Colonial India*, Sage, New Delhi, 1994.
9. Rathore, Aakash Singh, *Becoming Babasaheb*: *The Life and Times of Bhimrao Ramji Ambedkar, Birth to Mahad, (1891 – 1929*), Harper Collins, New Delhi, 2023.
10. Roy, Arundhati, *The Doctor and the Saint*: *The Ambedkar–Gandhi Debate: Caste, Race and* The Annihilation of Caste, Penguin, Gurgaon, 2019 (first pub. in 2014).
11. Syama Sundar, Unnamati ed., *No Laughing Matter*: *The Ambedkar Cartoons, 1932–1956*, Navayana, New Delhi, 2020 (first pub. in 2019)
12. Teltumbde, Anand, *Mahad*: *The Making of the First Dalit Revolt*, Aakar, 2016.
13. Zelliot, Eleanor, *Dr. Babasaheb Ambedkar and the Untouchable Movement*, Bluemoon Books, New Delhi, 2004.
14. Zelliot, Eleanor, *Ambedkar's World*: *The Making of Babasaheb and the Dalit Movement*, Navayana, New Delhi, 2013 (first pub. in 2004).
15. Zelliot, Eleanor, *From Untouchable to Dalit*: *Essays on the Ambedkar Movement*, Manohar, New Delhi, 2005.

اکائی 13۔ مسلم لیگ اور ہندو مہا سبھا

(Muslim League and the Hindu Mahasabha)

اکائی کے اجزا

13.0 تمہید

13.1 مقاصد

13.2 تاریخی پس منظر

13.3 'پھوٹ ڈالو اور راج کرو' کی برطانوی پالیسی

13.4 سر سید احمد خان اور علی گڑھ تحریک

13.5 فرقہ واریت کے فروغ کے اسباب

13.5.1 تاریخ کی غلط تشریح

13.5.2 انتہا پسندانہ قوم پرستی کا فروغ

13.6 شملہ وفد

13.6.1 علاحدہ انتخابی حلقوں اور اہمیت کے تناسب سے نمائندگی کی منظوری

13.7 آل انڈیا مسلم لیگ کا قیام

13.7.1 آل انڈیا مسلم لیگ کے مقاصد

13.8 لکھنؤ معاہدے کا سبب بننے والے واقعات

13.9 لکھنؤ معاہدہ

13.10 ہندو مہا سبھا

13.10.1 ہندو مہا سبھا کے مقاصد

13.11 ہندو مسلم تعلقات

13.12 مسلم لیگ کا احیا

13.13 فرقہ ورانہ فسادات

13.14 محمد علی جناح

13.15 اکتسابی نتائج

13.16 کلیدی الفاظ

13.17 نمونہ امتحانی سوالات

13.18 تجویز کردہ اکتسابی مواد

13.0 تمہید (Introduction)

ابتدائی بیسویں صدی میں ہندوستان میں برطانوی حکومت کی جانب سے اختیار کی جانے والی مختلف پالیسیاں فرقہ ورانہ جماعتوں کے ظہور کا باعث بنیں۔ ان میں سب سے اہم تنظیمیں مسلم لیگ اور ہندو مہاسبھا تھیں۔ ان تنظیموں کی سرگرمیوں کی وجہ سے جدید ہندوستان میں مذہبی فرقہ واریت کا فروغ ہوا جس کا جدید ہندوستان کی سیاست پر راست اثر پڑا اور اس کا حتمی نتیجہ 1947ء میں تقسیم ہندوستان کی شکل میں رونما ہو۔ فرقہ واریت بنیادی طور پر ایک نظریہ (ideology) ہے۔ یہ جدید دور کی پیداوار ہے اور ایک طرح سے برطانوی پالیسیوں کا نتیجہ ہے۔ کسی نظریہ کو اپنے آپ کے، دوسرے کے یا بڑے پیمانے پر سماج کے بارے میں، ادراک، خیالات اور افکار کے ایک مجموعے کے طور پر سمجھا جا سکتا ہے۔ فرقہ وارانہ نظریہ یہ سمجھنے پر مجبور کر دیتا ہے کہ ایک مذہب کے ماننے والے تمام افراد کے سماجی، معاشی اور سیاسی مفادات واحد اور یکساں ہیں یہی فرقہ واریت کا پہلا مرحلہ ہے۔ فرقہ وارانہ نظریہ کے دوسرے مرحلے پر فرد یہ سوچنے لگتا ہے کہ مختلف طبقات کے مفادات مختلف ہیں۔ فرقہ وارانہ نظریے کے تیسرے مرحلے یعنی اس کے انتہائی درجے پر انسان یہ سمجھتا ہے کہ دوسرے طبقات کے مفادات نہ صرف مجھ سے مختلف ہیں بلکہ وہ میرے مفادات کے خلاف اور ان سے ٹکرانے والے بھی ہیں۔ جدید ہندوستان میں فرقہ ورانہ نظریے اور سیاست کے عروج نے ہندو اور مسلمانوں کے درمیان دوری پیدا کر دی۔ مسلم لیگ، جو تمام مسلمانوں کی نمائندہ جماعت ہونے کا غلط دعویٰ کرتی تھی، اس نے نظریہ کو تشکیل دیا کہ ہندوستان میں ہندو اور مسلم دو مختلف قوم ہیں۔ یہ غیر سائنسی تشریح اس ہندو فرقہ ورانہ سوچ سے ملتی جلتی تھی کہ ہندو ہی 'اصل' اور 'قانونی' ہندوستانی قوم تشکیل دیتے ہیں اور دیگر مذاہب کے پیروکار 'غیر ملکی' ہیں۔

13.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعہ کے بعد آپ

- فرقہ واریت کے نظریہ اور جدید ہندوستان میں اس کے ظہور کے اسباب کو جان سکیں گے۔
- مسلم لیگ اور ہندو مہاسبھا کے رہنماؤں کے افکار اور سرگرمیوں کو سمجھ سکیں گے۔
- لکھنؤ معاہدہ کا سبب بننے والے حالات اور ہندوستانی تاریخ میں اس کی اہمیت کو سمجھ سکیں گے۔

13.2 تاریخی پس منظر (The Historical Context)

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ہندوستان پر برطانوی قبضے سے قبل متعدد مسلم حکمرانوں نے اس ملک پر حکومت کی۔ مسلم اعلیٰ طبقے جو اس سے پہلے ااقتدار میں رہ چکے تھے، اقتدار کھونے کا شکوہ کیا۔ ساتھ ہی انہوں نے یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ اس سے سبھی عام مسلمانوں کا نقصان ہوا جو کہ سراسر غلط پروپیگنڈا تھا۔ اپنی حکمرانی کے ابتدائی دور میں ایسٹ انڈیا کمپنی کھلے عام ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان فرق کرتے ہوئے ہندو طبقے کی حمایت کررہی تھی۔ انگریز یہ سمجھتے تھے کہ ان کے اصل مخالف مسلمان ہیں اسی لیے وہ کمپنی کی اہم اور بڑی ملازمتوں میں انہیں شامل نہیں کرتے تھے۔ کئی عام اور نچلے طبقے کے مسلمان دیسی دست کاریوں سے وابستہ تھے لیکن جب گھریلو صنعتوں کو بھی تباہ کردیا گیا تو عام مسلمان کثیر تعداد میں بے روزگار ہوگئے۔ انگریزوں کے تعصب کی وجہ سے انہیں فوج میں بھی شامل نہیں ہونے دیا گیا۔ اس طرح ہندوستانی مسلمانوں کو منصوبہ بند طریقے سے ایک نسل کو معاشی تباہی سے دوچار کیا گیا۔ تعلیم کے معاملے میں بھی وہ پسماندہ رہے۔ انگریزوں کے تئیں قدامت پرستی اور تعصب کی وجہ سے وہ 1857ء تک نئے انگریزی تعلیمی نظام کے فائدے حاصل کرنے سے بھی محروم رہے۔ یوں تو 1857ء کی بغاوت میں ہندو اور مسلمان دونوں ہی شامل تھے مگر انگریزوں کو ایسا لگتا تھا کہ یہ مغل سلطنت کی تجدید کے لیے بنیادی طور پر ایک مسلم کوشش تھی۔ اس بغاوت کو انگریزوں نے بڑی بے دردی سے کچل دیا تھا۔ مسلم اعلیٰ طبقے کے لیے 1857 کی بغاوت کے بعد والا دور سیاسی اور ثقافتی اعتبار سے غالباً تاریک ترین زمانہ تھا۔ اس بغاوت کے بعد چند دہائیوں تک انگریزی حکومت مسلمانوں کے خلاف کینہ پالتی رہی۔ اسی لیے مسلمان انتظامی اور فوجی دونوں شعبوں میں اہم عہدوں سے محروم رکھے گئے اور انہیں حددرجہ کچلا گیا۔ انگریزوں کے اس رویے پر مسلمانوں نے بھی شدید احتجاج کیا۔ یہ صورت حال سرسید احمد خاں کے سیاسی افق پر ابھرنے تک جوں کی توں برقرار رہی۔

13.3 'پھوٹ ڈالو اور راج کرو' کی برطانوی پالیسی (British Policy of Divide and Rule)

1857ء میں ہندو اور مسلمانوں کی جانب سے مشترکہ بغاوت نے انگریزوں کے ہوش اس حد تک اڑا دیے تھے کہ انگریزوں نے ان میں پھوٹ ڈالنے کا خصوصی منصوبہ بنایا۔ 1859ء میں بمبئی کے برطانوی گورنر ایلفنسٹون (Elphinstone) نے لندن کو مشورہ دیا کہ 'قدیم رومی اصول *'Divide et Impera'* (پھوٹ ڈالو اور راج کرو) پر ہمیں عمل کرنا چاہیے۔' چند دہائیوں بعد جان اسٹریچی (John Strachey) نے محسوس کیا کہ 'ہندوستان میں ہماری سیاسی حیثیت' کے لیے 'ہندوستانی لوگوں میں باہم دشمن گروہوں کا ہونا ضروری ہے۔' اور یہ پالیسی انگریزوں کی بقا کے لئے ضروری تھی۔ کانگریس کی قیادت میں قومی تحریک کے عروج کے ساتھ ہی برطانوی افسران مسلمانوں کی حمایت کرنے لگے۔ اس طرح نہایت چالاکی سے انگریزوں نے 'پھوٹ ڈالو اور راج کرو' کی پالیسی پر عمل کیا تاکہ ان کی حکمرانی کو کوئی خطرہ لاحق نہ ہو۔ انہوں نے ہندوستانی سیاست میں فرقہ واریت اور علاحدگی پسندی کے رجحانات کو ہوا دینی شروع کی۔ انہوں نے خود کو مسلم اقلیت کا خیر خواہ قرار دیتے ہوئے مسلم زمین داروں اور تعلیم یافتہ متوسط طبقے کا دل جیتنے کی کوشش کی ساتھ ہی ہندوستانی سماج میں دیگر اختلافات کو بھی بڑھاوا دیا۔ بنگالیوں کے غلبے کا ذکر کرکے غیر بنگالیوں کے دل میں ان کے خلاف نفرت پیدا کی اور صوبائی تعصب کو فروغ دیا۔ ذات پات کے ڈھانچے کو غیر برہمن کو برہمن کے خلاف کرنے کے لیے استعمال کیا اور نچلی ذاتوں کو بڑی ذاتوں

سے لڑوایا۔ یوپی اور بہار کے علاقوں میں جہاں ہندو مسلم مثالی امن وآشتی کے ساتھ رہا کرتے تھے وہاں برطانوی منتظمین نے اردو زبان کے درباری مقام کو ہندی میں بدلنے کی کوشش کرنے والی تحریک کی بھرپور حوصلہ افزائی کرتے ہوئے لسانی پھوٹ ڈالنے کی کامیاب کوشش کی۔ ہندوستان کی سماجی رنگارنگی اور اختلافات کو غیر ملکی حکمرانوں نے اپنے مفاد کے لیے استعمال کرنا شروع کیا۔ مثلاً ذات اور مذہب کے امتیاز کو بنیاد بنا کر فوجی تنظیم کی جانے لگی۔ غرض کہ زندگی کے ہر میدان اور ہر شعبے میں برطانوی حکمرانوں نے علاحدگی پسندی کے رجحان کو بڑھاوا دینے کی کوشش کی۔ متحدہ ہندوستانی قوم پرستی کے طوفان سے نمٹنے کے لیے مسلمانوں کو انگریزی حکومت کا وفادار بنانا انگریزوں کے لیے ضروری تھا اور کچھ لوگوں کی طرف سے مسلمانوں کا تعاون حاصل کرنے اور ان کے ساتھ تعاون کرنے پر بھی زور دیا گیا۔

13.4 سرسید احمد خان اور علی گڑھ تحریک

(Sir Syed Ahmed Khan and the Aligarh Movement)

سرسید احمد خان کی علی گڑھ تحریک کی شروعات سے قبل ہی بنگالی مسلمانوں نے خود کو منظم کرنا شروع کردیا تھا۔ بنگال میں مسلمانوں کی پہلی تنظیم 'انجمن اسلامی' تھی۔ اس کا قیام 1855ء میں دو مقاصد کے تحت عمل میں آیا تھا ایک مسلمان طبقہ کے مفادات کو فروغ دینا اور دوسرے انگریزوں سے وفاداری سکھانا۔ لفٹننٹ گورنر کو عرضداشتیں دیتے ہوئے انجمن نے مطالبہ کیا کہ ہندوؤں کے ساتھ برابری کے مقابلے کے لیے ہمیں 'کوئی خصوصی مراعات کی ضرورت نہیں بلکہ دیانت داری سے کام کیا جائے۔' اس بات کو یقینی بنانے کے لیے انجمن نے تعلیم کے فروغ کے خصوصی اقدامات کی وکالت کی، برطانوی راج سے وفاداری دکھائی اور 1857ء کی بغاوت کی مذمت کی۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ علی گڑھ تحریک سے بہت پہلے ہی بنگال میں مسلم سیاست کی بنیاد پڑ چکی تھی۔ نواب لطیف خان کی محمڈن لٹریری سوسائٹی (1863ء) اور سید عامر علی کی سنٹرل نیشنل محمڈن اسوسی ایشن (78-1877) بنگال کی ممتاز مسلم تنظیمیں تھیں۔

سید احمد خان (1898–1817) سب سے ممتاز اصلاحی رہنما تصور کیے جاتے ہیں جنھوں نے انگریزوں اور ہندوستانی مسلمانوں کے درمیان تعلقات قائم کیے۔ سید احمد خان نے جو ایک زمیندار خاندان میں پیدا ہوئے، انتہائی قریب سے مغل سلطنت کے سیاسی زوال اور اس کے مقابلے انگریزوں کی قوت کا مشاہدہ کیا تھا۔ گھر والوں کی مرضی کے خلاف جا کر انہوں نے انگلش ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت اختیار کرلی۔ انہوں نے قریب سے دیکھا تھا کہ انگریزوں نے کس طرح 1857ء کی بغاوت کو کچل دیا تھا اور وہ مسلمانوں کو کس حد تک شک کی نظر سے دیکھتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے انگریزوں اور مسلمانوں کے درمیان عدم اعتماد کی گہری کھائی کو پاٹنے کا فیصلہ کیا۔ *The Causes of Indian Revolt* اور *The Loyal Mohammedans of India* جیسی اپنی کتابوں سے انہوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ مسلمان انگریزوں کے وفادار ہیں اور وہ 1857ء کی بغاوت کے راست ذمہ دار نہیں ہیں۔ مسلمانوں میں تعلیمی پسماندگی سے لڑنے اور انہیں انگریزی میں اعلیٰ تعلیم سے روشناس کرنے کے لیے انہوں نے دو اسکول اور ایک ٹرانسلیشن سوسائٹی قائم کی جس کے بعد انہوں نے 1875ء میں علی گڑھ میں مشہور محمڈن اینگلو اورینٹل کالج قائم کیا جو بعد میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی بنا۔ اس کالج نے شمالی ہندوستان کے مسلمان اعلیٰ طبقے کے احیا میں اہم کردار ادا کیا۔ علی گڑھ کالج نے ایک جدید مسلم دانشور اعلیٰ طبقہ کو تخلیق کیا جو

انگریزوں کی سیاسی وفاداری کے جذبے سے لبریز تھااور جدید مغربی تعلیم اور سماجی اصلاح کے تئیں پر جوش تھا۔

سرسید احمد خان قوم پرست اور فرقہ پرست دونوں خیالات کے حامل تھے کیونکہ ان کے یہ خیالات ان کی ذات میں بیک وقت موجود ہوتے تھے تو انہیں زمانی ترتیب میں درجہ بند کرنا بے حد مشکل تھا۔ 27 جنوری 1883 کو پٹنہ میں تقریر کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ ”روز مرہ زندگی کے تمام معاملات میں ہندوستانی مسلم ایک قوم ہیں۔ میں ہمیشہ کہتا رہا ہوں کہ ہندوستان ایک نئی نویلی دلہن کی طرح ہے اور ہندو اور مسلمان اس کی دو خوبصورت آنکھیں ہیں۔ اگر دونوں باہم مل کر رہیں تو دلہن ہمیشہ خوبصورت رہے گی، اگر وہ مختلف سمتوں میں دیکھیں گے تو دلہن بھینگی نظر آئے گی اور جزوی طور پر اندھی ہو جائے گی۔“تاہم وہ کانگریس کے ساتھ جڑ کر اپنی قوم پرستی ثابت کرنے کو تیار نہیں تھے۔ انہوں نے کانگریس کی سخت مخالفت کی اور ہندوستانی مسلمانوں کو اس سے جڑنے سے روکا۔ ان کا ماننا تھا اعتدال پسند قائدین کی ماتحتی میں بھی کانگریس سیاسی طور پر جارحانہ ہے۔ کانگریس کی تشکیل کے ایک سال بعد 1886ء میں انہوں نے محڈن ایجوکیشنل کانفرنس منعقد کی جس کا مقصد مسلمانوں کو تعلیمی، سماجی، اور معاشی ترقی کے راستے پر گامزن کرنا تھا اور انہیں کانگریس سے دور رکھنا تھا۔ اس کے ایک سال بعد کانفرنس کے دوسرے اجلاس میں انہوں نے مسلمانوں کو خبردار کیا کہ وہ ابھی سرگرم سیاست میں شرکت کے لیے تیار نہیں اور نہ ہی ابھی سیاسی طور پر اتنے مضبوط ہیں کہ انگریزوں کے تعاون کے بغیر ابھر سکیں، اس لیے ابھی انگریزوں سے تعاون زیادہ فائدہ مند رہے گا۔

محڈن اینگلو اورینٹل کالج کے پرنسپل تھیوڈر نے سرسید کو اس بات کا قائل کیا کہ 'جہاں اینگلو۔ مسلم تعاون مسلم فرقے کی حالت کو سدھارنے کا سبب بنے گا وہیں قومی جدوجہد میں شامل ہونے سے مسلمانوں کو ایک بار پھر سخت جدوجہد، محنت اور دکھوں میں مبتلا ہونا پڑے گا۔ مسٹر بیک نے سید احمد کو جتایا کہ انگریزوں کے ساتھ تعاون کرنا ان کے اپنے فرقے کے مفاد میں ہوگا۔ مسلم قوم پرستی کے علمبردار سرسید احمد خاں نے 1883ء میں اپنی تقریر میں اعلان کیا کہ ہندو مسلم دو باہم متخارب قومیں ہیں جو کسی طرح مشترکہ سیاسی زندگی نہیں گزار سکتیں۔ ان کا یہ ٹھوس یقین تھا کہ کانگریس کی جانب سے جمہوری بنیادوں پر نمائندہ اداروں کا مطالبہ اور ملکی نظم ونسق میں مقامی لوگوں کے لیے بڑا حصہ مسلم مفاد کے لیے تباہ کن ہے۔ انہوں نے اپنے ہم مذہبوں کو متنبہ کیا کہ برطانوی طرز کی نمائندہ مجلس قانون ساز کے نتیجے میں ہندوستان کے بیشتر علاقوں میں ہمیشہ ہندوؤں کا غلبہ حاصل رہے گا اور مسلمان کبھی بھی اقتدار حاصل نہیں کر سکیں گے۔ 'انتخاب کے ذریعے نمائندگی کے نظام کا مطلب اکثریت کے نظریات کی نمائندگی ہے۔ ۔ ۔ ۔ مجھ پر یہ واضح ہو چکا ہے کہ انتخاب کے اصول کی شروعات ۔ ۔ ۔ برائیاں لے کر آئے گی۔ بڑا طبقہ (اکثریت) مکمل طور پر چھوٹے طبقے (اقلیت) کے مفادات میں مداخلت کرے گا۔' سرسید کو ڈر تھا کہ انگریزی حکومت کی مدد لیے بغیر مسلمان معاشی برتری اور تعلیم کے اونچے معیار میں، ترقی یافتہ ہندوؤں سے پیچھے رہ جائیں گے۔ اسی لیے انہوں نے انگریزوں کے ساتھ وفاداری اور کانگریس سے علاحدہ رہنے کی پالیسی اپنائی۔ انہوں نے واضح کیا کہ جمہوری حکومت کا مطلب ہے اکثریت کی حکومت اور ہندوستان میں اکثریت کی حکومت کا مطلب ہے ہندو اقتدار۔ اسی سبب سے سرسید احمد خاں اینگلو مسلم تعاون کے حامی اور کانگریس مخالف رہے۔ مسلمانوں کی بھاری تعداد کو کانگریس سے جُدا رکھنے میں سرسید کو کامیابی ملی۔ وہ حکومت کے مکمل وفادار ہو گئے اور 1888 میں کانگریس کی مخالفت میں بنارس کے راجہ شیو پرساد کے ساتھ مل کر 'United Indian Patriotic Association' قائم

کی۔یہ ایک رجعت پسند تنظیم تھی جس نے کانگریس کے ترقی پسند نظریات کی مخالفت کی اور برطانیہ سے وفاداری کا حلف اٹھایا۔

13.5 فرقہ واریت کے فروغ کے اسباب (Causes for the Growth of Communalism)

مسلمانوں کے درمیان فرقہ وارانہ اور علاحدگی پسندی کے رجحانات کا اہم سبب،ان کی تعلیمی پسماندگی تھا۔مسلمانوں کا اعلیٰ طبقہ زیادہ تر زمیندار اور امراء طبقے پر مشتمل تھا جنھوں نے انگریز مخالف رویہ اپنایا اور اپنی قدامت پرستی کے سبب جدید تعلیم میں بہت کم دلچسپی ظاہر کی۔ اس وجہ سے ہندوستان میں تعلیم یافتہ مسلمانوں کی تعداد کم ہوتی چلی گئی۔سائنس،جمہوریت اور قومیت پر زور دینے والے جدید مغربی خیالات مسلمانوں میں عام نہیں ہوسکے جس کی وجہ سے وہ پسماندگی کے ساتھ ساتھ کٹّر قدامت پرستی کا شکار ہوگئے۔اس کے برخلاف ہندو جنھوں نے مغربی تعلیم حاصل کرنے میں کوئی جھجک نہیں دکھائی،مسلمانوں سے کافی آگے نکل گئے اور نظم ونسق میں اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوگئے۔ آگے چل کر کافی دیر سے سرسید احمد خاں اور بدرالدین طیب جی کی کوششوں سے مسلمان مغربی تعلیم حاصل کرنے لگے۔مسلمان میں نیا متوسط طبقہ نہ ہونے کے برابر تھا۔ تعلیم یافتہ مسلمان تجارت اور صنعت میں زیادہ مواقع نہیں حاصل کرسکے جس کی وجہ سے وہ صرف سرکاری نوکری پر منحصر ہوگئے۔ تعلیم یافتہ بے روزگاروں کو بے حد کم مواقع حاصل تھے جس کے سبب برطانوی افسران اور وفادار مسلم رہنماؤں کے لیے یہ بے حد آسان ہوگیا کہ تعلیم یافتہ مسلمانوں کو تعلیم یافتہ ہندوؤں کے خلاف بھڑکائیں۔ مسلم قیادت نے اپنے نوجوانوں کو برطانوی حکومت کی وفاداری کا سبق پڑھایا تاکہ انہیں سرکاری نوکریاں اور حکومت کا تعاون حاصل کرنے میں کوئی دقت نہ پیش آئے۔

13.5.1 تاریخ کی غلط تشریح (The Misuse of History)

ہندوستانی تاریخ کی غلط تشریح نے جدید ہندوستان میں فرقہ ورانہ نظریہ کو مستحکم کیا اور اسے تیزی سے فروغ دیا۔اس مسخ شدہ تاریخ ہی سے افراد، تنظیموں اور سیاست نے اپنی طاقت حاصل کی۔ایک ممتاز مورخ بپن چندر کہتے ہیں 'درحقیقت یہ کہنا کوئی مبالغہ آرائی نہیں ہوگی کہ تاریخ کی فرقہ وارانہ تشریح، ہندوستان میں فرقہ واریت کا بنیادی نظریہ رہا ہے۔اس کے بغیر فرقہ واریت نہیں پنپ سکتی۔یہ بات خاص طور سے ہندو فرقہ واریت پر صادق آتی ہے۔جب کہ تاریخ کا استعمال کرتے ہوئے مسلم فرقہ واریت کا انحصار زیادہ تر مذہب اور اقلیتی احساس پر ہوتا ہے تاکہ خوف کی نفسیات یا احساس پیدا کیا جا سکے۔'

برطانوی سامراجی مورخین، جیسے جیمس مل نے ہندوستانی تاریخ کو حکمرانوں کے مذہب کی بنیاد پر ہندو اور مسلم ادوار میں تقسیم کیا۔ انہوں نے قدیم دور کو ہندو اور دور وسطیٰ کو مسلم دور سے تعبیر کیا۔وہ اس بات کو بھول گئے کہ کئی غیر ہندو حکمران جیسے چندر گپت موریہ، اشوک، کنشک اور ہرش وردھن نے بھی قدیم ہندوستان پر راج کیا۔اسی طرح ترک، افغان اور مغل سلطنتیں جنھوں نے عہد وسطیٰ میں حکمرانی کی ان تمام کو ان کے مذہب سے پہچانا گیا اور اس دور کو 'مسلم دور' کہا گیا اور اس حقیقت کو بھلا دیا گیا کہ بہت سے غیر مسلم راجا جیسے وجے نگر کے حکمراں اور شیواجی کے تحت مراٹھوں نے بھی عہد وسطیٰ میں حکومت کی۔

ایک بدگمانی یہ پیدا کی گئی کہ عہد وسطیٰ میں تمام حکمران مسلم تھے اور تمام رعایا ہندو، ساتھ ہی یہ سمجھا گیا کہ تمام مسلمان، حکمران

طبقے سے تعلق رکھتے تھے اور تمام ہندو زبردستی بے رحم مسلم حکمرانی کے تابع بنائے گئے۔ سامراجی مورخین اس بات کو نظرانداز کردیتے ہیں کہ ایک طبقہ کے طور پر حکمرانوں نے چاہے وہ ہندو ہو یا مسلم، اپنی رعایا کو ایک کمتر مخلوق سمجھ کر ان پر زور زبردستی کی چاہے وہ رعایا ہندو ہو یا مسلم۔اس کے ساتھ ہی ہندوستان کی ملی جلی تہذیب کو مکمل طور پر بھلا دیا گیا۔

یہ غلط تشریح اور اس کے نتیجے میں ہندوستانی عہد وسطیٰ کی تاریخ کے بارے میں پیدا ہونے والی غلط فہمی نے فرقہ وارانہ نظریے کے فروغ میں بڑا کردار ادا کیا۔دورِ وسطیٰ کی ہندوستانی تاریخ کو ہندو مسلم تصادم کی تاریخ سمجھا گیا۔ یہ سمجھا گیا کہ اس عہد کے دوران ہندو مسلم تعلقات کافی خراب تھے۔ 'مسلم حکمرانی' کو بیرونی قبضہ بتایا گیا جس نے ہر پہلو سے ہندوؤں کی بے حرمتی کی۔ ایچ۔ایم۔ ایلیٹ (H.M. Elliot) اور جان ڈاؤسن (John Dowson) جیسے سامراجی مورخین نے مندروں کی تباہی، خواتین کی بے حرمتی اور ہندوؤں کے ساتھ دیگر توہین آمیز سلوک کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا۔دورِ وسطیٰ کے مسلم حکمرانوں کو صرف اس لیے 'بیرونی حکمران' بتایا گیا کیونکہ وہ مسلمان تھے اس حقیقت سے قطع نظر کہ ان میں سے بہت سے ہندوستان کی سرزمین میں ہی پیدا ہوئے تھے۔فرقہ وارانہ تشریح کے تحت جنھوں نے 'بیرونی' مسلم حکمرانوں کے خلاف لڑائی لڑی انھیں 'قومی ہیرو' اور 'مجاہد آزادی' کا درجہ دیا گیا۔اس طرح رانا پرتاپ اور شیواجی قومی ہیرو قرار پائے حالانکہ انہوں نے اپنے علاقے کے لیے اسی طرح لڑائی لڑی جس طرح دوسرے راجا لڑتے ہیں۔ بالعموم، تمام مسلمانوں یہاں تک کہ مذہب تبدیل کرکے مسلمان بن جانے والے ہندوؤں کو بھی 'بیرونی' بتایا گیا صرف اس لیے کہ ان کا تعلق اس مذہب سے تھا جو ہندوستان کے باہر پیدا ہوا تھا اور حملہ آوروں کا مذہب تھا۔قدیم ہندوستانی ثقافت پر بہت زیادہ زور دیا گیا اور دورِ وسطیٰ کی ثقافت کو بالکل خارج کردیا گیا۔ ہندوستانی تاریخ کی منظرکشی میں اس طرح کے رجحانات نے جدید ہندوستان میں فرقہ واریت کو فروغ دیا۔فرقہ پرستوں نے ہندو مسلم اختلافات پر زور دیا اور ان کی زندگی کے مشترکہ پہلوؤں اور باہمی میل جول کو بھول گئے۔ہندو اور مسلم فرقہ پرستوں نے دونوں طبقات کی ملی جلی اقدار پر پردہ ڈال دیا کیوں کہ اس سے ان کی فرقہ وارانہ فکر اور سیاست کا پردہ فاش ہو سکتا تھا۔المیہ یہ تھا کہ ہندوستانی تاریخ کی مسخ شدہ شکل نے کٹر قوم پرستوں کی ذہنیت کو بھی اپنی جکڑ میں لے لیا اور فرقہ وارانہ نظریے کو پھلنے پھولنے کے لیے کھلی فضا میسر آگئی۔

13.5.2 انتہا پسندانہ قوم پرستی کا فروغ (Growth of Militant Nationalism)

جارحانہ قوم پرستی کا فروغ بھی مسلم فرقہ واریت کو بڑھانے کا ایک سبب بنا۔انتہاء پسند قوم پرست رہنماؤں (پال، بال، لال اور آربندو) کی جانب سے ہندو نظریات اور روایات کو غیر معمولی اہمیت دیے جانے کے سبب مسلمانوں میں ناراضگی پیدا ہوئی۔اسی طرح قومیت کے معاملے میں مسلمانوں کو جو خدشات تھے ان کو دور کرنے کے بجائے چند کٹّر ہندو قوم پرست، مسلم حکمرانوں کو غیر ملکی کہہ کر مسلمانوں کو اپنے سے دور کرنے لگے۔ قوم پرستی میں یہ ہندو رنگ خاص طور پر اس لیے بھی مضر ثابت ہوا کہ اس کو عیار برطانوی اور ان کے ہمنوا لوگوں نے مسلم ذہنوں میں زہر بھرنے کے لیے استعمال کیا۔انگریزوں نے مسلمانوں کو یہ کہہ کر ڈرانا شروع کیا کہ اگر ہندوؤں کو غلبہ حاصل ہو جائے تو ان کی حالت بدتر ہو جائے گی۔یہی وجہ تھی کہ تعلیم یافتہ مسلمانوں کا خاصہ بڑا طبقہ قومی تحریک سے لاتعلق ہو گیا اور ان میں علاحدگی پسندی کے رجحانات پرورش پانے لگے۔1905ء میں بنگال کی تقسیم، مسلمانوں اور ہندوؤں میں دراڑ ڈالنے کی جانب ایک اور قدم تھا۔مسلمانوں کو

ان کی وفاداری کے انعام کے سلسلہ میں حکومتِ ہند نے مشرقی بنگال کا علاحدہ مسلم اکثریتی صوبہ قائم کیا۔ مسلم فرقہ پرستوں نے فرقہ وارانہ خطوط پر بنگال کی تقسیم کو سیاسی ترقی یافتہ ہندوؤں کے خلاف پس ماندہ مسلمانوں کی تائید حاصل کرنے کے لیے استعمال کیا۔

13.6 شملہ وفد (The Shimla Deputation)

1882ء کے ایکٹ کے تحت ہندوستانی مجلس قانون ساز (Indian Legislative Council) کی تشکیل کرتے وقت مسلمانوں کو کوئی خصوصی نمائندگی نہیں دی گئی اور مسلمان عملی وجوہات کی بنا پر ایک بھی نشست نہیں جیت پائے۔ ان حالات نے سرسید کو اپنی 1883ء کی تقریر میں مسلمانوں کے لیے علاحدہ نشستوں کی ضرورت کے مطالبہ پر مجبور کر دیا۔ 1906ء میں گورنر جنرل لارڈ منٹو نے ہندوستان میں سیاسی اصلاحات کی ضرورت پر غور کے لیے ایک کمیٹی تشکیل دی۔ مسلم رہنماؤں نے محسوس کیا کہ نئی خود مختار باڈیز میں وہ ہندو اکثریت سے شکست کھا جائیں گے۔ سرسید احمد خان کے پیروکاروں بالخصوص محسن الملک نے پانچ ممتاز مسلم رہنماؤں کا گروہ تشکیل دیا جس نے آغا خان کی سرکردگی میں یکم اکتوبر 1906ء کو شملہ میں وائسرائے لارڈ منٹو سے ملاقات کی۔ اس وفد نے دیگر امور کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کے لیے علاحدہ انتخابی حلقوں کا مطالبہ کیا تاکہ ہندو اکثریت کے خلاف سیاسی تحفظ حاصل ہو سکے۔ ساتھ ہی انہوں نے مختلف شعبوں میں مسلمانوں کی نمائندگی اور تاج برطانیہ کے ساتھ وفاداری کے بدلے مسلمانوں کی حقیقی تعداد سے کہیں زیادہ ملازمتوں کا مطالبہ کیا۔

13.6.1 علاحدہ انتخابی حلقوں اور اہمیت کے تناسب سے نمائندگی کی منظوری (Grant of Separate Electorates and Weightage Representation)

وائسرائے نے وفد کو مخاطب کر کے ان کے مطالبات سے پوری ہمدردی کا اظہار کیا۔ اس نے وفد کے اراکین کو یقین دلایا کہ ان کے سیاسی مفادات کا پوری طرح سے تحفظ کیا جائے گا۔ لارڈ منٹو نے کہا "آپ کا یہ مطالبہ بالکل صحیح ہے کہ آپ کی حیثیت کا تعیّن عددی طاقت پر نہیں بلکہ آپ کے فرقہ کی سیاسی اہمیت اور حکومت برطانیہ کے لیے آپ لوگوں کی خدمات کی بنیاد پر کیا جانا چاہیے۔ اس معاملے میں، میں پوری طرح سے آپ کے ساتھ ہوں۔ میں صرف یہ کہ سکتا ہوں کہ مسلم طبقے کو بھروسہ رکھنا چاہیے کہ جس کسی بھی انتظامی تنظیم نو سے میں منسلک ہوں، اس میں ان کے سیاسی حقوق اور مفادات کی حفاظت کی جائے گی۔" لارڈ منٹو کا یہ بیان اس بات کی وضاحت کرتا ہے کہ کس طرح برطانوی حکومت ابتداء ہی سے مسلم فرقہ واریت کو بڑھاوا دے رہی تھی۔ لارڈ منٹو نے ہندوستان کے سیاسی جسم میں اس زہر کو داخل کرتے ہوئے 1909ء کے مارلے منٹو قانون کی بنیاد رکھی۔ لارڈ منٹو نے مسلمانوں کو ایک خود مختار فرقہ تسلیم کیا اور علاحدہ انتخابی حلقے (Separate Electorate) اور تناسب کے لحاظ سے سیاست میں ان کے علاحدہ مفاد کی توثیق کی۔

علاحدہ انتخابی نشستوں کی منظوری نے اصولی اور عملی طور پر مسلم علاحدگی پسندی کی بنیاد ڈال دی۔ یہ واضح کر دیا گیا کہ مسلمان ایک علاحدہ، ممتاز اور خدائے واحد کو ماننے والا طبقہ ہیں اور ان کے سیکولر مفادات ہندوؤں سے مختلف ہیں۔ علاحدہ انتخابی حلقے ہندو اور مسلمانوں کے درمیان اور ہندوستانی سیاست میں ایک خلیج پیدا کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ مسلمان، انگریزوں کو اپنے محافظ کے طور پر دیکھنے لگے اور اس

طرح انگریزوں نے مسلم اشرافیہ کی وفاداری حاصل کرلی۔اس طرح انگریزوں نے مسلم اشرافیہ کے دلوں میں بیٹھی خوف کی نفسیات کا کامیابی سے استعمال کیااوران کے فرقہ وارانہ جذبات سے کھلواڑ کیا۔ یہاں سے خلافت تحریک کے مختصر سے عرصہ کو چھوڑ کر مسلم لیگ اور کانگریس شاید ہی کبھی ملے اوران دونوں کے درمیان کی خلیج کافی گہری ہوتی چلی گئی۔

13.7 آل انڈیا مسلم لیگ کا قیام (Foundation of the All-India Muslim League)

مسلمانوں کی پہلی سیاسی جماعت، مسلم لیگ کا قیام 30 دسمبر 1906ء کو ڈھاکہ (جواب بنگلہ دیش میں ہے) میں عمل میں آیا۔ ہز ہائی نس آغا خان گوکہ اس وقت ڈھاکہ میں نہیں تھے ،انہیں لیگ کا مستقل صدر منتخب کیا گیا۔ لیگ کا آغاز کرنے والی چند ممتاز شخصیات میں وقارالملک، ڈھاکہ کے نواب خواجہ سر سلیم اللہ، جن کے محل میں یہ میٹنگ منعقد ہوئی اور محسن الملک شامل تھے۔ لیگ کی قیادت بالخصوص مسلم فرقے کے اعلیٰ اور پیشہ ور طبقہ کے ہاتھ میں تھی اوراس پر نواب، زمینداروں اور قدیم امراء کے مفادات کا غلبہ تھا۔ یہ کسی بھی لحاظ سے عام مسلمانوں کی نمائندہ نہیں تھی۔ چنانچہ 1930ء کے ابتدائی عشرے اور 1940ء کے آخر تک اسے عوامی تائید بھی حاصل نہیں ہوئی جب تک کہ لیگ نے انتہادرجے کے فرقہ وارانہ پروپیگنڈہ کا سہارا نہیں لیا۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ جہاں مولانا آزاد لیگ کی شروعات کے وقت موجود تھے اور جناح غیر حاضر تھے۔ مزیدار بات یہ ہے کہ جناح نے کھلم کھلا لیگ کے قیام کی مخالفت کی اور مسلم لیگ کے افتتاحی اجلاس میں شریک ہونے سے انکار کردیا۔

13.7.1 آل انڈیا مسلم لیگ کے مقاصد (Objectives of the All-India Muslim League)

1. ہندوستانی مسلمانوں میں برطانوی حکومت کے تعلق سے جذبہ وفاداری کو فروغ دینااور حکومتی اقدامات کے خلاف پیدا ہونے والی کسی بھی غلط فہمی کو دور کرنا۔
2. ہندوستانی مسلمانوں کے سیاسی اور دیگر حقوق اور مفادات کا تحفظ اور ترقی اور ان کی ضروریات اور امنگوں کو نرم لہجے میں حکومت کے سامنے رکھنا۔
3. مذکورہ بالا نکات سے تعصب برتے بغیر جہاں تک ہوسکے مسلمان اور ہندوستان کے دیگر فرقوں کے درمیان ممکنہ حد تک ہم آہنگی پیدا کرنا۔

مسلم لیگ کا قیام ہندوستانی مسلمانوں کے سیاسی ارتقاء میں ایک اہم واقعہ قرار دیا جاتا ہے۔ اپنے قیام کی آغاز سے ہی یہ ایک برطانیہ نواز اور کانگریس مخالف قومی تنظیم ثابت ہوئی۔ جہاں تک طریقہ کار کا تعلق ہے یہ کسی بھی قسم کے احتجاج کے خلاف تھی۔ مسلم لیگ کا پہلا رسمی اجلاس 1907ء میں کراچی میں ہوا اور سر آدم جی پیر بھائی نے اس کی صدارت کی۔ سر سید علی امام جنہوں نے 1908ء میں امرتسر اجلاس کی صدارت کی، انہوں نے طنزیہ طور پر کہا کہ 'کانگریس چاند کا مطالبہ کررہی ہے'۔ وہ چاہتے تھے کہ کانگریس اس بات کا اعلان کرے کہ عملی سیاست میں برطانوی انتظامیہ سے وفاداری ہی ہندوستان سے وفاداری ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ مسلم لیگ کا یہ 'مقدس فرض' ہے کہ وہ اس

وقت تک قوم کے مفادات کا تحفظ کرے جب تک کانگریس کوئی 'قابل عمل پالیسی' نہیں لے آتی۔ اس کانفرنس میں مسلمان رہنماؤں نے قانون ساز کونسلوں اور سیول سروس میں مسلمانوں کے لیے زیادہ نمائندگی کا مطالبہ کیا۔ گورنر جنرل کی مجلس عاملہ (Executive Council) میں بھی لیگ نے اکثریتی فرقہ کے برابر نمائندگی کا مطالبہ کیا۔ 1908ء کے امر تسر اجلاس میں مسلم لیگ کے مطالبات سے اس کی فرقہ وارانہ ذہنیت کے علاوہ یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ یہ جماعت صرف اعلیٰ اور متوسط طبقوں کی نمائندہ تھی۔ لیگ نے مسلمانوں کے ہنر مند طبقے کے لیے نوکریاں اور عہدے حاصل کرنے کی بھی جدوجہد کی۔ مسلم لیگ کی سیاسی سرگرمیاں غیر ملکی حکمرانوں کی بجائے ہندؤں اور قومی کانگریس کے خلاف تھیں۔ لیگ کے سکریٹری نے اعلانیہ کہا 'کانگریس سے کسی قسم کا سیاسی اتحاد ممکن نہیں، چوں کہ ان کے اور کانگریس کے درمیان کوئی مشترکہ سیاسی مقاصد نہیں پائے جاتے۔'

مسلم لیگ تمام تعلیم یافتہ مسلم دانشور طبقے کی حمایت حاصل کرنے میں ناکام رہی۔ قوم پرست مسلمان بھی اس کے فرقہ وارانہ کردار کو ناپسند کرنے لگے۔ حتیٰ کہ مسٹر جناح بھی کئی برس تک لیگ کی فرقہ وارانہ پالیسی کی مخالفت کرتے تھے۔ 1910ء میں ہوئے کانگریس کے الٰہ آباد اجلاس میں جناح نے فرقہ وارانہ نمائندگی کے نظام کی مذمت میں ایک قرارداد پیش کی۔ اس قرارداد کی تائید مولانا مظہر الحق نے کی جو کہ ہندو مسلم اتحاد کے زبردست حامی تھے۔ نواب سید محمد، مولانا شبلی نعمانی، مولانا محمد علی اور مولانا آزاد نے نہ صرف لیگ سے کوئی ربط رکھنے سے انکار کیا بلکہ لیگ کی فرقہ وارانہ پالیسی اور اس کی حکومت سے وفاداری کے رویے پر اعتراض کیا۔ ترقی پسند مسلم لیڈران جیسے کہ سید وزیر حسین، حسن امام اور حکیم اجمل خاں لیگ کے مخالفین میں تھے۔

13.8 لکھنؤ معاہدہ کا سبب بننے والے واقعات (Events Leading to the Lucknow Pact)

مورلے منٹو اصلاحات کے پیش کیے جانے کے بعد کچھ ایسے واقعات رونما ہوئے جن کے سبب لیگ کانگریس سے قریب تر ہو گئی۔ تقسیم بنگال کی منسوخی نے انگریزوں پر لیگ کے بھروسہ کو متزلزل کر دیا۔ محمد علی کے بموجب 'ہندوؤں کے احتجاج اور مہم کے زیر اثر تقسیم بنگال کی تنسیخ نے مسلمانوں پر یہ واضح کر دیا کہ برطانوی حکومت سے تعاون کر کے امیدیں باندھنا ٹوٹی ہوئی شاخ پر جھولنے کے برابر ہے۔' مزید یہ کہ مسلم لیگ کا صدر دفتر علی گڑھ سے لکھنؤ منتقل کر دیا گیا تھا جس نے مسلم لیگ پر علی گڑھ کالج کے پرنسپلوں کے اثرات کم کر دیے۔ نئے وائسرائے لارڈ ہارڈنگ نے غیر جانبدارانہ پالیسی اپنائی۔ یوروپ کی مسلم ریاستوں کے تئیں برطانیہ کے رویہ کے سبب مسلمانوں کی وفاداری کو شدید دھچکا لگا۔ محمد علی اس بارے میں لکھتے ہیں 'مسلمانوں کی جانب سے ہندوؤں کی مخالفت میں انگریزوں سے تعاون کرنا ایک فطری تحریک تھی لیکن ترکی، ایران اور مراقش کے دشمنوں کے ساتھ جیسا معاملہ انگریزوں نے رکھا، اس کے سبب 1911ء ہی سے مسلمانوں کی ہمدردیاں انگلستان کے ساتھ نہیں رہیں۔'

مسلم لیگ کو کانگریس کے قریب کرنے کا سب سے اہم سبب ترک اطالوی جنگ اور بلقان جنگوں کے دوران ترکی کے تعلق سے انگلینڈ کی پالیسی تھی۔ ہندوستانی مسلمان توقع رکھتے تھے کہ انگلینڈ، ترکی کی حمایت کرے گا لیکن انہیں مایوسی ہوئی۔ انہیں محسوس ہوا کہ انگریز

مسلمانوں کے سچے دوست نہیں ہو سکتے۔ اس کے علاوہ چند روشن خیال لیڈر جیسے محمد علی، شوکت علی اور جناح یہ چاہتے تھے کہ مسلم لیگ انگریزوں کی خدمت گزاری کی پالیسی ترک کرکے جدوجہد آزادی میں شریک ہو جائے۔ نتیجتاً مسلم لیگ نے اپنی پالیسی تبدیل کرکے کانگریس سے خوشگوار تعلقات استوار کرنے کی کوشش کی۔ 1913ء کے لکھنؤ اجلاس میں لیگ کے مقاصد میں واضح تبدیلی نظر آئی۔ حکومت سے وفاداری کی پالیسی کی جگہ تاج برطانیہ کے تحت ہندوستان کی حکومت خود اختیاری کے اصول نے لے لی۔

13.9 لکھنؤ معاہدہ (The Lucknow Pact, 1916)

1913ء کے کانگریس اجلاس نے لیگ کے رویے میں اس خوشگوار تبدیلی کا خیر مقدم کیا اور کانگریسی رہنماؤں نے، مسلم لیگ کے مثالی نظریے 'برطانوی سلطنت کے تحت ہندوستان کی خود مختار حکومت' کو سراہا اور قومی اتحاد کو فروغ دینے اور ملک کے مختلف فرقوں کے درمیان تعاون اور بھائی چارگی قائم کرنے کے سلسلے میں مسلم لیگ کی کوششوں کی تعریف کی۔ 1915ء میں لیگ کا سالانہ اجلاس بمبئی میں بلایا گیا جس میں کانگریس نے بھی حصہ لیا۔ کانگریسی قائدین کی ایک بڑی تعداد نے مسلم لیگ کے اس اجلاس میں شرکت کی۔ جن میں گاندھی، مالویہ، سروجنی نائیڈو اور کئی دیگر رہنما شامل تھے۔ کانگریس کے صدر ایس۔ پی سنہا اور مسلم لیگ کے صدر مظہر الحق نے تبادلہ خیال کیا۔ 1916ء میں کانگریس اور لیگ نے ایک ہی مقام لکھنؤ میں اپنے اجلاس منعقد کیے۔ اس قربت کے نتیجے میں 1916ء میں لکھنؤ کے مشہور کانگریس لیگ سمجھوتے پر دستخط ہوئے۔ تلک اور جناح نے کانگریس اور مسلم لیگ میں اتحاد قائم کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔

لکھنؤ معاہدہ کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان ہندوستان کے مستقبل کے دستور پر ہونے والا پہلا اور واحد مکمل معاہدہ تھا۔ اس معاہدہ کے مطابق کانگریس کو علاحدہ مسلم نشستوں کے لیے راضی ہونا پڑا حالانکہ نشستوں کا تناسب ان کی آبادی کے مقابلے زیادہ تھا۔ کانگریس اس بات پر بھی رضامند ہوئی کہ مسلم طبقے کو متاثر کرنے والا کوئی بھی بل قانون ساز اسمبلی میں منظور نہیں کیا جائے گا اگر اس فرقے کے تین چوتھائی افراد اس کی مخالفت کریں۔ مسلمانوں کو ہندو اکثریت والے صوبوں میں یہ تحفظ دیا گیا۔ گو کہ لکھنؤ معاہدہ کئی معنوں میں آگے کی جانب ایک قدم تھا بالخصوص اس نے مسلم لیگ اور کانگریس کو ایک مقصد کی خاطر جمع کیا۔ پھر بھی بپن چندرا کہتے ہیں کہ 'مسلمانوں کے لیے علاحدہ نشستوں کو قبول کرتے ہوئے کانگریس نے رسمی طور پر فرقہ واریت کو قبول کر لیا۔ سب سے بڑھ کر یہ معاہدہ اس مفروضہ پر مبنی تھا کہ ہندوستان مختلف طبقات پر مشتمل ہے جن میں سے ہر ایک کے مفادات مختلف ہیں۔ چنانچہ اس نے ہندوستانی سیاست میں فرقہ واریت کے عروج کا راستہ ہموار کر دیا۔'

لکھنؤ معاہدہ میں فرقہ واریت کے اصول پر راضی ہونے کی بنا پر کانگریس کو تنقید کا نشانہ بننا پڑا۔ در حقیقت اس کا مفہوم یہ تھا کہ کانگریس نے ہندوستانی سماج میں فرقہ واریت کو ایک حقیقت کے طور پر قبول کر لیا ہے۔ تاہم تاریخی تناظر میں کانگریس نے اسے ایک چھوٹی برائی کے طور پر قبول کیا کیوں کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان چل رہی رسہ کشی (کیوں کہ دونوں متضاد سمتوں میں جا رہے تھے) آزادی کی جدوجہد کو ناممکن بنا رہی تھی۔ کانگریس کو توقع تھی کہ اس معاہدہ کے طے پانے کے بعد مسلم لیگ جدوجہد آزادی میں کانگریس کے ساتھ

شامل ہو جائے گی جس سے ملک میں اتحاد اور بھائی چارے میں اضافہ ہو گا مگر بعد کے واقعات نے ثابت کیا کہ کانگریس کا خیال غلط تھا۔ فرقہ واریت کا مطالبہ جب ایک بار مان لیا گیا تو مستقبل کی ہر دستوری اسکیم میں اسے دہرایا جاتا رہا۔ جیسا کہ 1919ء یا پھر 1935 کی اصلاحات۔ لکھنؤ معاہدہ کے ذریعہ بنایا گیا ہندو مسلم اتحاد نہ صرف مختصر بلکہ ایک سراب ثابت ہوا۔ آنے والے برسوں میں کانگریس فرقہ وارانہ نمائندگی سے انکار یا اس کی مخالفت نہیں کر سکی اور اسی کے سبب ہندوستان تقسیم ہو گیا۔

13.10 ہندو مہاسبھا (The Hindu Mahasabha)

ہندو مہاسبھا تحریک کی جڑیں پنجاب کی غالب تجارتی و مذہبی ثقافت میں پوشیدہ ہیں۔ انگریزوں کی جانب سے اٹھائے گئے کئی اقدامات جیسے مردم شماری کا ڈاٹا اور مسلمانوں کا علاحدہ حلقہ انتخاب منظور کرنا، ہندوؤں کے فرقہ وارانہ خطوط پر متحرک ہونے کا ذریعہ بنی۔ نوآبادیاتی ریاستی مردم شماری جسے 1871ء میں شروع کیا گیا تھا، اس نے ہندوؤں پر ایک خصوصی اثر چھوڑا۔ اس مردم شماری نے پنجاب میں ہندو آبادی میں مستقل کمی کا انکشاف کیا۔ 1891ء میں یہ 43.8 فیصد تھا جو 1911ء میں گھٹ کر 36.3 فیصد ہو گیا تاہم اس عرصہ میں مسلم اور عیسائی آبادی میں اضافہ دکھایا گیا۔ 1911ء کی مردم شماری کے مطابق 1901ء سے 40 ہزار ہندوؤں نے اسلام اور 12 ہزار ہندوؤں نے عیسائیت قبول کر لی۔ اس سے ہندوؤں کے درمیان خطرہ کی گھنٹی بجنے لگی اور ہندو رہنماؤں نے ہندوؤں کے ساتھ کھڑے ہونے اور ہندوستان میں مسلمانوں سے ان کے وجود کو لاحق خطرہ سے مذہبی بنیاد پر ان کے دفاع کا عہد کیا۔

پنجاب میں آریہ سماج نے بیسویں صدی کی ابتدا ہی سے ہندو شعور کو مستحکم کرنا شروع کر دیا۔ 1906ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے قیام نے پنجاب کے شہروں میں مختلف ہندو سہایک سبھاؤں کی تشکیل کا کام تیز کر دیا۔ مقامی آریہ سماجی رہنماؤں نے ان کے قیام کا کام اپنے ذمہ لیا۔ رام بھاج دتا، ایک آریہ سماجی نے لاہور میں 1906ء میں حکومت کی جانب سے مسلمانوں کی تائید کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے ہندو سہایک سبھا کی بنیاد ڈالی۔ اس نے 'ہندو سیاست' کے فروغ کی اپیل کی۔ 4 اگست 1906ء کو ممتاز آریہ سماجی اور ہندو سنگھی رہنماؤں جیسے لالا لاجپت رائے، شادی لال، لالہ ہنس راج، راج بھاج دتا اور دیگر نے ہندو سبھا قائم کی جس کا مقصد ہندوؤں کی اخلاقی، ذہنی اور مادی حالات میں سدھار لانا تھا۔ تاہم پنجاب میں ہندو سبھا تحریک کے پیچھے سب سے پرزور قوت بہادر لال چند (1852-1912) کی تھی جو کہ ایک اہم آریہ سماجی لیڈر اور لاہور کے جج تھے۔ 1909ء میں لال چند نے لالہ لاجپت رائے کے اخبار 'پنجابی' میں 15 مضامین کی ایک سیریز لکھی۔ ان مضامین کا عنوان تھا 'Self-Abnegation in Politics' (سیاست میں خود کی دستبرداری) جو کہ بعد میں اسی عنوان سے 1938ء میں کتابی شکل میں شائع ہوئے۔ اس کتاب میں دو قومی نظریہ کا ہندو مماثل ملتا ہے۔ وہ کانگریس کے ملی جلی قومیت کے نظریہ کے سخت خلاف تھے۔ ان کے مطابق، 'حب الوطنی فرقہ وارانہ بنیادوں پر ہونی چاہیے نہ کی صرف جغرافیائی بنیادوں پر۔'

ہندو شعور کی بیداری کے اس پس منظر میں 1909ء میں پنجاب ہندو سبھا کا قیام عمل میں آیا جس کا مقصد 'ہندو طبقات کے مفادات کا تحفظ' تھا۔ ایم ایم مالویہ نے اکتوبر 1909ء میں اس کے پہلے اجلاس کی صدارت کی۔ سبھا نے 21 اور 22 نومبر کو پہلی صوبہ پنجاب

ہندو کانفرنس کاانعقاد کیا جس میں پنجاب، متحدہ صوبجات اور شمالی ہندوستان سے 3ہزار رہنماؤں نے شرکت کی۔ کانفرنس میں ان رہنماؤں نے ہندوؤں کی گھٹتی تعداد، مسلمانوں کے مقابلے ہندوؤں کو طاقتور بنانے، ہندوؤں ایک علاحدہ قومی اور ممتاز قوم تصور کرنے، مسلم لیگ کے بڑھتے اثرات سے ہندو مفادات کو لاحق خطرات، برطانوی حکومت کے تقسیمی رویہ وغیرہ پر بات کی۔ کانفرنس نے بالخصوص کانگریس پر تنقید کی اور اس پر ہندو مفادات کے تحفظ میں ناکام ہونے کا الزام عائد کیا۔اس نے 'ہندو مرکوز سیاست' پر زور دیا۔1909ء سے 1914ء تک پنجاب ہندو سبھا نے پنجاب میں پانچ کانفرنسیں کیں۔

1910ء کے بعد سے کل ہند ہندو ایسو سی ایشن بنانے کی کاوشیں شروع ہوئیں۔ پنجاب ہندو سبھا نے 8دسمبر 1913ء کو امبالا میں منعقدہ اپنے پانچویں اجلاس میں آل انڈیا ہندو سبھا کی تشکیل کی قرارداد منظور کی۔ بالآخر ہندو علاحدگی پسندوں کی مسلسل کاوشوں کی بنا پر اپریل 1915ء میں ہردوار میں کمبھ میلے کے موقع پر ہندوؤں کی آل انڈیا کانفرنس منعقد کی گئی۔اس کانفرنس ہی میں آل انڈیا ہندو سبھا (سرواد یشک ہندو سبھا) کی بنیاد پڑی۔ قاسم بازار کے مہاراجہ منندراچندر انندی، نے اس کانفرنس کی صدارت کی۔1921 میں اس کا چھٹا اجلاس ہردوار کے مقام ہی پر منعقد ہوا اور اس کا نام بدل کر آل انڈیا ہندو مہاسبھا رکھ دیا گیا۔

13.10.1 ہندو مہاسبھا کے مقاصد (Objectives of the Hindu Mahasabha)

1. ہندوؤں کے درمیان 'اتحاد اور اتفاق' پیدا کرنا
2. ہندو کمیونٹی میں تعلیم کو فروغ دینا
3. ہندو کمیونٹی کے تمام طبقات کی اصلاح کرنا
4. 'جہاں اور جب بھی ضروری ہو' ہندو مفادات کا تحفظ کرنا
5. ہندو اور ہندوستان کے دیگر طبقات کے درمیان بہتر تعلقات پیدا کرنا اور ان کے ساتھ دوستانہ انداز میں پیش آنا اور حکومت کے ساتھ 'وفاداری پر مبنی تعاون' کرنا
6. بالعموم اپنی کمیونٹی کے 'مذہبی، اخلاقی، تعلیمی، سماجی اور سیاسی مفادات' کے فروغ کے لیے اقدامات کرنا

ہندو مہاسبھا نے 'ہندو اتحاد و اتفاق' پر زور دیا اور برطانوی حکومت کی وفادار رہی۔ شمالی ہندوستان یعنی یوپی، بہار، دہلی اور پنجاب میں ایک مضبوط قوت بن کر ابھری۔1926ء کے آخر تک ہندو مہاسبھا نے پورے ملک میں 362 شاخیں قائم کر لیں۔ جنوبی ہند میں اس کا زیادہ اثر ورسوخ نہیں تھا۔ مدن موہن مالویہ (1861–1948) جو ایک کانگریسی تھے اور دو مرتبہ (1909ء اور 1918ء) کانگریس کے صدر رہے، 24-1922ء میں ہندو مہاسبھا کے پہلے صدر بنے۔لالہ لاجپت رائے (1965–1928) اور (26–1925) کے دوران ہندو مہاسبھا کے صدر رہے۔ بی ایس مونجے نے 1927–1933 کے درمیان اس کی قیادت کی۔ ان کے بعد بھائی پرمانند (1948–1947) اس کے صدر بنے۔ وی ڈی ساورکر نے 1937ء میں اس کی قیادت کی۔

'تمام ہندوؤں' کے مفادات کے تحفظ کا دعویٰ کرنے والی ہندو مہاسبھا نے 1909ء کے انڈین کونسل ایکٹ کے تحت مسلمانوں کو دیے گئے علاحدہ انتخابی حلقے کی مخالفت کی۔ ہندو سبھا کے جنرل سکریٹری شادی لال نے اپریل 1909ء میں یہ کہتے ہوئے وائسرائے لارڈ منٹو کے پاس عرضداشت داخل کی کہ حکومت مسلمانوں کے تئیں نرم رویہ اختیار کر رہی ہے اور انہوں نے اس بات پر احتجاج کیا کہ 'مسلمانوں کی حد سے زیادہ نمائندگی' انصاف و دیانت کے خلاف ہے۔ ہندو سبھا کے رہنماؤں نے ہندو جذبات کا استحصال کرتے ہوئے ہندوؤں کی گھٹتی تعداد اور ہندو نسل کی معدومیت پر تشویش کا اظہار کیا۔ یو این مکھرجی کا اثر انگیز پمفلٹ 'ہندو: ایک ختم ہوتی قوم' نے بتایا کہ مسلمانوں اور عیسائیوں کی بڑھتی تعداد کی بنا پر ہندو آئندہ 420 سال میں ختم ہو جائیں گے۔ سوامی شردھانند (1857-1926) ایک مشہور ہندو عوامی لیڈر تھے۔ انہوں نے مسلمانوں اور عیسائیوں پر حملہ کرتے ہوئے کہا کہ وہ 'تشدد، طاقت اور دھوکہ' سے ہندوؤں کا مذہب بدل رہے ہیں۔ اس طرح کے پروپیگنڈہ نے ہندو اور مسلمانوں میں موجودہ خلیج کو مزید بڑھا دیا۔

ہری دوار میں 1921 میں منعقدہ چھٹے اجلاس میں سبھا نے اپنے دستور میں تبدیلی کرتے ہوئے 'متحدہ اور خود کی حکومت' کو آئیڈیل بنا کر پیش کیا اور 'وفاداری' کا لفظ نکال دیا۔ اپنے ایک خصوصی اجلاس میں اس نے عدم تعاون اور سودیشی کو اپنے پروگراموں کا مرکز بنایا۔ تاہم وہ عوامی سیاست میں داخل نہیں ہوئی۔ تحریک عدم تعاون کے دور میں ہندو مہاسبھا سرگرم نہیں رہی۔ مالویہ نے دسمبر 1922ء میں گیا کے اجلاس میں فکری بنیادوں پر تنظیم کو دوبارہ شروع کیا۔ 1923ء میں منعقدہ مہاسبھا کا بنارس اجلاس انتہا پسندانہ قوم پرستی کے ظہور کا اشارہ تھا۔ عدم تعاون کے مختلف پہلو جیسے نئی کونسلوں کا بائیکاٹ، سرکاری نوکریوں سے استعفیٰ وغیرہ پر سبھا کی حیثیت متضاد رہی۔

تصویر۔ مدن موہن مالویہ

سیتارام چترویدی، جدید ہندوستان کے معمار: مدن موہن مالویہ، پبلی کیشنز ڈویژن، وزارت اطلاعات ونشریات، حکومت ہند، 2014۔

لاجپت رائے نے عدم تعاون کو 'غیر عملی' بتاتے ہوئے اس کی مخالفت کی۔ انہوں نے کہا کہ کونسلوں کا بائیکاٹ صوبوں کے لیے لازمی نہیں ہے۔ راجا رام پال سنگھ نے یہ کہتے ہوئے تحریک کو رد کر دیا کہ ہندوؤں کے مفادات کا تحفظ 'اعلیٰ قسم کی حب الوطنی' ہے۔ گو کہ مالویہ نے پہلے 1920 کے الیکشن سے دستبرداری اختیار کر لی، انہوں نے اس کے باقی مراحل میں عدم تعاون کی مخالفت کی۔ 1923ء کے بعد ان کا سیاسی کیریر کافی کامیاب ہوا۔ ان کے مطابق عدم تعاون ہندو مفادات کے لیے نقصان دہ تھا۔ انہوں نے اسکول اور کالج کے بائیکاٹ کو 'تعلیمی خودکشی' بتایا۔ مالویہ اس بات پر برہم تھے کہ مسلمانوں کی خاطر ہندو سیاست دانوں کو قانون ساز کونسلوں کے بائیکاٹ کے لیے کہا جا رہا ہے اور 'برسوں کی سیاسی محنت سے حاصل کی گئی کامیابیوں' کو قربان کیا جا رہا ہے۔ مالویہ کے بیشتر ساتھیوں نے عدم تعاون پروگرام کی مخالفت کی اور نومبر و دسمبر 1920ء کے الیکشن میں قانون ساز کونسلوں میں داخل ہوئے۔ بی ایس مونجے اور ایم جیکر نے کونسلوں کے بائیکاٹ کی گاندھی

کی اپیل مسترد کردی اور مستعفی ہونے سے انکار کر دیا۔ راجا نریندر ناتھ جو پنجاب ہندو سبھا کے سکریٹری تھے نے بائیکاٹ کی پروا کیے بغیر پنجاب قانون ساز کونسل کے انتخابات میں حصہ لیا اور کانگریس پر 'ہندو مفادات' سے پہلو تہی کا الزام لگایا۔ ان کا ماننا تھا کہ عدم تعاون کے درمیان حاصل کیا گیا ہندو مسلم اتفاق غیر عملی تھا۔

ہندو مہاسبھا نے انڈین نیشنل کانگریس کی پیش کردہ متحدہ قومیت کے تصور کی مخالفت کی۔ مہاسبھا نے مسلمانوں کو ہندو قوم سے 'الگ' تصور کیا۔ مالویہ کے مطابق مسلم 'بیرونی حملہ آور' تھے۔ بی ایس مونجے نے کہا کہ صرف برطانوی حکومت کے خلاف ہی آزادی کی تحریک چلانا کافی نہیں ہے بلکہ اسے مسلمانوں کے خلاف بھی چلانا چاہیے۔ انہوں نے ہندوستان کو ہندوؤں کے گھر میں تبدیل کرنے کی بات کی۔ سوامی شردھانند کے خیال میں اسلام 'قتل و غارت گیری، چوری، غلامی اور بے راہ روی و جنسی رویوں' کا مذہب تھا۔ انہوں نے ہندوؤں کو مسلمانوں سے الگ رہنے، مسلم تہواروں میں شریک نہ ہونے، مسلم مزاروں کا دورہ نہ کرنے اور مسلم علما کی پیروی نہ کرنے کا مشورہ دیا۔ وی ڈی ساورکر کا ماننا تھا کہ مسلمان ہندوستان کے وفادار نہیں ہو سکتے اور وہ اسے 'مسلم ریاست' میں بدلنے کا ایک خفیہ ایجنڈہ لے کر کام کر رہے ہیں۔ ایم ایس گولوالکر کے مطابق مسلم ہندوستان کے لیے ایک 'اندرونی خطرہ' ہیں اور انہوں نے ہزاروں سال کے لیے ہندوستان کو غلام بنا کر رکھنے کا منصوبہ تیار کیا ہوا ہے اور اسلام ہندوستان میں ایک 'تباہ کن' قوت ہے۔ بھائی پرمانند نے کہا کہ مسلمان، ہندوؤں کو دائرہ اسلام میں داخل کرنے کے مذہبی فریضہ سے بندھے ہوئے ہیں۔ ہندو مہاسبھا کے جنرل سکریٹری اشوتوش لہری کے مطابق ہندوستان میں رہنے والے تمام مسلمان 'سچے قوم پرست' نہیں ہیں۔ پنڈت آتمارام نے علی گڑھ سے بیان دیا کہ مسلمان 'گوکشی کے ذمہ دار' ہیں اور انہیں 'ہندوستان سے باہر بھگا دینا چاہیے۔' انہوں نے ہندوؤں سے درخواست کی کہ وہ مسلمانوں کی داڑھی اور مونچھ نوچ ڈالیں اور ان کے دکانات و مکانات کو آگ لگا دیں۔ ہندو مبصرین نے یہ کہتے ہوئے ہندوؤں کو خوفزدہ کیا کہ اگر آریہ سماج کام نہیں کرے گی تو ہندوستان سے گائے غائب ہو جائے گی اور گائتری کی جگہ کلمہ لے لے گا۔ بھائی پرمانند کے مطابق مسلمان، انگریزوں سے اپنے تعلقات اور 'اپنے علاحدہ مطالبات و سازشوں' کی بنا پر برطانوی حکومت کے خلاف جدوجہد میں ہندوؤں کی راہ میں حائل ہو چکے ہیں۔ ہندو قوم پرستوں کا احساس تھا کہ مسلمان قوم پرست نہیں ہو سکتے کیوں کہ قوم پرستی ان کی 'بنیادی نوعیت' کی بنا پر 'بیرونی' ہے۔

جب 1915ء میں کمبھ میلہ کانفرنس میں آل انڈیا ہندو سبھا قائم کی گئی تو گاندھی وہاں موجود تھے اور انہوں نے اس کے قیام کی سخت مخالفت کی۔ ہندو مہاسبھا کے کئی ارکان، کانگریس سے بھی وابستہ تھے اور اس طرح دوہری رکنیت کے اصول کو برقرار رکھا گیا لیکن یہ معاملہ مسلم لیگ کے ساتھ نہیں تھا۔ کانگریس پر ہندو مہاسبھا کا اتنا زیادہ اثر تھا کہ ایک کانگریسی سوشلسٹ کے ایم اشرف نے مہاسبھائیوں پر کانگریس میں اہم عہدوں پر قبضہ کرنے اور آگرہ، اودھ، علی گڑھ، بدایوں، بندیل کھنڈ، یوپی میں کانگریس استقبالیہ کمیٹیاں جوائن کرنے کی اجازت پر احتجاج کیا۔ جب فرقہ وارانہ تنظیمیں اپنی شدت پسندی کی علامات دکھانا شروع کر رہی تھیں 16 دسمبر 1938ء کو کانگریس نے ہندو مہاسبھا اور مسلم لیگ کو 'فرقہ وارانہ جماعتیں' قرار دیتے ہوئے بلیک لسٹ کر دیا اور کانگریس ارکان پر اس طرح کی جماعتوں میں 'دوہری رکنیت' لینے پر پابندی عائد کر دی۔

13.11 ہندو مسلم تعلقات (Hindu–Muslim Relations)

1923 میں کاکی ناڈا میں کانگریس کے سالانہ اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے محمد علی نے مسلمانوں سے اپیل کی تھی کہ وہ ہندوؤں کے ساتھ متحد ہو جائیں۔ یہ اتحاد پین اسلامک مقاصد کی تکمیل میں ان کا مددگار ثابت ہوگا۔ انہوں نے یہ بھی واضح کیا کہ برطانوی پالیسی یہ ہے کہ اسلامی مقاصد کی مخالفت کی جائے۔ ان کی اپیل کا فرقہ وارانہ سیاست پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ قدیم فرقہ وارانہ ذہنیت کی تجدید میں دونوں فرقوں کے درمیان آئے دن چھوٹی چھوٹی باتوں پر جھڑپیں ہونے لگیں۔ 1920ء میں مالابار، آگرہ اور دوسرے کئی مقامات پر ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان انتہائی افسوسناک واقعات پیش آئے۔ کئی مقامات جیسے لکھنو اور الہ آباد میں شدید نوعیت کا فرقہ وارانہ تصادم ہوا۔ اس طرح کے فرقہ وارانہ فسادات نے باہمی عدم اعتماد میں اضافہ کیا اور ہندو اور مسلمانوں کے تعلقات مزید خراب ہوگئے اور فرقہ وارانہ جماعتیں اس فرقہ وارانہ فضا کا فائدہ اٹھانے لگیں۔ ہندو سنگھٹن تحریک نہ صرف ہندوؤں کے مفادات کے تحفظ کے لیے جمع ہوئیں بلکہ چند نام کے مسلم گروہوں کو ہندوؤں میں واپس لینے کا دعویٰ کیا۔ اس دعویٰ کا مقابلہ کرنے کے لیے مسلمانوں میں 'تبلیغ' اور 'تنظیم' تحریکات شروع ہوئیں۔ ہر ایک نے دوسرے کے فیصلے کو شک کی نظر سے دیکھنا شروع کیا۔ اسطرح ملک میں فرقہ واریت کی فضا قائم ہوتی چلی گئی جس نے ہندو مسلم اتحاد کو سب سے زیادہ نقصان پہنچایا۔

13.12 مسلم لیگ کا احیا (Revival of the Muslim League)

1922ء میں تحریک عدم تعاون سے اچانک دستبرداری اور 1924ء میں مصطفیٰ کمال پاشاہ کی جانب سے خلافت کو ختم کرنے کے اعلان سے انگریزوں کے خلاف لڑرہے تمام مسلمانوں کو اچانک جھٹکہ لگا۔ ان کے سامنے اچانک ایک سیاسی خلا پیدا ہو گیا۔ وہ بے تابی سے کسی لیڈر کا انتظار کرنے لگے جو انہیں سر گرم سیاست میں شامل کرے۔ اس سے مسلم لیگ کے احیا کی صورت پیدا ہوئی جو پچھلے کچھ عرصہ سے غیر فعال تھی۔ اس کی سر گرمیاں جو پچھلے چار سال سے معطل تھیں، صدر محمد علی جناح کی قیادت میں مئی 1924ء میں لاہور میں ہونے والی میٹنگ کے بعد دوبارہ شروع ہوئیں۔ اس اجلاس میں مسلم لیگ نے 'سوراج کو تیزی سے حاصل کرنے' کا اعلان کیا۔ اس نے ہندوستان میں بننے والی کسی بھی دستور میں شامل کرنے کے لیے چند 'بنیادی اصول' بھی وضع کیے۔

مسلم لیگ نے ہندوستان کے لیے خود مختار صوبوں کے ساتھ وفاقی دستور کا مطالبہ کیا جس میں مرکزی حکومت کے کام کاج۔ عمومی مسائل تک محدود کر دیے گئے تھے۔ اس نے قانون ساز مجالس اور دیگر میں 'مناسب اور موثر نمائندگی' کی ضمانت اور اس وقت رائج 'علاحدہ انتخابی حلقوں' کے نظام کو جاری رکھنے کا مطالبہ کیا۔ فرقہ کو متاثر کرنے والا کوئی بھی بل قانون ساز اسمبلی میں منظور نہیں کیا جائے گا اگر اس کمیونٹی کے تین چوتھائی افراد اس کی مخالفت کریں۔ مسلم لیگ نے تمام عوامی جماعتوں سے فرقہ وارانہ تناؤ کم کرنے کی اپیل کی اور ہندو مسلم اتحاد پر زور دیا۔ لیگ کے مطابق سوراج کے حصول کے لیے بین فرقہ جاتی اتحاد ضروری تھا اور اس نے تمام فرقہ وارانہ مسائل کے پر امن حل کے لیے مصالحتی مجالس کے قیام کا مطالبہ کیا۔ جناح نے ہندو مسلم اتحاد سے متعلق قرارد پیش کرنے اور اسے منظور کروانے میں اہم کردار

ادا کیا۔

13.13 فرقہ ورانہ فسادات (Communal Riots)

تحریک عدم تعاون سے دستبرداری کے بعد سے ہندوستان کی سیاسی فضاء شدید نوعیت کے فرقہ وارانہ فسادات کے سبب مکدّر ہو گئی۔ یہ ایک المیہ تھا کہ سات صدیوں سے ہندو مسلمان مل جل کر ساتھ ساتھ زندگی گزارنے کے باوجود چند گہری سماجی، سیاسی اور مذہبی وجوہات کے سبب ابھی تک یہ دو علاحدہ اکائیوں کی حیثیت برقرار رکھے ہوئے تھے۔ دونوں فرقوں کے کئی نمایاں رہنماؤں نے اختلافات کے ان اسباب کو دونوں فرقوں کی آپسی تعلقات اور سمجھوتے کی مدد سے ختم کرنے کی کوشش کی۔ 1921ء میں ایک کمیٹی مقرر کی گئی تاکہ انڈین نیشنل ایکٹ تیار کیا جا سکے۔ ڈاکٹر انصاری اور لالہ لاجپت رائے نے اس کا مسودہ تیار کیا اور اسے 1923ء میں پیش کیا۔ اسی اثنا میں سی۔ آر۔ داس کی تحریک پر بنگال کانگریس کمیٹی نے بنگال کے لیے ایک ہندو مسلم ایکٹ منظور کیا۔ ایکٹ میں علاحدہ حلقہ انتخاب کے ذریعہ آبادی کے بنیاد پر مجلس قانون ساز میں نمائندگی کی گنجائش رکھی گئی۔ مقامی اداروں میں نمائندگی ہر ڈسٹرکٹ میں 60:40 کے تناسب سے رکھی گئی۔ 60 اکثریتی فرقے کے لیے اور 40 اقلیتی فرقہ کے لیے، سرکاری عہدوں کا 55 فیصد مسلمانوں کو دیا جائے، مسجدوں کے سامنے کسی طرح کا گانا بجانا نہ ہو۔ مگر یہ ایکٹ جس پر لمبے مباحث ہوئے کانگریس کے کھلے اجلاس میں شکست سے دوچار ہو گیا۔

مئی 1923ء میں کلکتہ میں بدترین فساد پھوٹ پڑا جب کہ ایک آریہ سماجی جلوس نے مسجد کے سامنے گانا بجانا شروع کیا۔ فسادات کئی دن تک جاری رہے اور دونوں فرقوں کے کئی لوگ مارے گئے۔ 1924ء میں بقرعید کے موقع پر فسادات کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔ جن میں سے بدترین فساد دہلی میں ہوا۔ ناگپور میں سڑکوں پر لڑائی شروع ہو گئی۔ جبل پور اور دوسرے شہروں کا بھی یہی حال رہا۔ فوج کی جانب سے فائرنگ کے بعد ہی امن بحال ہو سکا۔ شمال مغربی سرحدی صوبے میں جو کہ نمایاں طور سے ایک مسلم علاقہ ہے کوہاٹ کے مقام پر بدترین فساد ہوا۔ گڑبڑ اس وقت ہوئی جب کہ سناتن دھرم سبھا نے ایک پمفلٹ جاری کیا۔ جس میں ایک مخالف اسلام نظم شامل تھی۔ شہر کے ہندوؤں پر حملے کیے گئے اور پولیس ان حملوں کو روکنے میں ناکام ہو گئی۔ اس المیہ کی دکھ بھری داستان انڈین نیشنل کانگریس ہندو مہاسبھا اور مسلم لیگ کے لیے بحث کا موضوع بن گئے۔ اکتوبر 1924ء میں رام لیلا کے دوران الہ آباد میں ایک فساد پھوٹ پڑا جس میں 12 لوگ ہلاک ہو گئے۔ اسی سال لکھنؤ شہر امین آباد پارک میں نماز کے مسئلہ پر ایک بڑا فساد برپا ہوا۔ 1925ء تا 1926ء میں ہندو مسلم تعلقات میں مزید بگاڑ پیدا ہوتا چلا گیا۔ اس دوران تقریباً 30 فرقہ وارانہ فسادات ہوئے۔ جن میں سے زیادہ تر یوپی اور بنگال میں ہوئے۔ فرقہ وارانہ نفرت کی فضا اتنی زیادہ تھی کہ 23 دسمبر 1926ء کو دہلی میں عبدالرشید نے سوامی شردھانند کو قتل کر دیا اور مسلم پریس نے رشید کو غازی قرار دیا۔ 1927ء میں بدری شاہ اور بھیراؤ سنگھ جیسے آریہ سماج کے قائدین بہرائچ اور ماؤنٹ ابو میں قتل کر دیے گئے۔

1926ء میں موتی لال نہرو، ابوالکلام آزاد نے ایک منشور پیش کیا جس میں تجویز دی گئی کہ انڈین نیشنل یونین کے نام سے ایک غیر فرقہ وارانہ تنظیم قائم کی جائے، مگر یہ تنظیم قائم ہی نہیں کی جا سکی۔ اسی سال بنگال کونسل کے غیر سوراجی مسلم ارکان کو لے کر سر عبدالرحیم

मौलाना आज़ाद नेशनल उर्दू यूनिवर्सिटी Estd. 1998 MAULANA AZAD NATIONAL URDU UNIVERSITY

نے بنگال مسلم پارٹی قائم کی۔ انہوں نے اپنے اس اقدام کا جواز یہ پیش کیا کہ ہندوستان کی تقریباً تمام سیاسی پارٹیاں کسی نہ کسی طرح فرقہ وارانہ کردار کی حامل ہیں۔ دونوں فرقوں کے درمیان خلیج کو باٹنے کی کانگریس اور اعتدال پسندوں کی تمام کوششیں رائیگاں گئیں۔ ان اختلافات کا یقینی اثر ملک کی سیاست اور جدوجہد آزادی پر پڑا۔

13.14 محمد علی جناح (Mohammad Ali Jinnah)

1906ء میں بحیثیت بیرسٹر ہندوستان لوٹنے کے بعد محمد علی جناح (1876-1948) نے انڈین نیشنل کانگریس میں شمولیت اختیار کی اور 1906ء میں کلکتہ میں منعقدہ کانگریس کے اجلاس میں دادا بھائی نوروجی کے سکریٹری کی ذمہ داری نبھائی۔ جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ وہ مسلم لیگ کی تشکیل کے مخالف تھے۔ لیگ کے صدر آغا خان کے الفاظ میں جناح نے کہا تھا کہ 'علاحدہ انتخابی حلقوں کا ہمارا مطالبہ خود ملک کو ہی تقسیم کرنے کا باعث بن رہا ہے۔' جیسا کہ 1906ء سے وہ قومی اتحاد کے درپے تھے، سروجنی نائیڈو نے جناح کو 'ہندو۔ مسلم اتحاد' کا سفیر قرار دیا۔ گو کہ جناح نے 1913ء میں مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کی انہوں نے علاحدہ حلقہ انتخاب کی مخالفت کی کیوں کہ ان کے خیال میں اس سے ملک کی تقسیم کا اندیشہ تھا۔ تاہم ایک قابل ذکر تبدیلی ہوئی؛ اس کے بعد انہوں نے بھی مسلمانوں کے نمائندے کی حیثیت سے بات کرنی شروع کردی۔ تاہم وہ اب بھی قوم پرستی اور سیکولر سیاست سے وابستہ تھے۔ یہ ہم جانتے ہیں کہ جناح نے کانگریس اور مسلم لیگ کو ایک جگہ لانے اور لکھنؤ معاہدہ کروانے میں اہم کردار ادا کیا۔ وہ رولٹ بل کی منظوری کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے قانون ساز اسمبلی سے مستعفی ہوگئے۔

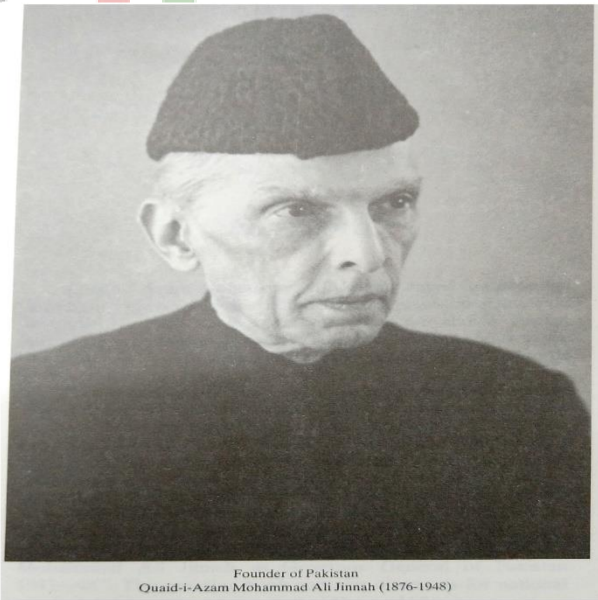

تصویر۔ محمد علی جناح

(Jaswant Singh, Jinnah: India-Partition-Independence, Rupa, New Delhi, 2009.)

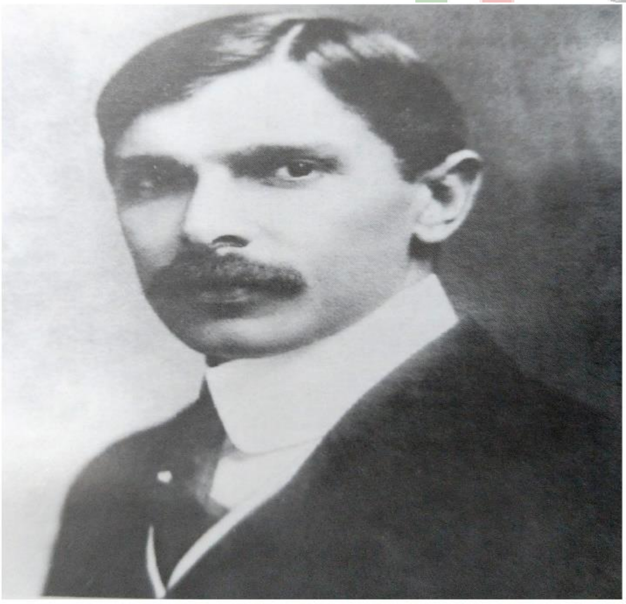

تصویر۔ محمد علی جناح (جوانی میں)

(Jaswant Singh, Jinnah: India-Partition-Independence, Rupa, New Delhi, 2009.)

جناح نے 1924ء میں لیگ کا احیا کیا اور اس سال لاہور میں ہونے والے اس کے اجلاس کی صدارت کی۔ 1927ء میں انہوں نے لیگ کے ایک بڑے حصہ کو علاحدہ انتخابی حلقوں کے خلاف قائل کرلیا اور مسلم مفادات کے تحفظ کے لیے چند اقدامات اٹھائے۔ انہیں 'دہلی

پیشکش' کہا جاتا ہے۔ تاہم علاحدہ انتخابی حلقوں کے سوال پر لیگ تقسیم ہو گئی اور سر محمد شفیع کے گروپ نے علاحدہ انتخابی حلقوں سے دستبرداری کی مخالفت کی۔ کچھ عرصہ میں جناح کے زیر اثر گروہ ختم ہو گیا اور دیگر لوگ بھی ان کے ہمنوا بن گئے۔ 1929ء میں دہلی میں منعقدہ آل پارٹیز مسلم کانفرنس کی جانب سے جناح نے 'چودہ نکات' وضع کیے جو کئی سال تک لیگ اور دیگر جماعتوں میں مشاورت کی بنیاد بنے رہے۔ اہم مطالبات یہ تھے:

1. مستقبل کا دستور وفاقی طرز کا ہوگا جس میں صوبوں کو ان کے مستحقہ اختیارات دیے جائیں گے۔ تمام صوبوں کو ایک جیسی خود مختاری عطا کی جائے گی۔
2. ملک کی تمام مجالس قانون ساز اور منتخبہ اداروں میں اقلیتوں کو مناسب اور موثر نمائندگی دی جائے گی۔
3. علاحدہ حلقہ انتخاب کے ذریعہ مسلمانوں کے فرقہ وارانہ گروہ کی حیثیت سے نمائندگی کی جائے گی۔
4. کوئی بھی از سر نو علاقائی تقسیم کسی بھی صورت میں شمال مغربی سرحدی صوبے پنجاب اور بنگال میں مسلم اکثریت کے موقف کو متاثر نہیں کرنی چاہیے۔ سندھ کو بمبئی پریسڈنسی سے علاحدہ کیا جائے۔
5. تمام فرقوں کو مکمل مذہبی آزادی عطاء کی جائے۔ دستور میں مسلم تمدن، تعلیم، زبان اور پرسنل لاء کے تحفظ کے لیے مناسب حفاظتی دفعات فراہم کی جائیں۔
6. چاہے مرکزی ہو یا صوبائی مقننہ اس کے ایک تہائی 3/1 ارکان مسلم اقلیت سے لیے جانے چاہیے۔

جناح، علی برادران، محمد شفیع اور دوسرے مسلم رہنماؤں نے پہلی گول میز کانفرنس کی تجویز کا خیر مقدم کیا۔ انہوں نے مطالبہ کیا کہ کانفرنس میں مسلم نمائندے، صحیح معنوں میں فرقہ کی نمائندگی کرنے والے ہونے چاہیے۔ انہوں نے واضح کیا کہ قوم پرست مسلمانوں کے لیے میٹنگ میں کوئی جگہ نہیں ہے۔ حکومت نے اس تجویز کا خیر مقدم کیا۔ چوں کہ یہ ان کی پھوٹ ڈالو اور راج کرو کی پالیسی سے میل کھاتی تھی۔ پہلی گول میز کانفرنس میں تقریباً سبھی ممتاز مسلم لیڈر شریک ہوئے۔ انہوں نے کھلے الفاظ میں اعلان کیا کہ کوئی ایسا دستور جس میں مسلم مفادات کا مناسب تحفظ مہیانہ کیا گیا ہو وہ ان کے لیے ہرگز قابل قبول نہیں ہے اور یہ کہ صرف مسلم قائدین ہی اس بات کے اہل ہیں کہ مجوزہ تحفظات کے کارآمد ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں فیصلہ کر سکیں۔ کانفرنس نے اس مطالبہ کو کم و بیش تسلیم کر ہی لیا۔

دوسری گول میز کانفرنس میں مسلم لیگ سے کوئی سمجھوتہ کرنے کی گاندھی کی ہر کوشش ناکام ہو گئی اور آخر کار انگلستان کے وزیر اعظم میکڈونالڈ کی ثالثی کی ضرورت آن پڑی۔ 16 اگست 1932 کو اس کی جانب سے دیا گیا کمیونل ایوارڈ، لیگ کی ایک فتح تھی۔ اس نے عملی طور پر اس کو تسلیم کر لیا جسے سائمن کمیشن نے بھی غیر منصفانہ کہا تھا۔ کمیونل ایوارڈ کے ذریعہ نہ صرف مسلمانوں بلکہ سکھوں اور اینگلو انڈین کے لیے بھی علاحدہ حلقہ انتخاب مقرر کیے گئے اور پسماندہ فرقوں کے لیے خصوصی نشستیں فراہم کی گئیں۔

پونا معاہدہ کے بعد 1932ء میں ایک یونٹی کانفرنس الہ آباد میں منعقد کی گئی۔ دستوری مسائل پر تمام نمایاں اختلافات پر سمجھوتے

کی غرض سے ایک کمیٹی مقرر کی گئی۔ کمیٹی نے جوائنٹ حلقہ انتخاب پر اتفاق کیا بشرطیکہ یہ دفعہ رکھی جائے کہ ایسا کوئی امیدوار کامیاب نہیں قرار دیا جائے گا جسے اپنے ہی فرقے کے ڈالے گئے ووٹوں کا کم از کم 30 فی صد نہ حاصل ہوا ہو۔ مرکزی مقننہ میں 32 فی صد مسلم نمائندگی منظور کی گئی۔ قبل اس کے کہ کمیٹی اپنی تجاویز کا اعلان کرتی، برطانوی حکومت نے مسلمانوں کے لیے مرکزی مقننہ میں 33 فی صد (3/1) ایک تہائی نشستوں کا اعلان کر دیا اور ایک علاحدہ سندھ صوبے کا بھی فیصلہ کر دیا۔ پھوٹ ڈالو اور راج کرو کی اس برطانوی پالیسی اور جناح کے رویے سے یہ ظاہر ہو گیا کہ برطانوی حکمرانی میں ہندو مسلم اتحاد ہونا ناممکن ہے۔ اس دور میں فرقہ واریت کے فروغ کے سبب تقسیم ہند ہی ایک منطقی پیش رفت نظر آنے لگا تھا۔

کسی وقت 'ہندو مسلم اتحاد کے سفیر' رہنے والے جناح، 1930ء کے عشرے کے اواخر اور 1940ء کے عشرے کی ابتدا میں اتنے فرقہ پرست ہو گئے کہ ان کے کچھ بیانات غور کرنے کے قابل ہیں۔ 1938ء میں مسلم لیگ سے صدارتی خطاب کرتے ہوئے انہوں کہا کہ 'کانگریس اس ملک میں ہندو راج قائم کرنے کے لیے کوشاں تھی۔' مارچ 1940ء میں انہوں نے علی گڑھ کے طلبا سے کہا کہ 'گاندھی مسلمانوں کو ہندو راج کے تحت غلام بنا کر رکھنا چاہتے تھے۔' مارچ 1941ء میں علی گڑھ میں خطاب کرتے ہوئے انہوں نے مسلمانوں سے اپیل کی کہ 'پاکستان نہ صرف ایک عملی مقصد ہے بلکہ اگر آپ اس ملک میں اسلام کو مٹنے سے بچانا چاہتے ہیں تو یہی واحد مقصد ہے۔' 1946ء میں مسلمانوں سے لیگ کو ووٹ دینے کی اپیل کرتے ہوئے انہوں نے دھمکی دی کہ 'اگر ہم آج اپنا فرض پہچاننے میں ناکام ہو جاتے ہیں، تو آپ شودر بن کر رہ جائیں گے اور اسلام ہندوستان سے ختم ہو جائے گا۔'

اس طرح مسلم فرقہ پرستوں نے 'اسلام خطرے میں ہے' کا نعرہ لگا کر عام مسلمانوں کو اپنے اطراف جمع کر لیا جس طرح ہندو فرقہ پرستوں نے ہندوؤں کو مشتعل کرنے کے لیے 'ہندو مذہب خطرے میں ہے' کا نعرہ لگایا تھا۔ بالآخر دونوں ہی جانب کے فرقہ پرست، بدترین فرقہ وارانہ فسادات اور ملک کی تقسیم کے ذریعے سب سے بڑے انسانی المیے کا سبب بنے جہاں سرحد کے دونوں جانب موجود آبادیوں کو ہجرت کرنی پڑی۔ اور آج بھی فرقہ واریت ہمارے سامنے ایک چیلنج بن کر کھڑی ہوئی ہے

13.15 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ سمجھ چکے ہونگے کہ فرقہ واریت بنیادی طور پر ایک نظریہ ہے اور یہ جدید دور کی دین ہے۔ نوآبادیاتی دور میں کئی عوامل نے اس کے ابھرنے، پھیلنے اور مضبوط ہونے میں ہاتھ بٹایا۔ اب آپ ان عوامل جیسے مسلمانوں میں تعلیمی پسماندگی، نوآبادیاتی معیشت کے مخصوص اوصاف، نوکریوں کے لیے مقابلہ، ایک طبقہ کو دوسرے طبقہ سے لڑانے کی انگریزوں کی پالیسی، ہندوستانی تاریخ بطور خاص ہندوستانی عہد وسطیٰ کی غلط سمجھ، انتہا پسند قوم پرستوں میں شدید ہندو رنگ وغیرہ مسلمانوں کے اعلیٰ اور متوسط طبقہ میں علاحدگی پسندی کا سبب بنے۔ جس طرح مسلم لیگ نے تمام مسلمانوں کے مفادات کے تحفظ کا دعویٰ کیا، ٹھیک ویسے ہی ہندو مہاسبھا نے تمام ہندوؤں کے مفادات کی حفاظت کرنے کے بلند بانگ دعوے کیے۔ اس کے رہنما مسلمانوں کے شدید دشمن تھے۔ دونوں طرح کی فرقہ

واریت ہولناک فرقہ وارانہ فسادات کا سبب بنی۔1920 کے عشرے میں بڑھتا ہوا فرقہ وارانہ تناؤ ملک بھر میں فسادات کے سلسلے کی شکل میں ظاہر ہوا۔1938ء میں انڈین نیشنل کانگریس نے ہندو مہاسبھا اور مسلم لیگ دونوں کو فرقہ وارانہ جماعتیں قرار دیتے ہوئے پابندی عائد کر دی۔ کانگریس ارکان کی ان میں حصہ لینے پر پابندی لگادی گئی۔ جناح جنہیں ایک وقت 'ہندو مسلم اتحاد کا سفیر' کہا جاتا تھا 1930 کے عشرے کے آخر میں شدید فرقہ پرست بن گئے اور پاکستان کے خواب کی تعبیر کے حاصل ہونے تک مسلم لیگ کی قیادت کی۔

13.16 کلیدی الفاظ (Keywords)

فرقہ واریت: فرقہ واریت بنیادی طور پر ایک نظریہ (ideology) ہے۔ یہ ایک جدید نظریہ ہے اور ایک طرح سے برطانوی پالیسیوں کا نتیجہ ہے۔ کسی نظریہ کو اپنے آپ کے، دوسرے کے یا بڑے پیمانے پر سماج کے بارے میں، ادراک، خیالات اور افکار کے ایک مجموعے کے طور پر سمجھا جاسکتا ہے۔

دوہری رکنیت: ایک ہی وقت میں کانگریس اور کسی دوسری فرقہ پرست تنظیم کا رکن یا ممبر ہونا۔

اشراف مسلمان: مسلمانوں میں اپنے آپ کو حسب و نسب سے اعلیٰ تصور کرنے والا طبقہ جو ہمیشہ اپنے مفاد کے لیے تمام مسلمانوں کی وکالت کا دعویٰ کرتا تھا اور پس پردہ اپنے مفاد کے لیے کام کرتا تھا۔

13.17 نمونہ امتحانی سوالات (Model Exanimation Questions)

13.17.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. *The Indian Musalmans* کے مصنف کون ہیں؟
2. مرکزی قومی انجمن محمدی (Central National Mohammedan Association) کس نے قائم کی؟
3. تقسیم بنگال کس سال میں ہوئی؟
4. مسلم لیگ کہاں قائم کی گئی؟
5. سوامی شردھانند کو کس نے قتل کیا؟
6. مسلمانوں کو کس نے 'اندرونی خطرہ' تصور کیا؟
7. جناح کب مسلم لیگ میں شامل ہوئے؟
8. جناح کو 'ہندو مسلم اتحاد کا سفیر' کس نے بتایا؟
9. علی گڑھ میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کس سال میں قائم ہوا؟
10. بااثر پمفلٹ 'Hindus: A Dying Race' کس نے لکھا؟

13.17.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. جناح کے 'چودہ نکات' کے اجزا کیا تھے؟
2. ہندوستانی تاریخ میں لکھنؤ معاہدہ کی اہمیت پر نوٹ لکھیے۔
3. آپ برطانوی حکومت کے تئیں سرسید کے وفادار رویہ کی توجیہہ کس طرح کریں گے؟
4. فرقہ وارانہ تناؤ اور فسادات سے نمٹنے کے لیے قوم پرست لیڈر شپ نے کیا اقدامات کیے؟
5. ہندوستان کی مسخ شدہ تاریخ نے کس طرح فرقہ وارانہ نظریہ کی تخلیق میں مدد دی؟

13.17.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. فرقہ واریت کے پھیلنے میں ہندو مہا سبھا کے کردار کا تنقیدی جائزہ لیجیے۔
2. فرقہ واریت کے فروغ میں مسلم لیگ کے کردار پر ایک تنقیدی نوٹ لکھیے۔
3. آپ کے خیال میں فرقہ واریت اچھی ہے یا بری؟ کیوں؟ آپ نے جو کچھ دیکھا ہے یا دوسروں سے سنا ہے اس کی روشنی میں مثالیں دیجیے۔

13.18 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Learning Resources)

---

1. Bandyopadhyay, Sekhar, *From Plassey to Partition*: *A History of Modern India*, Orient Longman, Hyderabad, 2004.
2. Bapu, Prabhu, *Hindu Mahasabha in Colonial North India, 1915–1930*: *Constructing Nation and History*, Routledge, Abingdon, Oxon, 2013.
3. Batabyal, Rakesh, *Communalism in Bengal*: *From Famine to Noakhali, 1943–47*, Sage, New Delhi, 2005.
4. Becker, Mary Louise, *The All-India Muslim League,1906–1947: A Study in Leadership in the Evolution of a Nation*, Oxford University Press, Karachi, 2013.
5. Bolitho, Hector, *Jinnah*: *Creator of Pakistan*, Surjeet Publications, Delhi, 2005.
6. Chandra, Bipan, *Communalism in Modern India*, Vikas Publishing House, Ltd., New Delhi, 1996 (First Pub. in 1984).
7. Hasan, Mushirul, *Nationalism and Communal Politics in India 1885–1930*, Manohar, New Delhi, 2000 (first pub. 1991).
8. Ikram, S.M., *Indian Muslims and Partition of India*, Atlantic Publishers, New Delhi, 1992.
9. Jawed, Ajit, *Jinnah*: *Secular and Nationalist*, Kitab Publishing House, New Delhi, 1998.

10. Lelyveld, David, *Aligarh's First Generation: Muslim Solidarity in British India*, Oxford University Press, New Delhi, 2003 (First Pub. in 1978).
11. Mathews, Roderick, *Jinnah Vs. Gandhi*, Hatchet India, 2012.
12. Misra, Salil, *A Narrative of Communal Politics*: *Uttar Pradesh, 1937–39*, Sage, New Delhi, 2001.
13. Puniyani, Ram, *Communal Politics*: *Facts versus Myths*, Sage, New Delhi, 2003.
14. Reddy, Sheela, *Mr and Mrs Jinnah*: *The Marriage that Shook India*, Penguin, Gurgaon, 2017.
15. Renold, Leah, *A Hindu Education*: *Early Years of the Banaras Hindu University*, Oxford University Press, New Delhi, 2005.
16. Sarkar, Sumit, *Modern India* (*1885–1947*), Macmillan, New Delhi, 2005 (first pub. 1983).
17. Singh, Jaswant, *Jinnah*: *India, Partition, Independence*, *Rupa & Co.*, New Delhi, 2009.
18. Venkat, Dhulipala, *Creating a New Medina*: *State Power, Islam, and the Quest for Pakistan in Late Colonial North India*, Cambridge University Press, New Delhi, 2015.
19. Wells, Ian Bryant, *Ambassador of Hindu–Muslim Unity*: *Jinnah's Early Politics*, Permanent Black, Delhi, 2005.
20. Wolpert, Stanley, *Jinnah of Pakistan*, Oxford University Press, New Delhi, 1985.

اکائی 14۔ بائیں بازو کی تحریکیں

(Left Movements)

اکائی کے اجزا

14.0 تمہید
14.1 مقاصد
14.2 پس منظر
14.3 کانگریس سوشلسٹ پارٹی کا قیام
14.3.1 جواہر لال نہرو اور اشتراکی تحریک
14.4 ایم این رائے اور کمیونسٹ پارٹی
14.5 کچھ دیگر بائیں بازو کی جماعتیں
14.6 بائیں بازو کی تحریکوں کی کمزوریاں
14.7 ہندوستانی سیاست میں بائیں بازو کے اثرات
14.8 اکتسابی نتائج
14.9 کلیدی الفاظ
14.10 نمونہ امتحانی سوالات
14.10.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
14.10.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
14.10.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
14.11 تجویز کردہ اکتسابی مواد

14.0 تمہید (Introduction)

1917 میں لینن کے ذریعے روس میں زار شاہی کے خاتمہ سے ہندوستان میں بائیں بازو کی تحریکوں کو تقویت ملی۔ گاندھی جی کے ذریعے خلافت اور عدم تعاون تحریک کا واپس لیا جانا ایک دوسرا بڑا محرک تھا۔ بہت سے لوگ ایسے تھے جو حصول آزادی کے گاندھیائی فلسفے سے مطمئن نہیں تھے، ایسے لوگوں میں جواہر لال نہرو، سبھاش چندر بوس، آچاریہ نریندر دیو، ایم۔ این۔ رائے وغیرہ شامل تھے۔ ہندوستان میں بائیں بازو کا عروج ہندوستانی قومی تحریک کے پس منظر میں ہوا۔ اس کے نظریات اور رجحانات کو بیان کرنے کی کسی بھی کوشش کا نقطہ آغاز اس حقیقت سے ہوتا ہے کہ یہ ایک ہی وقت میں قومی اور انقلابی تحریک تھی۔ بائیں بازو کی تحریکیں تاریخی طور پر ہندوستانی قومی کانگریس کے تحت آزادی کی جدوجہد سے جڑی ہوئی تھیں اور کانگریس میں موجود اس کی نظریاتی قیادت، ابتدائی قوم پرست رہنماؤں کے خیالات اور نظریات سے متاثر تھی۔ کانگریس میں موجود بائیں بازو کے رہنماؤں نے اپنی پوری توجہ قومی آزادی پر لگائی اور صرف ملک کو مضبوط کرنے کے مقصد سے انتہا درجے کی سماجی اور معاشی تبدیلیوں کی تبلیغ کی۔ ان کا یقین تھا کہ ملک کی آزادی اور قوم کی ترقی کے لیے بڑے پیمانے پر سماجی اور معاشی بدلاؤ کی ضرورت ہے۔ وہ صرف ابتدائی قوم پرست رہنماؤں جیسے مہاتما گاندھی کے قدامت پسند سماجی۔ معاشی نظریات اور جدیدیت مخالف فلسفے سے متنفر ہوئے جو نہ صرف روایتی سماجی درجہ بندی میں کسی بھی بڑی تبدیلی کے خلاف تھے، بلکہ جدید سائنس، تکنیک اور صنعتی ارتقا کو بھی مشتبہ نظروں سے دیکھتے تھے۔ کانگریس کے اندر متعدد ایسے دانشور بڑھتے چلے گئے جو ملک میں شدید سماجی اور معاشی تبدیلیوں کے حق میں تھے مگر وہ ہندوستانی زندگی اور سماج کے لازمی عناصر کو نکال پھینکنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ مارکس کے طبقاتی جدوجہد کے نظریے کا ردعمل نہایت سرد مہری بھرا تھا۔ وہ اشتراکی نظریے کی طرف متوجہ ہوئے کیونکہ وہ نہ صرف تیز رفتار ترقی کا منصوبہ مہیا کرتا ہے بلکہ قدامت پسندی اور سرمایہ داری کا ایک متبادل بھی پیش کرتا ہے۔ اس طرح کے دانشوروں جیسے نہرو، بوس، نریندر دیو، جے پرکاش وغیرہ کے ابھرنے سے ہندوستانی قوم پرستی میں ایک زیادہ تبدیلی پسند عنصر، ایک زیادہ بامقصد جہت اور آزادی کی جدوجہد میں ایک زیادہ مثبت کردار کا اضافہ ہو گیا۔

بائیں بازو کے کمیونسٹ طبقے نے دوسری طرف قومی آزادی سے زیادہ طبقاتی کشمکش اور مزدور طبقے کی بین الاقوامیت پر توجہ مرکوز کی، جس کی وجہ ایک ایسے مقصد کو نظر انداز کیا جو عوام کے بڑے حصے کے ذہنوں کو متاثر کر سکتا تھا۔ ایسا مانا جاتا ہے کہ پہلی جنگ عظیم نے حتمی مقصد یعنی عالمی پرولتاری یا مزدوروں کے انقلاب کی طرف بڑھنے کے لیے پہلے قدم کے طور پر سامراجیت کو اکھاڑ پھینکنے کے لیے مناسب حالات پیدا کیے۔ یہ ایک ایسا مقصد تھا جو انتہا پسند قوم پرستوں کے مقاصد سے زیادہ انقلابی اور غیر مفاہمتی تھا۔ کمیونسٹ تحریک کے ابتدائی سالوں میں اس کا سب سے بڑا مقصد ایک ایسی انقلابی پارٹی بنانا تھا جو مزدور طبقے کی ڈھال ہو اور اپنی قیادت میں ایک انقلاب برپا کرنا تھا۔ لیکن ان حالات میں اپنی پہچان ایک قومی مقصد سے جوڑے بغیر اور قومی بورژوا طبقے کے ساتھ ایک مشترکہ قومی جدوجہد کا محاذ بنائے بغیر تقریباً ناممکن تھا۔ اسی لیے 1920 کی دہائی میں کمیونسٹ گروہوں کے بننے سے لے کر ایک مسئلہ بار بار سامنے آ رہا تھا کہ کیسے پرولتاری بین الاقوامیت کے نظریات کا ہندوستانی قوم پرستی کی اقدار کے ساتھ تال میل بٹھایا جائے۔ یہی چیز کمیونسٹوں کی عام غیر مقبولیت کا سبب بنی۔ اس اکائی میں آپ ان بائیں بازو کی تحریکوں کے آغاز، عروج اور ارتقا کے بارے میں جانیں گے جنھوں ہندوستانی سیاست کو بڑی حد تک متاثر کیا۔ اپنی متعدد

کمزوریوں کے باوجود ان کا ابھرنا بڑے پیمانے پر قومی تحریک کے لیے فائدہ مند ثابت ہوا۔ مزدوروں کو ٹریڈ یونینوں میں منظم کرنے، ان کو ان کے سیاسی حقوق کا احساس دلانے اور کسانوں کی تحریکوں کو منظم کرنے میں بائیں بازو والوں نے بیحد اہم کردار ادا کیا۔

14.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- کانگریس سوشلسٹ پارٹی کی ابتدا اور ارتقاء کے بارے میں جان سکیں گے۔
- جواہر لال نہرو اور اشتراکی تحریک کو سمجھ سکیں گے۔
- ایم این رائے اور کمیونسٹ پارٹی کے بارے میں جان سکیں گے۔
- بائیں بازو کی تحریکوں کی کمزوریوں سے واقف ہو سکیں گے۔
- ہندوستانی سیاست میں بائیں بازو کے اثرات کا تجزیہ کر سکیں گے۔

14.2 تاریخی پس منظر (Historical Background)

بیسویں صدی کی دوسری دہائی کے آخری سالوں اور تیسری دہائی کے دوران نہایت تیزی سے بائیں بازو کی ترقی ہوئی۔ قومی تحریک کے بنیادی مقصد کو متاثر کرنے میں اس نے بہت اہم کردار ادا کیا۔ حصول آزادی کے مقصد کے ساتھ اس کا سماجی اور معاشی نظریہ صاف اور کھل کر سامنے آیا۔ آزادی حاصل کرنے کی جدوجہد اور مظلوم و بیکس مزدور عوام کو ان کی سماجی اور معاشی زبوں حالی سے نجات دلانے کی جدوجہد ساتھ ساتھ چلنے لگی۔ اشتراکی (Socialist) نظریات ہندوستان کی سرزمین میں پہنچنے شروع ہوئے اور اشتراکیت (Socialism) نوجوانوں کا مقبول ترین نظریہ بن گیا۔ جواہر لال نہرو اور سبھاش چندر بوس اس نظریے کی نمایاں علامت تھے۔ دھیرے دھیرے بائیں بازو کی دو طاقتور پارٹیاں، کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا (Communist Party of India) یا سی۔ پی۔ آئی۔ (C.P.I.) اور کانگریس سوشلسٹ پارٹی (Congress Socialist Party) یا سی۔ ایس۔ پی۔ (C.S.P.) ابھر کر سامنے آئیں۔

روسی انقلاب نے ان سب پر گہرا اثر ڈالا۔ 7 نومبر 1917 میں ولادمیر ایلیچ لینن (Vladimir Ilyich Ulyanov) کی قیادت میں مارکسوادی نظریات کی حامل بالشویک (Bolshevik) پارٹی نے روس میں کا زار شاہی کا خاتمہ کر کے اشتراکی حکومت قائم کی۔ روس کے نئے اشتراکی حکمرانوں نے چین اور ایشیا کے دوسرے حصوں میں قائم اپنے نوآبادیاتی اختیارات کو چھوڑنے کا اعلان کیا۔ روس کے اس نئے نظام حکومت سے نوآبادیاتی ملکوں میں روشنی کی نئی لہر دوڑ گئی۔ لوگوں نے ایک سبق اس واقعہ سے یہ بھی لیا کہ اگر عام لوگ یعنی کسان، مزدور اور اہل علم طبقہ متحد ہو کر زار شاہی حکومت کا تختہ پلٹ کر ایک ایسا سماجی نظام قائم کر سکتے ہیں جس میں کوئی کسی کا استحصال نہیں کرتا ہے، تب تو انگریزی سلطنت کے ساتھ بر سر جنگ ہندستانی عوام بھی ایسا کر سکتی ہے۔ اس لیے اشتراکی اصول خصوصاً مارکسی نظریہ فکر نے جو بالشویک

پارٹی کا رہنما اصول تھا، لوگوں کو بے حد متاثر کیا اور ایشیائی باشندے خاص طور سے اس کی طرف کھنچے۔ 1919 میں انتہا پسند لیڈر بپن چندر پال نے لکھا تھا 'آج جرمنی کی فوجی حکومت کے زوال اور مطلق العنان زار شاہی حکومت کے خاتمہ کے بعد پوری دنیا میں عوام کی ایک نئی طاقت ابھری ہے جو اپنے جائز حقوق کے تحفظ کے لیے اور دولت مند و نام نہاد اونچے طبقوں کے ذریعے کیے جا رہے استحصال اور ظلم سے نجات پا کر آزادی کے ساتھ اپنی مرضی سے زندہ رہنے کا اختیار حاصل کرنے کے لیے پوری طرح کمربستہ ہے۔' اشتراکی فکر تیزی سے نوجوانوں میں پھیلنے لگی، خصوصاً ان لوگوں میں جنھوں نے عدم تعاون تحریک میں سرگرمی سے حصہ لیا تھا اور جو اس کے نتیجے اور گاندھیائی عدم تشدد کے اصول اور ان کے سوراج کے منصوبے سے غیر مطمئن تھے۔ نتیجتاً اشتراکیوں اور کمیونسٹوں کی بہت کی تنظیمیں پورے ملک میں وجود میں آ گئیں۔ بمبئی میں ایس۔اے۔ ڈانگے (S.A. Dange) نے 'گاندھی اور لینن' (Gandhi and Lenin) نام کا ایک پمفلٹ شائع کیا اور پہلے ہفتہ وار اخبار کی شروعات کی جس کا نام 'دی سوشلسٹ' (*The Socialist*) تھا۔ بنگال میں مظفر احمد نے 'نو یگ' (*Nav Yuga*) نکالا اور بعد میں نظر الاسلام کے تعاون سے 'لانگل' (*Langal*) جریدہ وجود میں آیا۔ پنجاب میں غلام حسین نے کچھ دوسرے ساتھیوں کے ساتھ مل کر 'انقلاب' (*Inqilab*) شائع کیا اور مدراس میں ایم۔ سنگارویلو (M. Singaravelu) نے 'لیبر کسان گزٹ' (*Labour Kisan Gazette*) کی بنیاد ڈالی۔

1927 کے بعد سے پورے ملک میں طلبا تنظیموں کا جال سا بچھ گیا۔ 1928 اور 1929 کے دوران پورے ملک میں سیکڑوں نوجوان کانفرنسیں منعقد کی گئیں اور ان میں، جن سماجی، معاشی اور سیاسی برائیوں سے ملک دوچار ہو رہا تھا، ان کا مکمل حل تلاش کرنے کی پرزور کوشش کی گئی۔ سامراجیت، سرمایہ داری اور جاگیرداری کے خلاف بولتے ہوئے جواہر لال نہرو اور سبھاش چندر بوس نے گھوم گھوم کر پورے ملک میں اشتراکی نظریات کا پرچار کیا۔ چندر شیکھر آزاد اور بھگت سنگھ کی رہنمائی میں انقلابی انتہا پسندوں کا جھکاؤ اشتراکیت کی طرف ہو گیا۔ بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں پورے ملک میں ٹریڈ یونین اور کسان تحریکیں تیزی سے پھیلتی رہیں۔ پوری دنیا، عظیم مندی (The Great Depression) کا شکار تھی، اس لیے ان دنوں اشتراکی نظریات کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ چونکہ سرمایہ دار دنیا میں بے روزگاری کا غلبہ تھا اس لیے عالمی سطح پر مندی کی وجہ سے سرمایہ داری نظام کو شدید دھکا لگا اور مارکسی اور اشتراکی نظام کی طرف لوگوں کی رغبت میں اضافہ ہوا۔ کانگریسی خیمہ میں ہی 1936 اور 1937 میں جواہر لال نہرو اور 1938 اور 1939 میں سبھاش چندر بوس کے کانگریس کا صدر منتخب ہونے میں بائیں بازو کے رجحان کی جھلک صاف دکھائی پڑتی ہے۔ کانگریس سوشلسٹ پارٹی کے قیام سے بھی اس حقیقت کی تصدیق ہوتی ہے۔

14.3 کانگریس سوشلسٹ پارٹی کا قیام (Formation of the Congress Socialist Party)

31-1930 اور 34-1932 کے دوران نوجوان کانگریسیوں کے ایک گروپ نے جیل میں سوشلسٹ پارٹی بنانے میں پہل کی۔ گاندھیائی حکمت عملی اور قیادت کا طلسم ٹوٹ چکا تھا اور اشتراکی نظریات کے تئیں ان کی دلچسپیاں بڑھ گئی تھیں۔ ان میں سے کئی لوگ

1920 کی دہائی کے آخری دور میں نوجوان تحریک میں سرگرم رہ چکے تھے۔ جیل میں ان لوگوں نے مارکسی اور دوسرے اشتراکی نظریات کا مطالعہ اور ان پر مباحثہ کیا تھا۔ وہ مارکسیت، اشتمالیت اور سویت یونین کے نظریات سے بے انتہا متاثر ہوئے تھے، اس لیے انہیں ہندستانی کمیونسٹ پارٹی (Communist Party of India) کے اس وقت کے سیاسی نظریات راس نہیں آئے۔ایسی صورت میں ان کو متبادل پارٹی کی تلاش ہوئی۔ بالآخر ان سب نے مل کر اکتوبر 1934 میں بمبئی میں جے پرکاش نرائن(Jayprakash Narayan)، آچاریہ نریندر دیو(Acharya Narendra Dev)اور مینو مسانی(Minu Masani)کی قیادت میں کانگریس سوشلسٹ پارٹی(Congress Socialist Party) کی بنیاد رکھی۔ ابتداء سے ہی سبھی کانگریسی اور اشتراکی ان چار بنیادی باتوں پر ایک رائے تھے کہ ہندوستان کی اہم ترین جدوجہد 'قومی جدوجہد آزادی' ہے اور اشتراکیت تک پہنچنے کے لیے قومیت ایک ناقابل فراموش مرحلہ ہے۔ سبھی اشتراکیوں کو کانگریس کے اندر ہی رہ کر کام کرنا چاہیے کیونکہ قومی جدوجہد کی قیادت کرنے والی یہی بنیادی تنظیم ہے اور جیسا کہ آچاریہ نریندر دیو نے لکھا تھا کہ 'ہم لوگوں کے لیے قومی تحریک سے کٹ جانا خودکشی کے مترادف ہوگا اور کانگریس ہی بلاشبہ قومی تحریک کی نمائندگی کرتی ہے۔ ہم کو ہر حالت میں کانگریس اور قومی تحریک کو اشتراکی سمت کی طرف لے جانا چاہیے اور اس کے حصول کے لیے مزدوروں اور کسانوں کو ان کی طبقاتی تنظیموں میں منظم کرنا اور ان کی مالی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے جدوجہد کرنا چاہیے۔'

کانگریس سوشلسٹ پارٹی نے شروع سے ہی کانگریس کے مزاج کو بدلنے اور خود کو مضبوط کرنے کے لیے بھرپور کوششیں کی۔ اس کے پیچھے اس کے دو مقاصد تھے۔ پہلا مقصد یہ تھا کہ کانگریس کی نظریاتی کایاپلٹ کی جائے جس سے آزاد ہندوستان میں وہ دھیرے دھیرے اشتراکیت کا راستہ اپنا لے اور موجودہ مالی معاملات میں اس کا رجحان کسانوں اور مزدوروں کے مفاد میں ہو۔ بہر حال منصوبے اور نظریہ کی یہ تبدیلی اچانک نہیں واقع ہوگی بلکہ اس کے لیے محنت درکار ہے اور اس کو بتدریج آگے بڑھانے کی ضرورت ہے۔ مثلاً 1934 میں جے پرکاش نرائن نے اپنے پیروکاروں سے زور دے کر کہا تھا کہ 'ہم کانگریس کے سامنے ایک پروگرام پیش کر رہے ہیں اور چاہتے ہیں کہ کانگریس اس کو منظور کر لے۔ اگر وہ اس کو نہیں منظور کرتی ہے تو ہم یہ نہ کہیں کہ اس کو چھوڑ کر ہم نکلے جا رہے ہیں۔ اگر آج ہم ناکام ہوتے ہیں تو کل پھر کوشش کریں اور اگر کل ناکامی ہاتھ آتی ہے تو دوبارہ کوشش کریں گے۔' علاوہ ازیں یہ بھی سوچا گیا کہ کانگریس کی تنظیم میں بڑے پیمانے پر بدلاؤ ہونا چاہیے جس کا مطلب تھا کہ اعلیٰ ترین قیادت کو بدلنا ضروری ہے کیونکہ وہ عوامی جدوجہد کو ترقی دینے میں ہر سطح پر ناکام ثابت ہوئی ہے۔ اس لیے مرکزی اشتراکی قیادت کے طور پر کانگریس سوشلسٹ پارٹی کو کانگریس کے نعم البدل کے طور پر پیش کرنا اور فروغ دینا تھا، جیسا کہ کانگریس سوشلسٹ پارٹی کے 'میرٹھ مقالہ' (Meerut Thesis)میں 1935 میں لکھا تھا کہ 'کانگریس کے اندر سامراجیت مخالف عناصر کو سرمایہ داری کے حامیوں سے الگ کرنا ہے اور ان کو انقلابی اشتراکی قیادت کے تحت لانا ہے۔' بہر حال جلد ہی اشتراکیوں کو اس بات کا احساس ہو گیا کہ ایسا کرنا قریب قریب ناممکن ہے، اس لیے اس خیال کو ہی ترک کر دیا گیا اور ایک ایسی ملی جلی قیادت قائم کیے جانے کا فیصلہ کیا گیا جس میں ہر سطح کی قیادت پر اشتراکیوں کو شامل کیا جائے۔

کانگریس میں بائیں بازو کے رہنماؤں کی بات کو دو بار، 1939 میں ترپیورا میں اور 1940 میں رام گڑھ میں فوقیت حاصل ہوئی۔

لیکن جب دائیں اور بائیں بازو کی بنیاد پر تقسیم کی نوبت آئی اور کانگریس کو خالص دائیں بازو کی قیادت سمجھنے پر زور دیا گیا، تو کانگریس سوشلسٹ پارٹی اور ہندستانی کمیونسٹ پارٹی دونوں ہی پیچھے ہٹ گئیں۔ ان دونوں کے رہنماؤں کو یہ احساس ستانے لگا کہ اس طرح کی کوشش سے نہ صرف قومی تحریک کمزور ہو گی بلکہ بائیں بازو کے لوگ عوامی جدوجہد سے کٹ جائیں گے اور یہ بھی کہ ہندستانی عوام کو صرف گاندھی کی قیادت میں ہی منظم کیا جاسکتا ہے۔ اس وقت کے حالات میں قیادت کے لیے گاندھی کا کوئی متبادل نہیں تھا۔ بہر حال نہرو کی طرح کانگریس سوشلسٹ پارٹی اور بائیں بازو کے گٹ اور پارٹیاں اس بات کو مکمل طور پر کبھی تسلیم نہیں کر سکیں اور اسی لیے وہ لوگ جب اور تب متبادل قیادت کی رٹ لگاتے رہے۔ بائیں بازو کے دوسرے دھڑوں کے مقابلے کانگریس سوشلسٹ پارٹی کو ہندستان کی حقیقی صورت حال کا بہتر شعور تھا، اس لیے اس نے کانگریس کی موجودہ قیادت کی تنقید کے باوجود اس سے تعلق بنائے رکھا۔ ہندوستان میں جب اشتراکی جدوجہد کے لیے حالات بد سے بدتر ہو گئے، تب کانگریس سوشلسٹ پارٹی نے اپنے اشتراکی اصولوں کو نظرانداز کر کے حقیقت پسندی کا راستہ اختیار کیا جو کہ نظریاتی طور پر جواہر لال نہرو کی فکر سے میل کھاتا تھا۔ اس انحراف پر بائیں بازو کی پارٹیوں اور جماعتوں نے اشتراکیوں کو جم کر لتاڑا۔ مثلا 1939 میں گاندھی اور کانگریس کے دائیں بازو والے گروہ کے مقابلہ میں سبھاش چندر بوس کی حمایت نہ کرنے پر انہیں بہت کھری کھوٹی سنائی گئیں۔ ایسے موقعوں پر اشتراکیوں نے اپنا بچاؤ کیا اور اصل ہندستانی صورت حال کو سمجھنے میں اپنی مہارت کا ثبوت دیا۔ مثلاً 1939 میں کانگریس کے تریپورا اجلاس کے بعد جے پرکاش نرائن نے کہا تھا کہ 'ہم اشتراکی یہ چاہتے ہیں کہ کانگریس میں گٹ بازی نہ ہو اور ہم قیادت کے مسئلہ پر بھی کوئی مقابلہ آرائی نہیں چاہتے ہیں۔ کانگریس کی پالیسی اور منصوبہ سے ہی ہمارا تعلق ہے۔ ہم صرف کانگریس کے فیصلوں پر اثر انداز ہونا چاہتے ہیں۔ پرانے نیتاؤں سے ہمارا چاہے جتنا اختلاف ہو، ہم ان سے جھگڑنا نہیں چاہتے۔ ہم تو سامراجیت مخالف جنگ میں ان کے شانہ بہ شانہ چلنا چاہے ہیں۔'

شروع سے ہی کانگریس سوشلسٹ پارٹی کے لوگ موٹے طور پر تین نظریاتی خیموں میں بٹے ہوئے تھے:

1. پہلے وہ لوگ جو مارکسیت کے پیروکار تھے اور انقلابی اور انتہا پسند پر تشدد کاروائیوں کی حمایت کرتے تھے۔
2. دوسرے وہ لوگ جو فیبین انجمن (Fabian Society) کے پیروکار تھے اور آہستہ آہستہ بنا کسی انقلابی کاروائی کے، اشتراکیت کے حصول میں یقین رکھتے تھے۔
3. تیسرے گروہ میں وہ لوگ شامل تھے جو گاندھی کے عدم تشدد اور دیگر نظریات کی پیروی کرتے تھے۔

اس تقسیم سے پارٹی میں کسی طرح کی کوئی کمزوری نہیں تھی بلکہ یہی اس کی قوت کا سرچشمہ تھا۔ قومی کانگریس کے تحت کانگریس سوشلسٹ پارٹی گروپ اور معیار پر قائم بذات خود ایک تحریک تھی۔ حالانکہ 1930 کی دہائی کی مارکسیت، بائیں بازو میں پیدا ہوئی اس رنگارنگی کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تھی۔ یہی وجہ تھی کانگریس سوشلسٹ پارٹی آخر دم تک پریشانی کے دلدل میں پھنسی رہی۔ اس سب کے باوجود پارٹی کے بانیوں میں آپسی اور دوستانہ تعلقات کے باعث کافی عرصے تک نظریاتی اختلافات کھل کر باہر نہیں آسکے۔ اس کے عظیم رہنما، آچاریہ نریندر دیو اور جے پرکاش نرائن، اشتراکیت اور قومیت کے اصولوں پر پوری طرح جمے رہے۔ لیڈروں کے درمیان نظریاتی

اختلافات کے باوجو کانگریس سوشلسٹ پارٹی نے مارکسیت کی شکل میں اشتراکیت کی بنیادی پہچان کو مکمل طور پر قبول کر لیا تھا۔ مثلاً جے پرکاش نرائن نے اپنی کتاب 'اشتراکیت کیوں؟' (*Why Socialism?*) میں یہ کہا کہ 'پہلے سے کہیں زیادہ آج یہ کہنا ممکن ہو گیا ہے کہ اشتراکیت (Socialism) کا صرف ایک ہی اصول ہے اور وہ ہے اشتمالیت (Communism)۔' جیسے جیسے گاندھیائی سیاست کی اہمیت لوگوں کی سمجھ میں آنے لگی، اس کی فکر کا وسیع جمہوری پہلو، کانگریس سوشلسٹ پارٹی کا رہنما نظریہ بنتا چلا گیا۔

14.3.1 جواہر لال نہرو اور اشتراکی تحریک (Jawaharlal Nehru and the Socialist Movement)

ہندوستانی قومی تحریک کو اشتراکیت کی طرف لے جانے کا سہرا جواہر لال نہرو کے ہی سر ہے، جنہوں نے سب سے زیادہ زور و شور سے ان نظریات کو پھیلایا۔ 1929 کے بعد تو وہ اشتراکیت اور اشتراکی فکر کا نمونہ بن گئے۔ ان کے خیال سے سیاسی آزادی کے ساتھ سماجی اور معاشی آزادی بھی ضروری تھی۔ چالیس سال کی عمر میں ہی نہرو کو، 1929 کے کانگریس کے تاریخی لاہور اجلاس کا صدر بنایا گیا اور اسی عہدہ پر وہ دوبارہ 1936 اور 1937 میں منتخب کیے گئے۔ کانگریس کے صدر اور مہاتما گاندھی کے بعد عوام کے مقبول ترین رہنما کی حیثیت سے انہوں نے کئی بار ملک کا دورہ کیا، ہزاروں میل کا سفر طے کیا اور کروڑوں لوگوں سے مخاطب ہوئے۔ انہوں نے اپنی کتاب، ایک 'سوانح عمری' (*An Autobiography*) اور 'تاریخ عالم کی ایک جھلک' (*Glimpses of World History*) میں اشتراکیت کی اہمیت کو اچھی طرح واضح کیا اور پر زور طریقے سے اعلان کیا کہ معاشی آزادی کے بغیر سیاسی آزادی بے معنی ہے۔ اسی لیے سیاسی آزادی کے حصول کے بعد ہی اشتراکی سماج قائم کیا جاتا ہے۔ اس طرح نہرو نے قوم پرست نوجوانوں کی پوری نسل کو اشتراکیت کے سانچے میں ڈھالنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ انہوں نے نوجوانوں کے دلوں میں اشتراکی قدروں کو اچھی طرح بٹھا دیا۔

نہرو کے دل میں معاشی معاملات سے دلچسپی اس وقت پیدا ہوئی جب 21-1920 کے دوران مشرقی اتر پردیش کی کسان تحریک سے ان کا رابطہ قائم ہوا۔ 23-1922 کے دوران جب وہ جیل گئے، تو وہاں فرصت کے اوقات کو، انہوں نے روسی انقلاب نیز دوسرے انقلابات کے مطالعہ میں صرف کیا۔ 1921 میں بروسیلس (Brussels) میں نوآبادیاتی سلطنت اور اس کے ظلم و جبر کے خلاف منعقد شدہ بین الاقوامی کانگریس (International Congress) میں انہوں نے بھی حصہ لیا اور اسی دوران وہ کمیونسٹوں اور نوآبادیاتی سلطنت سے برسرپیکار لوگوں کی صحبت میں آئے۔ اس وقت تک وہ موٹے طور پر مارکسواد کو ماننے لگے تھے۔ اسی سال انہوں نے سوویت یونین کا دورہ کیا اور وہاں قائم شدہ نئے اشتراکی سماج سے بہت متاثر ہوئے۔ وہاں سے واپسی کے بعد انہوں نے سوویت یونین پر ایک کتاب شائع کی جس کے سرورق پر انہوں نے ورڈس ورتھ (Wordsworth) کے ذریعہ فرانسیسی انقلاب پر لکھی گئی نظم کا مشہور مصرعہ تحریر کیا:

'Bliss was it in that dawn to be alive, but to be young was very heaven'

(انقلاب کے ابتدائی دور میں رہنا بے حد پر مسرت تھا، مگر انقلاب کی جوانی تو مکمل جنت ہی تھی۔)

ایس۔ گوپال(S. Gopal)کے لفظوں میں جب نہرو ہندوستان واپس ہوئے تب وہ 'ہوشمند ترقی پسند انقلابی' بن چکے تھے۔ جوا ہر لال نہرو نے آزادی کے حصول کے لیے انڈیا لیگ(India League)بنانے میں سبھاش چندر بوس کا پورا ساتھ دیا تا کہ سماج کے معاشی ڈھانچہ کو اشتراکی شکل دینے کے لیے جدوجہد کی جا سکے۔ 1929 میں کانگریس کی لاہور کانفرنس میں انہوں نے اعلان کیا 'میں تو اشتراکی اور جمہوریت پسند ہوں۔ میں راجاؤں، مہاراجاؤں کے اقتدار میں یقین نہیں رکھتا اور مجھ کو اس نظام میں بھی یقین نہیں ہے جو صنعت و حرفت کے جدید راجاؤں کو پیدا کرتی ہے جن کا تسلط عوام کی زندگی اور قسمت پر، ماضی کے راجاؤں مہاراجاؤں سے بھی زیادہ ہوتا ہے اور جن کے طور طریقے سفاک جاگیر داروں کی ہی طرح کے ہیں۔ انہوں نے واضح کیا کہ 'ملک سے غریبی اور عدم مساوات کو دور کرنے کے لیے اشتراکی پروگراموں کو مکمل طور سے اپنانا پڑے گا۔' کانگریس کے لیے سرمایہ اور مزدور، زمیندار اور کسان کے درمیان توازن قائم رکھنا ممکن نہیں ہے کیونکہ موجودہ حالات میں ترازو کا پلہ بری طرح سرمایہ داروں اور زمینداروں کے حق میں جھکا ہوا ہے۔

اشتراکیت کے تئیں نہرو کی دلچسپیاں 1933 اور 1936 کے دوران کھل کر ظاہر ہوئیں۔ 'ہندوستان کدھر؟' کا جواب دیتے ہوئے انہوں نے اکتوبر 1933 میں لکھا کہ 'بلاشبہ ہندوستان، انسان کی سماجی اور معاشی برابری کے عظیم مقصد کو حاصل کرنے کی طرف جا رہا ہے۔ وہ ایک قوم کے ذریعے دوسری قوم اور ایک طبقہ کے ذریعے دوسرے طبقہ کے استحصال کے خاتمہ کی طرف گامزن ہے۔' مزید برآں دسمبر 1933 میں انہوں نے لکھا 'سچا شہری نمونہ، اشتراکی نمونہ ہے، کمیونسٹ نمونہ ہے۔' اپریل 1936 میں انہوں نے لکھنو کانگریس کے موقع پر اپنی صدارتی تقریر میں اشتراکیت پر اپنے نظریہ کی مزید وضاحت بہت صاف اور پرزور لفظوں میں کی کہ 'مجھے کامل یقین ہے کہ پوری دنیا اور ہندوستان کے سارے مسائل کا حل، اشتراکیت ہے۔ میں جب اس لفظ کا استعمال کرتا ہوں تو مبہم انسانیت پسند معنی میں نہیں بلکہ سائنسی اور مالی مفہوم میں کرتا ہوں۔ میری سمجھ سے ملک کی غریبی، بے روزگاری، غلامی اور زبوں حالی کا حل اشتراکیت کے ذریعہ ہی ممکن ہے۔ اس کے لیے ہمارے سماجی اور سیاسی ڈھانچے میں مکمل تبدیلی درکار ہے۔ محدود معنی میں نہ لے کر اس کا مطلب نجی جائداد کا خاتمہ اور منافع کے موجودہ نظام کی جگہ پر امداد باہمی کے اعلیٰ اصول کا قیام ہے۔'

انہیں دنوں نہرو نے طبقاتی تجزیے اور طبقاتی کشمکش کے کردار پر بہت زور دیا اور اسی دوران جواہر لال نہرو اور گاندھی کے آپسی تعلقات میں پیچیدگی سی پیدا ہوئی۔ نہرو نے گاندھی کی اس لیے تنقید کی کہ وہ طبقاتی کشمکش کے اصول کو نامنظور کرتے تھے، ساتھ ہی وہ استحصال کرنے والوں اور استحصال سہہ رہے لوگوں کے درمیان تال میل قائم کرنے کی تعلیم دیتے تھے۔ وہ گاندھی کے تولیت (Trusteeship)کے اصول کو نہیں مانتے تھے جس کے ذریعہ زمینداروں اور سرمایہ داروں کا دل ودماغ بدلنا ہوتا ہے۔ نہرو نے اپنی سوانح عمری میں ایک پورا باب ہی گاندھی کے نظریات کی مخالفت میں صرف کیا اور بڑے نرم لہجہ میں ان کی تنقید کی۔ مگر ساتھ ہی، ہندوستانی سماج میں گاندھی نے جو کردار ادا کیا تھا یا کر رہے تھے اس کی انہوں نے کھل کر تعریف کی۔ نہرو نے اپنے بائیں بازو کے ساتھیوں کے ذریعہ گاندھی پر کی گئی تنقید کے جواب میں جنوری 1936 میں ایک مضمون تحریر کیا کہ 'گاندھی نے ہندوستان میں اہم ترین انقلابی کردار ادا کیا ہے کیونکہ ان کو معاملات سے متعلق حالات کا بہترین استعمال بخوبی معلوم ہے۔ وہ عوام کے دلوں تک پہنچ سکتے ہیں جب کہ مزید ترقی یافتہ نظریات

والی دوسری جماعتیں صرف ہوا میں کام کرتی ہیں۔' بہر حال گاندھی کے قول و عمل نے 'عوام میں زبردست بیداری' پیدا کی۔ سماجی مسائل کو مرکزی اہمیت دی اور جہاں کہیں بھی ضروری ہوا انہوں نے اپنی دلچسپیوں کی قیمت پر عوام کو اوپر اٹھانے پر زور دیا۔ یہی وہ تھی کہ قومی تحریک نے عوام کی بھلائی میں کام کرنا اپنا اصلی مقصد بنایا۔ 'نہرو نے کانگریس اور بائیں بازو کے دوسرے لوگوں کو گاندھی کے بارے میں اپنائے گئے رویہ کے سلسلہ میں جو مشورہ دیا تھا، اس کو موہت سین (Mohit Sen) نے بہت خوبصورتی سے مختصر لفظوں میں پیش کیا ہے کہ نہرو کو یقین تھا کہ 'کانگریسیوں کی اکثریت، اعتدال پسند لوگوں کی غیر منظم جماعت ہے۔ گاندھی نہ صرف اس کی نمائندگی کرتے ہیں بلکہ کسی بھی عوامی تحریک کے لیے ان کا ہونا بہت ضروری ہے۔ بائیں بازو کے لوگوں کو ان سے یا معتدل لوگوں سے چاہے جتنا بگاڑ کیوں نہ ہو، ان کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، بلکہ ان کی حکمت عملی، معتدل لوگوں کو خصوصاً گاندھی کو بائیں بازو کی طرف راغب کرنے والی ہونی چاہیے۔'

اشتراکیت کے بارے میں نہرو کا ایک دائرہ عمل تھا جس میں سیاسی اور نوآبادیت مخالف جدوجہد کو اس وقت تک مرکزی مقام دیا گیا تھا جب تک ملک میں بدیسی حکومت قائم ہے۔ دراصل حکومت کی طاقت کو کمزور کیے بغیر ان دونوں باتوں کو نبھانا اس وقت تک بیحد مشکل کام تھا۔ نہرو نے 1936 میں اشتراکیوں سے یہ کہا کہ ان کو دو بنیادی باتوں نے بہت متاثر کیا ہے اور وہ ہیں 'قومیت اور سماجی آزادی۔' قومیت کی نمائندگی کانگریس کرتی ہے اور سماجی آزادی کی نمائندگی اشتراکیت کرتا ہے۔ اور ان دونوں کو ایک ساتھ جاری رکھ کر شیر و شکر کرنا ہندستانی اشتراکیوں کا خاص کام ہے۔' اس لیے نہرو نے کسی بھی ایسی تنظیم کو بنانے کی بات پسند نہیں کی جو کانگریس سے الگ اور اس سے آزاد ہو یا گاندھی سے اور کانگریس کے بائیں بازو کے عنصر سے بے تعلق ہو۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ کانگریس کی پوری ساخت کو تبدیل کرکے اشتراکیت کے نمونے پر ڈھالا جائے۔ اس کے لیے کانگریس کے پرچم کے نیچے کام کرنا ضروری ہے۔ اس میں کسان مزدور شامل ہوں اور وہ اس میں اہم کردار ادا کریں اور یہ بھی کوشش ہو کہ بایاں بازو کسی بھی طرح، قومی تحریک کی خاص دھارے سے الگ نہ ہونے پائے۔

14.4 ایم این رائے اور کمیونسٹ پارٹی (M.N. Roy and the Communist Party)

سوویت یونین اور اس کے انقلابی نظریات سے متاثر ہو کر ہندستانی انقلابیوں کی کثیر تعداد جو بیرونی ممالک میں جلاوطن تھی سوویت روس پہنچ گئی۔ ان میں سب سے مشہور اور معروف شخص منابندر ناتھ رائے (Manabendra Nath Roy) تھے جنہوں نے لینن کے ساتھ مل کر نوآبادیاتی ملکوں کے لیے کمیونسٹ پارٹی کی بین الاقوامی پالیسی مرتب کرنے میں مدد کی تھی۔ اسی طرح سات ہندستانی رہنماؤں نے مل کر ایم۔ این۔ رائے کی قیادت میں اکتوبر 1920 میں تاشقند میں ہندستانی کمیونسٹ پارٹی قائم کی۔ اس کوشش کے علاوہ بائیں بازو کی بہت سی جماعتیں 1920 کے بعد ملک کی سرزمین پر وجود میں آنے لگی تھیں۔ ان میں سے زیادہ تر تنظیموں کا اتحاد، دسمبر 1925 میں کانپور میں ہوا اور کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا (Communist Party of India) نام کی ایک کل ہند پارٹی کی بنیاد ڈالی گئی۔ تھوڑے ہی دنوں بعد سچدانند وشنو گھاٹے (Sachchidanand Vishnu Ghate) اس کے جنرل سکریٹری بنے۔ پارٹی نے اپنے سبھی ممبران کو کانگریس کا رکن بننے اور اس کے اندر رہ کر ہر طریقے سے بائیں بازو کو مضبوط کرنے اور انقلابی قوم پرستوں کو پورا تعاون دینے کے لیے

کہا، تاکہ کانگریس زیادہ سے زیادہ انقلابی اور عوامی تنظیم کی شکل اختیار کر سکے۔

ابتدائی دور کے کمیونسٹوں کی سیاسی سرگرمیوں میں، مزدوروں اور کسانوں کو تنظیموں میں منظم کرنا اور انہیں کے ذریعہ کام کرنا شامل تھا۔ اس طرح کی پہلی تنظیم کانگریس کی لیبر سوراج پارٹی(Labour Swaraj Party) تھی جس کو نومبر 1925 میں مظفر احمد، قاضی نزرالاسلام، ہیمنت کمار سرکار جیسے لوگوں نے بنگال میں قائم کیا تھا۔ 1926 کے آخری دور میں بمبئی میں کانگریس لیبر پارٹی اور پنجاب میں کیرتی کسان پارٹی(Kirti Kisan Party) بنائی گئی۔ 1923 سے ہی مدراس میں لیبر پارٹی آف ہندوستان (Labour Party of Hindustan) نامی ایک تنظیم کام کر رہی تھی۔ 1928 تک ان سبھی صوبائی پارٹیوں نے مل کر ملکی سطح کی تنظیم، ورکرس اینڈ پیزنٹس پارٹی(Workers and Peasants Party) بنائی اور اس کی ایک ایک اکائی راجستھان، یوپی اور دہلی میں قائم کی گئی اور کبھی کمیونسٹ، اس کے ممبر ہوا کرتے تھے۔ ورکرس اینڈ پیزنٹس پارٹی کا خاص مقصد کانگریس کے اندر رہ کر کام کرنا تھا جس سے اس کو اور زیادہ انقلابی رجحان والی عوامی پارٹی بنایا جا سکے اور آزادانہ طریقے سے مزدوروں اور کسانوں کو اس میں شامل کیا جائے تاکہ پہلے مرحلہ میں مکمل آزادی (پورن سوراج) اور پھر اشتراکیت کے حصول کا مقصد پورا ہو۔ ورکرس اینڈ پیزنٹس پارٹی نے بڑی تیزی سے ترقی کی اور تھوڑے ہی وقت میں ہر جگہ خصوصاً بمبئی میں کانگریس پر کمیونسٹ اثرات بڑھنے لگے۔ جواہر لال نہرو اور دوسرے انقلابی رہنماؤں نے کانگریس پر بڑھتے ہوئے کمیونسٹ اثرات کا خیر مقدم کیا۔ جواہر لال نہرو کے ساتھ سبھاش چندر بوس، نوجوان تنظیموں(Young Leagues) اور بائیں بازو کی طاقتوں یعنی ورکرس اینڈ پیزنس پارٹیوں نے کانگریس کے اندر بایاں محاذ مضبوط بنانے اور ہندستانی قومی تحریک کو بائیں بازو کی طرف لے جانے میں اہم کردار ادا کیا۔

ٹریڈ یونینوں کے معاملے میں، ورکرس اینڈ پیزنٹس پارٹیوں نے تیزی سے ترقی کی۔ انہوں نے 1927 اور 1929 کے دوران مزدور طبقہ کی جدوجہد کے ابھرنے میں فیصلہ کن کردار ادا کیا اور مزدوروں کے درمیان کمیونسٹ وجود کو پائیدار بنانے میں بڑی تقویت پہنچائی۔ حالانکہ 1929 کے دوران اور اس کے بعد دو ایسے واقعات ہوئے جن کی وجہ سے قومی تحریک پر کمیونسٹ اور ورکرس اینڈ پیزنٹس پارٹیوں کا تیزی سے بڑھتا ہوا اثر تھوڑا رکا اور آخر میں ختم ہی ہو گیا۔ پہلی بات تو یہ تھی کہ حکومت نے کمیونسٹوں پر بڑے ظلم ڈھائے اور ان پر سخت تشدد کیا۔ 1922 اور 1924 کے دوران سوویت روس سے ہندوستان میں داخل ہونے کی کوشش میں بہت سے کمیونسٹوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ ان پر جعل سازی کے بہت سے مقدمے پشاور میں چلائے گئے اور لمبی لمبی سزائیں دی گئیں۔ 1924 میں ایس۔ اے۔ ڈانگے، مظفر احمد، ناننی گپتا اور شوکت عثمانی کو کانپور بالشویک سازش مقدمے میں پھنسا کر ان سب کو چار چار سال کی سزا دی گئی۔

1929 تک قومی اور ٹریڈ یونین تحریکوں پر اشتمالیت(Communism) کے بڑھتے ہوئے اثرات سے حکومت بری طرح پریشان تھی۔ اس نے کمیونسٹوں پر سخت چوٹ کرنے کا ارادہ کیا اور اس مقصد کے لیے مارچ 1910 میں یکبارگی اچانک دھاوا بول کر ٹریڈ یونین کے 32 سرگرم سیاسی کارکنوں کو گرفتار کر لیا۔ ان میں تین برطانوی کمیونسٹ، فلپ اسپریٹ(Philip Spratt)، بین

براڈلے(Ben Bradley)اور لیسٹر ہچنسن(Lester Huchinson) بھی شامل تھے۔ یہ لوگ ٹریڈ یونین تحریک کو منظم کرنے میں مددگار کی حیثیت سے ہندوستان آئے تھے۔ حکومت کا واحد مقصد ٹریڈیونینوں کو ختم کرنا اور کمیونسٹوں کو قومی تحریک سے الگ کرنا تھا۔ان سبھی لوگوں پر میرٹھ جعل سازی کیس کے تحت میرٹھ میں مقدمہ چلایا گیا۔ یہ مقدمہ جلد ہی قومی اہمیت اور وقار کا مسئلہ بن گیا۔ جواہر لال نہرو، ایم۔اے۔ انصاری اور ایم۔ سی۔ چھاگا، ان لوگوں کے دفاع میں اٹھ کھڑے ہوئے۔ گاندھی نے میرٹھ جاکر قیدیوں سے ملاقات کی ۔ان سے ہمدردی کا اظہار کیا اور آئندہ کی جانے والی جدوجہد میں ان سے تعاون کی اپیل کی۔ قیدیوں نے اپنے دفاع میں جو بیانات دیے ان کو سبھی قومی اخباروں نے شائع کیا اور اس طرح پہلی بار کمیونسٹ نظریات سے ملک کے لاکھوں لوگ واقف ہوئے ۔ کمیونسٹوں کو قومی دھارے سے الگ تھلگ کرنے کی حکومت کی خواہش نہ صرف ناکام رہی بلکہ نتائج اس کے الٹ ہی نکلے، مگر حکومت کو مزدور تحریک کو قیادت سے محروم کرنے میں ضرور کامیابی حاصل ہوئی۔ کمیونسٹوں نے بذات خود اپنے ہی اوپر جان لیوا حملہ کیا اور اس نے حکومت کے ذریعہ کیے گئے حملے کی رہی سہی کسر پوری کر دی۔ انہوں نے جلد بازی میں اچانک جو اقدامات کیے اس کو کمیونسٹ اصطلاح میں 'فرقہ پرست سیاست' (Sectarian Politics)یا 'بائیں بازو کا انحراف' (Leftist Deviation) کے نام سے جانا جاتا ہے۔

کمیونسٹ انٹرنیشنل کی چھٹی کانگریس کی ہدایت پر کمیونسٹوں نے ہندوستانی قومی کانگریس سے اپنا ناتا توڑ لیا اور اس کو سرمایہ داروں کی پارٹی بتایا نیز یہ بھی کہا کہ سرمایہ دار طبقہ اور کانگریس دونوں سامراجیت کے حمایتی اور مددگار ہیں اور عوامی تحریک کو منظم کرکے مکمل سوراج کے حصول کا نعرہ تو کانگریس کا ڈھونگ ہے۔ یہ عوام کے اوپر اپنا اثر ورسوخ قائم کرنے کی سرمایہ دار طبقہ کے ان لوگوں کی کوشش ہے جو برطانوی سامراج سے مصالحت کرنے میں مصروف ہیں۔ بائیں بازو کے کانگریسی لیڈر جیسے نہرو اور بوس قومی تحریک کے اندر سرمایہ داروں کے ایجنٹ بتائے گئے۔ان پر یہ الزام تھا کہ یہ لوگ مزدور اور محنت کش عوام کو جھانسا دے کر سرمایہ داروں کے زیر اثر رکھنا چاہتے ہیں۔اب کمیونسٹوں کا ہی کام تھا کہ وہ اس پرامن تحریک کی ساری باتوں کی قلعی کھولیں اور برطانوی سامراج کے خلاف مسلح جدوجہد کو آگے بڑھائیں۔ 1931 میں ہوئے گاندھی ارون سمجھوتہ کو قوم کے ساتھ کانگریس کی کھلی بے وفائی بتایا گیا۔ بالآخر ورکرس اینڈ پیزنٹس پارٹیوں کو بھی اس خدشہ کے تحت تحلیل کر دیا گیا کہ دو شاخوں والی پارٹی (مزدور اور کسان)، چھوٹے چھوٹے سرمایہ داروں کے زیر اثر آجائے گی۔ اس لیے کمیونسٹوں نے اس کی جگہ پر ایک غیر قانونی، آزاد اور مرکزی پارٹی بنانے پر پوری توجہ دی۔ان کے سیاسی نظریہ میں اچانک آئے اس بدلاؤ کا نتیجہ یہ ہوا کہ کمیونسٹ، قومی تحریک سے ایسے موقع پر الگ تھلگ ہو گئے جب وہ عوام کی سب سے بڑی جدوجہد کی طرف بڑھ رہی تھی اور اس کے اوپر بائیں بازو کے اثرات کافی ٹھوس اور مضبوط ہو رہے تھے۔اس کے علاوہ کمیونسٹ چھوٹی چھوٹی جماعتوں میں بکھر گئے۔ برطانوی حکومت نے ایسے حالات کا فائدہ اٹھایا اور کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کو غیر قانونی قرار دے دیا۔اس سب کے باوجود کمیونسٹ تحریک مکمل تباہی سے بچی رہی۔اس کے دو اسباب تھے۔ پہلی وجہ تو یہ کہ سارے کے سارے کمیونسٹوں نے سول نافرمانی تحریک سے اپنا ناتہ نہیں توڑا تھا۔ وہ اب بھی اس میں سرگرم تھے۔ اس طرح اشتراکی اور کمیونسٹ نظریات کی اشاعت ملک میں مسلسل جاری رہی۔ اس لیے بہت سارے نوجوان جو عام نافرمانی تحریک نیز انقلابی سرگرمیوں میں ہمہ تن مصروف تھے وہ اشتراکیت، مارکسیت اور سوویت یونین سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور

1934 کے بعد وہ کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا میں شامل ہو گئے۔

1935 میں پورن چند جوشی(Puran Chand Joshi) کی قیادت میں کمیونسٹ پارٹی دوبارہ منظم کی گئی۔تب اس کے حالات میں بنیادی تبدیلی پیدا ہوئی ۔ فسطائیت(Fascism) کے خوف سے اگست 1935 میں ماسکو میں کمیونسٹ انٹر نیشنل (Communist International) یا کامنٹرن (Comintern) کا ساتواں اجلاس منعقد ہوا۔اس میں اس نے اپنے پرانے خیالات کو ترک کرکے بالکل نیا رخ اختیار کیا۔اس نے فسطائیت مخالف، سرمایہ دار ملکوں کے ساتھ اشتراکی ملکوں کا متحدہ محاذ بنانے پر زور دیا۔ اس میں نوآبادیاتی ملکوں میں بورژوا طبقے(*bourgeoisie*)کی قیادت میں چلنے والی قومی تحریکیں بھی شامل تھیں۔ کمیونسٹ کارکنوں کو ہندوستانی قومی کانگریس(Indian National Congress)کے تحت چلنے والی قومی تحریک میں شمولیت اختیار کرنی پڑی۔

شروع میں ہندوستان میں کمیونسٹ تحریک میں تبدیلی لانے کی اصولی اور سیاسی بنیاد ایک دستاویز کے ذریعہ رکھی گئی تھی جو دت بریڈلے تھیسس(Dutt-Bradley Thesis)کے نام سے مشہور ہے۔اس میں لکھا گیا تھا کہ سامراج مخالف عوامی مزاحمت کو کامیاب بنانے میں ہندوستانی قومی کانگریس سب سے نمایاں کردار ادا کرسکتی ہے۔ایک بار پھر کمیونسٹ پارٹی کے تعلقات ہندوستانی قومی کانگریس کے ساتھ مضبوط ہونے لگے۔اس نے اپنے ممبروں کو اس میں شامل ہونے کے لیے کہا اور زور ڈالا کہ وہ اپنے زیر اثر لوگوں کو بھی کانگریس میں شامل کریں۔1938 میں یہ تھوڑا سا اور آگے بڑھی اور تسلیم کیا کہ 'ہندوستانی قومی کانگریس ہندوستان کے عوام کی وہ سیاسی تنظیم ہے جو سامراجیت کے خلاف پوری طرح مستعد ہے۔' 1939 میں پی۔ سی۔ جوشی نے پارٹی کے ہفتہ وار اخبار 'نیشنل فرنٹ' (National Front)میں لکھا کہ آج ہماری سب سے بڑی اور طبقاتی جدوجہد، قومی تحریک ہے اور کانگریس اس کی ترجمان ہے۔اس کے علاوہ کمیونسٹ پارٹی قومی تحریک کو مزدور طبقہ کی قیادت میں لانے کے اپنے موقف پر بھی قائم رہی۔اس دوران کمیونسٹوں نے کانگریس کے اندر بڑی محنت سے کام کیا۔پارٹی کے بہت سارے لوگ کانگریس کی ضلع اور صوبائی کمیٹیوں کے عہدیدار بن گئے اور تقریبا20لوگ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے ممبر بھی ہو گئے۔1936اور1942کے درمیان ان لوگوں نے کیرالا، آندھرا، بنگال اور پنجاب میں زبردست کسان تحریکیں چلائیں۔اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ تھی کہ ان لوگوں نے سامراجیت مخالف مجاہدین آزادی کی حیثیت سے اپنا کھویا ہوا وقار دوبارہ بحال کرلیا۔

14.5 کچھ دیگر بائیں بازو کی جماعتیں (A Few Other Left-Wing Parties)

1930 کی دہائی میں بائیں بازو میں کچھ دوسرے گٹ اور رجحانات ابھر کر سامنے آئے۔1930 میں ایم۔این۔رائے (M.N. Roy)ہندوستان لوٹ آئے۔انہوں نے اپنے پیروکاروں یعنی رائسٹوں (Royists) کی ایک مضبوط جماعت تیار کی۔بعد کے سالوں میں ان کی نظریاتی اور سیاسی فکر میں بڑی تبدیلی پیدا ہوئی۔1939 میں جب سبھاش چندر بوس کو کانگریس کی صدارت سے استعفیٰ دینے کے لیے مجبور کیا گیا تب بوس نے اپنے بائیں بازو کے ساتھیوں کی ایک الگ پارٹی فارورڈ بلاک(Forward Block)قائم کی۔1930 کی

دہائی میں کئی دوسری جماعتیں بھی کام کر رہی تھیں جیسے ہندستان سوشلسٹ ریپبلکن ایسوسی ایشن (Hindustan Socialist Republican Association)،ریولوشنری سوشلسٹ پارٹی(Revolutionary Socialist Party) اور بہت سے ٹراٹسکی کے پیروکار گروہ(Trotskyist Groups) وغیرہ۔ سوائی سہجانند سرسوتی ،پروفیسر این۔ جی۔ رنگا اور اندولال یاگنک جیسے بائیں بازو کے لوگ کسی بھی تنظیم میں شامل نہیں تھے۔ یہ لوگ اپنے اپنے طور پر کام کرتے تھے۔ سوشلسٹ پارٹی آف انڈیا، کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا، جواہر لال نہرو، سبھاش چندر بوس اور دوسری بائیں بازو کی جماعتوں اور لیڈروں کا سیاسی پروگرام مشترک تھا،اس لیے تنظیمی اور نظریاتی اختلافات کے باوجود ان سب نے 1935 کے بعد ساتھ ساتھ کام کر کے ہندستانی سیاست کو اشتراکی سمت دی۔ان کے مشترکہ پروگرام کی بنیادی باتیں یہ تھیں؛

- سامراجی اور زمینداری نظام کی مستقل اور زبردست مخالفت کرنا۔
- مزدوروں کی ٹریڈیونین اور کسانوں کی سبھائیں منظم کرنا۔
- آزاد ہندوستان کو اشتراکی سمت کی طرف لے جانا۔
- لوگوں کی سماجی اور معاشی تبدیلی کے لیے پروگرام چلانا۔
- فسطائیت، نوآبادیت اور جنگوں کی مخالف پالیسی کو تیز کرنا۔

14.6 بائیں بازو کی تحریکوں کی کمزوریاں (Weaknesses of the Left Movements)

حالانکہ بائیں بازو کے زیادہ تر لوگ نہایت حوصلہ مند، جنگجو اور سرفروش مجاہدین آزادی تھے پھر بھی یہ لوگ اپنا بنیادی کام پورا کرنے میں ناکام رہے یعنی قومی تحریک پر اشتراکی نظریات کا اثر نہیں ڈال سکے اور اس طرح 1930 کی دہائی میں کیے گئے اپنے عہد وپیمان کو یہ عملی جامہ نہیں پہنا سکے۔اس معمے کو مورخین اب تک حل نہیں کر سکے۔اس صورت حال کے بارے میں جو وضاحتیں دی گئی ہیں ان سے یہ پتہ چلتا ہے کہ کانگریس کے بڑے رہنماؤں کے ساتھ بائیں بازو والوں کا اختلاف ہمیشہ غلط باتوں پر ہوتا تھا اور جب یہ تناتنی انتہا کو پہنچ جاتی تب بایاں بازو یا تو اس بات کو ماننے کے لیے مجبور ہو جاتا یا پھر قومی تحریک سے الگ تھلگ ہو جاتا تھا۔

کانگریس کے دائیں بازو کے ایک دم الٹ اس کی حکمت عملی اور نظریے میں ذرہ برابر لچیلا پن نہیں آتا، بلکہ بائیں بازو والے، دائیں بازو والوں کی مخالفت میں یکطرفہ اور انتہا پسندانہ رخ اپنا کر چرب زبانی سے کام لیتے اور سطحی اور غلط باتوں کو لے کر ان سے جھگڑتے۔ان کے ساتھ ان کا ٹکراؤ نظریاتی مسئلہ پر نہیں بلکہ جدوجہد کے طور طریقوں اور طرز عمل کے سلسلے میں ہوا کرتا تھا۔ مثلاً کانگریس کے دائیں بازو کے خلاف ان کا سب سے بڑا الزام یہ تھا کہ یہ سامراجیت کا حامی ہے نیز سرمایہ داروں کے زیر اثر ہونے کی وجہ سے پوری طرح سے سامراجیت کی مخالفت نہیں کرتا ہے۔اس طرح کے لچر اور بے بنیاد الزامات کی تردید بڑی آسانی سے دائیں بازو والوں کے ذریعہ ہو جاتی تھی۔ عوام کا اعتماد دائیں بازو پر تھا مگر بائیں پر نہیں تھا۔اس کے ثبوت میں تین باتوں کا تذکرہ کیا جا سکتا ہے۔ 37-1936 میں الیکشن اور سرکار بنانے کے مسئلے پر

کانگریس کے اندر دونوں بازؤں میں جو ٹکراؤ ہوا، اس کو سامراجیت کے ساتھ مصالحت بتایا گیا۔ 42-1939 میں عوامی تحریک شروع کرنے کے مسئلہ پر پھر ٹکراؤ کی نوبت آئی۔ گاندھی نے عوامی تحریک شروع کرنے میں جو ہچکچاہٹ دکھائی اس کی تعبیر یہ نکالی گئی کہ گاندھی کا رویہ انگریزوں کے تئیں نرم ہے اور وہ سنہرا موقع ہاتھ سے کھو رہے ہیں۔ 47-1945 میں تیسری بار بائیں بازو کا ٹکراؤ، کانگریس کے طاقتور گروپ کے ساتھ جس میں جواہر لال نہرو اور مولانا آزاد شامل تھے، اس وقت ہوا جب اقتدار کی منتقلی کی بات چل رہی تھی۔ بائیں بازو والوں نے یہ کہا کہ سامراجیت کے ذریعہ اٹکایا گیا یہ آخری روڑا ہے۔ اس کے ذریعہ وہ اپنے اقتدار کی مدت کو لمبا کرنا چاہتی ہے اور تھکی ماندی کانگریس قیادت یا تو اقتدار کی بھوکی ہے یا پھر وہ بے وفائی کر رہی ہے۔

ہندوستان کی حقیقی صورت حال کے سلسلہ میں بائیں بازو والوں کا مطالعہ کافی ناقص تھا۔ جواہر لال نہرو کے علاوہ، وہ کانگریسی قیادت کی غالب اکثریت کو سرمایہ داروں کا لیڈر مانتے تھے۔ بات چیت کے ذریعہ معاملہ کو حل کرنے کی کانگریس کی کسی بھی کوشش کو برطانوی سامراجیت کے ساتھ مصالحت سمجھا جاتا تھا اور قانونی دائرہ میں رہ کر کسی بھی کوشش کو حصول آزادی کی جدوجہد سے غداری مانا جاتا تھا۔ وہ ہندوستان کے سماجی طبقات اور ان کے سیاسی امور کی تشریح و وضاحت میں عمومیت (generalisation) اختیار کرتے تھے۔ قومی تحریک کو باضابطہ چلانے کی کوشش کو وہ تحریک کو بھٹکانا سمجھتے تھے۔ عوام کو نظریاتی اعتبار سے متحرک کرنے کے بجائے وہ اپنی تمام تر توجہ ہمیشہ اس بات پر دیتے تھے کہ عدم تشدد کی بنسبت مسلح جدوجہد کہیں زیادہ کارگر اور بہتر ہے۔ ان کے خیال سے عوام، قائدین کے ایک اشارہ پر عمل کرنے کے لیے ہمیشہ تیار رہتے ہیں۔ انہوں نے عوام کے درمیان اپنی اہمیت کو بہت بڑھا چڑھا کر آنکا تھا۔ اس کے علاوہ وہ جدوجہد آزادی کی گاندھیائی حکمت عملی کو سمجھنے میں بھی قاصر رہے۔

بائیں بازو کی سب سے بڑی کمزوری یہ تھی کہ اس کی مختلف پارٹیاں، جماعتیں، اور شخصیتیں بہت دنوں تک متحد نہیں رہ سکیں اور ان کو متحد کرنے کی ساری کوششیں بھی ناکام رہیں۔ اصولی اور نظریاتی اختلافات ان میں اتنے زیادہ تھے اور ان کے لیڈران چڑ چڑے ہو گئے تھے اور بات بات میں جذبات سے بے قابو ہو اٹھتے تھے۔ نہرو اور بوس بہت دنوں تک ساتھ ساتھ کام نہ کر سکے اور 1939 میں بر سر عام جھگڑ پڑے۔ نہرو اور اشتراکی بھی آپس میں تال میل نہیں بٹھا سکے۔ 1939 کے بعد بوس اور اشتراکی بھی الگ الگ ہو گئے۔ کانگریس سوشلسٹ پارٹی اور کمیونسٹوں نے 1935 سے 1940 تک نہایت محنت سے مل جل کر کام کیا۔ کانگریس سوشلسٹ پارٹی نے کمیونسٹوں اور رائسٹوں کے لیے 1935 میں اپنا دروازہ کھول دیا تا کہ غیر قانونی کمیونسٹ پارٹی کو قانونی طور پر سیاست میں آنے کا راستہ مل سکے، لیکن جلد ہی اشتراکی اور کمیونسٹ الگ الگ ہو کر ایک دوسرے کے دشمن بن گئے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ دونوں میں لمبے عرصہ کے لیے پھوٹ پڑ گئی۔ ہر ایک اشتراکی کو کمیونسٹ، اپنا دشمن اور ہر ایک کمیونسٹ کو اشتراکی، سرمایہ داروں کا رہنما یا (1947 کے بعد) امریکی ایجنٹ دکھائی پڑتا تھا۔

14.7 ہندوستانی سیاست میں بائیں بازو کے اثرات (Influence of the Left on Indian Politics)

بائیں بازو نے ہندستانی سماج اور سیاست پر بنیادی طور سے گہرا اثر ڈالا۔ متعدد کسان اور مزدور تنظیمیں وجود میں آئیں، جن کا قیام بائیں بازو کا بڑا کارنامہ ہے۔ کانگریس پر بھی اس کا بہت اثر پڑا۔ انتظامی نقطہ نظر سے آل انڈیا کانگریس کمیٹی میں ایک تہائی ووٹ، کئی اہم باتوں پر بائیں بازو کی حمایت میں پڑتے تھے۔ 1936 سے 1939 کے درمیان نہرو اور بوس کانگریس کے صدر منتخب ہوئے۔ نہرو کو اپنی انتظامیہ کمیٹی میں تین عظیم اشتراکیوں، آچاریہ نریندر دیو، جے پرکاش نرائن اور اچیت پٹوردھن (Achyut Patwardhan) کو نامزد کرنے میں کامیابی ملی تھی۔ 1939 میں بائیں بازو کے امیدوار کی حیثیت سے بوس نے صدارتی انتخاب میں 1377 کے مقابلے 1580 ووٹوں سے پی پٹا بھی سیتارمیا (Dr. B. Pattabhi Sitaramayya) کو ہرایا تھا۔ نظریاتی اور سیاسی دونوں اعتبار سے کانگریس کا جھکاؤ اکثر بائیں بازو کی طرف رہا جیسا کہ نہرو نے لکھا ہے کہ 'ہندستانی قومیت کو بڑی اہم سماجی تبدیلی کی طرف ڈھکیل دیا گیا ہے اور غیر متعین طور پر ہی سہی، یہ نئے نظریے کے چاروں طرف گھوم رہی ہے۔' کانگریس اور اس کے دائیں بازو نے یہ تسلیم کر لیا تھا کہ ہندوستان کی غریبی اور ناداری صرف نوآبادیاتی حکومت کی وجہ سے ہی نہیں ہے بلکہ ملک کے اندرونی سماجی اور معاشی ڈھانچے کا بھی نتیجہ ہے۔ اس لیے ان سب میں مکمل تبدیلی بے حد ضروری ہے۔

1931 کے کانگریس کے کراچی اجلاس میں پاس کی گئی بنیادی حقوق اور معاشی پالیسی سے بھی قومی تحریک پر بائیں بازو کے اثرات صاف ظاہر ہوتے ہیں۔ اس کے بعد 1936 میں کانگریس کے فیض پور اجلاس میں معاشی پالیسی کی جو تجویز پاس کی گئی تھی، اس سے بھی کانگریس پر بائیں بازو کا اثر اچھی طرح نمایاں ہوتا ہے۔ مزید برآں 1936 کے کانگریس کے انتخابی منشور (Election Manifesto)، 1938 میں قائم شدہ قومی منصوبہ بندی کمیٹی (National Planning Committee) اور طبقاتی اور معاشی مسائل پر گاندھی کی سوچ میں دھیرے دھیرے تبدیلی میں بھی بائیں بازو کے اثرات کی جھلک ملتی ہے۔ پروگریسیو رائٹرس ایسوسی ایشن (Progressive Writers' Association)، آل انڈیا اسٹوڈنٹس فیڈریشن (All-India Students' Federation) اور آل انڈیا اسٹیٹس پیپلس کانفرنس (All-India States' People's Conference) کا قیام بائیں بازو کے ہی کارنامے ہیں۔ آل انڈیا ویمنس کانفرنس (All-India Women's Conference) کے قیام میں بھی بایاں بازو بہت سرگرم تھا۔ ان سب کے علاوہ بائیں بازو نے کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا اور کانگریس سوشلسٹ پارٹی جیسی اہم تنظیموں کو بھی شروع کرکے پروان چڑھایا تھا۔

14.8 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ یہ جان چکے ہونگے کہ کس طرح ہندوستان میں بائیں بازو کی تحریکوں کو عروج حاصل ہوا۔ روس میں لینن کی قیادت میں بالشویک انقلاب نے ان تحریکوں کو مزید تقویت پہنچائی۔ بائیں بازو کی دو بڑی جماعتیں کانگریس سوشلسٹ پارٹی اور

کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کا قیام اور ان کا قومی جدوجہد میں شامل ہونا کئی معنوں میں بے حد اہمیت کا حامل ہے۔ان لوگوں نے قومی کانگریس کے اندر اور باہر کسان اور تحریکوں کو منظم کیا،ٹریڈ یونینیں بنائیں اور سامراجی اور سرمایہ دار طبقے کے ذریعے کیے جانے والے استحصال کے خلاف آواز اٹھائی۔جواہر لال نہرو، سبھاش چندر بوس اور دیگر اشتراکی رہنماؤں نے کانگریس کو اشتراکی نوعیت بنانے پر زور دیا اور اس میں مزدوروں اور کسانوں کی شمولیت پر پوری توجہ دی۔ کمیونسٹوں نے بھی کمیونسٹ انٹرنیشنل کی ہدایات پر ہندوستان کی آزادی کے لیے جدوجہد کی۔ایم این رائے جیسے رہنماؤں نے کانگریس پر مزدوروں اور کسانوں سے دھوکہ دہی اور سامراجیت کا ساتھ دینے کا الزام لگایا۔انہوں نے مسلح جدوجہد کو بہتر اور موثر بتایا اور گاندھیائی پرامن جدوجہد کو مسترد کر دیا۔ باہمی اختلافات اور عوام کو اپنی طرف راغب نہ کرپانے کی وجہ سے بائیں بازو کی تحریکیں اپنے حتمی مقصد کے حصول یعنی ہندوستان کی قومی جدوجہد کو اشتراکی بنانے میں ناکام رہیں لیکن اس کے باوجود انہوں نے آزادی کی تحریک اور ہندوستانی سیاست پر اپنے گہرے اثرات مرتب کیے اور معاشی اصلاحات کے منصوبے کو اولیت دلائی۔

14.9 کلیدی الفاظ (Keywords)

رائسٹوں	:	(Royists) ایم این رائے کے ذریعے قائم کردہ ریڈیکل ڈیموکریٹک پارٹی کے ممبران۔
زار شاہی	:	روس کے حکمراں کو زار کہا جاتا تھا اور اس کی حکومت زار شاہی کے نام سے مشہور تھی۔
روسی انقلاب	:	لینن کی قیادت میں 1917 میں روسی مارکسوادیوں (بالشویکوں) کے ذریعے زار شاہی کا خاتمہ اور پہلی اشتراکی ریاست یعنی سوویت روس کا قیام۔
اشتراکیت	:	اسے انگریزی میں *Socialism* کہا جاتا ہے۔یہ کارل مارکس کے نظریات پر مبنی ہے جس میں معاشی اور سیاسی مساوات، دولت کی مساوی تقسیم اور غیر طبقاتی سماج پر زور دیا جاتا ہے۔
اشتمالیت	:	اسے انگریزی میں *Communism* کہا جاتا ہے۔یہ اشتراکیت کی ہی ایک ترقی یافتہ شکل ہے جس میں ذاتی ملکیت کا مکمل خاتمہ ہو جاتا ہے اور سماج کی ہر چیز پر سماج کے ہر فرد کا مساوی حق ہوتا ہے۔اشتراکیت اور اشتمالیت سرمایہ داری کے مکمل مخالف ہیں۔
سرمایہ داری	:	اسے انگریزی میں *Capitalism* کہا جاتا ہے۔اس میں دولت چند ایک سرمایہ داروں کے ہاتھ میں اکٹھا ہو جاتی ہے اور یہ ذاتی ملکیت کی طرفدار ہے۔
بالشویک	:	روس کے مارکسوادیوں کی ایک پارٹی جو کمیونسٹ اصولوں پر مکمل یقین رکھتی تھی اور سرمایہ داری سے کسی بھی سمجھوتے کے لیے تیار نہیں تھی۔
عظیم مندی	:	(Great Depression)، سرمایہ دار ملکوں میں 1929 میں آئی عالمی گراوٹ جس میں پیداوار بڑھنے اور مانگ کم ہونے سے اشیا کی قیمتوں میں اچانک اس قدر گراوٹ آئی کہ دنیا بھر کے شیئر مارکیٹ ایک جھٹکے میں برباد ہو گئے اور لاکھوں لوگوں کے اربوں روپیوں کا نقصان ہو گیا۔ساتھ ہی پوری دنیا میں بے

روزگاری اور بھکمری پھیل گئی۔

فسطائیت : (Fascism)ایک ایسا نظریہ ہے جس میں طاقت کے ذریعے دوسرے ممالک پر قبضہ کرنا اور اور ایک نسل کی برتری ثابت کرنا جائز ٹھہرایا گیا۔ اسے ہٹلر اور مسولینی نے عمل میں لایا۔

کمیونسٹ انٹرنیشنل : (Communist International) یا کامنٹرن (Comintern) عالمی اشتراکی انجمن تھی جو پوری دنیا میں اشتراکیت کے فروغ کے لیے سرگرم تھی۔

بورزوازی : (Bourgeoisie) فرانسیسی لفظ ہے جس کا مطلب ہے درمیانی طبقہ جیسے تاجر، دکاندار اور کاریگر وغیرہ۔

انتخابی منشور : (Election Manifesto) الیکشن میں پارٹیوں کے ذریعے کیے گئے وعدوں کا پلندا۔

14.10 نمونہ امتحانی سوالات (Model Exanimation Questions)

14.10.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. کانگریس سوشلسٹ پارٹی کب قائم کی گئی؟
2. سی۔پی۔آئی۔(C.P.I.) کا پورا نام بتائیے۔
3. زار کسے کہا جاتا تھا؟
4. روسی انقلاب کس سال میں آیا تھا؟
5. دو ہندوستانی اشتراکی رہنماؤں کے نام بتائیے۔
6. ایم این رائے کس پارٹی سے وابستہ تھے؟
7. بالشویک کون تھے؟
8. عظیم مندی کس سال میں آئی؟
9. بورژوازی سے آپ کیا سمجھتے ہیں؟
10. انتخابی منشور کیا ہوتا ہے؟

14.10.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. ہندوستان میں بائیں بازو کی تحریکات کے پس منظر پر ایک نوٹ لکھیے۔
2. بائیں بازو کی تحریکوں کی کمزوریاں بتائیے، آخر یہ ہندوستان میں روس کی طرح کامیاب کیوں نہیں ہو سکیں؟
3. ہندوستانی سیاست میں بائیں بازو کے اثرات پر ایک نوٹ لکھیے۔
4. بائیں بازو کی کچھ دیگر چھوٹی جماعتوں کے بارے میں ایک نوٹ لکھیے۔

5. کانگریس سوشلسٹ پارٹی کے لوگ کتنے دھڑوں میں بنٹے ہوئے تھے؟ وضاحت کیجیے۔

14.10.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. جواہر لال نہرو اور اشتراکی تحریک پر ایک تفصیلی مضمون لکھیے۔
2. ایم این رائے اور کمیونسٹ پارٹی کے ارتقا پر ایک تفصیلی مضمون لکھیے۔
3. کانگریس سوشلسٹ پارٹی کی ابتدا اور ارتقا پر تفصیلی بحث کیجیے۔

14.11 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Learning Resources)

1. Bandyopadhyay, Sekhar, *From Plassey to Partition*: *A History of Modern India*, Orient BlackSwan, New Delhi, 2012 (first pub. in 2004).
2. Bose, Subhas Chandra et. al. *The Indian Struggle 1920–1942*, Oxford University Press, New Delhi, 1997.
3. Chandra, Bipan et al. *India*'*s Struggle for Independence 1857–1947*, Penguin, New Delhi, 2017.
4. Chandra, Bipan (ed.), *The Indian Left: Critical Appraisals*, Vikas Publishing House, New Delhi, 1983.
5. Chandra, Bipan, *Essays on Indian Nationalism*, Har-Anand Publications, New Delhi, 1993.
6. Chowdhury, Satyabrata Rai, *Leftism in India*, *1917–1947*, Sage, New Delhi, 1977.
7. Gopal, S., *Jawaharlal Nehru*: *A Biography*, Vol. I, Vintage Digital, 2015.
8. Nehru, Jawaharlal, *An Autobiography*, Penguin Random House, India, 2017.
9. Sarkar, Sumit, *Modern India*, *1885–1947*, MacMillan, New Delhi, 1996 (first pub. in 1983).
10. Shankar, Girja, *Socialist Trends in Indian National Movement*, *Being a Study of the Congress Socialist Party*, 1st edn., Twenty-First-Century Publishers, Meerut, 1987.

اکائی 15۔آزاد ہند فوج

(Indian National Army)

اکائی کے اجزا

15.0 تمہید
15.1 مقاصد
15.2 سبھاش چندر بوس کی سیاسی سرگرمیاں
15.3 آزاد ہند فوج کا تاریخی پس منظر
15.4 نیتاجی کی مشرقی ایشیا میں آمد اور آزاد ہند فوج پر اس کے اثرات
15.5 ہندوستان کی آزادی میں آزاد ہند فوج کا تعاون
15.6 جاپان کی شکست اور عالمی جنگ کا خاتمہ
15.7 آزاد ہند فوج کے سپاہیوں کا مقدمہ اور قومی بغاوت
15.8 آزاد ہند فوج کی کامیابیاں
15.9 نتائج
15.10 کلیدی الفاظ
15.11 نمونہ امتحانی سوالات
15.11.1 معروضی سوالات
15.11.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
15.11.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
15.12 تجویز کردہ اکتسابی مواد

मौलाना आज़ाद नेशनल उर्दू यूनिवर्सिटी
Estd. 1998
MAULANA AZAD NATIONAL URDU UNIVERSITY

15.0 تمہید (Introduction)

آزاد ہند فوج (آزاد ہند فوج)، جسے آزاد ہند فوج بھی کہا جاتا ہے، ایک انقلابی مسلح فورس تھی جسے ہندوستان کی برطانوی نوآبادیاتی حکومت کے خلاف آزادی کی جدوجہد کے دوران تشکیل دیا گیا تھا۔ اس کے قیام کا مقصد ہندوستان کو برطانوی تسلط سے آزاد کرانا تھا۔ آزاد ہند فوج خاص طور پر اس کے لیڈر سبھاس چندر بوس سے وابستہ ہے، جنہوں نے اس کی تشکیل اور قیادت میں اہم کردار ادا کیا۔ 1940 کی دہائی کے دوران، برطانوی پر تشدد کوششوں کے باوجود، آزاد ہند فوج، ہندوستان چھوڑو تحریک کے ساتھ، آزادی کے لیے سب سے اہم تحریک کے طور پر ابھری۔ اس یونٹ میں، ہم ملک کو نوآبادیاتی حکمرانی سے آزاد کرانے کے لیے سبھاش چندر بوس جن کو نیتا جی کے نام سے جانا جاتا ہے اور ہندوستان سے باہر رہنے والے ہندوستانیوں کی جدوجہد کے بارے میں تبصرہ کریں گے۔ نیتا جی کی شخصیت سیاسی، مذہبی، لسانی اور علاقائی تقسیم کو ختم کرتی ہے۔ وہ صحیح معنوں میں ایک قوم پرست شخصیت تھے اور آزاد ہند فوج قومی اتحاد اور سامراج کے خلاف بغاوت کی نشانی بن گئی۔

15.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- آزاد ہند فوج کی تشکیل کے اغراض و مقاصد کے بارے میں جانیں گے۔
- سبھاس چندر بوس کی کرشماتی قیادت میں آزاد ہند فوج کی ترقی اور کاروائیوں کے بارے میں جان سکیں گے۔
- انگریزوں کے خلاف جنگ میں آزاد ہند فوج کے کردار، تجزیاتی مباحثہ کے بارے میں واقف ہو سکیں گے۔
- ہندوستانی قوم پرست تحریک پر آزاد ہند فوج کی جدوجہد کے اثرات کو سمجھ سکیں گے۔

15.2 سبھاش چندر بوس کی سیاسی سرگرمیاں

(Political Activities of Subhas Chandra Bose)

سبھاس چندر بوس، ایک ممتاز ہندوستانی قوم پرست اور عظیم مجاہد آزادی تھے۔ 23 جنوری 1897 کو کٹک، اڑیشہ میں پیدا ہوئے، انہوں نے بیسویں صدی کی ابتدا میں برطانوی سامراج کے خلاف جنگ میں اہم کردار ادا کیا۔ بوس سوامی وویکانند اور اروبندو گھوش جیسے ہندوستانی مجاہدین کے خیالات سے بہت متاثر تھے۔ انہوں نے انڈین سول سروسز میں کامیابی حاصل کی لیکن بعد میں مستعفی ہو کر انڈین نیشنل کانگریس میں شمولیت اختیار کی اور 1920 میں مہاتما گاندھی کی طرف سے شروع کی گئی عدم تعاون کی تحریک میں حصہ لیا۔ تاہم، آزادی کے حصول کے لیے مزید جارحانہ اقدامات پر بوس کے یقین نے انہیں بعد میں گاندھی اور کانگریس سے الگ ہونے پر مجبور کیا۔ بوس ایک کٹر سامراج مخالف تھے، وہ اپنی تخلیقی، مساویانہ اور برادرانہ معنوں میں قوم پرست تھے۔ انہوں نے نازی جرمنی کی نسل پرستی اور جاپان کی جارحیت کو پسپا محسوس ہوتے ہوا دیکھا۔ لیکن وقت اور حالات انہیں مجبور کیا کہ اپنے ملک کو آزاد کرانے کے لیے ان طاقتوں کی مدد لینے پر مجبور

ہوئے۔ ہندوستان کی آزادی کے لیے ان کی شدید خواہش نے انہیں انسانی حقوق کی سنگین ترین خلاف ورزیوں کو نظر انداز کرنے پر مجبور کیا۔

نیتا جی سیاسی طور پر کانگریس میں سوشلسٹوں کے ساتھ منسلک تھے اور مہاتما گاندھی سے ان کے بہت سے اختلافات تھے۔ اوّل یہ کہ گاندھی عدم تشدد پر پختہ یقین رکھتے تھے، بوس اپنے ملک کو آزاد کرنے کے لیے تشدد کے حامی تھے۔ دوم، بوس کا خیال تھا کہ صنعت کاری اور جدیدیت ہندوستان کی تخلیق نو کو جنم دے گی، جبکہ گاندھی کا خیال تھا کہ ہندوستان کے دیہاتوں کی خود مختار ترقی ہی ان کے لئے نجات دہندہ ہو گی۔ تیسرا، یہ کہ بوس سیاسی طور پر بنیاد پرست اور سوشلسٹ تھے جنھوں نے ہندوستان کے غریبوں کے حالات کو بہتر بنانے کے لیے طبقاتی کشمکش سے منہ نہیں موڑا، گاندھی کا خیال تھا کہ طبقاتی جدوجہد، اس کے پر تشدد کردار کی وجہ سے، ناقابل قبول ہے اور انہوں نے غریبوں اور مظلوموں کی ابتر حالات کو دور کرنے کے لیے امیروں کی امانت داری اور سچائی کی تلقین کی۔ بوس کو 1938 میں گاندھی اور دیگر کانگریسوں کی حمایت سے کانگریس کا صدر منتخب کیا گیا۔ لیکن جب بوس نے 1939 میں اس عہدے کے لیے دوبارہ الیکشن لڑنے کا فیصلہ کیا تو گاندھی اور ان کے ساتھیوں نے اس کی مخالفت کی۔ بوس نے گاندھی کے امیدوار پٹا بھی سیتا رامیّا (Dr. Pattabhi Sitaramayya) کے خلاف کانگریس کی تریپوری سیشن میں کامیابی حاصل کی۔ لیکن بعد میں، پارٹی کی مرکزی قیادت کے ساتھ اختلافات کی وجہ سے، انہوں نے عہدے سے استعفیٰ دے دیا۔ بی آر ٹاملسن (B.R. Tomilson) نے اس الیکشن کو "نظریاتی جنگ سے تعبیر کیا ہے"۔ عدم تشدد کے طریقوں سے مایوس ہو کر، انہوں نے آل انڈیا فارورڈ بلاک (1939) قائم کیا، جو کانگریس کے ساتھ جھکاؤ رکھنے والی قوم پرست تنظیم تھی، جس نے ہندوستان کی مکمل آزادی کی وکالت کی۔

جب دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی تو زیادہ تر ہندوستانی برطانوی حکومت کے ساتھ اپنے گذشتہ تجربات کی وجہ سے اتحادی طاقتوں (Allied Powers) کی حمایت میں نہیں تھے۔ درحقیقت، برطانیہ کی جانب سے ہندوستانی رہنما اور عوام کو اعتماد میں نہ لینے سے پہلے بھارت کو جنگ میں شامل ہونے کا اعلان کیا گیا' اور نہ ہی مستقبل میں کسی ٹھوس منصوبے کا کوئی وعدہ تھا۔ جسکی وجہ سے کانگریس کی وزارتوں نے احتجاجاً استعفیٰ دے دیا۔ یہاں تک گاندھی نے بھی واضح کر دیا کہ وہ 'فاشسٹ یا نازی طاقتوں اور اتحادیوں میں کوئی فرق نہیں دیکھتے ہیں۔ سب استحصال کرنے والے ہیں، سب اپنے انجام کو گھیرنے کے لیے اس حد تک بے رحمی کا سہارا لیتے ہیں۔ 1940 میں، جب انڈین نیشنل کانگریس نے انفرادی ستیہ گرہ کا اہتمام کیا، سبھاش چندر بوس محدود انفرادی ستیہ گرہ سے متاثر نہیں ہوئے۔ اور انہوں نے مارچ 1940 میں انگریزوں کے خلاف بہار کے رام گڑھ میں سمجھوتہ مخالف کانفرنس کا اہتمام کیا۔ بوس نو آبادیاتی حکمرانی کے سخت مخالف تھے اور انہوں نے اس خیال کو قبول کرنے سے انکار کر دیا کہ جنگ میں نازی فوج کے خلاف انگریزوں کا ساتھ دیا جانا چاہیے۔ بوس نے کلکتہ میں بڑے پیمانے پر مظاہروں کا اہتمام کیا جس میں "ہول ویل مونومینٹ" کو ہٹانے کا مطالبہ کیا گیا، جو کلکتہ کے بلیک ہول میں مرنے والوں کی یادوں میں نصب کیا گیا تھا۔ ان کی آواز اور افعال کے خوف سے برطانوی نو آبادیاتی حکام نے انہیں جولائی 1940 میں گرفتار کر لیا۔ نومبر 1940 میں انہوں نے جیل میں بھوک ہڑتال شروع کر دی جس کے بعد انہیں جیل سے رہا کر دیا گیا اور دسمبر 1940 میں پھر انہیں گھر میں نظر بند کر دیا گیا۔ وہاں سے وہ پٹھان کے لباس اور اپنا حلیہ تبدیل کر کے فرار ہو گئے۔ شمال مغربی سرحدی صوبوں سے ہوتے ہوئے افغانستان پہنچے، وہاں انہوں نے گرفتاری

سے بچنے کے لئے فرار ہو گئے اور پھر سوویت اور جرمن طاقتوں کی مدد سے، ماسکو کا سفر کیا۔ سوویت یونین کی انگریزوں کے خلاف حمایت چاہتے تھے۔ تاہم، بوس کو سوویت یونین کے رد عمل سے مایوسی ہوئی۔ آخر کار، اپریل 1941 کو وہ ماسکو سے برلن چلے گئے۔ وہاں مقیم ہندوستانی طلبہ نے ان کا پر جوش خیر مقدم کیا اور علمی سرگرمیوں کو چھوڑ کر سوبھاش چندر بوس کی مہم میں شامل ہو گئے۔

جرمنی میں بوس نے نازی وزیر خارجہ ربینٹرو سے مدد طلب کی۔ یہاں، 'نازی اسپیشل بیورو' کی مدد سے انہوں نے ہندوستانیوں تک پہنچے اور انہیں آزادی کے لیے لڑنے کی ترغیب دینے کے لیے 'آزاد ہند ریڈیو' قائم کیا۔ بوس نے 'انڈین لیجن' کی بنیاد بھی ڈالی، اس میں وہ ہندوستانی جنگی قیدی شامل تھے جو جرمن فوج کے ہاتھوں پکڑے گئے تھے، اور بعد میں وہرماچٹ (جرمن مسلح افواج) کا حصہ بن گیے۔ تاہم، نظریاتی اختلافات اور محدود حمایت کی وجہ سے، بوس نے اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے دوسرے راستے تلاش کیے۔ خاص طور پر، بوس تب ناراض ہو گئے تھے جب ہٹلر کی فوج سوویت سرحد پار کر چکی تھی۔ وہ سوشلسٹ قوم کے طور پر سوویت یونین کے مداح تھے۔ مئی 1942 میں بوس نے ہٹلر سے ملاقات کی، اور یہ مانا کہ ہٹلر ہند کی افواج کو اپنے پروپیگنڈہ فتوحات کے لیے استعمال کرنے میں زیادہ دلچسپی رکھتا تھا۔ دوسری جنگ عظیم سنجیدگی سے آگے بڑھ رہی تھی ہٹلر نے سوویت اثر و رسوخ سے باہر بیشتر یورپ کو زیر کر لیا۔ ہٹلر اور اسٹالن کے درمیان ایک معاہدہ ہوا جس کی وجہ سے مشرقی یورپ میں اثر و رسوخ کے علاقوں کو تقسیم کر دیا گیا۔ بوس نے جرمن حکام کے ساتھ ان ہندوستانی فوجیوں کو رہا کرنے کی اپیل کی تھی جو شمالی افریقہ میں برطانوی شکست کے بعد جرمنوں کے ہاتھ لگ گئے تھے لیکن وہ کامیاب نہیں ہو سکے۔ اس کے علاوہ ہٹلر نے ابھی بھی انگلینڈ کو بے اثر کرنے کی امیدیں پالی تھیں اور اس لیے وہ ہندوستان میں انگریزی سلطنت کے خلاف سخت موقف اختیار نہیں کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے اپنے آپ کو ہندوستان کی آزادی کے حق میں غیر واضح طور پر اعلان کرنے سے بھی انکار کر دیا۔

جون 1941 میں جب جرمنی نے سوویت یونین پر حملہ کیا تو بوس کی حکمت عملی کو شدید صدمہ لگا۔ تاہم، جرمنی نے ابھی بھی اس کی کوشش میں اس کا ساتھ دینے کا وعدہ کیا، اس لیے انکی نے امید برقرار تھی۔ اس میں کچھ پیش رفت بھی ہوئی کیونکہ اب کچھ ہندوستانی فوجیوں کو جرمن افسروں نے انگریزوں کے خلاف لڑنے کے لیے کمپیکٹ یونٹ بنانے کی تربیت دی تھی۔ اور جرمنی میں تمام عذر کے باوجود، بوس چار بٹالین بنانے میں کامیاب ہو گئے، جن میں تقریباً 4000 ہندوستانی فوجی شامل تھے، جو دسمبر 1942 تک انگریزوں کے خلاف لڑنے کے لیے تیار تھے۔ قومی ترانے کے طور پر 'جن گن من ادھینائک' گانا، اور 'جئے ہند' قومی سلام کے طور پر جو کہ تمام ہندوستانیوں کے لیے بلا تفریق ذات پات اور نسل کے لیے عام ہو گا۔ یہ ملک کے اتحاد کی طرف نیتا جی کی پائیدار وراثت تھی۔ 'جئے ہند' کا مشہور نعرہ انکے رفیق کار عابد حسن سفرانی نے دیا تھا جو انڈین نیشنل آرمی کی سلامی کے علامت بن گئی۔

ستمبر 1940 میں جنگ میں جاپان کے داخلے، اور دسمبر 1941 میں زیادہ جارحانہ انداز نے ایشیا کے ممالک کو پوری طرح متحرک کر دیا۔ جاپانی افواج کی تیز رفتار پیش قدمی اور جنوب مشرقی ایشیا میں برطانوی اور دیگر یورپی سامراجی طاقتوں کی شکست نے بوس کے لیے ایک نیا راستہ کھولا اور اس کی حکمت عملی ہندوستان کی آزادی کے لیے تیار ہوئی۔ فروری 1942 میں سنگاپور کے زوال نے انہیں بے حد جوش دلایا اور وہ پہلی بار آزاد ہند ریڈیو پر بات کرنے کے لیے باہر آئے اور اعلان کیا کہ 'سنگاپور کے زوال کا مطلب برطانوی سلطنت کا خاتمہ ہے، اور

ہندوستانی تاریخ میں ایک نئے دور کا آغاز۔ یہ ریڈیو اکتوبر 1941 سے وجود میں آیا تھا اور اس عرصے کے دوران یہ بیرون ملک ہندوستانی تحریک آزادی کا سب سے اہم ترجمان بن گیا۔

برطانیہ کی طرف سے لڑنے والے ہندوستانی فوجیوں کی کافی تعداد جاپانیوں کے ہاتھ لگ گئی۔ نیز جنوب مشرقی ایشیا اور دیگر ممالک میں مقیم ہندوستانی آبادی، جو بوس کی حکمت عملی سے متفق تھے۔ اور دوسری طرف بوس باقاعدگی سے ریڈیو پر اپنے ملک کے لوگوں سے خطاب کرتے تھے اور انہیں انگریزوں کے خلاف کارروائی کرنے پر اکساتے تھے۔ جاپانی فتوحات جس نے برطانوی سامراج کی کمر توڑی تھی، وہ سمجھتے تھے کہ اب وہ آزاد ہند کے لیے انگریزوں کے خلاف لڑنے کے لیے ہندوستانیوں کی ایک بڑی قوت تیار کرنے پر پرامید تھے۔ اور وہ جرمنی میں جاپانی سفیر سے رابطے میں تھے وہ اپنے اہداف کو حاصل کرنے کے منصوبے بنا رہے تھے۔ جاپانی بھی بوس کے خیالات سے واقف تھے۔ مئی 1942 میں، ہٹلر نے بوس کی جاپان منتقلی کے لیے مدد فراہم کرنے پر اتفاق کیا۔ لیکن ہٹلر نے ہندوستان کی آزادی کے اعلان کے خیال سے گریز کیا۔ لیکن کم از کم انہوں نے جاپان منتقلی میں جرمن سے مدد کا وعدہ کر لیا۔ نظریاتی مسائل اور سہ فریقی طاقتوں کی ملکی اور بین الاقوامی پالیسیوں پر بوس نے انتہائی حکمت عملی سے کام لیا۔ انہوں نے ہٹلر کی نسل پرستانہ پالیسیوں کے بارے میں بھی عوامی سطح پر بات نہیں کی۔ انکا کہنا تھا کہ جرمنی یا اٹلی یا جاپان کی داخلی سیاست سے ہمیں کوئی سروکار نہیں ہے ہمارا مقصد صرف آزادی ہند ہے۔

اس دوران ہندوستان کا سیاسی منظر نامہ بھی بدل رہا تھا۔ گاندھی، ہندوستان پر جاپانی حملوں سے خوفزدہ تھے، چاہتے تھے کہ انگریز فوری طور پر اقتدار سے دستبردار ہو جائیں تاکہ ہندوستانی جاپانیوں کے ساتھ بات چیت کر سکیں۔ گاندھی کا خیال تھا کہ جاپانیوں کے پاس ہندوستان کے خلاف کچھ نہیں ہے لیکن وہ انگریزوں سے دشمنی رکھتے ہیں۔ اگر انگریز ہندوستان پر لگام لگاتے رہے تو جاپانی ہندوستان پر حملہ کر دیں گے۔ لہٰذا، وہ چاہتے تھے کہ انگریز فوراً ہندوستان چھوڑ دیں اور ہندوستانیوں کو اپنے معاملات خود سنبھالنے دیں۔ 8 اگست 1942 کو گاندھی نے ہندوستانیوں کے لیے 'کرو یا مرو' کا نعرہ دیا اور انگریزوں سے کہا کہ وہ فوری طور پر 'ہندوستان چھوڑو' کا نعرہ دیا جس کے نتیجے میں ملک بھر میں بغاوت پھوٹ پڑی۔ گاندھی کی پوزیشن میں یہ بڑی تبدیلی تھی۔ اور یہ بوس کی سوچ کے ساتھ موافق تھی۔ تاہم، جنوری 1943 کے وسط تک ہی اس کے آبدوز کے جاپان کے سفر کا منصوبہ ترتیب دیا گیا۔ فروری 1943 میں، اس نے ایشیا میں اپنی لڑائی شروع کرنے کے لیے جرمن ساحل چھوڑ دیا اور جاپان پہنچ گئے اور بے خوف ہو کر اپنے مقصد کی طرف بڑھ گئے۔

15.3 آزاد ہند فوج کا تاریخی پس منظر (Historical Background of Indian National Army)

جاپان کے ذریعہ امریکہ پر پرل ہاربر 1941 کے حملے نے اسے مقبول ملک بنا دیا کیونکہ اس نے ٹیکنالوجی اور پیسے کے لحاظ سے سب سے زیادہ طاقتور ملک پر حملہ کیا۔ امپیریل جاپان نے مشرقی اور جنوب مشرقی ایشیاء میں تیزی سے توسیع کی۔ جنوب مشرقی ایشیا میں جاپانی افواج کی تیزی سے پیش قدمی برطانوی، ڈچ اور فرانسیسی جیسی یورپی استعماری طاقتوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے سے صورتحال مکمل طور پر بدل گئی۔ اس خطے میں ہندوستان کی کل آبادی تقریباً 20 لاکھ تھی جس میں برما، ملایا، تھائی لینڈ، انڈونیشیا، ہانگ کانگ اور ہند-چین میں نمایاں ملک تھے۔

انگریزوں کی طرف سے کئی ہندوستانی سپاہی لڑ رہے تھے۔ جاپانیوں نے جنوب مشرقی ایشیا میں انگریزوں کو شکست دینے کے بعد کئی ہندوستانی فوجیوں کو جنگی قیدی بنالیا۔ اور حکمت عملی کے تحت ہندوستانیوں سمیت جنوب مشرقی ایشیا میں قوم پرستوں کو ان کے ساتھ تعاون کرنے کا منصوبہ بنایا۔ جاپانی فوج کے ایک افسر میجر فوجیواڑہ نے کیپٹن موہن سنگھ جو ایک جنگی قیدی تھے اور ہندوستان کے سب سے بڑے افسروں میں سے ایک تھے، کو قائل کیا کہ ہندوستان کی آزادی کے لیے جاپانیوں کے ساتھ مل کر کام کریں۔ اور انکو ہندوستانی فوج کو منظم کرنے کے لیے مقرر کیا گیا۔ اس کے علاوہ فوجیواڑہ نے گیانی پریتم سنگھ سے بھی رابطہ کیا جس کے دونوں فریقوں کے درمیان تعاون شروع کیا۔ اس بات پر اتفاق کیا گیا کہ ہندوستانی فاتح جاپانی افواج کے ساتھ مل کر ایک ہندوستانی قومی فوج کے قیام کے لیے کام کریں گے جو ہندوستان کی آزادی کے حصول کے لیے جاپانی افواج کی مدد کرے گی۔ پریتم سنگھ نے دوسرے ہندوستانی فوجیوں سے بھی ملاقاتیں کیں اور ان سے ہندوستان کی آزادی کے لیے لڑنے کو کہا۔ بات چیت کے کئی دور ہوئے اور آخر کار موہن سنگھ کو یقین ہو گیا، خاص طور پر جب ہندوستانی جنگی قیدیوں کا انتظام ان پر چھوڑ دیا گیا تھا۔ 1942 کے اوائل میں جب ملایا اور سنگاپور جاپانی ہاتھوں میں چلے گئے تو موہن سنگھ کی ذمہ داری مزید ہندوستانی فوجیوں کو سونپی گئی۔ ہندوستانی قیدیوں کی دیکھ بھال کے علاوہ، موہن سنگھ نے تھائی لینڈ، ملایا اور سنگاپور میں ہندوستانی شہریوں سے بھی رابطہ کیا۔ ملک کے مقصد کے لیے بیرون ملک کام کرنے والے بہت سے ہندوستانی انقلابی تھے۔ ان میں سے راش بہاری بوس تھے، جو 1915 سے جاپان میں انگریز مخالف کی حیثیت سے رہ رہے تھے۔ انہوں نے جنگ کی ہنگامی صورتحال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہندوستانیوں کو برطانیوں کے خلاف مسلح جدوجہد کے لیے اکٹھا کیا۔

مزید یہ کہ ملایا اور دیگر ممالک میں ہندوستانی قوم پرستانہ خیالات سے کافی حد تک متاثر تھے۔ انہوں نے پریتم سنگھ اور موہن سنگھ کا کام آسان بنادیا کیونکہ ہندوستانی شہریوں کے ساتھ ساتھ سپاہیوں کو جوش وخروش کے ساتھ بھرتی کیا اس طرح ہندوستانیوں کا فوج شامل ہونے کے لیے کچھ وجوہات تھی مثلاً (i دانشوروں میں ایک گہرا قوم پرستانہ جذبہ تھا۔ (ii یہ احساس تھا کہ انگریزوں نے انہیں بے عزتی کے ساتھ چھوڑ دیا تھا اور بھاگتے ہوئے نسلی امتیاز کا استعمال کیا تھا۔ اور (iii فوجیوں اور شہریوں کے ساتھ جاپانیوں کے ظالمانہ سلوک کا مشاہدہ کیا، خاص طور پر چینیوں کا جن کا جاپانیوں نے سینکڑوں کی تعداد میں قتل عام کیا۔

مارچ 1942 میں ٹوکیو میں ہندوستانیوں کی ایک کانفرنس منعقد ہوئی اور انہوں نے انڈین انڈیپنس لیگ (Indian Independence League) بنائی۔ اس کے بعد بنکاک میں ایک کانفرنس جون 1942 میں منعقد ہوئی جہاں راس بہاری بوس کو لیگ کا صدر منتخب کیا گیا اور آزاد ہند فوج کو بڑھانے کا فیصلہ کیا گیا۔ کیپٹن موہن سنگھ کو آزاد ہند فوج کا کمانڈر مقرر کیا گیا جس کے پاس اب تقریباً 40000 ہندوستانی سپاہی تھے۔ اس کانفرنس نے سبھاش چندر بوس کو تحریک کی قیادت کرنے کی دعوت دی۔

جاپانی بھی سبھاش چندر بوس کے رابطے میں تھے وہ اس وقت برلن میں تھے اور وہاں سے اپنا ریڈیو نشر کر کے ہندوستانیوں کو انگریزوں کے مخالفت اٹھنے کی تلقین کر رہے تھے۔ جون 1942 میں پورے جنوب مشرقی ایشیا سے ہندوستانی مندوبین کی ایک بڑی کانفرنس ہوئی جس کے لیے نیتاجی نے ایک پیغام بھیجا تھا۔ کام پوری سنجیدگی کے ساتھ شروع ہوا اور اچھی طرح آگے بڑھا۔ کرپس مشن کی ناکامی اور

MAULANA AZAD NATIONAL URDU UNIVERSITY

ہندوستان میں بڑھتی ہوئی سیاسی سرگرمیوں نے امید کی ایک کرن پیدا کردی تھی جو اگست کے شروع میں 'ہندوستان چھوڑو' تحریک کی شکل میں شروع ہوئی۔اس خطے میں ہندوستانیوں میں جوش وخروش بہت زیادہ تھااور اگست کے آخر تک چالیس ہزار

فوجی آزاد ہند فوج میں شامل ہو چکے تھے۔ سولہ ہزار تین سو سپاہیوں کا پہلا آزاد ہند فوج ڈویژن 10 ستمبر 1942 میں فوجی کارروائی میں جانے کے لیے تیار تھا۔ موہن سنگھ پرجوش تھے اور انہوں نے جاپانیوں سے کہا کہ وہ دو لاکھ پچاس ہزار فوجیوں پر مشتمل ایک فوج تیار کرنا چاہتے ہیں جس میں زیادہ تر شہری آبادی سے بھرتی کا وعدہ کیا۔ وہ آزاد ہند فوج کی جاپانیوں کی طرف سے باضابطہ عوامی شناخت اور اپنے فوجیوں کو تربیت دینے کے لیے سہولیات بھی چاہتے تھے۔ لیکن جاپانی ردعمل ان تجاویز کے حوالے سے زیادہ حوصلہ افزا نہیں تھا۔ان کی قراردادوں پر جاپانی سرد ردعمل اور ان کی سرگرمیوں میں جاپانی مداخلت نے آئی آئی ایل اور آزاد ہند فوج کے رہنماؤں کو پریشان کردیا۔

ان میں سے بہت سے لوگ آئی آئی ایل کے صدر راس بہاری بوس سے اس معاملے کی پیروی میں موثر نہ ہونے پر ناراض بھی تھے۔ جاپانی مداخلت عمومی تھی اور اس کی مزاحمت کی جارہی تھی۔ برما میں ہندوستانی جائیدادوں سے دستبرداری کا سوال سب سے زیادہ متنازعہ تھا۔ جاپانیوں نے ان جائیدادوں کا کنٹرول ہندوستانی ہاتھوں میں دینے سے انکار کردیا جو آزاد ہند فوج اور آئی آئی ایل اپنے فوجیوں کی تربیت دینے اور مصلحہ کرنے کے لیے بطور وسائل استعمال کرنا چاہتے تھے۔ سنگاپور اور ملایا میں ہندوستانی قومی فوج کی توسیع کی اجازت دینے سے جاپانی ہچکچاہٹ نے بھی موہن سنگھ کو بہت پریشان کیا۔ مزید برآں، انہوں نے اور دیگر لیڈروں نے محسوس کیا کہ جاپانی خفیہ طور پر بھارتیوں کا ساتھ دے رہے لیکن کھلے عام آئی آئی ایل اور آزاد ہند فوج کو ہندوستانی جنگی قیدیوں کا کنٹرول سنبھالنے کی اجازت نہیں دے رہے تھے۔ چنانچہ ہندوستانیوں کو جاپانیوں کے ارادوں پر شک ہونے لگا۔ حالات مزید خراب ہوتے گئے اور موہن سنگھ نے جاپانیوں کو صاف صاف بتادیا کہ اگر انہوں نے ہندوستان میں انگریزوں کی جگہ لینے کی کوشش کی تو ہندوستانی بھی ان سے لڑیں گے۔ انہوں نے ملایا میں ان کے جابرانہ اور نسل پرستانہ رویے کی بھی نشاندہی کی۔ انہوں نے برما میں جاپانی فوجی مہم کے لیے آزاد ہند فوج فوجی فراہم کرنے سے انکار کردیا، اور پھر دسمبر کے آخر تک آزاد ہند فوج کو ختم کرنے کا فیصلہ کیا۔ راس بہاری اپنی طرف سے حالات کو قابو میں کرنا چاہتے تھے۔ اس کے لئے انہوں نے موہن سنگھ کو برطرف کرنے اور وہاں ہندوستانیوں کی سرگرمیوں کو کنٹرول کرنے کی کوشش کی۔ موہن سنگھ کو جاپانیوں نے اپنے کچھ ساتھیوں کے ساتھ قید کرکے الگ تھلگ کردیا۔ آزاد ہند فوج اب عملی طور سے غیر فعال تھی اور یہ سبھاش چندر بوس ہی تھے جنہوں نے اس خطے میں اپنی آمد کے بعد اسے دوبارہ زندہ کیا۔

15.4 نیتاجی کی مشرقی ایشیا میں آمد اور آزاد ہند فوج پر اس کے اثرات

(Netaji's Arrival in East Asia, and Its Impact on the Indian National Army)

سبھاش چندر بوس 2 جولائی 1943 کو سنگاپور پہنچے اور راس بہاری بوس سے آزاد ہند فوج کی کمان سنبھالی۔ انہوں نے ہندوستانی شہریوں کو بھرتی کرکے بھرتی کی پالیسی میں تبدیلی کی۔ خطے میں تقریباً تیس ہزار ہندستانی INA میں شامل ہوئے۔ انہوں نے آزاد ہند لیگ بھی قائم کی

جو اس خطے میں ہندوستانی برادری سے رابطہ کرنے کے لئے ذمہ دار تھی۔ جولائی 1944 تک آزاد ہند لیگ کی دو لاکھ اراکین پر مشتمل تھی اور اسکی 72 شاخیں تھیں۔ چند مہینوں میں آزاد ہند فوج کے پاس تین فائٹنگ بریگیڈ تھے جن کا نام گاندھی، آزاد اور نہرو کے نام پر رکھا گیا۔ جلد ہی دیگر بریگیڈز بھی وجود میں آئیں، بعد میں شیکھر بندوپادئے لکھتے ہیں کہ بیرون ملک ہندوستانی عورتوں کو فوج میں شامل کرنے کا تجربہ سبھاش چندر بوس نے کیا تھا اور اسی کے تحت سبھاش چندر بوس ایک ویمن رجمنٹ بھی بنائی جس کا نام 'رانی آف جھانسی رجمنٹ' تھا اور یہ جھانسی کی رانی کے نام سے منسوب تھی جس میں تقریباً ایک ہزار خواتین بطور سپاہی شامل ہوئیں۔ لکشمی سوامینا تھن، ایک تامل خاتون، (بعد میں، اس نے ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام کے خلاف 2002 صدارتی انتخابات میں حصہ لیا) اس رجمنٹ کی کمانڈر بنیں۔ فوجی عورتوں کے ٹریننگ دینے کے لئے ایک کیمپ قائم کیا۔ اس فوج میں ہر طبقہ کی عورتیں شامل ہوئی ان کی تعداد ابتدا میں پندرہ سو تھی۔ آزاد ہند فوج کو بیرون ملک مقیم ہندوستانیوں نے بہت زیادہ تعاون کیا۔ بوس نے آزاد ہند فوج کی ہمت و جرأت بڑھانے کے 'جئے ہند' اور 'دہلی چلو' جیسے نعرہ دیا۔ سبھاش چندر بوس کا سب سے مشہور اعلان تھا کہ "تم مجھے خون دو میں تمھیں آزادی دونگا"

شروع میں آزاد ہند فوج کے متعدد مراکز تھے۔ موہن سنگھ فوجی تربیت اور آپریشن کے انچارج تھے، لیکن اب وہ اور آزاد ہند فوج پالیسی معاملات انڈین انڈیپنڈنس لیگ کی کونسل آف ایکشن کے تحت تھے، جس کے سربراہ راس بہاری تھے۔ یہ ساری تنظیمیں جاپانیوں کے مکمل کنٹرول میں تھیں۔ دوسری طرف، نیتا جی کی آمد کے بعد آزاد ہند فوج صرف ان کے ساتھ وابستہ رہی۔ اور اب 'مارشل ریس' کے بارے میں کوئی بات نہیں تھی اور مختلف نسلی اور لسانی پس منظر سے تعلق رکھنے والے تمام سپاہیوں کو اکٹھا کر دیا گیا تھا۔ بوس نے تربیت یافتہ اور پیشہ ور سپاہیوں کے ساتھ ساتھ عام شہریوں کو بھی بھرتی کر کے اس پالیسی کو مزید جاری رکھا۔ ملی جلی رجمنٹیں تشکیل دے کر اور آزاد ہند فوج کے سپاہیوں کو سیاسی تربیت دے کر نسلی اور علاقائی وفاداریوں کو غالب 'قومی جذبات' کے تابع کرنے کی تمام کوششیں کی گئی۔ اب کوشش یہ تھی کہ لڑنے والی افواج کو ہندوستانی بنایا جائے اور ان کے اندر قومی شعور پیدا کیا جائے۔ یہاں تک کہ آزاد ہند فوج، مخلوط رجمنٹوں کا نام مخصوص برادریوں اور علاقوں کے بجائے قوم پرست رہنماؤں کے نام پر رکھا گیا تھا۔ اس طرح گاندھی، آزاد اور نہرو بریگیڈ تھے۔ سبھاش چندر بوس ہمیشہ سیکولر روایت پر قائم رہے۔ انہوں نے اپنی جدوجہد کے ساتھ ساتھ آئی این اے کی جدوجہد کو بھی ایک حصہ کے طور پر دیکھا۔

ہندوستان میں جنگ آزادی کی جدوجہد جاری تھی۔ بوس نے سنگاپور میں 21 اکتوبر 1943 کو 'آزاد ہند حکومت' کے قیام کا اعلان کیا اور جئے ہند اور 'دِلّی چلو' کے نعرے لگائے۔ انہوں نے خدا کے نام پر حلف لیا کہ "وہ آزادی کے لئے اپنے خون کے آخری خطرہ کے لئے لڑتے رہیں گے" اور ہندوستانی عوام سے مطالبہ کیا کہ 'ہمارے بینر کے گرد ریلی نکالیں اور ہندوستان کی آزادی کے لیے ہڑتال کریں'۔ اس نے مزید اعلان کیا کہ 'عارضی حکومت "مذہبی آزادی کے ساتھ ساتھ اپنے شہریوں کو مساوی حقوق اور مساوی مواقع کی ضمانت دے گی۔ یہ پوری قوم کی خوشی اور خوشحالی کو یکساں طور پر حاصل کرنے کے لئے اپنے پختہ عزم کا اعلان کرتا ہے اور ماضی میں ایک اجنبی حکومت کی طرف سے چالاکی کے ساتھ پروان چڑھائے گئے تمام اختلافات کو ختم کرتا ہے۔ جنوب مشرقی ایشیا میں برطانوی ہندوستانی فوج کے چالیس ہزار سے زیادہ فوجیوں کی وفاداری بہت اہمیت کی حامل تھی۔ یہ ایک مختصر وقت میں ہوا اور ایک منظم قوت بنکر اپنے تربیت دہندگان انگریزوں کے خلاف

جنگ لڑی۔ سب سے اہم محرک یقیناً قوم پرستی کا احساس تھا۔ جس نے بوس کو آخری دم تک لڑنے کا حوصولہ دیا۔

سبھاش چندر بوس کی وسیع مقبولیت، ان کی کرشماتی شخصیت، ان کی قائل کرنے والی طاقتیں، ہندوستان کی آزادی کے مقصد سے ان کی واضح اور گہری وابستگی، اور مذہب، ذات پات، علاقے کی سرحدوں کے پار ہندوستانی اتحاد کے خیال سے ان کا پرجوش لگاؤ تھا۔ اس خطے میں اپنے قیام کے پہلے سال میں وہاں کے ہندوستانیوں میں آزاد ہند فوج کی طرف سے جاپانیوں کی مدد سے ہندوستان میں برطانوی دفاع کی خلاف ورزی کے امکان کے بارے میں زبردست جوش و خروش پایا جاتا تھا، جس کی وجہ سے ملک بھر میں نوآبادیات کے خلاف جنگ شروع ہو جاتی تھی۔ بغاوت دوسرے دور میں، جب 1944 کے وسط سے اتحادی افواج کا غلبہ ہو گیا اور آزاد ہند فوج اور جاپانی فوج کی مشترکہ افواج کو شمال مشرقی ہندوستان کے ساتھ ساتھ جنوب مشرقی ایشیا کے ممالک سے بھی پیچھے ہٹنا پڑا۔

بوس نے ایک ایسے رہنما کا کردار ادا کیا جو شکست خوردہ فوج کے حوصلے بلند رکھنے اور آزادی حاصل کرنے کے دوسرے طریقے تلاش کرنے میں لگے رہے۔ انہوں نے ہندوستان کی آزادی کی امید کبھی نہیں چھوڑی۔ 1943 کے اواخر تک لوگوں کی طرف سے ان کی پکار کا جواب زبردست تھا۔ ہزاروں ہندوستانی فوجیوں اور شہریوں نے رضاکارانہ طور پر لڑنے کے ساتھ ساتھ، مالی مدد اور سازوسامان کے ساتھ مدد کی۔ نیتاجی نے عوام کو ہر طرح سے جدوجہد کی حمایت کرنے کی تلقین کی کیونکہ 'ہندوستان سے باہر، خاص طور پر مشرقی ایشیا میں، ایک لڑاکا فورس کو منظم کرنے کی کوشش کی جو ہندوستان میں قابض برطانوی فوج پر حملہ کرنے کے لیے کافی طاقتور ہو گی۔ جب ہم ایسا کریں گے تو ایک انقلاب برپا ہو جائے گا، نہ صرف اندرون ملک شہری آبادی میں بلکہ ہندوستانی فوج میں بھی، جو اب برطانوی پرچم کے نیچے کھڑی ہے۔ جب برطانوی حکومت پر ہندوستان کے اندر سے اور باہر سے دونوں طرف سے حملہ کیا جائے گا تو وہ منہدم ہو جائے گی، اور پھر ہندوستانی عوام اپنی کھوئی ہوئی آزادی دوبارہ حاصل کر لیں گے۔ جاپانی فیلڈ مارشل نے تجویز پیش کی کہ آزاد ہند فوج کو صرف فیلڈ پروپیگنڈہ یونٹ کے طور پر کام کرنا چاہیے، بوس نے اسے فوری طور پر مسترد کر دیا اور مطالبہ کیا کہ آزاد ہند فوج بریگیڈ کو جنگی یونٹ کے طور پر استعمال کیا جانا چاہیے۔

جاپانیوں نے ابتدائی طور پر تقریباً دس ہزار فوجیوں پر مشتمل آزاد ہند فوج کے ایک ڈویژن کو ہی فوجی یونٹ بنانے پر اتفاق کیا۔ محمد زمان کیانی نے اس یونٹ کی کمان سنبھالی۔ اس تقسیم کو مزید تین رجمنٹوں میں تقسیم کیا گیا تھا جن کا نام گاندھی، نہرو اور آزاد کے نام پر رکھا گیا تھا۔ ان میں سے بہترین سپاہیوں کو شاہنواز خان کی قیادت میں گوریلا یونٹ بنانے کے لیے منتخب کیا گیا۔ جو سب سے پہلے محاز پر جائے گی۔

فوجیوں نے اس یونٹ کا نام 'سبھاس بریگیڈ' رکھا۔ فوجیوں کے حوصلے بلند کرنے کے لیے بوس نے ان کے کیمپوں میں ان سے ملاقات کی اور انکی حوصلہ افزائی کی۔ تمام ذاتوں اور برادریوں کے سپاہیوں کو عام طور پر کھانے پر ایک ساتھ آمادہ کیا جاتا تھا جس کی وجہ سے ان کے درمیان مذہبی اور لسانی تفریق ختم کرتے ہوئے ایک مشترکہ رشتہ قائم ہوتا تھا۔ قومی یکجہتی کا یہ مظاہرہ اہم تھا، ملک میں بڑھتی ہوئی فرقہ وارانہ تقسیم ہندوستانی سیاست کو کمزور کر رہی تھی۔ آزاد ہند فوج کی تاریخ کا اہم واقعہ رانی جھانسی رجمنٹ کی تشکیل تھی، جو کہ تمام خواتین پر مشتمل لڑاکا یونٹ ہے، جو جدوجہد آزادی میں ہندوستانی خواتین کی شرکت اور شراکت کی علامت ہے۔

15.5 ہندوستان کی آزادی میں آزاد ہند فوج کا تعاون

(Contribution of 'Azad Hind Fauj' to India's Freedom Struggle)

23-24 اکتوبر 1943 کو آدھی رات کو آزاد ہند حکومت نے برطانیہ اور امریکہ کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ کیونکہ امریکی افواج ہندوستانی سرزمین پر موجود ہونے کی سبب امریکہ کو بھی شامل کیا گیا تھا، حالانکہ امریکہ در حقیقت ہندوستانی آزادی کے مطالبات کا ہمدرد تھا۔ ایک سال کے اندر، لاکھوں ہندوستانی اراکین وطن نے جنوب مشرقی ایشیا میں جنگ کا اعلان کرتے ہوئے شہریت کے حلف پر دستخط کیے۔ جاپان حکومت نے آزاد ہند حکومت کو ہر قسم کی سفارتی اور فوجی مدد کا وعدہ کیا۔ جاپان کی مدد سے، بوس نے جنوب مشرقی ایشیا میں، خاص طور پر سنگاپور اور برما جیسے جاپان کے زیر قبضہ علاقوں میں آزاد ہند فوج قائم کی۔ آزاد ہند فوج ہندوستانی جنگی قیدیوں اور عام شہریوں پر مشتمل تھا جنہوں نے رضاکارانہ طور پر فورس میں شمولیت اختیار کی۔ بوس نے آزاد ہند فوج کو ماتحت تنظیم نہیں بلکہ ایک اتحادی فوج کے طور پر ماننے پر جاپان کو آمادہ کیا۔ انڈمان اور نکوبار جزائر کا قانونی کنٹرول جاپانیوں نے آزاد ہند حکومت کو دے دیا تھا، حالانکہ بعد میں اس نے فوجی کنٹرول برقرار رکھا۔ آزاد ہند حکومت کا ہیڈ کوارٹر برما سے منتقل کر دیا گیا۔

جنوری 1944 میں سنگاپور میں بوس نے ایک مکمل کابینہ اور وزراء، آزاد نیشنل بینک، اس کا اپنا ڈاک ٹکٹ، اور ایک قومی کرنسی کے ساتھ حکومت کا ایک متبادل ڈھانچہ تیار کیا۔ ایڈوانس گوریلا یونٹ جسے 'سبھاس بریگیڈ' کہا جاتا ہے پہلے ہی وہاں منتقل ہو چکا تھا۔ جاپانی فوج بھی اب حملے کے لیے تیار تھی۔ اگرچہ جاپانی آزاد ہند فوج فوجیوں کے چھوٹے گروپوں کو بڑے جاپانی یونٹوں کے ساتھ منسلک کرنا چاہتے تھے، بوس نے ہندوستانی فوجیوں کو جاپانی کمانڈ اور کنٹرول کے ماتحت کرنے سے انکار کر دیا، اور آزاد ہند فوج کے لیے ایک آزاد کردار اور شناخت پر اصرار کیا۔ ان کا یہ بھی پختہ یقین تھا کہ یہ ہندوستانی فوجیوں کی قربانی ہے جو ہندوستان کی آزادی کے لئے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ اس بات پر اتفاق کیا گیا کہ آزاد ہند فوج کی ایک بٹالین برطانوی مغربی افریقی ڈویژن کے خلاف لڑائی میں شامل ہو گی۔ اس کے بعد آزاد ہند فوج ہندوستانی علاقے میں کوہیما اور امپھال کی طرف بڑھے گی۔ فروری میں آزاد ہند فوج کی کچھ یونٹ نے برما میں انگریزوں کے خلاف کامیابی سے جنگ کی۔ 6 جولائی 1944 کو، سنگاپور سے آزاد ہند ریڈیو سے نشر کی گئی ایک تقریر میں، بوس نے مہاتما گاندھی کو 'فادر آف نیشن' (بابائے قوم) کہہ کر مخاطب کیا اور جو جنگ وہ لڑ رہے تھے اس کے لیے ان کے آشیرواد اور نیک خواہشات کی درخواست کی۔

پھر مارچ 1944 میں، آزاد ہند فوج، جاپانی افواج کے ساتھ، ہند برما سرحد عبور کر کے امپھال اور کوہیما کی طرف بڑھی۔ ہندوستانی فوجی اپنے ملک میں ہونے پر بہت خوش اور پرجوش تھے۔ اس محاذ پر تقریباً 84,000 جاپانی اور 12,000 آزاد ہند فوج فوجیوں نے تقریباً 150,000 برطانوی فوجیوں کا سامنا کیا۔ جاپانی فوجی اپنے ساتھ تیز رفتاری کے لیے زیادہ راشن نہیں لے کر گئے تھے اور انہوں نے کوہیما اور امپھال پر فوری قبضہ کرنے پر اپنی امیدیں وابستہ کر لی تھیں۔ اپریل 1944 میں، وہ امپھال اور کوہیما پر قبضہ کرنے کے بہت قریب تھے، کیونکہ انہوں نے امپھال پر قبضہ کر لیا تھا۔ آزاد ہند فوج کے سپاہی بہت اچھے طریقے سے لڑ رہے تھے اور ان کا جذبہ بہت بلند تھا۔ انہوں نے آپریشن U-Go کے دوران منی پور کے امپھال سے تھوڑے فاصلے پر موئرنگ (Moirang) میں ہندوستانی ترنگا جھنڈا لہرایا تھا۔

آزاد ہند کے لیڈر و سپاہی اور اس کے حامی کافی پر امید تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ ایک 'آزاد ہندوستان' کا خواب قریب ہے۔ تاہم، برطانوی زیر قیادت افواج کی طرف سے اب پیش کی جانے والی سخت مزاحمت کی وجہ سے، قبضہ طویل ہو گیا۔ ضبط کے ساڑھے تین ماہ کے دوران مشکل حالات میں ان کا محدود راشن ختم ہو رہا تھا۔ جب کہ برطانوی فوجیوں کو ہوائی جہاز کے ذریعے مسلسل امریکی سپلائی سے راشن فراہم کیا جا رہا تھا، جاپانی فضائی مدد بہت زیادہ محدود اور ناکافی تھی۔ یہاں مئی 1944 میں جنگ عظیم کی چند شدید ترین لڑائیاں لڑی گئیں۔ ان لڑائیوں میں آزاد ہند فوج بریگیڈ بھی شامل تھے۔ بدقسمتی سے، مانسون سال کے اوائل میں آ گئی۔ بہت تیز بارش شروع ہو گئی جس نے پیڑوں کو اکھاڑ پھینکا اور پورے علاقے میں کیچڑ پھیل گیا۔ لڑائی کے محاذ پر کچھ کرنے کے لیے زیادہ نہیں تھا اور صرف انتظار کرنا تھا۔ پہلے ہی نقل و حمل کے مسائل اور رسد کی قلت کا سامنا تھا۔

آزاد ہند فوج اور جاپانی فوجی ملیریا میں مبتلا ہوتے تھے اور جنگل کے علاقوں میں دوائیاں حاصل کرنا مشکل تھا۔ پھر بھی، فوجیوں کے ساتھ ساتھ جنوب مشرقی ایشیا میں دوسرے ہندوستانیوں کا حوصلہ بلند تھا۔ تعطل پورے جون اور جولائی کے ابتدائی ہفتے میں جاری رہا۔ پھر، 10 جولائی کو، جاپانیوں نے سبھاش چندر بوس کو مطلع کیا کہ اب وہاں رہنا مشکل ہو جائے گا اور وہ اب جنگ کے اس خطرے سے پیچھے ہٹ جائیں گے۔ آزاد ہند فوج یونٹس خوراک اور ادویات کی شدید کمی کے ساتھ ساتھ ملیریا سمیت کئی بیماریاں پھیلنے کی وجہ سے بھی کافی پریشان تھے۔ اب واپسی ہی واحد آپشن تھا جو جولائی کے تیسرے ہفتے میں شروع ہو گئی۔ بعد میں 26 جولائی کو جاپان نے شمال مشرقی ہندوستان میں مہم کو معطل کرنے کا اعلان کیا۔ واپسی میں بہت سے فوجی بیماری اور بھوک سے مر گئے، بہت سے زخمی اور بیمار ہوئے۔ بوس نے 21 اگست 1944 کو ایک ریڈیو خطاب میں قبول کیا کہ شمال مشرقی ہندوستان میں کنٹرول حاصل کرنے کی آزاد ہند فوج کی کوشش کامیاب نہیں ہوئی۔ ان کے بقول، ابتدائی مانسون اور آمد و رفت کے مسائل بنیادی طور پر ناکامی کے ذمہ دار تھے۔

مانسون آنے سے پہلے آزاد ہند فوج اور جاپانی سپاہی بہت اچھا کام کر رہے تھے۔ انہوں نے امید نہیں ہاری اور فوجیوں کو مصروفیت کے اگلے دور کے لیے تیار رہنے کی تلقین کی۔ اگرچہ شمال مشرق میں کارروائی میں حصہ لینے والے آزاد ہند فوج فوجیوں کی اکثریت اب گراؤنڈ کر دی گئی تھی، لیکن فوجیوں کا ایک اور بڑا دستہ برما سے پہنچا جو کارروائی کے لیے تیار تھا۔ تب تک جنگ برما پہنچ چکی تھی اور برطانوی اور امریکی افواج جاپانیوں کو وہاں سے نکالنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ آزاد ہند فوج کے سپاہی بھی لڑائی میں شامل تھے۔ وہ ملایا میں بھی برطانوی امریکی افواج کے خلاف تعینات تھے۔ برما میں ایراوادی کے کنارے، فروری 1945 میں آزاد ہند فوج کی افواج کا برطانوی افواج سے سامنا ہوا۔ انہوں نے انگریزوں کو کافی جانی نقصان پہنچایا اور ان کو دریا عبور کرنے سے روک دیا۔ امریکیوں کی بھاری فضائی مدد کے باوجود برطانوی افواج زیادہ پیش قدمی نہیں کر سکی اور مارچ 1945 میں بھی تعطل جاری رہا۔ اس سے بھی اہم بات یہ ہے کہ برمی حکومت، جاپانیوں کی حتمی شکست کو محسوس کرتے ہوئے، ان کی مخالفت اور انگریزوں کی حامی ہو گئی۔ اس سے چندر بوس کے لئے مسائل پیدا ہو گئے جنہوں نے پھر برمی حکومت کے ساتھ بات چیت کی اور عہد کیا کہ ان کے فوجی ایک دوسرے کے خلاف نہیں لڑیں گی۔ ان مسائل کے باوجود، آزاد ہند فوج کے سپاہی اپریل میں ماؤنٹ پوپا کے پاس بہادری سے لڑے۔ لیکن اعلیٰ برطانوی افواج سے شکست کھا کر پیچھے ہٹ گئے۔ اب یہ واضح تھا کہ آزاد ہند

فوج یہ جنگ نہیں جیت سکتی، اس کے باوجود وہ لڑتی رہی۔ 29 اپریل 1945 کو پریم کمار سہگل کو انگریزوں نے گرفتار کر لیا اور 18 مئی کو شاہ نواز خان اور گربخش سنگھ ڈھلوں کو بھی قید کر لیا گیا۔

15.6 جاپان کی شکست اور عالمی جنگ کا خاتمہ (Defeat of Japan, and the End of World War)

اگرچہ، آزاد ہند فوج برما میں جنگ ہار گئی تھی، بوس نے ہمت نہیں ہاری تھی۔ انہوں نے اپنی فوجیں ملایا اور تھائی لینڈ میں لڑنے کے لیے بھیجیں۔ تمام الٹ پھیر کے باوجود، بوس فائنل جیت کے لیے پر امید تھے۔ اور تھائی لینڈ میں اپنی فوجیں جمع کیں اور مدد کے لیے تھائی حکومت سے بات چیت کی۔ وہ اپنے ملک کی آزادی کے لیے ایک اور جنگ کے لئے بتا رہے تھے۔ لیکن 6 اور 9 اگست 1945 کو جاپان میں ہیروشیما اور ناگاساکی پر دو ایٹم بم گرائے گئے جس سے مشرقی ایشیا میں جنگ کا خاتمہ ہوا۔ جاپان نے ہتھیار ڈال دیے اور اب نیتا جی کو اپنی حکمت عملی پر یکسر نظر ثانی کرنی پڑی۔ شکست کے بعد بھی نیتا جی مایوس نہیں تھے۔ انہوں نے اپنے باقی سپاہیوں کو اعلان کیا کہ 'دہلی کی سڑکیں بہت ہیں اور دہلی اب بھی ہمارا مقصد ہے'۔ ان کا یقین تھا کہ 'بھارت بہت پہلے آزاد ہو جائے گا.' آزاد ہند فوج مختلف وجوہات کی بنا پر عسکری طور پر کامیاب نہیں ہو سکی۔ آزاد ہند فوج کو قوم پرست آئیڈیلزم اور اس یقین کی بنیاد پر اٹھایا گیا تھا کہ وہ جاپانیوں کے ساتھ مل کر، کم از کم شمال مشرقی ہندوستان میں، برطانوی افواج کو جلد مغلوب کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے اور اس کے نتیجے میں ہندوستان میں ایک عام بغاوت ہو گی۔

ملک کی آزادی. مثالی جوش و جذبے اور نیتا جی کے کرشمے سے متاثر ہو کر، ہزاروں شہری آزاد ہند فوج میں شامل ہوئے۔ انہوں نے ایک جدید پیشہ ور سپاہی کے لیے مطلوبہ فوجی تربیت حاصل نہیں کی اور نہ ہی ان کے پاس ایسی تربیت حاصل کرنے کا صبر اور استقامت تھی۔ مزید برآں، فوجیوں کی باقاعدہ تنخواہ اور خوراک کے لیے سرمایہ کبھی بھی کافی نہیں تھے۔ اکثر فوجیوں کو تنخواہ نہیں ملتی تھی بلکہ صرف جیب خرچ ملتا تھا۔ ریاست کی مالی اعانت سے چلنے والے پیشہ ورانہ فوجی نظام کا کوئی متبادل نہیں تھا۔ اس طرح، آزاد ہند فوج کے سپاہیوں کے لیے ضروری اشیاد ستیاب نہیں تھی، مثالی جوش اور بوس کی کرشماتی قیادت کی وجہ سے سپاہیوں کو بہادری کے کاموں کے لیے ترغیب ملی تھی۔ لیکن یہ زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکا اور لڑائی کے طول پکڑنے سے فوجیوں کے حوصلے میں کمی واقع ہوئی۔ بوس کے لئے بھی مسئلہ تھا۔ جب وہ جاپان اور پھر سنگاپور پہنچے تو جنگ میں جاپان کی قسمت بدلنا شروع ہو چکی تھی۔ اپریل 1943 تک، بحرالکاہل اور جنوب مشرقی ایشیاء دونوں میں جاپان کی بالادستی تھی۔ لیکن 1943 کے وسط سے آخر تک، اتحادی افواج بعض علاقوں میں برتری حاصل کر رہی تھیں۔ 1944 تک، جاپانی حکومت دور دراز علاقوں میں لڑنے والی اپنی فوج کے لیے بھی خاطر خواہ وسائل فراہم نہیں کر سکی۔ ہندوستانی علاقوں میں مہم کے دوران، جاپانی اور ہندوستانی فوجیوں کو خوراک کے لیے کافی راشن اور کپڑے نہیں ملے جس کی وجہ سے بڑی تعداد میں بیماریاں اور اموات ہوئیں۔ یورپ اور بحرالکاہل کے خطے میں محوری طاقتوں کی شکست نے نیتا جی اور آزاد ہند فوج کے لیے مزید مشکلات پیدا کر دیں۔ آزاد ہند فوج فوجی محاذ پر جو کچھ حاصل کرنے میں ناکام رہی، وہ سیاسی محاذ پر حاصل کرنے سے کہیں زیادہ ہے۔

15.7 آزاد ہند فوج سپاہیوں کا مقدمہ اور قومی بغاوت

(Trials of INA Soldiers, and the National Upsurge)

آزاد ہند فوج کا برطانوی نوآبادیاتی حکومت سے آزادی کی جدوجہد میں تاریخی کردار تھا۔آزاد ہند افواج ایک مسلح فورس تھی جسے ہندوستانی قوم پرستوں نے دوسری جنگ عظیم کے دوران برطانوی راج سے ملک کو آزادی کرانے کے لیے تشکیل دیا تھا۔آزاد ہند فوج کے اصل بانی سبھاش چندر بوس کا ماننا تھا کہ آزادی کے حصول کے لیے مسلح مزاحمت ضروری ہے۔انہوں نے جاپان اور جرمنی سمیت محوری طاقتوں سے انگریزوں کے خلاف لڑائی میں آزاد ہند فوج کے لیے مدد طلب کی۔1945 میں، دوسری جنگ عظیم کے اختتام پر، برطانوی ہندوستانی حکام نے کئی آزاد ہند فوج سے وابستہ سپاہیوں اور افسروں کو غداری، ترکِ وطن اور شہنشاہ کے خلاف جنگ چھیڑنے کے الزام میں گرفتار کر لیا۔آزاد ہند فوج کا مقدمہ دہلی کے لال قلعہ میں شروع ہوا جو نومبر 1945 میں شروع ہو کر اور 1946 کے اوائل تک جاری رہا۔

آزاد ہند فوج مقدمے میں کئی سینئر افسران مثلاً کرنل پریم سہگل، کرنل گربخش سنگھ ڈھلون، اور میجر شاہ نواز خان شامل تھے۔ برطانوی حکام نے ان پر غداری اور بغاوت کا الزام لگایا۔ان کا دفاع کے لئے وکلاء کی ایک کمیٹی بنائی گئی جس میں بھولا بھائی ڈیسائی، تیج بہادر سپرو، جواہر لال نہرو اور آصف علی شامل تھے، دفاع نے دلیل دی کہ آزاد ہند فوج فوجی جنگی قیدی تھے نہ کہ برطانوی رعایا۔اس لیے ان پر غداری کا مقدمہ نہیں چل سکا۔اس مقدمے نے بہت زیادہ عوامی توجہ حاصل کی اور پورے ہندوستان میں قوم پرست جذبات کو بھڑکا دیا۔مقدمہ کی سنوائی کے دوران ہندوستان میں بڑے پیمانے پر احتجاج اور مظاہرے ہوئے، کیونکہ لوگوں نے آزاد ہند فوج کو ان کی آزادی کی لڑائی کی علامت کے طور پر دیکھا۔ برطانوی حکومت پہلے ہی ہندوستان میں بڑھتے ہوئے اختلاف سے نبرد آزما تھی، اور آزاد ہند فوج کے مقدمات نے آگ کو مزید بھڑکا دیا۔ عوامی احتجاج کے بڑھتے ہوئے دباؤ میں ملک بھر میں بڑے پیمانے پر عام نافرمانی اور ہڑتالیں ہوئیں اور قیدیوں کو باعزت بری کرنے کے لئے حکومت ہند پر شدید دباؤ تھا۔

دہلی کے لال قلعہ میں آزاد ہند فوج کے افسروں اور سپاہیوں کے مقدموں کی وجہ سے ہندوستانیوں میں انگریزوں کے خلاف شدید غم و غصہ بھڑک اٹھا۔آزاد ہند فوج اور اس کے اہم افسران ملک کے ہر گھر میں پہچانے جانے لگے۔آزاد ہند فوج کے لیڈروں اور سپاہیوں کے مقدمے نے ہندوستان میں قوم پرست سیاسی ماحول کو گرما دیا۔ فضائیہ، بحریہ اور یہاں تک کہ فوج کے سپاہی بھی قوم پرست نظریہ سے متاثر ہوئے اور انہوں نے آزاد ہند فوج کے شہیدوں اور زندہ بچ جانے والے سپاہیوں کا احترام کیا۔عام لوگوں نے پورے ہندوستان میں ہزاروں اور لاکھوں کی تعداد میں احتجاج کیا، سرکاری فوجوں کے ساتھ لڑائی لڑی، زخمی ہوئے اور یہاں تک کہ اپنی جانیں بھی گنوا دیں۔آزاد ہند فوج تحریک کے بعد کے اثرات میدان جنگ میں اس کی ٹھوس کامیابیوں سے کہیں زیادہ وسیع اور طاقتور ثابت ہوئیں۔آزاد ہند فوج کے قیدیوں کا مقدمہ قوم پرست تحریک کے لیے ایک فخر ثابت ہوا جسے آزاد ہند فوج کی شکست اور ہندوستان چھوڑو تحریک کو دبانے کے بعد ملک کو ہزیمت کا سامنا کرنا پڑا۔لوگ جوش میں آ گئے اور آزاد ہند فوج کی حمایت میں سڑکوں پر نکل آئے۔ قوم پرست اخبارات نے اس بہادری کو بڑے پیمانے پر

شائع کیا۔

ان مقدمات نہ صرف ملک بھر میں عوامی تحریک اور احتجاج کی قوم پرست لہریں پیدا کیں، بلکہ انہوں نے مسلح افواج میں مضبوط سیاسی اور قوم پرستانہ جذبات کو بھی جنم دیا ۔ بے پناہ عوامی دباؤ اور ہندوستان پر انگریزوں کی گرفت کمزور ہونے کی وجہ سے، برطانوی حکومت نے 1946 میں مقدمہ ختم کرنے اور قیدیوں کو رہا کرنے کا فیصلہ کیا۔ آزاد ہند فوج کے مقدمات نے ہندوستان کی تحریک آزادی کو متحرک کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ بالآخر 15 اگست 1947 کو ہندوستان کو آزادی حاصل ہوئی۔آزاد ہند فوج کے سپاہیوں اور سبھاش چندر بوس کی قیادت کی قربانیاں ہندوستان کی تاریخ کا اٹوٹ حصہ ہیں اور انہیں بڑی عزت واحترام کے ساتھ یاد کیا جاتا ہے۔

15.8 آزاد ہند فوج کی کامیابیاں (Achievements of the Indian National Army)

ممتاز ہندوستانی رہنماؤں سبھاس چندر بوس، راش بہاری بوس، اور دیگر کی قیادت میں، آزاد ہند فوج نے کئی کامیابیاں حاصل کیں۔ آزاد ہند فوج اگست 1942 کو جنوب مشرقی ایشیا میں دوسری جنگ عظیم کے دوران جاپان کی حمایت سے تشکیل دی گئی تھی۔اس کا بنیادی مقصد ہندوستان کو برطانوی راج سے آزاد کرانا اور ایک آزاد، متحد اور سوشلسٹ ملک کا قیام تھا۔آزاد ہند فوج نے برٹش انڈین آرمی اور جنوب مشرقی ایشیا میں اتحادی افواج کے خلاف فوجی مہمات میں حصہ لیا۔انہوں نے برما(اب میانمار)اور دیگر خطوں میں مختلف لڑائیاں لڑیں، لڑائی میں اپنے عزم اور بہادری کا مظاہرہ کیا۔آزاد ہند فوج نے جاپان کی مدد سے مارچ 1942 میں انڈمان اور نکوبار جزائر کو برطانوی کنٹرول سے آزاد کرایا۔ سبھاش چندر بوس نے خود ان جزائر کا دورہ کیا اور انہیں آزاد ہندوستان کا پہلا علاقہ قرار دیتے ہوئے ہندوستانی پرچم لہرایا۔آزاد ہند فوج نے 1944 میں کوہیما اور امپھال مہم کے دوران جاپانی افواج کے ساتھ ایک اہم کردار ادا کیا۔اگرچہ یہ مہمات اپنے مقاصد حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہوئیں، لیکن آزاد ہند افواج کی شرکت نے ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد سے ان کو وابستہ کردیا

دوسری جنگ عظیم کے خاتمے کے بعد، برطانوی ہندوستانی حکام نے آزاد ہند فوج کے کئی ارکان کو گرفتار کرکے دہلی کے لال قلعہ میں مقدمہ چلایا۔آزاد ہند فوج مقدمات نے بہت زیادہ عوامی توجہ اور ہمدردی حاصل کی، انگریزوں پر دباؤ ڈالا کہ وہ ہندوستان کی آزادی پر اپنے موقف نظر ثانی کریں۔آزاد ہند فوج نے ہندوستان کی تحریک آزادی میں نمایاں خدمات انجام دیں۔اس نے ہندوستان کی آزادی کے مسئلے کو بین الاقوامی سطح پر لا کھڑا کیا، جس سے ملک کی آزادی کی جدوجہد کو عالمی سطح پر حمایت حاصل ہوئی۔

آزاد ہند فوج کی قربانیوں نے ہندوستانی عوام کو ایک اہم اخلاقی درس دیا اور ہندوستان پر برطانوی نوآبادیاتی کنٹرول کو کمزور کرنے میں ایک نمایاں کردار ادا کیا۔مزید برآں، (آزاد ہند فوج) کے کچھ سابق فوجیوں نے بعد ازاں آزادی ہندوستان میں اہم کردار ادا کیا، ہندوستانی مسلح افواج میں خدمات انجام دیں اور حکومت میں نمایاں عہدوں پر فائز رہے۔اگرچہ آزاد ہند فوج نے اپنے بنیادی فوجی مقاصد حاصل کرنے میں کچھ حد تک ناکام رہی۔ لیکن ہندوستان کی تحریک آزادی پر اس کے کردار اور اثرات کو کم نہیں کہا جاسکتا۔ یہ ہندوستان کی جدوجہد آزادی کے ایک منفرد اور مضبوط باب کی نمائندگی کرتا ہے۔آزاد ہند فوج کی اہم کامیابیوں میں سے ایک سماج اور سیاست میں گہری فرقہ وارانہ تقسیم کے وقت

ہندو مسلم اتحاد تھا۔اس کے علاوہ،اس نے ہندوستان کے تمام خطوں کے لوگوں کوایک بینر تلے اکٹھا کر کے ذات پات ختم کر کے اور علاقائی سطح پر اتحاد کو فروغ دیا۔اس نے خواتین کو نہ صرف انتظامی کرداروں میں بلکہ فوج میں بھی شامل کر کے صنفی مساوات حاصل کرنے کی کوشش کی۔آزاد ہند فوج کے سیاسی فائدے بہت زیادہ تھے۔اس نے بیرون ملک اور اندرون ملک ہندوستانیوں میں قوم پرستی کا زبردست احساس جگایا اور ہندوستان چھوڑو تحریک کے خاتمے کے بعد نوآبادیاتی حکمرانوں کے خلاف ایک اور ممکنہ جنگ کے لیے انہیں دوبارہ متحرک کیا۔اب انگریزوں پر یہ بات بالکل واضح ہوگئی تھی کہ وہ ہندوستانی سپاہیوں کی وفاداری پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا۔اس طرح،آزاد ہند فوج نے قوم سازی کے عمل کے ساتھ ساتھ نوآبادیاتی نظام کے خاتمہ میں موثر کردار ادا کیا۔

15.9 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

سبھاش چندر بوس کی تشکیل کردہ آزاد ہند فوج نے جنوب مشرقی ایشیا میں ہندوستانیوں کو قوم پرست جھنڈے تلے متحرک اور منظم کرنے میں ایک مثبت کردار ادا کیا۔فوجیوں کے علاوہ ہزاروں ہندوستانی شہری اپنے ملک کی آزادی کے لیے لڑنے کے لیے فوج میں شامل ہوئے۔خطے کے لاکھوں ہندوستانیوں نے مالی تعاون فراہم کر کے اس کی حمایت کی۔اس ضمن میں عبدالمجیب یوسف فرمانی کا نام قابل ذکر ہے جنہوں نے سبھاش چندر بوس کو ایک کروڑ کا عطیہ دیا تھا۔مہاجر ہندوستانیوں کو اپنے ملک کے ساتھ مربوط کرنے میں اس کا کردار غیر معمولی تھا۔گھر میں بھی ہندوستانیوں میں جوش و خروش پیدا کرنے میں آزاد ہند فوج کا کردار بھی اہم تھا۔اس نے نہ صرف سویلین آبادی بلکہ مسلح افواج میں ہندوستانیوں کے درمیان زبردست قوم پرست اور انگریز مخالف جذبات پیدا کیے۔اس نے نوآبادیاتی حکومت کی بنیادوں کو شدید طور پر کمزور کر دیا اور بالآخر اس کے خاتمے کا باعث بنی۔

15.10 کلیدی الفاظ (Key Words)

آزاد ہند فوج	:	آزاد ہند فوج
نیتاجی	:	سبھاش چندر بوس
ٹرائل	:	مقدمہ
عدم تشدد	:	آہنسا
قوم پرست	:	ملک کو خود پر افضل اور برتر سمجھنا اور ہر حال میں اپنی قوم کی حمایت و طرفداری کرنا
سوشلسٹ	:	سوشلزم ایسے سماجی نظام کو کہتے ہیں جس میں پیداواری ذرائع معاشرے کی اجتماعی ملکیت ہوتے ہیں۔

15.11 نمونہ امتحانی سوالات (Modal Examination Questions)

15.11.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. سبھاش چندر بوس کون تھے؟
2. ہندوستانی قومی فوج کا بانی کون تھا؟
3. 1939 میں فارورڈ بلاک کی بنیاد کس نے رکھی؟
4. نیتاجی کی تشکیل کردہ خواتین رجمنٹ کا نام بتایئے۔
5. ہندوستانی قومی فوج کس ملک میں بنی؟
6. بوس نے آزاد ہندوستان میں پہلی صوبائی حکومت کہاں قائم کی؟
7. ہندوستانی قومی فوج نے کس سال ہندوستان پر حملہ کرنے کی کوشش کی؟
8. ان وکلا کا نام بتائیں جنہوں نے لال قلعہ کی عدالت میں قیدیوں کے دفاع میں مقدمہ لڑا؟
9. کس جگہ پر بوس نے مشہور ''دہلی چلو'' انعرہ دیا؟
10. اس قوم پسند رہنما کا بتائے جنہوں نے مہاتما گاندھی کو ''بابائے قوم'' کہا؟

15.11.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. آزاد ہند فوج کے مقاصد کیا تھے؟
2. آزاد ہند فوج کی اہم فوجی مہمات کیا تھیں؟
3. نیتاجی کی حالات زندگی پر روشنی ڈالیے۔
4. آزاد ہند فوج کی فوجی رجمنٹوں پر مختصراً تبادلہ خیال کریں۔
5. موہن سنگھ کی کارناموں پر روشنی ڈالیے۔

15.11.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. ہندوستانی تحریک آزادی میں آزاد ہند فوج کے خدمات پر ایک تفصیلی نوٹ لکھیں۔
2. آزاد ہند فوج کا تاریخی پس منظر پر روشنی ڈالئے۔
3. نیتاجی کی مشرقی ایشیا میں آمد کے بعد آزاد ہند فوج پر اثرات کا تفصیلی جائزہ لیں۔

15.12 تجویز کردہ اکتسابی مواد Suggested Learning Resources

1. Ayer, S.A., *Story of INA*, National Book Trust, India, 2006.
2. Dhillon, Gurbaksh Singh, *From My Bones*, Aryan Books International, New Delhi, 1998. Accessed online at http://www.subhaschandrabose.org/ina/snk08.html
3. Fay, Peter Ward, *The Forgotten Army: India's Armed Struggle for Independence, 1942–1945*, Rupa, New Delhi, 2020.
4. Khan, Shah Nawaz, *My Memoirs of INA & Its Netaji*, Delhi: Rajkamal Publications, 1946. Accessed online at http://www.subhaschandrabose.org/ina/snk08.html
5. Kiani, Mohammad Zaman, *India's Freedom Struggle and the Great INA*, New Delhi: Reliance Publishing House, 1994.
6. Mehdi, Ismat, and Shehbaz Safrani (comp.), *Abid Hasan Safrani*: *Netaji's Comrade-in-Arms*, Orient BlackSwan, New Delhi, 2023.
7. Sareen, T.R., *The Indian National Army*: *A Documentary Study*, Vol. 4, New Delhi: Gyan Publishing House, 2004.
8. Singh, Mohan, *Soldiers' Contribution to India's Independence*, Army Educational Stores, New Delhi, 1974.

اکائی 16۔ تقسیم ہنداور قومی تعمیر کا عمل

(Partition, and the Process of Nation Building)

اکائی کے اجزا

16.0 تمہید

16.1 مقاصد

16.2 ہندوستانی سیاست میں علاحدگی پسند رجحانات

16.3 مسلم لیگ کا عروج اور ارتقا

16.3.1 مسلم لیگ کے قیام کے اسباب

16.3.2 آل انڈیا مسلم لیگ کا قیام

16.4 تحریک پاکستان

16.4.1 پس منظر

16.4.2 تحریک کا آغاز

16.4.3 تحریک کا ارتقا

16.5 1945 کے بعد کے واقعات: تقسیم اور آزادی

16.5.1 سی۔آر۔فارمولا

16.5.2 گاندھی-جناح مذاکرات

16.5.3 دیسائی-لیاقت معاہدہ

16.5.4 ویول پلان اور شملہ کانفرنس

16.5.5 کیبنٹ مشن پلان

16.5.6 یوم راست کاروائی

16.5.7 دستور ساز اسمبلی

16.5.8 ماؤنٹ بیٹن پلان اور حصول آزادی

16.6 قومی تعمیر کا عمل
16.7 اکتسابی نتائج
16.8 کلیدی الفاظ
16.9 نمونہ امتحانی سوالات
16.10 تجویز کردہ اکتسابی مواد

16.0 تمہید (Introduction)

اپریل 1945 میں یوروپ میں دوسری عالمی جنگ کے بعد ہندوستانی قومی تحریک ایک نئے مرحلہ میں داخل ہوئی۔ قومی رہنماؤں کی جیلوں سے رہائی کے بعد اُن لوگوں میں جنھوں نے مزاحمت کے ایک اور مرحلے غالباً جدوجہد آزادی کے آخری مرحلہ کی جانب دیکھنا شروع کر دیا تھا، ایک نیا جذبہ پیدا ہوا۔ اسی کے ساتھ حسبِ ذیل اسباب کی بناپر قومی تحریک کے سلسلہ میں برطانیہ کے رویے میں بھی تبدیلی آئی۔ دوسری عالمی جنگ کے نتیجے میں عالمی سیاسی منظر نامہ میں طاقت کا توازن تبدیل ہوا۔ برطانیہ کی جگہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور سوویت یونین بڑی طاقتوں کے طور پر اُبھرے۔ یہ دونوں طاقتیں ہندوستان کی جدوجہد آزادی کے تئیں ہمدرد تھیں۔ جنگ نے برطانیہ کی معاشی اور فوجی طاقت کو نقصان پہنچایا تھا۔ برطانیہ میں سیاسی صورتِ حال بھی تبدیل ہوگئی تھی۔ کنزرویٹو پارٹی کو جو ہندوستان کے مطالبہ آزادی کی مخالفت کرتی تھی، انتخابات میں زبردست شکست ہوئی تھی۔ جنگ کے دوران رہنے والے وزیر اعظم ونسٹن چرچل، جنھوں نے 'برطانوی سامراج' کو ختم کرنے سے انکار کر دیا تھا، وزیر اعظم نہیں رہے تھے۔ کلیمینٹ اٹلی کی زیر قیادت لیبر پارٹی برسر اقتدار آگئی تھی۔ یہ پارٹی ہندستان پر برطانوی حکومت کو جاری رکھنے کے خلاف تھے۔ آئی این اے (آزاد ہند فوج) کی سرگرمیوں کی وجہ سے انگریزوں نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ قومی تحریک کو کچلنے کے لئے حکومت انتظامیہ اور مسلح فورسیز سے متعلق ہندستانیوں پر مزید انحصار نہیں کر سکتی تھی۔ جنگ کے بعد ہندوستانیوں کا جو پراعتماد اور پختہ رویہ سامنے آیا تھا اس سے انگریزوں نے سمجھ لیا تھا کہ ہندوستانی غیر ملکی حکومت کی ذلت کو اب مزید برداشت نہیں کریں گے۔ جنگ کے بعد سارے ملک میں بڑے پیمانے پر محنت کشوں میں بے چینی تھی۔ ہر صنعت میں ہڑتالیں ہونے کا خطرہ تھا۔ کسانوں میں بھی بے چینی بڑے پیمانے پر پھیلی ہوئی تھی اور یہ زیادہ پر تشدد ہوگئی تھی۔ اسکولوں اور کالجوں کے طلباء ہڑتالیں، مظاہرے اور جلوس منتظم کرانے میں پیش پیش تھے۔ اب برطانیہ نے ہندوستان کو آزادی دینے کا فیصلہ کیا، لیکن ساتھ ہی اپنی سابقہ پالیسیوں سے ملک میں اختلافات کے بیج بھی بو دیے جو آزادی کے وقت تک تناور درخت بن چکے تھے۔

19ویں صدی کی آخری دہائیوں میں ہندوستانی سیاست میں فرقہ پرستی کا ظہور ہوا۔ دو بڑے مذہبی گروہوں - ہندوؤں اور مسلمانوں کے کچھ ماہرین تعلیم اور سماجی مصلحین نے مذہب کی بنیاد پر منظم ہونا شروع کیا اور اپنی اپنی فرقوں کے مفادات کو فروغ دینے کے لیے کام کرنے کا دعویٰ کیا۔ اس وقت فرقہ واریت میں جو نئی پیش رفت ہوئی جسے 'دو قومی نظریہ' کہا جاتا تھا۔ اس نظریہ کے مطابق ہندوستان

دوالگ الگ قوموں پر مشتمل تھا یعنی مذہب کی بنیاد پر منقسم تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ، دونوں فرقوں کے درمیان اختلافات شدت اختیار کر گئے اور فرقہ وارانہ فساد کی بنیاد پڑی جس کے نتیجے میں ہندوستان کے لوگوں کے لیے المناک نتائج برآمد ہوئے اور ملک کی تقسیم ناگزیر ہوگئی۔

16.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- برطانوی ہندوستان میں علاحدگی پسندانہ رجانات سے واقف ہو سکیں گے۔
- فرقہ وارانہ سیاست اور تقسیم کے وقت رہنماؤں کی سیاسی اولوالعزمیوں کو سمجھ سکیں گے۔
- مسلم لیگ اور اس کی سرگرمیوں کا جائزہ لے سکیں گے۔
- ہندو فرقہ وارانہ تنظیموں سے واقف ہو سکیں گے۔
- ہندوستان کی تقسیم اور آزادی کی جانب پیش رفت سے واقف ہو سکیں گے۔
- نئے ہندوستان کی تعمیر کا مشاہدہ کر سکیں گے۔

16.2 ہندوستانی سیاست میں علاحدگی پسند رجانات (Separatist Trends in Indian Politics)

ہندستانی قومی سیاست میں علاحدگی پسند رجانات کا بنیادی سبب ہندو اکثریت سے مسلم اقلیت کو تکلیف تھی کیونکہ صنعت و تجارت، سرکاری نوکریوں، تعلیم اور پیشوں پر اکثریت کا غلبہ تھا۔ عام طور پر ملک کی معاشی پسماندگی نے بھی علاحدگی پسند رجانات کو اُبھارنے میں کردار ادا کیا۔ نتیجتاً ملک مخالف سے زیادہ ہندو مخالف سرگرمیاں ہونے لگیں۔ مسلمانوں کے ایک طبقہ میں علاحدگی پسندیدہ رجحان 1906 میں اُس وقت اپنے عروج پر پہنچ گیا جب آل انڈیا مسلم لیگ قائم ہوئی۔ لیگ نے بنگال کو تقسیم کیے جانے کی حمایت کی اور مسلمانوں کو خصوصی تحفظات دینے کا مطالبہ کیا۔ بعد ازاں اس کا علاحدہ ووٹنگ کرانے کا مطالبہ تسلیم کر لیا گیا۔ اگرچہ ہندو فرقہ پرستوں کی کوئی منظم پارٹی مسلم لیگ کے ساتھ تشکیل نہیں دی گئی تھی۔ لیکن فرقہ وارانہ نظریات میں اُبھار آیا تھا۔ متعدد ہندو مصنفین اور سیاسی کارکنان نے ہندو قوم پرستی کی بات شروع کر دی تھی اور انہوں نے ہندوستان میں مسلمانوں کو غیر ملکی قرار دیا تھا۔

1915 میں ہندو فرقہ پرستی نے منظم شکل تب اختیار کی جب مدن موہن مالویہ نے ہندو مہاسبھا قائم کی۔ 1925 میں ہندو فرقہ پرستی کا ایک اور منظم اظہار راشٹریہ سویم سیوک سنگھ (آر ایس ایس) کے قیام کی شکل میں ہوا۔ دونوں فرقوں، ہندو اور مسلمانوں نے خود پر مرکوز ایک تنگ ذہنیت کو مادی بہبود اور سماجی وسیاسی حیثیت سے متعلق معاملات میں فروغ دیا۔ انگریزوں نے اس کا فائدہ اُٹھایا۔ ملک میں متحد قومی جذبہ کے فروغ کو روکنے کے لیے انگریزوں نے لوگوں کو مذہبی خطوط پر تقسیم کرنے کا فیصلہ کیا۔ بنگال کی تقسیم (1905) اور 1909 کی اصلاحات کے ذریعہ فرقہ وارانہ بنیاد پر انتخاب، انگریزوں کی Divide and Rule (بانٹو اور راج کرو) پالیسی کی واضح مثالیں ہیں۔ فرقہ وارانہ گروہ، کانگریس کے خلاف ہاتھ ملانے میں بھی نہیں ہچکچائے۔ دراصل کسی بھی فرقہ پرست گروہ یا پارٹی نے غیر ملکی

حکومت کے خلاف کسی بھی جدوجہد میں حصہ نہیں لیا۔ان علاحدگی پسند رجحانات کا ہندوستانی معاشرہ اور جدوجہد آزادی پر منفی اثر پڑا۔علاحدگی پسند گروہوں نے فرقہ وارانہ جذبات اُبھارے اور قوم پرست طاقتوں کو کمزور کیا۔اُنہوں نے حصول آزادی میں بھی چند برسوں کے لئے تاخیر کردی۔مسلمانوں کے لئے الگ ملک کا مطالبہ اور بالآخر تقسیم ہند کا سبب بھی وہی تھا۔سب سے بڑی بات یہ ہے کہ علاحدگی پسند رجحانات کا نتیجہ فرقہ وارانہ فسادات کے سماجی مسئلہ کی شکل میں ظاہر ہوا۔یہ فسادات آزاد ہندوستان کی ایک مستقل علامت بن گئے۔

16.3 مسلم لیگ کا عروج اور ارتقا (Rise and Growth of the Muslim League)

16.3.1 مسلم لیگ کے قیام کے اسباب (Reasons for the Formation of Muslim League)

تقسیم کرو اور حکومت کرو کی برطانوی پالیسی: انگریزوں نے مغل حکمرانوں کا تختہ الٹ کر ہندوستان پر اپنی مکمل حکمرانی قائم کی۔چونکہ مغل تخت،ہندوستان میں عام مسلمانوں کے لیے ایک علامتی اہمیت اور جذباتی قدر و منزلت کا حامل تھا،اسے مسلم شناخت پر حملہ کے طور پر دیکھا گیا۔اس کے نتیجے میں،مسلمان برطانوی حکومت کے سخت ناقد بن گئے اور 1857 کی بغاوت میں بھرپور طریقے سے حصہ لیا۔جواب میں انگریزوں نے بغاوت کو کچلنے کے بعد مسلمانوں پر ظلم کیا۔تاہم،1870 کے بعد ان کے رویے میں ایک عظیم تبدیلی آئی کیونکہ انہیں احساس ہو چلا تھا کہ قوم پرستی کی بڑھتی ہوئی لہر کو روکنے کے لیے ہندوؤں اور مسلمانوں کو تقسیم کرنا ضروری ہے۔اس کے نتیجے میں،نوآبادیاتی حکومت نے مسلمانوں کے تئیں خوشامد کی پالیسی اپنائی اور انہیں اپنی سیاسی انجمنیں بنانے کی ترغیب دی۔ہندوستان پر اپنا تسلط برقرار رکھنے کے لیے برطانوی حکومت نے 'تقسیم کرو اور حکومت کرو' کی اپنی بدنام زمانہ پالیسی پر عمل کرنا شروع کر دیا۔1871 میں حکومت نے ایک قرارداد منظور کی جس کے تحت پرائمری اور سیکنڈری اسکولوں میں مسلمانوں کے لیے اردو کو ذریعہ تعلیم بنایا گیا اور مسلم تعلیمی اداروں کے لیے سرکاری امداد میں اضافہ کیا۔مسلمان حکمرانوں کو لٹیروں اور ہندو حکمرانوں کو اپنی مسلم رعایا کے ساتھ ظالم کے طور پر پیش کیا گیا۔بنگال کی تقسیم کو بھی مسلمانوں کے مفاد میں ایک اقدام کے طور پر ظاہر کیا گیا۔پریس،پوسٹرز،لٹریچر وغیرہ کے ذریعے ذات پات اور مذہب کی کمیوں کو جان بوجھ کر بڑھایا گیا اور فرقہ پرست رہنماؤں کو اپنی فرقوں کے مستند نمائندوں کے طور پر قبول کیا گیا۔

ہندی اردو تنازعہ: سب سے طویل عرصے تک،اردو،اترپردیش،پھر متحدہ صوبوں میں سرکاری زبان رہی۔عدالت میں تمام درخواستیں اردو میں لکھنی پڑتی تھیں۔اس سے ہندوؤں میں کافی ناراضگی پیدا ہوئی کیونکہ ان کے ذریعہ بولی جانے والی زبان دیوناگری رسم الخط کی ہندی یا ہندوستانی تھی۔ہندوؤں کے مسلسل احتجاج کے نتیجے میں،برطانوی حکومت نے 1900 میں ایک حکم جاری کیا کہ تمام درخواستیں دیوناگری رسم الخط میں ہندی میں جمع کی جائیں۔عدالتی سمن اور تمام سرکاری اعلانات کے لیے ہندی اور اردو دونوں کا استعمال کیا جا سکتا ہے۔اس کی وجہ سے اترپردیش میں راسخ العقیدہ حکمران طبقے کے مسلمانوں میں عدم تحفظ پیدا ہوا۔چونکہ ان علاقوں کے مسلمان نسبتاً سیاسی طور پر منظم تھے،اس لیے ان میں فرقہ وارانہ جوش نے مسلم لیگ کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا۔

کانگریس لیڈروں کا مذہبی/احیاء پسندانہ رجحان: بال گنگادھر تلک اور لالہ لاجپت رائے جیسے بنیاد پرست کانگریسی رہنما اپنی سیاسی گفتگو میں مذہبی اصطلاحات اور علامتوں کا استعمال کرنے سے باز نہیں آئے۔ درحقیقت کئی بار انہوں نے ہندومت کے روایتی تصورات سے تحریک حاصل کی۔ تلک نے اپنی طرف سے گنیش چترتھی اور شیواجی جینتی کے عوامی تہواروں کو منانا شروع کیا تاکہ ہندوستانیوں میں ان کی قدیم ثقافت کے لیے فخر پیدا کیا جاسکے۔ یہ بھی بڑے پیمانے پر عوام کو متحرک کرنے کے لیے کیا گیا۔ اگرچہ یہ فرقہ وارانہ ایجنڈے کے ساتھ نہیں کیا گیا تھا، لیکن اس نے بالآخر مسلمانوں کو کانگریس کی سیاست سے دور کردیا۔

مسلم فرقہ کی نسبتاً پسماندگی: مسلمانوں میں فرقہ وارانہ اور علیحدگی پسندانہ سوچ کا رجحان اس وجہ سے بڑھا کہ ان کی تعلیم، تجارت اور صنعت میں اس وقت کی نسبتاً پسماندگی تھی۔ اعلیٰ طبقے کے مسلم زمینداروں اور اشرافیہ کی انگریزوں کے خلاف دشمنی کی وجہ سے مسلمان زیادہ تر جدید مغربی تعلیم سے دور رہے۔ مسلمان کسی بھی منظم صنعت کی ترقی میں بہت زیادہ ملوث نہیں تھے اور سرکاری خدمات میں داخل ہونے کے لیے مغربی تعلیم سے فائدہ نہیں اٹھاتے تھے۔ نتیجے کے طور پر، وہ لبرل ازم سے متاثر نہیں ہوئے جیسا کہ اس وقت کے ہندوؤں نے کیا تھا۔

بنگال کی تقسیم اور کانگریس کا رویہ: 1905 میں برطانوی حکومت کی طرف سے بنگال کی تقسیم نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان تعلقات کو بہت زیادہ بگاڑ دیا۔ تقسیم نے مسلمانوں کے لیے بہت سے سیاسی فوائد کو یقینی بنایا لیکن ہندوؤں نے بنگال کی تقسیم کے خلاف مخالفانہ اور پر تشدد انداز میں رد عمل ظاہر کیا۔ اس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ ہندو مسلمانوں کو ان کا جائز حصہ دینے کو تیار نہیں ہیں۔ مسلمانوں کو بہت مایوسی ہوئی جب انہوں نے دیکھا کہ کانگریس غیر جانبداری کے اپنے تمام دعووں کے باوجود ہندو انتہا پسندوں کی کھل کر حمایت کر رہی ہے۔ یہ مسلم لیگ کے قیام کا سب سے بڑا سبب تھا۔

برطانیہ میں حکومت کی تبدیلی: برطانیہ میں 1905 کے انتخابات میں لبرل پارٹی دوبارہ اقتدار میں آگئی۔ پارٹی نے ہندوستان کے لیے سیاسی اصلاحات کا پروگرام دیا۔ مسلم قائدین نے صورتحال پر تبادلہ خیال کیا اور مسلمانوں کے مطالبات کو حکومت کے ساتھ اٹھانے کے لئے مشترکہ مقصد بنانے کا فیصلہ کیا۔

16.3.2 آل انڈیا مسلم لیگ کا قیام (Foundation of the All-India Muslim League)

شملہ وفد: برصغیر کے تمام حصوں سے لیے گئے پینتیس اعلیٰ درجے کے مسلم رہنماؤں نے یکم اکتوبر 1906 کو اس وقت کے وائسرائے لارڈ منٹو سے شملہ میں ملاقات کی۔ ان کے ذریعے پیش کردہ اہم مطالبات کچھ اس طرح تھے؛ علاحدہ انتخابی حلقوں کا حق مسلمانوں کو دیا جائے۔ مسلمانوں کو مرکزی مقننہ میں مزید تین نشستیں دی جائیں۔ مسلمانوں کو سول سروسز میں کوٹہ دیا جائے۔ مسلمانوں کو یونیورسٹیوں کی سینیٹ اور سنڈیکیٹس میں نمائندگی دی جائے۔ مسلمانوں کو مسلم یونیورسٹی کے قیام کے لیے امداد دی جائے۔ وائسرائے نے مسلمانوں کے مطالبات سے ہمدردی کا اظہار کیا اور انہیں برطانوی حکومت کے سامنے اٹھانے کا وعدہ کیا۔ وائسرائے کے جواب سے مسلم لیڈروں کو بہت حوصلہ ملا۔

آل انڈیا مسلم لیگ کی بنیاد: آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس ایک تنظیم تھی جس کی بنیاد سر سید احمد خان نے 1886 میں علی گڑھ میں رکھی تھی جس کا مقصد ہندوستان میں مسلم فرقہ میں جدید اور آزاد خیال تعلیم کو فروغ دینا تھا۔اس کا 20واں سالانہ اجلاس دسمبر 1906 میں نواب وقار الملک کی صدارت میں ڈھاکہ میں منعقد ہوا۔اس میں نواب سلیم اللہ خان، مولانا ظفر علی خان، حکیم اجمل خان، مولانا محمد علی وغیرہ جیسے مسلم رہنماوں نے شرکت کی۔نواب سلیم اللہ خان نے مسلمانوں کے مفادات کا خیال رکھنے کے لیے سینٹرل محمڈن ایسوسی ایشن کے قیام کا خیال پیش کیا۔آل انڈیا مسلم لیگ کے قیام کی قرارداد نواب سلیم اللہ خان نے پیش کی جس کی مندرجہ بالا مسلم رہنماؤں نے تائید کی۔اسی مناسبت سے 30 دسمبر 1906 کو آل انڈیا مسلم لیگ کی بنیاد رکھی گئی۔سر آغا خان کو پہلا صدر بنایا گیا۔مسلم لیگ کا قیام انگریزوں کی 'تقسیم کرو اور حکومت کرو' کی حکمت عملی کا پہلا ثمر سمجھا جاتا ہے۔

مسلم لیگ کے اغراض و مقاصد یہ تھے:

- مسلمانوں کے مفادات کا تحفظ اور تحفظ اور ان کے مطالبات کو برطانوی حکومت تک پہنچانا۔
- برطانوی حکومت کے لیے مسلمانوں میں احترام اور نیک نیتی کا جذبہ پیدا کرنا۔
- ہندوستان کی مختلف برادریوں کے درمیان بھائی چارہ کو فروغ دینا۔

لیکن، لیگ کا بنیادی مقصد ہندوستان میں مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ اور آگے بڑھنا اور حکومت کو ان کی ضروریات کی نمائندگی کرنا تھا۔ 1906 سے 1910 تک پارٹی کا مرکزی دفتر علی گڑھ میں رہا۔اس نے 1908 میں اپنی لندن برانچ قائم کی۔1910 میں اس کا ہیڈ کوارٹر لکھنؤ منتقل ہونے کے بعد اس کی سیاسی سرگرمیاں بڑھ گئیں۔مولاناوں (محمد علی اور شوکت علی)، فضل الحق، مظہر الحق، اور فضلی حسین کی قیادت میں، 1912 تک اس میں نہ صرف بہت سے نوجوان مسلمان شامل ہوئے بلکہ کانگریس کے کچھ مسلم ارکان بھی شامل ہوئے جنہوں نے، تاہم، اپنی جماعت کو برقرار رکھا۔مؤخر الذکر کی رکنیت.1906 میں انڈین نیشنل کانگریس میں شامل ہونے والے محمد علی جناح سات سال بعد 1912 میں مسلم لیگ میں شامل ہوئے۔

دسمبر 1906 میں ہی مسلم لیگ نواب وقار الملک نے ڈھاکہ میں تشکیل دی اور اُنہوں نے ہی اس کے پہلے اجلاس کی صدارت بھی کی۔1906 تا 1910 اس پارٹی کا مرکزی دفتر علی گڑھ میں رہا۔اس کے ہیڈ کوارٹر کی لکھنو منتقلی کے بعد اس کی سیاسی سرگرمیاں بڑھ گئیں۔مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، مولانا فضل الحق، مظہر الحق اور فضلِ حسین کی رہنمائی میں 1912 تک نہ صرف متعدد مسلم نوجوان بلکہ کانگریس کے کچھ مسلم ممبران بھی جنہوں نے موخر الذکر میں اپنی ممبری بھی برقرار رکھی، اس میں شامل ہوئے۔خلافت تحریک (1920-24) کے دوران یہ پارٹی بس برائے نام ہی موجود تھی اور اپنے اجلاس وہاں منعقد کرتی تھی جناب خلافت کانفرنسیں ہوتی تھی۔ہندوستان کے آئینی مسائل حل کرنے کے لئے 1928 میں ایک آل پارٹی کانفرنس پہلے دہلی اور بعد میں پونہ میں منعقد ہوئی۔اس کے لئے ایک سب کمیٹی موتی لال نہرو کی زیر قیادت قائم کی گئی جس کے رُکن علی امام، تیج بہادر سپر داور سبھاش چندر بوس تھے۔اگست 1928 میں اس سب کمیٹی نے

ایک رپورٹ جو 'نہرو رپورٹ' کے نام سے مشہور ہوئی، پیش کی گئی جس میں ہندوستان کے لئے 'حکومتِ خود اختیاری' کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ علاحدہ الیکشن کو نامنظور کر دیا گیا تھا اور بنگال و پنجاب کے مسلمانوں کے لئے سیٹوں کے ریزرویشن کو بھی مسترد کر دیا گیا تھا۔ اس رپورٹ میں مسلمانوں کے کسی بھی مطالبے کو منظور نہیں کیا گیا تھا۔ نہرو رپورٹ سے غیر مطمئن مسلم لیگ نے جناح کو اس منصوبہ کا فاکہ تیار کرنے کی ذمہ داری دی، جو مستقبل کے کسی بھی آئین کی بنیاد ہو اور جس میں ایک خود مختار ہندوستان میں مسلمانوں کے سیاسی حقوق کے تحفظ پر زور دیا گیا ہو۔ جناح 14 نکات کے ساتھ آگے آئے۔ یہ نکات مسلمانوں کے تمام مفادات کا احاطہ کرتے تھے اور یہ ان کے اہم مطالبات بن گئے۔ انہوں نے آئندہ دو دہائیوں یعنی 1947 میں قیام پاکستان تک مسلمانوں کی فکر کو بہت زیادہ متاثر کیا۔

1930 میں ڈاکٹر محمد اقبال نے الہ آباد اجلاس کے اپنے تاریخی خطاب میں ہندوستان کے شمال مغرب میں مسلم ریاست کے قیام کا مطالبہ کیا۔ 1936 میں جناح نے صوبائی اسمبلیوں اور مرکزی قانون ساز اسمبلی کے انتخابات لڑنے کے لئے ایک پارلیمانی بورڈ نامزد کیا۔ 1937 کے جنرل الیکشن میں لیگ نے ابتدائی حدود کے باوجود سیٹ اچھی کارکردگی نہیں دکھلائی۔ یہ استثنیا بنگال لیگ مسلم اکثریت کے حامل صوبوں میں خالی ہاتھ رہی۔ لکھنؤ اجلاس (1937) میں لیگ کے دو قومی نظریے کی توثیق ہوئی لیکن اس کے لاہور اجلاس (1940) میں ملک کی تقسیم کا مطالبہ کرنے والی تجویز پاس کی گئی۔ ہندوستانی قوم پرست پریس نے لاہور تجویز کو پاکستان تجویز قرار دیا حالانکہ اجلاس میں جو تقریر یہ بن کی تیں اُن میں یا تجویز کے متن میں اسی لفظ کا ذکر نہیں تھا۔ دوسری عالمی جنگ کے دوران لیگ حقیقتاً مضبوط ہد کی۔ 1946 میں عام اسمبلی انتخابات میں اس نے بہت اچھی کارکردگی دکھائی اور مرکز و صوبوں دونوں میں اس نے تقریباً تمام مسلم سیٹوں پر قبضہ کر لیا تھا۔

16.3.1 تحریک پاکستان (The Pakistan Movement)

بیسویں صدی کی چوتھائی دہائی میں وہ طاقتیں زیادہ واضح ہو گئی تھیں، جنہیں آزاد ہندوستان کی آخری شکل بنانی تھی۔ لیگ نے اپنی اصلاح کرنا شروع کر دیا تھا اور 1940 تک وہ سیاسی منظر نامہ پر ایک قابل ذکر طاقت بن کر ابھر چکی تھی اور ایک ایسی فورس جس نے مسلمانوں کے لئے قومی علاقے کا مطالبہ کیا تھا۔ انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں ایسی نظیریں پانا شاید ممکن ہے، جن میں پاکستان کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ فرقہ کے علاحدہ شناخت اور مفادات جن پر سرسید احمد خان نے زور دیا تھا، منٹو گیس مارلے اصلاحات اور ایک دہائی بعد مونٹنگ۔ چیمس فورڈ اسکیم میں دفن ہیں۔ وہ آج کی ضرورت کے لئے کافی ہیں۔ تاہم بیسویں صدی کی تیسری دہائی کے نصف اول میں یہ کافی نہیں نظر آتے۔ 1921 میں لیگ کے اجلاس کے صدر مولانا حسرت موہانی نے صلاح دی تھی کہ برطانوی ہندوستان میں ہندو اکثریت والے سات صوبوں کے مقابلہ میں مسلم اکثریت کے حامل چار صوبوں کو استعمال کیا جائے۔ اگرچہ یہ نظریہ ایک علاحدہ علاقے کے خیال کی جانب بڑھا تھا لیکن اس سے یہ خیال اپنی آخری شکل تک نہیں پہنچا تھا کیونکہ مسلمان ابھی تک ایک متحد ہندوستان میں رہنا چاہتے تھے۔ یہ رویہ بتدریج جاری و ساری رہا اور 1928 میں آغا خان نے آزاد ریاستوں کے لئے رضاکارانہ وفاق میں متحد مقتدر اعلیٰ علاقوں کے لئے اپنی وکالت میں اسے مضبوطی کے ساتھ پیش کیا تھا۔ یہ صورت حال اس وقت تک رہی جب تک 1930 میں ''دو قومی نظریہ'' کے موثر ترجمان محمد اقبال نے عوام کے درمیان اپنی بات نہیں رکھی تھی۔ محمد اقبال 1930 میں مسلم لیگ کے صدر تھے اور شاید ہندوستان کے مقبول ترین

اور موثر ترین مسلم شاعر تھے۔اپنے خطاب میں اقبال نے زور دے کر کہا تھا کہ اسلام کے مذہبی آئیڈیل معاشرتی نظام سے مربوط ہیں۔ایک کو مسترد کرنے کے معنی ہیں،دوسرے کو بھی مسترد کرنا۔ہندوستان میں جہاں ہر گروہ،ہر مذہب اور ہر فرقہ دوسرے کے وجود سے حسد رکھتا ہو،وہاں مستقبل کے ہندوستان کا مقصد ان اقدار کو متحد کرنا یا ملانا نہیں بلکہ ان میں ہم آہنگی پیدا کرنا ہونا چاہئے۔انہوں نے اس سے ایک برس قبل دہلی میں منعقدہ کل پارٹی مسلم کانفرنس کی اس تجویز کو بھی تسلیم کیا تھا کہ مستقبل کے آزاد ہندوستان کو ایک وفاقی ماڈل پر مبنی ہونا چاہئے، جس میں صوبوں کو خود مختاری اور بچے ہوئے اختیارات حاصل ہوں۔ لیکن یہ نظریات ان کے اپنے ہی رہے اور انہیں نہ تو لیگ کی تجویز میں رسمی طور پر شامل کیا گیا اور نہ ہی وہ کچھ وقت کے لئے مسلم دانشوروں میں بھی مقبول ہوئے۔چوتھی دہائی کے وسط تک اقبال کی پوزیشن بڑھ گئی تھی۔تب تک وہ مسلمانوں کو ایک قوم اور ایک الگ سیاسی یونٹ ماننے لگے تھے اور جناح کو اپنے نقطہ نظر کے قریب لانے کی کوشش کر رہے تھے۔

1935 کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ نے نہ صرف مسلمانوں کو علاحدہ نشستیں دینے کا ایک مضبوط آرڈیننس بلکہ سندھ،نارتھ ویسٹ فرنٹیئر پراونس(این ڈبلیو ایف پی)پنجاب میں تواتر سے موجود اکثریتوں کو نئے مکمل صوبوں کی شکل دی اور 48.6 فیصد سیٹیں بنگال میں دیں۔1933 میں کیمبرج کے ایک طالب علم رحمت علی نے ایک پمفلیٹ شائع کیا جس میں اس نے ہندوستان کے شمال مغرب میں ایک علاحدہ مسلم ریاست کی وکالت کی اور جسے اس نے پاکستان کا نام دیا جس کے معنی تھے" پاک لوگوں کی سرزمین"اور یہ لفظ پنجاب،افغانیہ(یعنی این ڈبلیو ایف پی)'کشمیر'،'سندھ'اور'بلوچستان' کے فائنل حصے کے اولین حروف کو ملا کر بنایا گیا تھا۔یہ علاقہ محدود تھا اور اس میں بنگال کو جہاں مسلمان مرکوز تھے شامل نہیں کیا گیا تھا۔اس طرح الگ ملک پاکستان کے تصور نے معینہ شکل اختیار کرلی اور اسے عام وخاص کے لئے پیش کیا گیا لیکن 36-1935 میں اسے کم حمایت ملی اور یہ مقبولیت کوئی اہم مسئلے نہیں بنا تھا۔مگر پانچ سال کے اندر ہی منظر تبدیل ہو گیا۔

1934 کے بعد لیگ کی قسمت اس وقت بدل گئی جب یوپی کے سیاستداں لیاقت علی خان نے جناح کو جو انگلینڈ میں قیام پذیر تھے ہندوستان واپس آنے اور تنظیم کی ذمہ داری لینے کی ترغیب دی۔انہوں نے ایسا ہی کیا اور مارچ 1934 میں وہ مستقل صدر منتخب ہوئے اور جلد ہی وہ اپنی موجودگی کا احساس کرانے لگے۔اگرچہ اس مرحلہ میں وہ کانگریس کے ساتھ تعاون کرنا اور مساوات کی بنیاد پر اس کے ساتھ کام کرنے کے لئے خواہاں تھے مگر 1937 کے انتخابات نے اس تصویر کو کچھ بدل دیا۔لیگ میں نئی جان ڈالنے اور مسلمانوں کو زیادہ موثر بنانے کے اپنے عام پروگرام کے ایک حصے کے طور پر جناح نے محسوس کیا کہ خاص طور پر مسلمانوں کی پارٹی کو قانون سازی میں رول ادا کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ممبئی میں لیگ کے 1936 کے اجلاس میں ان خیال کو قبول کیا گیا اور انتخابات لڑنے کا فیصلہ لیا گیا۔ایک مرکزی پارلیمانی بورڈ قائم کیا گیا اور جناح کو انتخابات کی ذمہ داریاں سونپی گئیں۔

لیگ نے انتخابات اور 1935 کے ایکٹ سے پیدا شدہ صورت حال سے جو نتائج اخذ کئے وہ دور رس تھے۔اقلیتی صوبوں میں ایسا نظر آیا کہ ان کی قسمت میں کبھی بھی حکومت تشکیل دینا نہیں ہے اور غیر مسلم ہندوستان پر زبردست گرفت کے ساتھ کانگریس ہمیشہ حاوی

رہے گی۔ اکثریتی صوبوں میں سیٹوں پر زور ان کے لئے نقصان دہ رہا اور کل اکثریت کے تحت انہیں صرف بنگال اور پنجاب دیے۔ بہر حال 1937 سے یہ ظاہر ہوا کہ ان صوبوں میں ان کی گرفت کمزور تھی۔ یہ واضح تھا کہ لیگ مسلم اکثریت والے صوبوں پر اپنی گرفت کو مضبوط کرنے کے لئے ترجیحی طور پر غیر مسلم لیڈروں کو اپنے غول میں لانا چاہتی ہے۔ علاوہ ازیں اس آئینی اسکیم کی مخالفت کرنی تھی جس نے اسے سیاسی طور پر غیر موثر بنادیا۔ آخری سہارے کے طور پر یہ خود اپنی شبیہ کو تبدیل کرنے کی تیاری کرتی اور ہندوستانی سیاست میں اپنے آپ کو آئندہ صرف ایک علاحدہ اقلیت نہیں بلکہ ایک الگ قوم مانے گی۔ نظریے میں اس تبدیلی کو ایک اہم سبب انتخابات کا نتیجہ انتخابی مہم کے دوران کانگریس اور لیگ ایک دوسرے کے مخالف نہیں رہے اور کم از کم یوپی میں ان کے درمیان ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرنے کا شریفانہ معاہدہ نظر آتا تھا۔ لیکن کانگریس نے کچھ کامیابی کے بعد اپنی حکومت بنانے کا فیصلہ کیا۔ اس نے اپنی وزارتوں میں ان مسلمانوں کو بھی شامل کیا جنہوں نے کانگریس کے نظریات کو تسلیم کیا اور یہ مانا کہ انگریزوں کے خلاف جدوجہد میں کانگریس ہی واحد تنظیم تھی۔ اس نے مسلم لیگ کے ممبران کو کیبنٹ میں شامل ہونے کی اجازت نہیں دی۔ اس فیصلہ نے لیگ کو الگ تھلگ کردیا اور شاید یہ اس کے نظریہ کے لئے ایک اہم موڑ ثابت ہوا۔

1947 میں لیگ نے لکھنؤ میں 1936 کے پروگرام کو جاری رکھنے کا فیصلہ لیا۔ جناح نے تنظیم کو مضبوط بنانے اور دانشوروں سے زیادہ عوامی حمایت حاصل کرنے کے لئے دوبارہ زور دیا۔ تین ماہ کے اندر ہی 170 شاخیں قائم کی گئیں اور یہ دعویٰ کیا گیا کہ صرف یوپی میں ہی ایک لاکھ نئے ممبر بنائے گئے۔ ملاؤں اور مولویوں نے دیہی اور شہری عوام میں لیگ کے نظریہ کو پھیلایا جبکہ کسی حد تک کامیابی کے ساتھ یہ کوشش بھی کی گئی کہ صوبائی قانون ساز اداروں میں غیر لیگی مسلم سیاستداں کو ساتھ لایا جائے۔ کانگریس مخالف پروپیگنڈہ مہم بھی شروع کی گئی۔ مسلمانوں کو سمجھایا گیا کہ وہ کانگریس راج میں انصاف اور اچھے کاموں کی توقع نہ کریں۔ کانگریس کے خراب انتظامیہ کے بارے میں بھی شکایتیں کی گئیں۔ جب 2 اور 3، دسمبر 1939 کو کانگریسی وزارتوں نے استعفیٰ دے دیے تو جناح نے اس کو 'یوم نجات' قرار دیا۔ اس کے ساتھ ہی پاکستان کا تصور بھی زور پکڑنے لگا۔ 1938 میں سندھ صوبائی مسلم لیگ نے پہلی مرتبہ اپنے پروپیگنڈہ میں 'قوم' اصطلاح کا استعمال کیا، جبکہ اسی سال لیگ کے سالانہ اجلاس نے جناح کو حکومت کی متبادل شکلوں کو جانچنے کا اختیار دیا۔ 1939 میں لیگ کی ورکنگ کمیٹی نے مختلف اسکیموں کو پرکھنے کے لئے ایک سب کمیٹی تشکیل دی۔ بالآخر 1940 میں لیگ کے لاہور اجلاس میں ایک تجویز جو 'پاکستان قرارداد' کے نام جانی جاتی ہے، منظور کی گئی۔ بہ الفاظ دیگر لیگ نے یہ فیصلہ کیا اور ہندوستان کو مذہبی طور پر تقسیم کیا جانا اور علاحدہ ملک بنایا جانا چاہئے۔ کانگریس نے اس نظریے کی مخالفت کی اور یہ پوزیشن لی کہ ایک سیکولر اور متحد تنظیم ہونے کی وجہ سے وہ ملک کے تمام طبقوں اور گروہوں کی نمائندگی کرتی ہے اور یہ کہ ہندوستان ایک ملک ہے اور آزاد ہندوستان ایک سیکولر اور متحد ملک رہنا چاہئے۔ دونوں رویے ناقابل مفاہمت تھے اور اس مسئلہ کو حل کرنے میں مزید سات سال لگنے تھے۔

1940 میں مطالبہ پاکستان ایک شیخ چلی کا خواب اور ایک غیر حقیقی مقصد لگتا تھا۔ مسلم دانشوروں، رہنماؤں اور متوسط طبقے یا عوام میں بھی اسے سنجیدگی سے قبول نہیں کیا گیا تھا۔ بعض مصنفین نے اس مطالبہ کا ایک سنجیدہ مقصد قرار نہیں دیا بلکہ اسے سودے بازی کا ایک

حربہ کہا جسے لیگ مستقبل کے آئینی معاہدہ سے زیادہ سے زیادہ رعایتیں حاصل کرنے کے لئے استعمال کر سکتی تھی۔ اگر ایسا تھا تو 1940 کے بعد بھی پاکستان ناگزیر نہیں تھا اور ایسا لگتا ہے کہ جناح بعد میں بھی بعض مراحل پر پاکستان سے کم کسی بات کو تسلیم کرنے کے لئے آمادہ تھے۔

1945 کے بعد کے واقعات: تقسیم ملک اور آزادی

(The Post-1945 Developments: Partition and Independence)

16.3.2 سی آر فارمولہ (C.R. Formula,1944)

سی راج گوپال آچاریہ نے ہندوستان کے حصول آزادی کے لئے کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان مفاہمت کی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے 1944 میں ایک فارمولہ تیار کیا جسے سی آر فارمولہ کہا جاتا ہے اور جس کی خاص باتیں تھیں: عبوری دور میں انٹرم حکومت کی تشکیل کے لئے مسلم لیگ کو کانگریس کے ساتھ تعاون۔ جنگ کے خاتمہ کے بعد ہندوستان کے شمال مغرب اور مشرق میں مسلم اکثریت کے حامل اضلاع کی حدود کے تعین کے لئے ایک کمیشن مقرر کیا جائے گا۔ ان اضلاع کے عوام رائے شماری کے ذریعہ ہندوستان سے علاحدگی کے مسئلے پر فیصلہ کریں گے۔ علاحدگی کی صورت میں دفاع، کامرس، مواصلات اور دیگر ضروری شعبوں کی مشترکہ طور پر نگرانی کے لئے دونوں حکومتوں کے درمیان معاہدہ ہوگا۔

16.3.3 گاندھی جناح مذاکرات (Gandhi-Jinnah Talks, 1944)

سی آر فارمولہ کی روشنی میں انگریزوں کے جانے کے، جو ناگزیر لگتا تھا، بعد ہندوستان کے مستقبل کے بارے میں غور کرنے کے لئے گاندھی نے جناح سے ملاقات کی تجویز رکھی۔ 9، ستمبر 1944 کو بمبئی میں مذاکرات شروع ہوئے اور 27، ستمبر تک جاری رہے۔ جناح نے ان کے خاتمے اور کسی معاہدہ پر پہنچنے میں ناکامی کا اعلان کیا۔ گاندھی کا کہنا تھا کہ چونکہ سی آر فارمولہ مسلم لیگ کے مطالبہ کو تسلیم کرتا ہے اس لئے وہ چاہتے ہیں کہ لیگ اپنی لاہور تجویز کو جو ان کے خیال میں دو قومی نظریے پر مبنی تھی ترک کرے۔ لیکن دو قومی نظریہ لیگ کی باضابطہ پالیسی بن چکا تھا لہٰذا جناح نے بحث کرتے ہوئے کہا کہ گاندھی کو یہ بات تسلیم کرنی چاہئے اور ماننا چاہئے کہ ہندو اور مسلمان دو خود مختار قومیں ہیں۔ گاندھی چاہتے تھے کہ لیگ انگریزوں کے خلاف کانگریس کی جدوجہد میں فوری طور پر اس کی حمایت کرے۔ صرف انگریزوں کے جانے کے بعد بھی تقسیم پر غور کیا جائے۔ لیکن جناح انگریزوں کے جانے سے پہلے ہی تقسیم کو یقین بنانا چاہتے تھے۔ اس طرح گاندھی اور جناح کے درمیان مذاکرات بغیر کسی مزید مفاہمت کے ناکام ہو گئے۔

16.3.4 دیسائی-لیاقت معاہدہ (Desai-Liaqat Pact, 1945)

گاندھی-جناح مذاکرات کی ناکامی کے بعد گاندھی سمجھ گئے کہ انگریز ہندوستان کو تب تک آزادی نہیں دیں گے جب تک کانگریس اور مسلم لیگ کے مستقبل اور عبوری حکومت کی تشکیل کے بارے میں کسی نتیجے پر نہیں پہنچتیں۔ لہٰذا گاندھی نے کانگریسی لیڈر بھولا بھائی جیون جی دیسائی سے تاکید کی کہ وہ مسلم لیگ کے لیڈروں کو منانے اور 1942-45 کی سیاسی پیچیدگی سے باہر نکلنے کا راستہ تلاش کرنے کے لئے ایک

اور کوشش کریں۔ جنوری 1945 میں بھولا بھائی دیسائی مسلم لیگ کے لیاقت علی خان سے ملے اور انہیں مرکز میں عبوری حکومت کی تشکیل کے لئے تجاویز پیش کیں۔ ان تجاویز پر رد عمل ظاہر کرتے ہوئے لیاقت علی نے معاہدہ کا اختصار شائع کیا۔ اس کے مطابق کانگریس اور لیگ مرکز میں حسب ذیل خطوط پر عبوری حکومت قائم کریں گی۔ کانگریس اور لیگ دونوں مساوی تعداد میں مرکزی عاملہ میں لوگوں کو نامزد کریں گی اور اقلیتوں بالخصوص درج فہرست ذاتوں اور سکھوں کو نمائندگی دی جائے گی۔ دیسائی۔لیاقت معاہدہ کے طور پر مشہور اس معاہدہ کو کانگریس یا لیگ نے رسمی طور پر کبھی منظور نہیں کیا۔

16.3.5 ویویل منصوبہ اور شملہ کانفرنس (Wavell Plan, and the Shimla Conference, 1945)

سی آر فارمولہ پر مبنی گاندھی۔جناح مذاکرات کی ناکامی کے بعد اس وقت کے گورنر جنرل لارڈ واویل نے آئینی تعطل کو ختم کرنے کے لئے ایک منصوبہ پیش کیا۔ 1945 میں اس پر غور کرنے کے لئے انہوں نے شملہ میں تمام ہندوستانی سیاسی پارٹیوں اور گروہوں کے رہنماؤں کی کانفرنس کی۔ انہوں نے ایک منصوبہ پیش کیا جس کے تحت کمانڈران چیف کے کے استثنیٰ سے ایگزیکٹیو کونسل پوری طرح ہندوستانیوں کو سونپی جانی تھی اور کونسل میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو مساوی نمائندگی دی جائے گی۔ یہ ہندوستان کے لئے نیا آئین تیار کئے جانے تک کے لئے ایک عبوری انتظام تھا لیکن کانفرنس اور منصوبہ جناح کی زیر قیادت مسلم لیگ کے غیر منطقی رویے کی وجہ سے ناکام ہوئے۔ وہ چاہتے تھے کہ ایگزیکٹو کونسل کے مسلم ممبران صرف مسلم لیگ منتخب کرے تاہم یہ بات کانگریس کے لئے ناقابل قبول تھی۔

16.4 کیبنٹ مشن منصوبہ (The Cabinet Mission Plan, 1946)

انگلینڈ میں 1945 کے عام انتخابات میں چرچل کی زیر قیادت کنزرویٹو پارٹی کو سی آر اٹلی جو نئے وزیر اعظم تھے، کی قیادت والی لیبر پارٹی نے شکست سے دوچار کرایا۔ لارڈ واویل کو لندن طلب بھی کیا اور انہیں مطلع کیا گیا کہ برطانیہ ہندوستان کو چھوڑنے کا ارادہ کر لیا ہے۔ بعد ازاں اسی سال (46-1945) میں ہندوستان کی صوبائی اسمبلیوں اور مرکز میں قانون ساز اسمبلی کے انتخابات کرائے گئے۔ ان عام انتخابات میں کانگریس نے مرکزی قانون ساز اسمبلی میں 57 سیٹوں پر کامیابی حاصل کی۔ مسلم لیگ نے مسلمانوں کے لئے محفوظ 30 نشستوں پر قبضہ کیا۔ صوبوں میں کانگریس کی اگرچہ 1937 میں 714 سیٹیں تھیں لیکن 1946 میں اس نے 923 نشستیں حاصل کیں۔ لیگ نے بھی بہتر کارکردگی دکھائی۔ 1937 میں یہ مسلمانوں کے 492 کے کوٹہ میں سے صرف اپنے 109 نمائندے کو ہی کامیابی سے ہمکنار کرا پائی تھی لیکن 1946 میں اس نے 425 سیٹوں پر کامیابی حاصل کی اور اس کا فیصد 86 تک پہنچ گیا تھا۔

24 مارچ 1946 کو کابینہ وزرا کا ایک خصوصی مشن جس میں لارڈ پیتھک لارینس، سر اسٹیورڈ کرپس اور اے وی الگیزنڈر شامل تھے۔ ہندوستان آیا تھا کہ ہندوستان کی ممکنہ حد تک جلد سے جلد آزادی حاصل ہو سکے۔ اس مشن نے ہندوستانی ریاستوں اور برطانوی ہندوستان کے نمائندوں کے ساتھ غور وخوض کرنے میں تقریباً پانچ ہفتے لگائے۔ آخر میں 5 مئی کو شملہ میں صوبوں کی گروہ بندی، وفاقی یونین کے کردار اور آئین ساز مشینری کے قیام پر غور کرنے کے لئے ایک کانفرنس منعقد کی تھی۔ لیکن جب کانگریس اور لیگ کے اختلافات ناقابل

مفاہمت ہو گئے تو کانفرنس کو ختم کر دیا گیا۔ 16 مئی 1946 کو کیبنٹ مشن نے اپنا ایک بیان شائع کیا جس میں انہوں نے اپنی سفارشات پیش کی تھیں جو کیبنٹ مشن منصوبہ کے طور پر جانی جاتی ہیں۔ اس کی درج ذیل اہم دفعات تھیں:

- برطانوی ہندوستان اور شاہی ریاستوں پر مشتمل ہند یونین میں امور یعنی خارجہ امور، دفاع اور مواصلات کو دیکھے گی۔
- اس کے عاملہ بھی ہو گی اور مجلس قانون ساز بھی۔
- یونین کے امور کے علاوہ دیگر تمام امور اور بقیہ اختیارات برطانوی ہندوستان کے موجودہ دو معنی ہوں گے۔
- شاہی ریاستوں کے پاس وہ تمام امور ہوں گے جو یونین کے پاس نہیں ہیں۔
- صوبے اپنے گروہ (حتمی وفاقی) تشکیل دینے کے لئے خود مختار ہوں گے۔
- یونین کے آئین اور گروہوں کو یہ دفعہ دیکھنی ہو گی کہ کچھ ابتدائی مرحلوں کے بعد کوئی صوبہ اپنی قانون ساز اسمبلی میں ووٹوں کی اکثریت کے ساتھ آئین کی شرائط ضوابط پر نظر ثانی کرنے کے لئے کہہ سکتا ہے۔
- ہر صوبہ کو اس کی آبادی کے تناسب سے کل سیٹوں کی تعداد الاٹ کر کے حال ہی میں منتخبہ صوبائی قانون سازوں کی بنیاد پر آئین ساز اسمبلی کی تشکیل۔ واحد قابل تبادلہ ووٹ کے ساتھ تناسبی نمائندگی کے طریقے سے انتخابات کرائے جانے تھے۔
- آئین سازی کے عمل کے دوران ملک کا انتظام چلانے کے لئے ایک عبوری حکومت جسے تمام اہم سیاسی پارٹیوں کی حمایت حاصل تھی قائم کی جانی چاہئے۔

مجوزہ آئین ساز اسمبلی 292 برطانوی ہندوستان کے اور 93 ہندوستانی ریاستوں کے ممبران پر مشتمل ہوتی۔ برطانوی ہندوستان کے ممبران کو 210 جنرل (وہ سب جو مسلمان یا سکھ نہیں تھے) 78 مسلم اور 4 سکھ سیٹوں میں تسلیم کیا گیا تھا۔ ابتدائی میٹنگ میں اسمبلی کو نہ صرف ایک چیئرمین اور دیگر عہدیداروں کو بلکہ ایک مشاورتی کمیٹی کو بھی منتخب کرنا تھا۔ بعد ازاں اسے اپنے آپ کو تین حصوں میں تقسیم کرنا تھا جو گروہ A,B,C کے صوبوں پر مشتمل ہوتے۔ گروہ A میں جو صوبے رکھے گئے وہ تھے مدراس، ممبئی، یونائیٹڈ پرونسیز اور بہار۔ وسطی صوبے اور اڑیسہ، گروہ B پنجاب، شمال مغربی سرحدی صوبہ اور سندھ پر مشتمل تھا جبکہ گروہ سی میں بنگال اور آسام کو رکھا گیا تھا۔ علاوہ ازیں یہ انتظام بھی کیا گیا تھا کہ کسی گروہ سے کسی صوبہ کی علاحدگی کا کوئی بھی فیصلہ نئے آئین کے تحت پہلے عام انتخابات کے بعد صوبائی قانون ساز یہ لے سکتی ہے۔ لیکن کانگریس اور لیگ دونوں ہی کیبنٹ مشن کی تجاویز پر اپنے رد عمل کا اظہار کرنے میں تذبذب میں مبتلا تھے۔ مجوزہ عبوری حکومت میں عہدوں کو بھرنے کے مسئلہ پر زیادہ نااتفاقی تھی۔ اس طرح کیبنٹ مشن دو اہم سیاسی پارٹیوں کے درمیان مفاہمت کرانے کی کوششوں میں مشتعل ہو گیا۔ بالآخر 29 جون کو وہ انگلینڈ کے لئے روانہ ہو گیا۔ کانگریس انتخابات لڑنے اور آئین ساز اسمبلی میں حصہ لینے کے لئے تو رضامند ہو گئی لیکن عبوری حکومت میں شامل ہونے سے انکار کر دیا۔ مسلم لیگ نے منصوبہ کو منظور کر لیا اور اسے توقع تھی کہ وائسرائے عبوری حکومت قائم کرنے کے لئے لیگ کو مدعو کریں گے، لیکن وائسرائے نے ایسا کرنے سے منع کر دیا۔ اس کے بعد مسلم لیگ نے کیبنٹ مشن منصوبے کی اپنی منظوری کو واپس لے لیا۔ 12 اگست 1946 کو واویل نے کانگریس کو عبوری حکومت تشکیل دینے کے لئے مدعو کیا۔

16.5.6 یوم راست کاروائی (Direct-Action Day)

اس سے قبل مسلم لیگ نے 30 جولائی 1946 کو یہ فیصلہ کیا وہ 16 اگست کو سارے ملک میں ''یوم راست کارروائی'' کے طور پر منائے گی۔ اس کشیدہ صورت حال میں کانگریس کا عبوری حکومت بنانے کے لئے مدعو کرنے کے وائسرائے کے فیصلے نے جلتی آگ پر تیل چھڑکنے کا کام کیا۔ اس لئے 16 اگست کو لیگ نے ملک میں عوامی مظاہرے اور ہڑتالیں کرائیں جن کے نتیجے میں سارے شہر میں فساد اور جھڑپیں ہوئیں۔ دوسری جانب کانگریس نے اپنے پہلے پہلے فیصلے کو پلٹ دیا اور وہ عبوری حکومت تشکیل دینے کے لئے تیار ہو گئی۔ شروع میں لیگ نے عبوری حکومت میں حصہ نہیں لیا لیکن بعد میں وہ حکومت میں شامل ہو گئی۔ تاہم لیگ نے آئین کا خاکہ تیار کرنے والی آئین ساز اسمبلی میں شمولیت سے انکار کر دیا۔ اس نے پاکستان پر زور دینا جاری رکھا اور برطانوی حکومت سے آئین ساز اسمبلی کو تحلیل کرنے کے لئے کہا۔

16.5.7 آئین ساز اسمبلی (The Constituent Assembly, 1946–50)

جون 1946 میں آئین ساز اسمبلی کے انتخابات ہوئے۔ کل 292 نشستیں برطانوی ہندوستان کو دی گئیں۔ 4 سیٹیں خالی رہیں کیونکہ سکھوں نے اسمبلی میں شمولیت سے انکار کر دیا تھا۔ اس طرح کانگریس نے کل 201، مسلم لیگ نے 73 اور 8 آزاد اور 6 دیگر پارٹیوں کے ممبران نے جیتیں۔ اسمبلی کی پہلی میٹنگ 9 دسمبر کو کونسل چیمبر کی لائبریری میں منعقد ہوئی۔ جس میں 205 ممبران نے شرکت کی۔ مسلم لیگ نے اسمبلی کا بائیکاٹ کیا اور علاحدہ ملک پاکستان کے لئے اپنے مطالبہ پر زور دیا۔ نوابوں اور راجاؤں نے بھی اسمبلی کا بائیکاٹ کیا۔ دریں اثنا ریاستوں کے عوام نے متحدہ ہندوستان میں ریاستوں کے الحاق کے لئے اپنی تحریک برقرار رکھی۔

16.5.8 ماؤنٹ بیٹن منصوبہ اور حصول آزادی

(Mountbatten Plan and the Declaration of Independence, 1947)

1947 کے اوائل میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو ہندوستان کا وائسرائے مقرر کیا گیا اور برطانوی حکومت نے اعلان کیا کہ وہ جون 1948 سے قبل ہی ہندوستانیوں کے ہاتھوں میں اقتدار سونپ دے گی۔ جون 1947 میں ماؤنٹ بیٹن نے ایک منصوبہ پیش کیا جو ہندوستان کو دو آزاد ملکوں ہندیونین اور پاکستان میں تقسیم کرنے سے متعلق تھا اور جون تھرڈ پلان کے نام سے جانا جاتا ہے۔ ہندوستانی ریاستوں کو اپنے مستقبل کا فیصلہ خود ہی کرنے کا حق دیا گیا تھا۔ برطانوی پارلیمنٹ کے ذریعے ایک بل بہت عجلت یعنی 12 دنوں (4 جولائی تا 16) میں پیش کیا گیا اور 18 جولائی کو شاہی منظوری ملنے کے بعد یہ ایکٹ بن گیا جو انڈین انڈپینڈنٹس ایکٹ کے طور پر مشہور ہوا۔ اس ایکٹ کے ذریعے دو قومی نظریہ کے قیام کے لئے 15 اگست 1947 کی تاریخ طے کی گئی۔ تقسیم مکمل ہوئی اور دو مملکتوں ہندوستان اور پاکستان کو اقتدار منتقل کر دیا گیا۔ پاکستان مغربی پنجاب، مشرقی بنگال، سندھ اور شمال مغربی سرحدی صوبہ (این ڈبلیو ایف پی) پر مشتمل تھا۔ 15 اگست 1947 کو ہندوستان آزاد ہو گیا۔ مگر بدقسمتی سے آزادی کے لئے ہندوستانی عوام کی شاندار جدوجہد کی فتح حصول آزادی سے قبل اور بعد میں ہونے والے خوفناک واقعات سے داغدار ہو گئی۔ لاکھوں لوگوں نے اپنے گھر کھودیے اور ہزاروں افراد مارے گئے۔ دونوں فرقوں سے متعلق لوگوں نے فرقہ وارانہ یکجہتی کو

برقرار رکھنے کے لئے اپنی جانیں قربان کردیں۔

16.6 قومی تعمیر کا عمل (The Process of Nation Building)

آزادی کے ساتھ ہی ہندوستانی عوام کی تاریخ اور ایک نئی اور خوشحال قوم کی تعمیر کی جدوجہد میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ ہندوستان کی قومی تعمیر کے عمل کا پتہ دستور ساز اسمبلی (Constituent Assembly) کی تشکیل سے لگایا جاسکتا ہے جس نے خود کو آزاد ہندوستان کے لیے آئین کی تیاری کا کام سونپا تھا۔ حالانکہ اس نے اپنا کام 26 نومبر 1949 کو ہی مکمل کر لیا تھا مگر ہندوستان کا آئین 26 جنوری 1950 کو تب نافذ ہوا جب ہندوستان ایک جمہوریہ بنا۔

دستور ساز اسمبلی کے کام کا خاکہ، جواہر لعل نہرو نے 13 دسمبر 1946 کو اسمبلی میں غایتی قرارداد (Objectives Resolution) پیش کرتے ہوئے اپنی تقریر میں بیان کیا تھا۔ ان کی مجوزہ قرارداد کے مطابق، اسمبلی نے ہندوستان کو ایک آزاد، خود مختار، عوامی جمہوریہ قرار دینے کے اپنے مضبوط اور پختہ عزم کا اظہار کیا تھا جس میں برطانوی ہندوستان، ہندوستانی ریاستیں اور آزاد خود مختار ہندوستان میں شامل ہونے کے خواہاں دیگر علاقے شامل تھے۔ اسمبلی نے اعلان کیا کہ آزاد اور خود مختار ہندوستان میں، 'سماجی، اقتصادی اور سیاسی انصاف؛ حیثیت، مواقع اور قانون کے سامنے برابری؛ فکر، اظہار، عقیدہ، نظریہ، عبادت، پیشہ، انجمن اور عمل کی آزادی کی ضمانت اور تحفظ ہندوستان کے تمام لوگوں کو حاصل ہوگا۔

14 اگست 1947 کو دستور ساز اسمبلی جس نے آزاد ہندوستان کی پارلیمنٹ کے طور پر بھی کام کیا، سے خطاب کرتے ہوئے ہندوستان کے پہلے وزیر اعظم جواہر لعل نہرو نے یہ یادگار الفاظ کہے، 'بہت سال پہلے ہم نے تقدیر کے ساتھ وعدہ کیا تھا...اور اب اس وعدے کو پوری طرح تو نہیں لیکن بڑی حد تک پورا کرنے کا وقت آگیا ہے۔ آج، جیسے ہی گھڑی کی سوئیاں نصف شب ہونے کا اعلان کریں گی، جب پوری دنیا نیند کی آغوش میں ہوگی، ہندوستان، زندگی اور آزادی کی کروٹ کے ساتھ اپنے بیدار ہونے کا اعلان کرے گا۔ یہ ایک ایسا لمحہ ہے جو تاریخ میں شاذونادر ہی آتا ہے جب ہم پرانے سے نئے کی طرف پیش رفت کرتے ہیں، جب ایک عہد کا خاتمہ ہوتا ہے....اور جب ایک قوم کی دبی ہوئی دیرینہ آرزو اور اس کی روح کو آواز ملتی ہے۔ یہ بے حد مناسب ہے کہ اس خاص لمحہ میں ہم ہندوستان اور یہاں بسنے والے تمام لوگوں اور اس سے بھی بڑھ کر تمام انسانیت کے مفاد کے لیے وقف ہو جانے کا حلف اٹھائیں۔'

اس طرح 'آزاد ہندوستان کی عظیم عمارت' کی تعمیر کی کوشش شروع ہوئی۔ پہلا کام ہندوستان کے اتحاد کو مکمل کرنا تھا۔ رجواڑے ریاستوں کے بہت سے حکمران اپنی آزاد ریاستوں کے قیام کے خواب دیکھ رہے تھے۔ تاہم، ریاستوں کے لوگوں کی تحریکوں اور سردار ولبھ بھائی پٹیل کے حسن انتظام کے نتیجے میں، انہوں نے ہندوستان سے الحاق کیا۔ جموں وکشمیر، حیدرآباد اور ٹراونکور کی ریاستیں، جو کہ ایسا کرنے سے گریزاں تھیں، لیکن رائے عامہ سے مجبور ہو کر آخر کار وہ ہندوستان میں شامل ہو گئیں۔ جموں وکشمیر کے لوگ قومی تحریک کے ایک حصے

کے طور پر مطلق العنانی کے خلاف مہم چھیڑے ہوئے تھے۔ پاکستانی چھاپہ ماروں کے حملے کے بعد ریاست نے ہندوستان کے ساتھ الحاق کر لیا۔ اس ریاست کے لوگ خود کو ہندوستانی قوم کا حصہ سمجھتے ہوئے پاکستانی حملہ آوروں کے خلاف لڑے۔ جموں وکشمیر کے لوگوں کی آئین ساز اسمبلی نے 1954 میں ہندوستانی وفاق کی ایک ریاست بننے کا فیصلہ کیا اور اس طرح کشمیر کے الحاق کی مزید تصدیق کی۔ 1949 کے آخر میں شمولیت کا عمل مکمل ہو چکا تھا۔ رجواڑے ریاستوں کو ختم کر کے ہندوستانی وفاق کی مختلف ریاستوں میں ملا دیا گیا تھا۔

اس کے بعد قومی تعمیر کی طرف اقدامات کا سلسلہ شروع ہوا۔ ملک کی ترقیاتی سرگرمیوں کی رہنمائی کے لیے پلاننگ کمیشن (Planning Commission) قائم کیا گیا۔ پہلے پنج سالہ منصوبوں (Five-Year Plans) کے دوران ملک میں آبپاشی اور بھاری صنعتوں کے قیام کے ذریعے زراعت میں خاصی بہتری آئی۔ ذرائع نقل وحمل اور مواصلات میں خاص طور پر ملک کے پسماندہ علاقوں میں نمایاں تبدیلیاں دیکھنے کو ملیں۔ متعدد تحقیقاتی کمیشنوں کی سفارشات کے بعد پرائمری سے پوسٹ گریجویٹ سطح تک تعلیم کو فروغ دینے کی نمایاں کوششیں کی گئیں۔ سائنسی اور تکنیکی علم کی ترقی پر خصوصی توجہ دی گئی۔ ہندوستان کے اہم شہروں میں انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی (IITs) قائم کیے گئے۔ ملک میں اعلیٰ تعلیم کے فروغ کو یونیورسٹی گرانٹ کمیشن (UGC) کے سپرد کیا گیا۔

اس دوران مختلف ترقیاتی اقدامات عمل میں لائے گئے۔ حکومت نے مختلف پالیسیاں بنا کر خاص طور پر غریبوں کے درمیان غربت کے خاتمے کی کوشش کی۔ درج فہرست ذاتوں (Scheduled Castes) اور درج فہرست قبائل (Scheduled Tribes) پر اس دوران خصوصی توجہ دی گئی اور ان کی فلاح و بہبود پر نظر رکھنے کے لیے ایک کمیشن قائم کیا گیا۔ 1955 میں ریاستی تنظیم نو کمیشن (State Reorganisation Commission) قائم کیا گیا جس کا مقصد ریاستی حدود کو معاشی اور انتظامی سہولت کے لحاظ سے معقول بنانا تھا۔ اس کے نتیجے میں 1956 میں ریاستی تنظیم نو قانون (State Reorganisations Act) منظور کیا گیا۔ تاہم یہ طریقہ کار وہیں ختم نہیں ہوا، یہ آج بھی جاری ہے۔ اس تنظیم نو کا اثر ملک کی لسانی تقسیم پر پڑ ہے۔ صوبوں کی خود مختاری، جو زیادہ تر زبانوں پر مبنی ہے، کا مقصد لسانی گروہوں کی متوازن ترقی کو فروغ دینا ہے۔ میں بنیادی طور پر فرقہ وارانہ فسادات کو کنٹرول کرنے کے لیے 1961 میں قومی یکجہتی کونسل (The National Integration Council) قائم کی گئی جس میں مرکزی وزراء، ریاستی وزرائے اعلیٰ اور بڑی سیاسی جماعتوں کے نمائندوں شامل تھے۔ حالانکہ خود کونسل کے پاس کوئی انتظامی اختیارات نہیں ہے۔ برادریوں کے درمیان تنازعات کو امن وامان کا مسئلہ سمجھا جاتا ہے، پھر بھی کونسل کی سفارشات کا امن وامان کی بحالی پر اثر پڑتا ہے۔

16.7 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

دوسری عالمی جنگ کے بعد ہندوستانی قومی تحریک کے فروغ کے دوران فرقہ وارانہ رجحانات اپنے خوفناک سر ابھار رہے تھے، جن کے المناک نتائج ہندوستانیوں کے لئے برآمد ہوئے اور جن کی وجہ سے ملک تقسیم ہوا۔ فرقہ پرست پارٹیوں نے مذہب کی بنیاد پر اپنی سرگرمیاں شروع کیں اور یہ دعوے بھی کئے کہ وہ اپنے اپنے فرقوں کے مفادات کو آگے بڑھانے کے لئے کام کر رہی ہیں۔ انگریز حکومت نے

مسلم لیگ کی اس بات کے لئے حوصلہ افزائی کی کہ وہ ایک علاحدہ ملک کے لئے اپنی مانگ پر زور دے۔ اگرچہ گاندھی سے ممتاز رہنما مذہب پر مبنی تقسیم کے فارمولے کو تسلیم نہیں کرنا چاہتے تھے لیکن مذہبی گروہوں کے درمیان فرقہ وارانہ فسادات نے پاکستان کی تشکیل میں تعجیل کی۔ برطانوی کیبنٹ مشن نے 1946 میں آزادی اور تقسیم کی جو تجویز پیش کی تھی اسے کانگریس نے منظور کر لیا۔ برطانوی پارلیمنٹ نے مشہور انڈین انڈپینڈ نٹس ایکٹ 1947 پاس کیا جس نے برطانوی ہندوستان کو ہندوستان اور پاکستان میں تقسیم کر دیا۔ ہندوستان نے 15 اگست 1947 کو اپنی آزادی حاصل کر لی۔

تقسیم ہند برطانوی ہندوستان کی عدم نوآبادیت کا نتیجہ تھی، جو تقریباً دو صدیوں سے نوآبادیاتی حکومت کے تحت رہا تھا۔ جیسے جیسے ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد نے زور پکڑا، یہ سوال ایک اہم مسئلہ بن گیا کہ مختلف مذہبی فرقوں کے مطالبات کو کیسے پورا کیا جائے۔ محمد علی جناح کی قیادت میں آل انڈیا مسلم لیگ نے ایک علیحدہ مسلم قوم کی وکالت کی، جو بالآخر تحریک پاکستان میں تبدیل ہو گئی، تاکہ ہندو اکثریتی ہندوستان میں مسلمانوں کے مفادات کا تحفظ کیا جا سکے۔ ہندوستان کے آخری برطانوی وائسرائے لارڈ لوئس ماؤنٹ بیٹن نے تقسیم کا منصوبہ پیش کیا جسے ماؤنٹ بیٹن پلان کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس منصوبے میں مذہبی خطوط پر ہندوستان کی تقسیم کا مطالبہ کیا گیا، جس میں 15 اگست 1947 کو دو آزاد ریاستیں، ہندوستان اور پاکستان وجود میں آئیں۔

آزادی کے بعد، ہندوستان نے قومی تعمیر کی طرف قدم بڑھائے۔ اس کا آغاز آزاد ہندوستان کے لیے آئین بنانے کے لیے دستور ساز اسمبلی کی تشکیل سے ہوا۔ اس کے نتیجے میں، ہندوستان میں انصاف، آزادی، مساوات، بھائی چارے، اتحاد، سالمیت کو برقرار رکھنے کے لیے آئین تشکیل دیا گیا اور ہندوستان کو ایک خود مختار، جمہوری اور جمہوریہ قرار دیا گیا۔ متعدد منتخبہ حکومتوں کے ذریعے ہندوستان میں معاشی ترقی لانے اور یکجہتی کو فروغ دینے کے لیے سلسلہ وار اقدامات کیے گئے۔

16.8 کلیدی الفاظ (Keywords)

درج فہرست ذاتیں	:	(Scheduled Castes) ہندوستان میں وہ ذاتیں جو دولت اور پچھڑے طبقے سے تعلق رکھتی ہیں۔
درج فہرست قبائل	:	(Scheduled Tribes) ہندوستان میں رہنے والے آدی واسی قبائل کو اس زمرہ میں لیا گیا۔
یونیورسٹی گرانٹس کمیشن	:	(UGC) یونیورسٹیوں کو گرانٹ یا فنڈ فراہم کرنے اور ان کے لیے قواعد اور ضوابط بنانے والا مرکزی خود مختار ادارہ جسے 1956 میں قائم کیا گیا۔

16.9 نمونہ امتحانی سوالات (Model Exanimation Questions)

16.9.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. فرقہ واریت سے آپ کی کیا مراد ہے؟
2. شملہ کانفرنس کی کیا اہمیت ہے؟
3. CR فارمولے کے اہم نکات کو شمار کریں۔
4. ڈیسائی لیاقت معاہدے سے آپ کی کیا مراد ہے؟
5. ویول پلان پر ایک نوٹ لکھیں۔
6. ڈائریکٹ ایکشن ڈے کی وضاحت کریں۔
7. گاندھی-جناح مذاکرات پر ایک نوٹ لکھیں۔
8. آئین ساز اسمبلی پر ایک نوٹ لکھیں۔
9. کیبنٹ مشن پلان کی اہم دفعات کی وضاحت کریں۔
10. محمد علی جناح پر ایک نوٹ لکھیں۔

16.9.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. تقسیم کرو اور حکومت کرو کی برطانوی پالیسی کو آپ کیا سمجھتے ہیں؟
2. مسلم لیگ کی تشکیل کے عوامل کا جائزہ لیں۔
3. 1947 میں تقسیم ہند کا سبب بننے والے عوامل کی وضاحت کریں۔
4. ماؤنٹ بیٹن پلان کی اہم خصوصیات کیا تھیں؟
5. ہندوستانی آزادی ایکٹ کی وضاحت کریں۔

16.9.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. تحریک پاکستان کے مختلف مراحل پر تفصیلی گفتگو کریں۔
2. ”کچھ مورخین تقسیم کو فرقہ وارانہ سیاست کی انتہا کے طور پر دیکھتے ہیں“۔ بیان کا جائزہ لیں۔
3. آزاد ہندوستان میں قوم سازی کے لیے حکومت کی طرف سے اٹھائے گئے اقدامات کی وضاحت کریں۔

16.10 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Learning Resources)

1. Godbole, Madhav, *The Holocaust of Indian Partition: An Inquest*, Rupa Publications, Delhi, 2006.
2. Hasan, Mushirul (ed.), *India's Partition*: *Process*, *Strategy and Mobilization*, Oxford University Press, Delhi, 1993.
3. Ikram, S.M., *Indian Muslims and Partition of India*, Atlantic Publishers, New Delhi, 1992.
4. Jalal, Ayesha, *The Pity of Partition*: *Manto's Life*, *Times*, *and Work across the India-Pakistan Divide*, HarperCollins, Noida, 2011.
5. Kaur, Ravinder, *Since 1947*: *Partition Narratives among Punjabi Migrants of Delhi*, Oxford University Press, New Delhi, 2007.
6. Khan, Lal, *Crisis in the Indian Sub-Continent: Partition Can be Undone*? Aakar, Delhi, 2007.
7. Khan, Yasmin, *The Great Partition: The Making of India and Pakistan*, Yale University Press, Connecticut, 2017.
8. Lapierre, Dominique, and Larry Collins, *Freedom at Midnight*, Vikas Publishing House, Delhi, 2011.
9. Mahajan, Sucheta, *Independence and Partition*: *The Erosion of Colonial Power in India*, Sage, New Delhi, 2000.
10. Rasid, Salman, *A Time of Madness*: *A Memoir of Partition*, Aleph, New Delhi, 2017.
11. Seervai, H.M., *Partition of India*: *Legend and Reality*, Emmenem Publications, Bombay, 1989.
12. Singh, Anita Inder, *The Partition of India*, National Book Trust, Delhi, 2020.
13. Srinivas Murthy, H.V., *History of India*, Eastern Book Company, Lucknow, 1995.
14. Talbot, Phillips, *An American Witness to India's Partition*, Sage, New Delhi, 2007.
15. Zamindar, Wazira Fazila-Yacoobali, *The Long Partition and the Making of Modern South Asia*: *Refugees*, *Boundaries*, *Histories*, Penguin, New Delhi, 2008.

نمونہ پرچہ امتحان

Directorate of Distance Education نظامت فاصلاتی تعلیم

Master of Arts ماسٹر آف آرٹس

Subject Code: MAHS213CCT

Subject: History of India

(1857 – 1950 A.D.)

پرچہ: تاریخ ہندوستان

(1857 تا 1950ء)

2nd Semester Examination ، دوسرا سمسٹر امتحان

Time : 3 hours وقت : 3 گھنٹے | Marks : 70 نشانات : ۷۰

ہدایات

یہ پرچۂ سوالات تین حصوں پر مشتمل ہے: حصہ اول، حصہ دوم، حصہ سوم۔ ہر جواب کے لیے لفظوں کی تعداد اشارۃً ہے۔ تمام حصوں سے سوالوں کا جواب دینا لازمی ہے۔

1۔ حصہ اول میں 10 لازمی سوالات ہیں جو کہ معروضی سوالات ہیں۔ ہر سوال کا جواب لازمی ہے۔ ہر سوال کے لیے 1 نمبر مختص ہے۔ (1 0 x 1 =10 Marks)

2۔ حصہ دوم میں 8 سوالات ہیں۔ اس میں سے طالب علم کو کوئی پانچ سوالوں کے جواب دینے ہیں۔ ہر سوال کا جواب تقریباً دو سو (200) لفظوں پر مشتمل ہے۔ ہر سوال کے لیے 6 نمبرات مختص ہیں۔ (5x6=30 Marks)

3۔ حصہ سوم میں پانچ سوالات ہیں۔ اس میں سے طالب علم کو کوئی 3 سوالوں کے جواب دینے ہیں۔ ہر سوال کا جواب تقریباً پانچ سو (500) لفظوں پر مشتمل ہے۔ ہر سوال کے لیے 10 نمبرات مختص ہیں۔ (3x10=30Marks)

حصہ اول

سوال : 1

1. شاردا ایکٹ کس نے متعارف کرایا؟
2. شاردا ایکٹ کب نافذ ہوا؟
3. نا عمر کی شادی کی سزا کیا ہے؟
4. کسے 'جدید ہندوستان کا بابا' کہا جاتا ہے؟
5. 'آتمیہ سبھا' کس نے قائم کی؟

6. رام موہن رائے نے اپنشدوں کا کس زبان میں ترجمہ کیا؟

7. مشہور کتاب *The Emergence of Indian Nationalism* کے مصنف کون ہیں؟

8. انیل سیل کا تعلق قوم پرستی کے کس نظریے سے ہے؟

9. البرٹ بل کی مخالفت کس نے کی؟

10. ورناکلر ایکٹ کس نے لاگو کیا؟

حصہ دوم

1. سماجی اصلاحی تحریک میں راجا رام موہن رائے کا کیا کردار ہے، واضح کریں؟

2. وارن ہیسٹنگ کے بعد کے دور میں نوآبادیاتی سماجی پالیسی میں جو تبدیلیاں آئیں ان کی وجوہات کیا تھیں؟

3. ایشور چندر ودیا ساگر نے کس طرح روایتوں اور جدّت پسندی میں توازن قائم کیا؟

4. کیمبرج نظریہ پر ایک مضمون لکھیے۔

5. بنگ بھاشا پرکاشک سبھا پر ایک نوٹ لکھیے۔

6. برٹش انڈیا سوسائٹی پر ایک نوٹ لکھیے۔

7. مدراس نیٹیو ایسوسی ایشن پر ایک نوٹ لکھیے۔

8. پونا سار وجنک سبھا پر ایک نوٹ لکھیے۔

حصہ سوم

1. ستی، نوزائیدہ بچوں کا قتل اور غلامی کے حوالے سے برطانوی پالیسیوں کی ترقی اور اثرات پر لکھیں۔

2. عمر رضامندی ایکٹ 1891 اور شاردا ایکٹ 1929 پر تفصیلی نوٹ لکھیں؟

3. 1857 کی بغاوت کیوں کر برطانوی اور مسلمانوں کے مابین تعلقات کے لئے ایک اہم نشانی تھی؟ تفصیلی وضاحت کیجیے۔

4. انڈین ایسوسی ایشن پر ایک تفصیلی مضمون لکھیے۔

5. زمینداری ایسوسی ایشن پر ایک تفصیلی مضمون لکھیے۔

اہم نکات